خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج ونوعیت

اور

عصر حاضر میں اس سے استفادہ

حافظ شعیب احمد

خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج ونوعیت

اور

عصر حاضر میں اس سے استفادہ

حافظ شعیب احمد

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور فون: ۸۸۹۸۶۳۹ ۰۳۰۰

بیاد
پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ
۱۹۴۷-۲۰۰۹

نام کتاب ——— خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج ونوعیت اور عصر حاضر میں اس سے استفادہ

مصنف ——— شعیب احمد

صفحات ——— 496

ناشر ——— دار النوادر

انتساب

تاریخ اسلام کی ان عظیم ہستیوں کے نام جنہیں

خلفاء راشدین

کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ جنہوں نے اپنے عہدِ خلافت کے پیش آمدہ
نئے مسائل کا حل اجتہاد کرتے ہوئے پیش کیا اور قیامت تک کے فقہاء و
مجتہدین امت کے لیے بطور اسوہ ایک شاندار عملی اجتہادی منہج پیش کیا
(رضی اللہ عنہم وارضاھم اجمعین)

ترتیب

باب دوم

باب سوم

باب چہارم:

مقدمہ

بسم اللہ والحمد للہ و الصلوۃ والسلام علی رسول اللہ و علی آلہ و اصحابہ و خلفاءہ الراشدین المھدیین ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین، اما بعد!

موضوع کا تعارف:

دین اسلام کی دیگر بہت سی خصوصیات وامتیازات میں سے ایک اہم خصوصیت اس کا دین کامل ہونا ہے جیسا کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (الانعام،۶:۳۸)

''ہم نے کتاب میں کسی چیز (کے لکھنے) میں کوتاہی نہیں کی۔''

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ﴾ (النحل،۱۶:۸۹)

''اور ہم نے تم پر (ایسی) کتاب نازل کی ہے کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل ہے)۔''

مگر یہ کامل ہونا اس اعتبار سے ہے کہ اس میں ہر دور کے نت نئے مسائل کے لیے کلیات وقواعد کی صورت میں رہنمائی موجود ہے۔اسلامی تعلیمات قواعد وضوابط اور کلیات کی حیثیت رکھتی ہیں لہٰذا جزئیات جن میں ہر دور کے نئے پیش آمدہ مسائل بھی شامل ہیں، کا حل ان کلیات کی روشنی میں کیا جائے گا اس حل کے لیے جو کوشش کی جائے گی اس کا اصطلاحی نام ''اجتھاد،، ہے اور ایسی کوشش کرنے والے شخص کو اسلامی نقطہ نظر سے ''مجتہد'' کہا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں اجتہاد کی اجازت اسلام کی اہم ترین خوبی ہے کیونکہ زمانہ ہر آن تغیر پذیر ہے، نت نئے مسائل جنم لیتے ہیں جن کا حل ایک مجتہد اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش کرتا ہے لہٰذا علمائے اسلام کے لیے اجتہاد کی اجازت ہونا امتِ مسلمہ کی نہایت خوش بختی اور

سعادت مندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اجتہاد کی فضیلت کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اذا حکم الحاکم فاجتهد ثم اصاب فله اجران و اذا حکم فاجتهد ثم اخطا فله اجر"(صحیح بخاری:۷۳۵۲)

"فیصلہ کرنے ولا جب اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرے اور راہِ صواب تک پہنچ جائے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور اگر وہ اجتہادی فیصلہ میں خطا کر بیٹھے تو بھی اس کے لیے اکہرا اجر ہے۔"

جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول ﷺ کو مختلف سوالات کے جوابات دیتے ہوئے یہ کہا کہ کتاب وسنت سے نصاً کسی مسئلہ کا حل نہ ملا تو وہ کتاب وسنت میں موجود دیگر نظائر و امثال کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجتہاد کر کے مسئلہ کا حل نکالیں گے تو رسول اللہ ﷺ نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور آپ ﷺ یوں گویا ہوئے:

"الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله صلی الله علیه وسلم لما یرضی رسول الله صلی الله علیه وسلم"(مسند احمد،۵:۲۳۰)

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کے ایلچی کو اس کام کی توفیق دی جو رسول اللہ ﷺ کی رضامندی کا باعث ہے۔"

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امتِ محمدیہ کے لیے اجتہاد کی اجازت ایک نعمت الٰہی ہے اور یہ ایک ایسی نعمت عظمیٰ ہے جس پر رسول عربی ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے حضور کلماتِ تشکر پیش کرتے ہیں۔

اجتہاد کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس کا آغاز اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے راجح قول کے مطابق خود رسول اللہ ﷺ نے بھی کئی ایک مواقع پر اجتہاد کیا۔اسی طرح آپ ﷺ کے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بھی اجتہاد کی مثالیں عہدِ نبوی میں ملتی ہیں اور عہدِ رسالت کے بعد تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے اجتہاد کی ضرورت ایک مسلمہ امر ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کے خلفاء اربعہ کو"خلفائے راشدین" کہا جاتا ہے۔یہ خلفاء کرام عہدِ نبوت میں ہی ہر لحاظ سے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں ایک امتیازی شان و مقام رکھتے تھے۔خود رسول اللہ ﷺ نے ان کی اصابتِ رائے،علمی مقام و مرتبہ اور آئندہ مستقبل میں غلبہ اسلام کے لیے ان کی خدمات کی طرف اشارہ کر دیا تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ "(سنن ابی ابوداود:۴۶۰۷)

''میری سنت اور میرے خلفاء کی سنت (مراد روش اور طریقہ کار) کو لازماً اختیار کرو، اسے مضبوطی سے تھام لو بلکہ اس کے ساتھ چمٹ جاؤ۔''

اسی طرح آپ ﷺ نے اپنا ایک خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اریت فی المنام انی انزع بدلو بکرة علی قلیب فجاء ابو بکر فنزع ذنوبا او ذنوبین نزعا ضعیفا واللہ یغفر له ثم جاء عمر بن الخطاب فاستحالت غربا فلم ار عبقریا یفری فریه حتی روی الناس وضربوا بعطن"(صحیح بخاری:۳۶۸۲)

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک کنویں پر چرخی کے ساتھ ڈول کھینچ رہا ہوں، اس دوران ابوبکر آئے۔ انھوں نے ایک دو ڈول کھینچے مگر کسی قدر ضعف کے ساتھ، اللہ انھیں اس پر معاف فرمائے پھر عمر بن خطاب آئے لیکن اب (وہ ڈول) ایک بڑا ڈول بن گیا، میں نے عمر جیسا عبقری (حیران کردینے والا شخص) نہیں دیکھا (جس نے اتنا پانی کنویں سے نکالا کہ) لوگ سیراب ہو گئے اور انھوں نے اپنے اونٹوں کو پانی پلا کر جمع شدہ پانی کے پاس ٹھہرا دیا۔''

اس حدیث میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اشاعتِ اسلام بارے جو پیش گوئی آپ ﷺ نے کی، بعد کے زمانہ میں واقعتہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مختلف فتنوں اور یورشوں کے نتیجہ میں کئی مسائل فقہیہ نے بھی سر اٹھایا جن کا خاتمہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی اجتہادی بصیرت کے ساتھ بطریق احسن کردیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمامِ حکومت سنبھالی تو اس وقت تک حکومتِ اسلامی کی بنیادیں بہت مستحکم ہو چکی تھیں لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اسلام اور مسلمانوں کو ہر لحاظ سے ترقی و وسعت ملی۔ اسلامی حکومت کی حدود مزید وسیع ہونے کی وجہ سے عرب وعجم کا اختلاط ہوا اور نئے نئے مسائل سامنے آئے جن کا حل خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ اجتہاد کی بدولت کرتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اصابتِ رائے کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لقد کان فیما قبلکم من الامم محدثون فان یکن فی امتی احد فانه عمر "(صحیح بخاری:۳۶۸۹)

''بے شک تم سے پہلے سابقہ امتوں میں بعض ایسے لوگ گزرے ہیں جنھیں (اللہ کی طرف سے) الہام ہوتا تھا، میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہے۔''

نیز ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا:

''ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر وقلبه''(جامع الترمذی:۳۶۸۲)

''بے شک اللہ نے عمر کی زبان اور دل پر حق بات جاری کر دی ہے۔''

اسی طرح آپ ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

'' والذی نفسی بیده ما لقیک الشیطن سالکا فجا قط الا سلک فجا غیر فجک'' (صحیح بخاری:۳۶۸۳)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے شیطان کا جب بھی کبھی تجھ سے آمنا سامنا ہوا، اس نے راستہ ہی بدل لیا۔''

آپ رضی اللہ عنہ ہی وہ ہیں جن کے اجتہادات سے قرآن مجید نے بھی بیس مقامات پر موافقت کی جنہیں ''موافقات عمر رضی اللہ عنہ'' کہا جاتا ہے۔ (جلال الدین، سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۱۱۴)

خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہی خطوط پر خلافت وحکومت کرتے رہے جن پر خلیفہ ثانی نے حکومت کو چھوڑا تھا۔ اکثر تمدنی وسیاسی اور انتظامی مسائل کا حل چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کر دیا تھا لہٰذا خلیفہ ثالث کو اپنی اجتہادی صلاحیتوں کے اظہار کا زیادہ موقع نہ مل سکا تاہم جب بھی ضرورت کا تقاضا ہوا تو خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی اجتہاد کرتے رہے۔

خلیفہ رابع دامادِ رسول سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اجتہادی مقام ومرتبہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا شمار ان چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے جنہیں عہدِ رسالت مآب ﷺ میں ہی فتویٰ دینے کی اجازت تھی اور آپ رضی اللہ عنہ کے کئی ایک اجتہادات وفتاوی کی توثیق خود رسول اللہ ﷺ نے بھی کی۔ آپ رضی اللہ عنہ سابقہ تینوں خلفاء کے عہد تک فتویٰ وقضاء کی ذمہ داری ادا کرتے رہے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کے زیادہ تر اجتہادات کا تعلق اسی زمانہ سے ہے۔

دراصل رسول اللہ ﷺ کی طویل معیت اور تعلیم وتربیت کے زیر اثر خلفاء راشدین اسرارِ دین سے بخوبی واقفیت حاصل کر چکے تھے اور ان میں اجتہادی صلاحیت وقابلیت بدرجہ اتم پیدا ہو چکی تھی لہٰذا یہ خلفاء کرام اپنے عہد خلافت میں پیش آمدہ عصری مسائل کا حل اجتہادی بصیرت کے ساتھ کرتے رہے۔ چونکہ امت میں بالعموم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بالخصوص ان خلفاء کا ایک خاص

علمی مقام ومرتبہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے خلفاء راشدین کے طریقے کو اختیار کرنے کا حکم دیا تھا لہٰذا ہمارے بعد کے فقہاء کرام بالخصوص ائمہ اربعہ بھی ان کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کی روشنی میں اجتہادات کرتے رہے اور اس طرح گویا ان کے اجتہادات اور اجتہادی منہج سے استفادہ کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرتے رہے۔ بلکہ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی کی تحقیق کے مطابق بعد کے ائمہ مجتہدین میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے اجتہادی مسائل میں (ماسوائے چند ایک کے) سلف کے اجتہادی دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی ہو (ڈاکٹر محمد رواس: فقہ حضرت علی، مترجم: مولانا عبدالقیوم، ص۹) سابقین کا نقطہ نظر ہی یہ تھا کہ نئی رائے قائم کرنے سے بہتر ہے کہ سلف کی رائے کی پیروی کی جائے لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان خلفاء کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کے بعد میں فقہ اسلامی پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

عصرِ حاضر میں موضوع کی اہمیت

آج بھی اسلام کو اور مسلمانوں کو بہت سے جدید چیلنجز اور مسائل کا سامنا ہے جن کے حل کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت تا قیامت رہے گی۔ ماضی میں جن علماء نے یہ کہا تھا کہ ائمہ اربعہ کے اجتہادات کے بعد اب اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی ان علماء نے یہ بات دراصل اس خدشہ کی بنا پر کہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر کس وناکس، جاہل اور غلط طور پر علم کا دعوی کرنے والے اجتہاد کرنے بیٹھ جائیں اور " ضلّوا و اضلوا،، (وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا بھی باعث بنے) کے مصداق بن جائیں تاہم ان علماء نے بھی اپنے اپنے مذاہب میں داخلی طور پر اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نئے نئے مسائل قیامت تک پیدا ہونے ہیں تو اجتہاد کی ضرورت بھی تا قیامت رہے گی نیز اجتہاد اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جسے کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا۔

موجودہ عصری مسائل کے حل کے لیے دیگر اجتہادی مآخذ کے علاوہ ان خلفاء کرام کے اجتہادی فیصلوں اور اجتہادی منہج میں بھی ہمارے لیے بڑی حد تک رہنمائی موجود ہے۔ اس مقالہ میں بھی یہی مقصود ہے کہ عصری مسائل کے حل کے لیے ان خلفاء کرام کے اجتہادی منہج کو ان کے اجتہادات کی روشنی میں متعین کیا جائے اور اس سے استفادہ کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کیا جائے تاکہ دنیا پر بالعموم اور اسلام کے معترضین پر بالخصوص یہ بات عیاں ہو سکے کہ اسلام نئے دور کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے اور نئے مسائل کو face کرتے ہوئے ان کا شرعی حل پیش کر کے اپنے ماننے والوں کی رہنمائی ہر دور میں کرسکتا ہے۔

زیر بحث موضوع پر تحقیق کے اہم اسباب:

اس موضوع پر تحقیق کرنے کے چند اہم اسباب حسب ذیل ہیں:

i۔ عصر حاضر کے نت نئے مسائل کے شرعی حل کے لیے اجتہاد کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کرنا۔

ii۔ خلفاء راشدین کی اجتہادی بصیرت اور اجتہادی کاوشوں کا تذکرہ کرنا جو انہوں نے میدانِ اجتہاد میں انجام دیں تا کہ آج کے علماء میں شوقِ اجتہاد پیدا ہو سکے، پنپ سکے اور تقلید جامد کے بندھن ٹوٹ سکیں۔

iii۔ خلفاء کرام کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کی شرعی حیثیت کو اجاگر کرنا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

''علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین'' (سنن ابی داود: ۴۶۰۷)

''میری اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت (طریقہ کار) کو اختیار کرو۔''

iv۔ خلفاء کرام کے اجتہادات کے فقہ اسلامی پر اثرات کا جائزہ لینا کیونکہ ہر دور کے فقہاء نے ان کے اجتہادات اور اجتہادی منہج سے استفادہ کیا ہے اور یہ اس لیے کہ امت میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالعموم اور خلفاء اربعہ بالخصوص ایک امتیازی شان ومقام رکھتے ہیں۔

v۔ خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج اور عصر حاضر میں اس سے استفادہ کو اجاگر کرنا کیونکہ انہیں تمام فقہاء کرام اور مجتہدین پر اجتہاد کرنے میں اسبقیت اور تقدم کا درجہ حاصل ہے لہٰذا وہ بعد کے فقہاء ومجتہدین کے لیے اجتہاد کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کے بعد ایک عملی نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا عصرِ حاضر کے فقہاء ومجتہدین کرام عصری مسائلِ اجتہاد کے حل کے لیے ان کے اجتہادی منہج سے استفادہ کرتے ہوئے راہِ صواب تلاش کر سکتے ہیں۔

vi۔ عصری اجتہادی مسائل میں خلفائے راشدین کے اجتہادات کی نوعیت سے استفادہ کرنا کیونکہ خلفائے راشدین کے دور میں حکمتِ الٰہی سے ایسے چیلنجز اور مسائل اسلام کو اور ان خلفاء کو پیش آئے جن کی امثال ونظائر قیامت تک پیش آنی تھیں تا کہ ہر دور کے مسلمان فقہاء ان سے استفادہ کر سکیں۔

vii۔ کفار اور دشمنانِ اسلام کے اس دعویٰ کی تردید کرنا کہ اسلام اب ایک فرسودہ دین ہو چکا ہے جو دور جدید کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا جب کہ رب کائنات نے اسلام کو قیامت تک کے لیے دستور حیات قرار دیا ہے۔

موضوع پر تحقیق کی افادیت:

ان مذکورہ بالا اسباب کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ زیرِ بحث موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے سے درج ذیل فوائد حاصل ہوسکیں گے۔

i۔ عہد خلافتِ راشدہ کے بعض فقہی مسائل اور خلفاء راشدین کے اجتہادات اور اجتہادی منہج سے آ گاہی ہوگی۔

ii۔ ان کے اجتہادات کے فقہ اسلامی پر اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

iii۔ خلفاء کرام کی اجتہادی بصیرت میں تفاوت کی حکمتوں سے استفادہ کیا جائے گا۔

iv۔ عصری اجتہادی مسائل سے آ گاہی ہوگی۔

v۔ عصر حاضر میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت اجاگر ہوگی۔

vi۔ عصری اجتہادی مسائل کے حل کے لیے خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج و نوعیت سے استفادہ کا شدید احساس پیدا ہوگا۔

vii۔ علم و تحقیق اور فکر و نظر کے نئے دروازے کھل سکیں گے خصوصاً ان حضرات کے لیے جو قانون و قضا، فقہ و اجتہاد اور تعلیم و افتاء سے تعلق رکھتے ہیں۔

موضوع سے متعلقہ سابقہ تصنیفی کام:

راقم الحروف کے علم کے مطابق موضوع زیر بحث پر کوئی مستقل تصنیف موجود نہیں ہے البتہ اصولِ فقہ کی بعض کتب میں قیاس و استحسان، استصلاح، عرف اور سدِ ذریعہ وغیرہ کی بحوث میں ضمناً خلفاء راشدین کے اجتہادات کا تذکرہ ان مصادر شریعت کے حجت ہونے کے حوالے سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی کا بیشتر کام چاروں خلفاء راشدین کے اجتہادات اور ان کی فقہی آراء کو محض جمع کرنے سے متعلقہ ہے البتہ شاذ و نادر وہ ان کے اجتہادات پر کبھی اپنا نقد و تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک تصنیفی کام ڈاکٹر ار۔ کے نور محمد کا "اقضیۃ الخلفاء الراشدین" کے نام سے ہے مگر چاروں خلفاء راشدین کے اجتہادات کی روشنی میں ان کا تفصیلی اجتہادی منہج ان مصنفین کے یہاں نہیں ملتا۔

موضوع سے متعلقہ مصادر و مراجع:

زیرِ بحث موضوع سے متعلقہ مصادر و مراجع کی طویل فہرست ہے جسے مقالہ کے آخر میں

لگا دیا گیا ہے البتہ یہاں اختصاراً ذکر کیا جاتا ہے کہ اس موضوع پر تحقیق کے دوران زیادہ تر استفادہ قرآنِ مجید، صحیحین، سنن اربعہ، مصنف عبد الرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن دار قطنی، ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی کی کتب (فقہ ابوبکر، فقہ عمر بن الخطاب، فقہ عثمان بن عفان اور فقہ علی المرتضی رضی اللہ عنہم اجمعین) سے کیا گیا ہے۔اسی طرح اصولِ فقہ کی قدیم و جدید کتب اور عصری مسائل کے لیے ''جدید فقہی مباحث'' (مرتب: مجاہد الاسلام قاسمی) مولانا مبشر حسین کی ''جدید فقہی مسائل'' اور معاصر رسائل و جرائد جن میں خصوصیت سے ماہنامہ محدث، سہ ماہی منہاج، سہ ماہی فکر و نظر اور ماہنامہ مجلّہ فقہ اسلامی وغیرہ شامل ہیں، سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

تبویب مقالہ:

اس مقالہ میں پیش کی جانے والی تحقیق کو ابواب و فصول کی صورت میں کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا ہے۔یہ مقالہ کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول :اسلام اور اجتہاد: پہلے باب کا عنوان ''اسلام اور اجتہاد'' ہے جس کے تحت دو فصول ہیں۔ اس باب میں اجتہاد کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، شروطِ اجتہاد، اجتہاد کا دائرہ کار اور عصرِ حاضر میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے دوسری فصل میں عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم تک کی تاریخِ اجتہاد پر بحث کی گئی ہے۔اور اس تاریخِ اجتہاد کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد اور عہدِ نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کی امثلہ بھی قدرے تفصیل سے ذکر کی گئی ہیں۔علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہادی منہج اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بالعموم اجتہادی منہج کیا تھا، اس کو بھی اختصار کے ساتھ رقم کیا گیا ہے۔

باب دوم : خلفاء راشدین اور اجتہاد: دوسرا باب بعنوان ''خلفاء راشدین اور اجتہاد'' تین فصلوں پر مشتمل ہے جس میں خلفاء راشدین کا مختصر تعارف کراتے ہوئے ان کے اجتہادی منہج اور طریق اجتہاد پر خامہ فرسائی کی گی ہے نیز خلفاء راشدین کے اجتہادات اور ان کے اجتہادی منہج کی شرعی حیثیت بارے اور ان کے باہم اختلاف کی صورت میں علماء امت کی آراء کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

باب سوم : خلافت راشدہ میں مسائل کی نوعیت اور خلفاء راشدین کے اجتہادات کی نوعیت: یہ باب چار فصلوں پر مشتمل ہے، اس میں خلافتِ راشدہ میں مسائل کی نوعیت اور خلفاء راشدین کے اجتہاد ات کی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے۔ نیز خلفاء کرام کے اجتہادات کے فقہ اسلامی پر اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم: عصر حاضر میں خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج ونوعیت سے استفادہ: یہ باب دو فصلوں پر مشتمل ہے اس میں مختلف نوعیتوں کے بعض عصری مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان جدید فقہی مسائل کے حل کے لیے خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج ونوعیت سے استفادہ کی صحیح صورت کو واضح کیا گیا ہے۔

مقابلہ کے آخر پر مکمل بحث کے خلاصہ کے ساتھ ساتھ تحقیق کے نتائج کو بھی خلاصۂ رقم کیا گیا ہے۔ کسی بھی موضوع پر ریسرچ کے باوجود اس میں مزید تحقیق کی گنجائش بہر حال موجود ہوتی ہے اسی لیے آخر موضوع سے متعلقہ سفارشات وتجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ ''گر قبول افتدز ہے عزّ وشرف''
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ابتدائی تصنیفی کاوش کو شرف قبولیت عطا فرمائے (آمین)

کلماتِ تشکر

سب سے پہلے تو میں اپنے خالقِ حقیقی کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے ایک حساس اور عصری موضوع پر خامہ فرسائی کی توفیق بخشی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس حوالے سے اللہ رب العالمین کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کے بعد میں ان عظیم ہستیوں کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ان کا شکریہ ادا نہ کیا گیا تو گویا رب تعالیٰ کے شکریہ کا بھی حق ادا نہ ہو سکے گا کیونکہ رسولِ کائنات ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے:

"من لم يشكر الناس لم يشكر الله".

''جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کیا اس نے (درحقیقت) اللہ کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا۔''

جن عظیم ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا میرے لیے فرض ہے ان سے اوّلاً میری مراد میرے ایم فل علوم اسلامیہ کے مقالہ کے نگران استاد محترم ڈاکٹر محفوظ احمد (ایسوسی ایٹ پروفیسر، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد) ہیں جن کی علمی وفکری خصوصاً فنی وتکنیکی رہنمائی مقالہ تحریر کرنے کے دوران لحہ بہ لحہ میرے شاملِ حال رہی اور یہ علمی موضوع کا حامل تحقیقی مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اسی طرح میں انتہائی زیادہ شکر گزار ہوں استاد محترم ڈاکٹر مدثر احمد (سابق چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد) کا جن کی بے پناہ شفقتوں اور عنایتوں سے میں ہمیشہ زیرِ بار رہوں گا۔

میں مکمل احساس تشکر کے ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ بندہ نے گو علوم اسلامیہ کی تحصیل ملک کی معروف علمی ودینی درسگاہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے کی مگر فن تصنیف وتالیف کے اصول وضوابط اور اس کے جدید فنی وتکنیکی تقاضوں سے جس علمی شخصیت نے ہمیں روشناس کرایا ان کا اسم گرامی ہے ڈاکٹر حامد رضا اسسٹنٹ پروفیسر جی سی یونیورسٹی فیصل آباد۔ بندہ اپنے استاد محترم کا تہہ دل سے شکر گزار ہے۔

نیز میرے شکریہ کے لائق جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے وہ میرے تمام اساتذہ کرام ہیں جن سے

میں بالخصوص فقہ واصول فقہ کا درس ایک عرصہ تک لیتا رہا جس کے نتیجہ میں ہی میرے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ میں خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج ان کے اجتہادات کی روشنی میں متعین کرسکوں۔ خصوصاً میرے شکریہ کے لائق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ مولانا عبدالعزیز علوی اوراستاد محترم مفتی جامعہ سلفیہ عبدالحنان زاہد حفظہما اللہ ہیں جنہوں نے میرے مقالہ کے مسودہ کو پڑھ سن کر قدم بہ قدم میری علمی وفکری رہنمائی کی۔ اور میرے لیے لائق صد شکریہ ہیں جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے پرنسپل چودھری محمد یسین ظفر جنہوں نے میری تدریسی ذمہ داری کم کر کے مجھے ریسرچ کے لیے فرصت کے لمحات فراہم کیے۔

اسی طرح میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا ماہنامہ محدث کے مدیر اعلیٰ حافظ عبدالرحمٰن مدنی آف لاہور کا جنہوں نے میرے لیے کئی عقدے حل کر دیے اور اس مشکل موضوع پر لکھنا میرے لیے آسان بنادیا۔

انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر میں جی سی یونیورسٹی لائبریری فیصل آباد، جامعہ سلفیہ لائبریری فیصل آباد، محدث لائبریری لاہور، قرآن اکیڈمی لائبریری لاہور، دار الدعوۃ السلفیہ لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے لائبریرین حضرات و منتظمین اور المورد لاہور کے ٹیچر ساجد حمید کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے نہایت فراخ دلی سے استفادہ کے مواقع فراہم کیے۔

حق تشکر ادا نہیں ہو سکتا جب تک ان مصنفین کا تذکرہ خیر نہ کیا جائے جنہوں نے زیر تحقیق موضوع سے متعلقہ اپنی تصنیفی یادگاریں چھوڑیں اور میرے لیے رہنمائی کا سامان فراہم کیا۔ (فجزاھم اللہ خیر الجزاء)

اور اب میں ان عظیم ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جن کا شکریہ کما حقہ ادا ہو ہی نہیں سکتا اور یہ وہ ہستیاں ہیں جن کا شکریہ ادا کرنے کا حکم اللہ رب العالمین نے بذات خود بایں الفاظ دیا ہے ''اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ'' (سورۃ لقمن: ۳۱:۱۴)۔ (میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی) میری مراد میرے بوڑھے والدین ہیں جنہوں نے لرزتے اور کپکپاتے ہاتھوں سے میرے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعائیں کیں اور میرے لیے ان دعاؤں کی برکت سے ہی اس مشکل گھاٹی کو عبور کرنا ممکن ہوسکا۔

اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں مقام رفیع عطا فرمائے پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ کو جنھوں نے اپنے استاذ محترم شیخ الحدیث حافظ عبدالعزیز علوی حفظہ اللہ کی اس مقالہ کی اشاعت کے لیے بھرپور سفارش اور تلقین کو اہمیت دیتے ہوئے اپنے صاحبزادگان کو حکم اشاعت فرمایا۔ راقم الحروف اس مقالہ کے ناشر محترم جناب رفیع الدین حجازی کا تہہ دل سے شکر گزار ہے کہ جنھوں نے اپنے والد مرحوم کے اس حکم کو وصیت سمجھتے ہوئے اس مقالہ کی اشاعت میں

بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجہ میں ہی بندۂ ناچیز کی یہ کاوش قارئین تک پہنچ سکی۔

آخر پر میں ممنون ہوں حافظ محمد سلیمان، ثمامہ رحمٰن، محمود فرید اور اپنے بھائی عبد الحفیظ کا جنہوں نے اس مقالہ کی کمپوزنگ کی ذمہ داری بخوبی نبھائی۔

کلمات تشکر کا اختتام بھی اللہ رب العزت کے شکریہ کے ساتھ کیا جاتا ہے کیونکہ اسی کی توفیق سے اپنے محسنین و معاونین کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق ملی ہے۔ و الحمد لله علی ذلک۔

حافظ شعیب احمد

فاضل علوم اسلامیہ و لیکچرار اسلامیات، گورنمنٹ کالج جڑانوالہ

باب اول:

اسلام اور اجتہاد

فصل اول:

تعارف اجتہاد

اجتہاد کا لغوی معنی ومفہوم:

کلمۂ اجتہاد ''افتعال'' کے وزن پر ہے جس کا مادہ (ج ھ د) ہے۔ ''الجَهد'' کا معنی مشقت اور ''الجُهد'' کا معنی طاقت ہے[۱] اور کلمہ اجتہاد کا لغوی معنی ہے ''بذل الوسع والمجهود'' [۲] (اپنی پوری طاقت اور محنت صرف کرنا)۔ گویا عربی میں اجتہاد کا لفظ اسی جدو جہد کے لیے مستعمل ہے جس میں محنت شاقہ ہو لہٰذا ''اجتهد فی حمل الرحاء'' (چکی کا پاٹ اٹھانے کی کوشش کی) کہنا تو صحیح ہے مگر ''اجتهد فی حمل خردلة'' (رائی کا دانہ اٹھانے کی کوشش کی) کہنا قطعاً درست نہ ہوگا [۳] کیونکہ اس میں کلفت ومشقت ہی نہیں۔

کسی عربی کلمہ کا لغوی معنی ومفہوم متعین کرنے کے لیے عربی زبان میں بالعموم اور قرآن وحدیث میں بالخصوص اس کے استعمالات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ذیل میں اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ قرآن وحدیث میں کلمہ "اجتہاد" کا استعمال کن معانی کے لیے ہوا ہے۔

قرآن وحدیث میں لفظ اجتہاد کا استعمال:

قرآنِ مجید میں لفظ ''اجتہاد'' کا استعمال تو نہیں ہوا البتہ اس کے مادہ (ج ھ د) کا استعمال ہوا ہے۔ ''جَهد'' کلمہ فتحہ کے ساتھ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر آیا ہے اور ان تمام مقامات پر اس کی نسبت ''ایمان'' یعنی قسموں کی طرف ہی کی گئی ہے۔ مثلاً

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾[۴]

''اور یہ لوگ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔''

اور ان پانچوں مقامات پر یہ مبالغہ کی حد تک قسم اٹھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے [۵] اور

"جُهد" کلمہ ضمہ کے ساتھ قرآن مجید میں صرف ایک بار وارد ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے فرماتے ہیں:

﴿ وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ ﴾[٦]

''اور وہ خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے مگر اپنی طاقت کے مطابق خرچ کر دیتے ہیں۔''

امام بیضاوی رحمہ اللہ (م٦٨٦ھ) لکھتے ہیں کہ اس آیت میں ''جُهدهم'' کا معنی ہے ''طاقتھم''[٧]

البتہ اسی مادہ سے مگر باب ''مفاعلہ'' سے ''جاھد'' کے مشتقات ماضی، مضارع، امر، اسم فاعل اور اس کے مصدر ''جہاد'' کا استعمال قرآن مجید میں پینتیس بار ہوا ہے۔[٨] کلمہ ''جہاد'' کی وضاحت میں امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ (م٥٠٦ھ) لکھتے ہیں کہ جہاد و مجاہدہ دشمن کا مقابلہ کرنے اور مدافعت میں اپنی انتہائی طاقت و وسعت خرچ کرنے کا نام ہے۔[٩]

البتہ احادیث میں کلمہ ''جَهد'' اور ''جُهد'' بکثرت وارد ہوا ہے۔ مثلاً حدیثِ صدقہ میں جیم کے ضمہ کے ساتھ آیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا ''ای الصدقة افضل'' (کون سا صدقہ افضل ہے؟) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جُهد المقل'' [١٠] یعنی قلیل المال شخص کا اپنی حالت (طاقت) کے بقدر خرچ کرنا۔[١١] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف چیزوں سے اللہ کے حضور پناہ مانگی ہے چنانچہ حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''کان یتعوذ من سوء القضاء و من درک الشقاء و من شماتة الاعداء و من جَهد البلاء''[١٢]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم بری تقدیر، بدبختی کے آ لینے اور تکلیف آنے پر دشمن کے خوش ہونے اور آزمائش کی مشقت سے پناہ مانگا کرتے تھے۔''

یہاں ''جَهد'' کلمہ فتح کے ساتھ وارد ہے جس سے مراد ہے۔

'' الحالة الشاقة التی تأتی علی الرجل یختار علیها الموت'' [١٣]

''جہد سے مراد وہ پُر مشقت حالت ہے جس کی آمد پر انسان موت کو ترجیح دیتا ہے۔''

حدیثِ غسل میں ''جَهد'' کا استعمال بایں الفاظ ہوا ہے۔

''اذا جلس بین شعبها الاربع ثم جهده'' [١٤]

''جب آدمی اپنی عورت کی چاروں شاخوں کے درمیان بیٹھا اور اس نے (جماع کے لیے) اپنی کوشش کی۔''

اس کی تشریح میں حافظ ابن اثیر رحمہ اللہ (م ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص محنت و کوشش کرے اور مبالغہ کی حد تک کرے تو عربی میں ''جهد الرجل فی الامر'' کہا جاتا ہے۔[۱۵]

اسی طرح احادیث میں ''جہاد'' کا لفظ بھی بکثرت استعمال ہوا ہے جیسے نبی ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

'' لاهجرة بعد الفتح ولكن جهاد ونية''[۱۶]

''فتح مکہ کے بعد اب مکہ سے ہجرت کا موقع کبھی نہ آئے گا البتہ جہاد جاری رہے گا اور (اعمال صالحہ کی) نیت کا ثواب ضرور ملے گا۔''

اور ''جہاد'' سے مراد ہے:

'' محاربة الاعداء وهو المبالغة واستفراغ ما فی الوسع والطاقة من قول او فعل''[۱۷]

''دشمن سے مقابلہ و جنگ کرنا اور اس کے لیے آخری حد تک قولاً وفعلاً اپنی ہمت و طاقت صرف کرنا۔''

اور اب احادیث میں خصوصاً ''اجتہاد'' کے استعمالات ملاحظہ ہوں۔

یمن جاتے ہوئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ اگر انہیں کسی مسئلہ میں قرآن و حدیث سے رہنمائی حاصل نہ ہو سکی تو وہ اجتہاد کریں گے چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں ''اجتهد رأي''[۱۸] ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے سجدہ میں خصوصی طور پر دعا کرنے کی تلقین بایں الفاظ کی ہے:

''واما السجود فاجتهدوا فی الدعاء فقمن ان يستجاب لكم''[۱۹]

''رہے سجود تو ان میں دعا بڑی جدوجہد اور کوشش کے ساتھ کرو کیونکہ اس کے قبول ہونے کی بہت زیادہ امید ہے۔''

ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں رسول اللہ ﷺ کی محنت و کوشش بارے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجتهد فی العشر الأواخر مالا يجتهد فی غيرها''[۲۰]

''رسول اللہ ﷺ (رمضان المبارک کے) آخری عشرہ میں جس قدر محنت اور کوشش (اعمال صالحہ کے لیے) کرتے تھے، اتنی محنت باقی عشروں میں نہ کرتے تھے۔''

حافظ بن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ''اجتہاد'' کا معنی ہے ''بذل الوسع فی طلب الامر'' (کسی چیز کی تلاش میں طاقت صرف کرنا) نیز اس کلمہ ''اجتہاد'' کا مادہ ''جہد'' بمعنی طاقت ہے۔ اور یہ باب افتعال سے ہے۔[۲۱]

مذکورہ بالا آیات وحدیث میں (ج ھ د) اور اس کے مشتقات کے استعمالات میں مبالغہ کی حد تک کوشش اور جد وجہد کا مفہوم سامنے آتا ہے۔ لہٰذا کلمہ ''اجتہاد'' بھی کسی معمولی نوعیت کی محنت و کاوش کا متقاضی و متحمل نہیں بلکہ یہ بھی انتہا درجہ کی محنت اور کوشش کرنے کا تقاضا کرتا ہے جس طرح کہ کئی ایک علماء لغت نے بھی صراحت کی ہے۔

کلمہ ''اجتہاد'' کے لغوی معنی و مفہوم کے متعین ہو جانے کے بعد علماء اصول فقہ کے یہاں اس کا اصطلاحی مفہوم حسب ذیل ہے۔

اصطلاحی مفہوم:

علماء اصول فقہ نے اجتہاد کے لغوی معنی و مفہوم کو شامل کرتے ہوئے اس کی اصطلاحی تعریف میں مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں چند ایک کا ذکر حسب ذیل ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ (م ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں:

" بذل المجتهد وسعه فی طلب العلم بأحكام شرعية و الاجتهاد التام ان يبذل الوسع فی الطلب بحيث يحس من نفسه بالعجز عن مزيد الطلب "[۲۲]

''(اجتہاد نام ہے) احکام شرعیہ جاننے کی طلب میں مجتہد کا اپنی تمام تر قوت و طاقت کے صرف کرنے کا۔ اور اجتہاد تام کا مطلب یہ ہے کہ اس (مجتہد) کا طلب احکام میں اس حد تک طاقت و کوشش صرف کرنا کہ اس سے مزید محنت و کوشش سے نفس عاجز ہو۔''

امام سیف الدین آمدی رحمہ اللہ (م ۶۳۱ھ) لکھتے ہیں کہ اصولیوں کی اصطلاح میں اجتہاد سے مراد ہے:

"الاجتهاد استفراغ الوسع فی طلب الظن بشیٔ من الاحکام الشرعیة علی وجه یحس من النفس با لعجز عن المزید فیه"[۲۳]

''اجتہاد نام ہے احکام شرعیہ کے جاننے کی طلب میں انتہائی حد تک اپنی کوشش بروئے کار لانے کا کہ نفس اس سے مزید کوشش کرنے سے عاجز ہو۔''

امام بیضاوی رحمہ اللہ (م ۶۸۵ھ) اجتہاد کی تعریف میں لکھتے ہیں:

" استفراغ الجهد فی درک الاحکام الشرعیة" [۲۴]

''اجتہاد شرعی احکام معلوم کرنے کے لیے پوری محنت و کوشش صرف کرنے کو کہتے ہیں۔''

علامہ زرکشی رحمہ اللہ (م ۷۹۴ھ) لکھتے ہیں:

" بذل الوسع فی نیل حکم شرعی عملی بطریق الاستنباط"[۲۵]

''استنباط کے طریقے سے شرعی عملی حکم کے حصول کے لیے طاقت و محنت صرف کرنے کا نام اجتہاد ہے۔''

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں کہ علماء کے کلام سے حقیقتِ اجتہاد جو سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ

" استفراغ الجهد فی ادراک الاحکام الشرعیة الفرعیة عن ادلتها التفصیلیة الراجعة کلیاتها الی اربعة اقسام الکتاب والسنة والاجماع والقیاس"[۲۶]

''شریعت کے فروعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل یعنی کتاب و سنت، اجماع اور قیاس سے سمجھنے کے لیے بھرپور کوشش کرنا۔''

مذکورہ بالا تعریفات کی روشنی میں چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

(i) اجتہاد کے لیے مجتہد کا ہونا ازبس ضروری ہے لہٰذا جس شخص میں اجتہادی صلاحیت و اہلیت ہی نہیں، اس کی جہد و کاوش غیر معتبر ہوگی، خواہ وہ کتنی ہی انتہائی کوشش کرے۔

(ii) حکمِ شرعی معلوم کرنے کے لیے انتہا درجہ کی کوشش کرنا ضروری ہے کہ مجتہد کو غالب گمان حاصل ہو جائے کہ یہ حکم ہی شریعت کا مقصود ہوگا۔

(iii) اجتہادی کوشش کسی شرعی حکم کے ادراک میں ہونی چاہیے لہٰذا غیر شرعی حکم کی تلاش و جستجو کرنا اجتہاد نہ ہوگا اگرچہ کتنی ہی محنت و مشقت کیوں نہ برداشت کر لی جائے مثلاً کسی حکم کا محض

لغت یا طبعی علوم وغیرہ سے تعلق ہو تو اس حکم کی تلاش کے لیے کی گئی محنت اجتہاد نہ ہوگی نیز شرعی حکم کا معلوم ہونا گویا مدفون خزانے کا دریافت ہونا ہے لہٰذا حکم شرعی ظاہر ہونے پر بغیر کسی آلودگی و ملاوٹ کے اصل حالت میں ہی اسے لوگوں تک پہنچایا جائے ایسا نہ ہو کہ کسی غیر اسلامی فکر کو اجتہاد کے لبادے میں لپیٹ کر ملمع کاری کر کے پیش کر دیا جائے۔

(iv) اجتہاد شریعت کے عملی احکام میں ہوتا ہے لہٰذا محض کسی عقلی، شرعی علمی، لغوی اور حسی مسئلہ کے حکم کے معلوم کرنے کی کوشش ''اجتہاد'' نہ ہوگی اسی لیے عقائد سے متعلقہ حکم کے ادراک کی کوشش اجتہاد نہ ہوگی اگرچہ متکلمین کے یہاں ایسی کوشش بھی اجتہاد ہے۔[۲۷]

(v) اجتہاد استنباط کے طریقے سے ہونا چاہیے یعنی دلائل پر غور وفکر کے بعد حکم شرعی معلوم کیا گیا ہو گویا عملِ اجتہاد ''اجتہاد'' کے اصول وضوابط کے بغیر آزادانہ رائے دینے کا نام نہیں۔

(vi) حکم شرعی معلوم کرنے کے لیے ادلہ اربعہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

''اجتہاد'' کی مذکورہ بالا تعریفات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایک مشکل ترین اور کٹھن کام ہے چنانچہ اجتہاد کی وادی میں کیوں کر قدم رکھا جائے اس کے لیے فضیلتِ اجتہاد بارے علم ہونا انتہائی ناگزیر ہے جو حسب ذیل ہے:

فضیلتِ اجتہاد:

مشہور حدیثِ رسول ﷺ:

"اذا حکم الحاکم فاجتہد ثم اصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتہد ثم اخطأ فلہ اجر"[۲۸]

''فیصلہ کرنے والا جب اجتہاد کرتے ہوئے فیصلہ کرے اور درست رائے تک پہنچ جائے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور اگر اجتہاد میں خطا کر بیٹھے تو بھی اس کے لیے اکہرا اجر ہے۔''

میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کی نبی ﷺ نے دو قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) صواب (درست) (۲) غیر صواب (نادرست)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے مجتہد مصیب کے لیے دہرے اجر اور غیر مصیب مجتہد کے لیے اکہرے اجر کی بشارت دی ہے حالانکہ انسان اکثر طور پر خطا کرے تو یا تو اللہ کی سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے یا پھر اسے معاف کر دیا جاتا ہے، مگر اجتہادی غلطی وہ غلطی ہے، بشرطیکہ اصول وقواعدِ اجتہاد کو ملحوظ

رکھنے کے باوجود ہوئی ہو، کہ جس پر نہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کا اعلان ہے بلکہ مستحقِ اجر ہونے کی اللہ کی طرف سے نوید جانفزا بھی ہے [۲۹] یہ حدیث ہی وہ محرک ہے جو مجتہدین کو اجتہاد پر اُبھارتی ہے گویا یہ حدیث مجتہدین کے لیے ایک مہمیز کا کام دیتی ہے وگرنہ شاید علمائے کرام اجتہاد ایسی مشکل و کٹھن وادی میں کبھی قدم نہ رکھتے کہ جس میں قدم قدم پر پھسلنے کے بہر حال امکانات موجود ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خطا کرنے کے باوجود مجتہدین کے لیے اللہ کی طرف سے ثواب کا وعدہ ایک بہت بڑا انعام الٰہی ہے جس سے صرف اور صرف مجتہدین حضرات ہی بہرہ ور ہوسکیں گے۔

مذکورہ بالا حدیث میں جہاں اجتہاد کی ترغیب وتحریض اور تشویق ہے وہاں مجتہدین کی فضیلت اور مقام ومرتبہ بھی عیاں ہوتا ہے۔ مجتہدین امت کا وہ طبقہ ہیں جو قرآن وحدیث میں غوطہ زن ہوکر شریعت کے نبض شناس بن کر اس کے مزاج کو سمجھتے ہوئے امت کو درپیش مسائل کا حل پیش کرتے ہیں، اگر وہ اللہ کے پسندیدہ فیصلہ کو پا لیتے ہیں تو ''من دل علی خیر فله مثل اجر فاعله'' [۳۰] (جس نے کسی کو نیکی کی راہ بتلائی تو اسے بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس کے بتانے پر عمل کرنے والے کو ملے گا)۔ کے مصداق ٹھہرتے ہیں اور اگر ان کا فیصلہ اللہ کی پسند ورضا کے مطابق نہ بھی ہو تو بھی وہ اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ وہ امت کی خیر خواہی کرتے ہوئے اجتہاد کرتے ہیں اور اجتہاد حقیقت میں ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے مجتہدین عوام الناس کی گویا خدمت کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ﴾ [۳۱]

''اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔''

نیز رسول اللہ ﷺ کا بھی فرمان گرامی ہے:

'' خیر الناس من ینفع الناس'' [۳۲]

''لوگوں میں سے بہترین شخص وہ ہے جو ان کے لیے نفع رسانی کا باعث بنے۔''

لہٰذا مجتہدین اس لحاظ سے بھی ''خیر الناس'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذکورہ بالا مشہور حدیث کے مطابق مجتہد مصیب کو دہرا اجر اور مجتہد کو غیر مصیب ہونے پر اکہرے اجر کی بارگاہ نبوت سے نوید ہے [۳۳] مگر مسند احمد کی ایک دوسری روایت کے مطابق مجتہد مصیب کو دس گنا اجر اور خطا ہونے پر مجتہد کے لیے اکہرا یا دوہرا اجر ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

''اذا قضی القاضی فاجتهد فاصاب فله عشرة اجور واذا اجتهد فاخطأ کان له اجر او اجران'' [۳۴]

''جب قاضی اپنے فیصلے میں اجتہاد کرتے ہوئے درست رائے کو پہنچ جائے تو اس کے لیے دس گنا اجر ہے اور اگر اس اجتہادی فیصلہ میں خطا کر بیٹھے تو بھی اس کے لیے اکہرا یا دوہرا اجر ہے۔''

ان دونوں حدیثوں میں بظاہر تعارض ہے لیکن یہ ظاہری تعارض یوں ختم ہو جاتا ہے کہ:

(i) ممکن ہے پہلے آپ ﷺ نے مجتہد مصیب کے لیے دہرے اجر اور غیر مصیب کے لیے اکہرے اجر کی نوید سنائی مگر بعد میں اللہ تعالیٰ نے مزید رحمت فرماتے ہوئے اس اجر و ثواب کو مزید بڑھا دیا تو نبی ﷺ نے حکم الٰہی کے مطابق امت کو بتا دیا کہ صحیح اجتہاد ہونے پر مجتہد کے لیے دس گنا اور اجتہاد میں خطا ہونے پر بھی مجتہد کے لیے اکہرا یا دہرا اجر ہے۔

(ii) پہلے آپ ﷺ نے مجتہد مصیب کے لیے دوہرا اجر بتایا ایک اس کی محنت کا اور دوسرا اس کی اصابتِ رائے کا مگر بعد میں آپ ﷺ نے غالباً ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [۳۵] (جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی)۔ کے اصول کے تحت مجتہد مصیب کے لیے دس گنا اجر کی نوید سنا دی کیونکہ اجتہاد کرنا بھی دین ہی کے لیے محنت و کوشش ہے اور یہ محنت و کوشش یقیناً ایک بہت ہی عظیم نیکی اور عبادت ہے۔[۳۶]

(iii) ان دو احادیث میں اجر و ثواب کا یہ تفاوت شاید عمل اجتہاد میں خلوص اور محنت کے تفاوت کے لحاظ سے ہے۔[۳۷]

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب شریعت نے یہ نوید سنائی ہے کہ کسی کو صحیح راستے پر لگانے والا بھی اتنا ہی اجر و ثواب حاصل کرتا رہتا ہے جتنا اس راستے پر چلنے والے کو ملتا ہے تو اس لحاظ سے بھی مجتہد کا اجر و ثواب بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور خطا ہو جانے پر اس پر گناہ نہیں بلکہ اجر و ثواب ہی کی نوید سنائی گئی ہے۔ بہر حال ان دو احادیث سے فضیلت اجتہاد عیاں ہوتی ہے کہ اجتہاد کا عمل بہر صورت اللہ کے ہاں اجر و ثواب پانے سے خالی نہیں لیکن یہ نوید اس شخص کے لیے ہے جو واقعۃً اجتہاد کرنے کا اہل ہو لیکن جو شخص نا اہل ہونے کے باوجود اجتہاد کی وادیٔ پر خار میں قدم رکھتا ہے تو وہ غلط فیصلہ کرنے پر گناہ گار ہے[۳۸] اور جتنے لوگ اس کی اجتہادی رائے کی وجہ سے گمراہ ہوں گے وہ نام نہاد مجتہد ان کا بھی ذمہ دار ہوگا[۳۹] ایسے ہی علماء مجتہدین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''ضلوا و اضلوا''.[۴۰]

فضیلت اجتہاد بارے بعض علماء کے اقوال:

(i) امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (م ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے
''الاجتهاد ركن عظيم فى الشريعة لاينكره منكر وعليه عول الصحابه بعد ان استا ثر الله برسوله وتابعهم عليه التابعون الى زماننا هذا''[۴۱]
''اجتہاد شریعت کا رکن عظیم ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فوت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین حتی کہ آج تک اہل علم کا اس پر اعتماد رہا۔''

(ii) اجتہاد چونکہ اپنی بساط کی حد تک حکم شرعی کی تلاش ہے اسی لیے امام شاطبی رحمہ اللہ (م ۷۹۰ھ) لکھتے ہیں کہ یہ گویا شارع کی نیابت کرنا ہے[۴۲] اور مجتہد کا شارع کا نائب بن کر حکم شرعی تلاش کرنا یقیناً ایک بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔

(iii) مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ (م ۱۹۸۷ء) رقم طراز ہیں ''اجتہاد نبوت ہی کا ایک حصہ ہے اور اس کے ڈانڈے نبوت کے فرازوں سے ملے ہوئے ہیں''[۴۳] حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد کی بدولت شریعت جامد نہیں بلکہ متحرک نظر آتی ہے[۴۴] تو شریعت کو متحرک رکھنے والے مجتہدین یقیناً قابل تحسین ہیں۔
بقول شاعر

یہ رتبہ بلند ملا جسے مل گیا　　　ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

فضیلت اجتہاد جان لینے کے بعد کیا ہر کس و ناکس اجتہاد کرنے بیٹھ جائے یا اس کی خاص اہلیت کے حصول کے لیے چند شرائط و قیود کا التزام ضروری ہے؟ اس قدر اہم اور حساس کام کے لیے یقیناً چند شرائط کی پابندی ضروری ٹھہرتی ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

شرائط اجتہاد:

گزشتہ بحث سے معلوم ہو چکا ہے کہ مجتہد شارع کا نائب بن کر حکم شرعی تلاش کرتا ہے تو شارع کی نیابت کا منصب جہاں فضیلت و مرتبہ کا منصب ہے وہاں ایک انتہائی ذمہ داری کا بھی احساس دلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد ایک نہایت مشکل، حساس اور کٹھن کام ہے اور اس سلسلہ میں ذرا سی بھی غفلت و کوتاہی سے انسان نہ صرف خود گنہگار ہوگا بلکہ دوسروں کے گناہ بھی اپنے سر لے

گا اسی لیے علمائے کرام نے میدان اجتہاد میں وارد ہونے کے لیے چند شرائط متعین کی ہیں مبادا کہ ہر کس و ناکس اجتہاد کرنے بیٹھ جائے اور نتیجۃً نا اہلی کی بنا پر امت کے لیے گمراہی کا باعث بن جائے۔

ایک مجتہد میں ''شروط اجتہاد'' پائے جانے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ہر کس و ناکس مریضوں کا علاج نہیں کر سکتا بلکہ ایک طبیب و ڈاکٹر کو تعلیمی و تجرباتی مراحل طے کرنے کے بعد حکومت وقت کی طرف سے مقرر کردہ میڈیکل بورڈ علاج معالجے کی اجازت دیتا ہے۔ بغیر تعلیم و تجربہ کے علاج سے لوگوں کی جان کو خطرہ ہے اور اگر بغیر اہلیت کے کوئی شخص اجتہاد کرنے بیٹھ جائے تو اس سے تو بسا اوقات لوگون کی جان مال اور ایمان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس بات کی وضاحت میں ایک واقعہ ذکر کرنا نہایت مناسب ہوگا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (م ۲۱ھ) نے بنو جذیمہ قبیلہ کو دعوتِ اسلام دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ مگر انہوں نے ''اسلمنا'' کی بجائے ''صبأنا صبأنا'' (ہم صابی ہوئے، صابی ہوئے) کہا۔ جس پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں قتل کر دیا۔ یہ واقعہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک اٹھا کر دو مرتبہ فرمایا:

'' اللهم انی ابرأ الیک مما صنع خالد''[۴۵]

''اے اللہ خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے بری (اور بیزار) ہوں۔''

اس واقعہ سے بخوبی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اجتہاد کی اجازت ہر کہ و مہ کو نہیں دی جا سکتی بلکہ اس کے لیے ضروری صلاحیت و اہلیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اجتہاد پر کسی مخصوص گروہ، جماعت یا افراد کی اجارہ داری ہے بلکہ جو بھی اپنے اندر اجتہاد کی صلاحیت پا لیتا ہے اسے اجتہاد کی نہ صرف اجازت ہوگی بلکہ بسا اوقات اس کے لیے اجتہاد کرنا فرض و لازم بھی ہو سکتا ہے۔[۴۶]

ذیل میں قدرے تفصیل کے ساتھ ان شرائط کا ذکر کیا جاتا ہے جو علماء و فقہاء نے ممکن حد تک درست رائے کو پانے کے لیے بطور وسیلہ مقرر کر دی ہیں۔ ان شرائط کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کسبی شرائط: یعنی جن کا تعلق ذاتی کسب و محنت کے ساتھ ہے وہ درج ذیل ہیں۔

i- قرآن مجید کا علم۔ ii- سنت رسول کا علم۔

iii- عربی زبان اور اس کے متعلقات کا علم و مہارت iv- سابقہ فقہاء کے اجماعی و اجتہادی مسائل کا علم۔

v- مقاصد و مصالح شریعت و علل احکام کا علم vi- اصول فقہ کا علم

vii- فقہی اصول و کلیات کا علم۔

viii۔ جدید علوم وطرز زندگی نیز مروجہ یعنی عرفِ حاضر کا علم

(۲) وہبی شرائط: یعنی جو خالص اللہ کی عطا کردہ ہیں اور ان میں انسان کے کسب کا کوئی خاص دخل نہیں ہوتا۔ یہ صرف ایک ہی ہے یعنی ''غیر معمولی ذہنی وعقلی صلاحیت''۔

(۳) قبولیت اجتہاد کے لیے شرائط: یعنی جو کسی مجتہد کے اجتہاد کے قبول عام کا درجہ پانے کے لیے ضروری ہیں اگرچہ وہ عمل اجتہاد کے لیے لازمی شرط کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ درج ذیل ہیں:۔

i۔ ایمان　　ii۔ عقل وبلوغت　　iii۔ عدالت وتقویٰ

مذکورہ بالا شرائط کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

قرآن مجید کا علم:

اجتہاد کا پہلا ماخذ قرآن مجید ہے لہٰذا ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ بالعموم قرآن مجید اور علوم قرآن سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرے۔ تاہم بالخصوص آیاتِ احکام کی تفصیلی معرفت حاصل کرے [۴۷] آیات احکام کی تعداد تقریباً پانچ سو ہے [۴۸] امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ (م۱۸۱ھ) کے بارے منقول ہے کہ انھوں نے آیات احکام کی تعداد نو سو بتائی ہے [۴۹] جبکہ ایک دوسرا نظریہ یہ ہے کہ مجتہد کی مکمل قرآن مجید پر دسترس ہونی چاہیے کیونکہ قرآن مجید میں شاید ہی کوئی آیت ہو جس سے کوئی حکم مستنبط نہ ہوتا ہو چنانچہ اس بارے امام طوفی رحمہ اللہ (م۷۱۶ھ) لکھتے ہیں:

> "ان احكام الشرع كما تستنبط من الاوامر والنواهي كذلك تستنبط من الاقاصيص والمواعظ ونحوها" [۵۰]
>
> ''احکام شریعت جس طرح اوامر ونواہی سے مستنبط کیے جاتے ہیں اسی طرح قصص اور وعظ ونصیحت کی آیات سے بھی ان کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔''

یہ ایک حقیقتِ واقعہ ہے کہ مدبر وفہیم شخص آیاتِ قصص وامثال سے بھی استنباط حکم کر لیتا ہے۔ [۵۱]

مجتہد اگر حافظِ قرآن ہو تو بہت اچھی بات ہے مگر یہ اجتہاد کے لیے شرط نہیں لہٰذا مجتہد کا حافظ قرآن ہونا ضروری نہیں بلکہ ضروری یہ ہے کہ زیر غور مسئلہ سے متعلقہ تمام آیات تک اس کی رسائی ہو سکتی ہو [۵۲] اگرچہ بعض علماء نے کم از کم آیات احکام کے حفظ کو ضروری قرار دیا ہے [۵۳] علوم قرآن میں سے خصوصاً جن علوم سے آگہی ضروری ہے ان میں آیات کی شان نزول، ناسخ ومنسوخ، مکی و

مدنی وغیرہ کا علم ہے۔[۵۴] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چونکہ قرآن مجید کا فہم براہ راست رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا جسے انہوں نے آگے اپنے شاگردوں یعنی تابعین تک منتقل کیا ہے لہٰذا فہمِ قرآن کے لیے اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ سے استفادہ بھی ضروری ہے۔[۵۵]

قرآن مجید سے متعلقہ ان علوم سے آگاہی سے آیات کے معانی و مراد اور موقع و محل متعین کرنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے۔[۵٦]

سنتِ رسول ﷺ کا علم:

جس طرح قرآن مجید حجت ہے اسی طرح حدیث وسنتِ مصطفیٰ ﷺ بھی حجت ہے لہٰذا ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ بالعموم تمام احادیث اور بالخصوص احادیثِ احکام بارے رسائی حاصل کرے۔[۵۷] احادیثِ احکام کی تعداد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے پانچ سو کہا ہے[۵۸] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (م ۲۴۱ھ) کا موقف ہے کہ ان کی تعداد بارہ سو ہے۔[۵۹] اور ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ مجتہد و مفتی کو چار لاکھ احادیث یاد ہوں تو امید ہے کہ یہ اس کے لیے کافی ہو جائیں گی۔[٦۰] آپ رحمہ اللہ کے اس قول بارے بعض علماء کا خیال ہے کہ شاید اس سے آپ کی مراد ''اکمل الفقهاء'' شخص ہو[٦۱] یا اسے فتویٰ واجتہاد میں احتیاط کرنے پر محمول کیا جائے گا۔[٦۲] اور امام غزالی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''ان كانت زائدة على الوف فهي محصورة'[٦۳]

''اگرچہ وہ کئی ہزار ہیں پھر بھی محدود ہیں۔''

لیکن امام ابن قیم رحمہ اللہ (م ۷۵۱ھ) کا موقف ہے:

''ان اصول الاحاديث التى تدور عليها الاحكام خمس مائة و هي مفصلة في نحو اربعة آلاف حديث''[٦۴]

''بے شک وہ اصولی احادیث جن پر احکام کا دارومدار ہے پانچ سو ہیں لیکن ان کی تفصیلات چار ہزار احادیث میں پھیلی ہوئی ہیں۔''

جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ (م ۱۲۵۵ھ) کہتے ہیں کہ

''ان الاحاديث التى تؤخذ منها الاحكام الشرعية الوف مؤلفة''.[٦۵]

''وہ احادیث جن سے احکام شریعت کو اخذ کیا جاتا ہے، کئی ہزار ہیں۔''

صحیح بات یہ ہے کہ احادیث احکام کی تعداد متعین کرنے کے لیے مزید محنت و وقت اور غور و خوض کی ضرورت ہے۔ احادیث احکام کی تعداد متعین کرنا یوں بھی ایک مشکل امر ہے اس لیے کہ ایک ہی حدیث مختلف اسناد و الفاظ کے ساتھ مروی ہوتی ہے اور اگر وہ ایک جگہ مختصر ہے تو دوسری جگہ تفصیل کے ساتھ ہے، شاید اسی لیے بعض محققین اصولیوں نے احادیث احکام کی تعداد کو متعین و محصور کرنے کی بجائے اجمالاً احکام سے متعلقہ احادیث کی معرفت کی شرط لگائی ہے[۶۶] بالخصوص عصرِ حاضر میں تو جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دستیابی کی وجہ سے انسب یہی ہے کہ زیر بحث مسئلہ سے متعلقہ قرآن مجید اور احادیث کی تمام نصوص سے آگاہی حاصل کی جائے[۶۷] تاہم مجتہد کے لیے تمام احادیث کا حتیٰ کہ احادیثِ احکام کا بھی حافظ ہونا ضروری نہیں ہے۔[۶۸]

سنت و حدیث رسول کے ساتھ علوم حدیث سے واقفیت بھی ضروری ہے جن میں احوالِ رجال اور ان کے بارے علماء جرح و تعدیل کے فیصلے، احادیث کی شان ورود، صحیح و ضعیف حدیث کی پہچان، علم مختلف الحدیث، روایت و درایت کے اصول، ناسخ و منسوخ احادیث کی معرفت وغیرہ شامل ہیں۔ مگر ان علوم میں بھی درجہ اجتہاد کو پہنچنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس بارے مجتہد دیگر علماء کی کاوشوں سے مستفید ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امام شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لا یلزم ان یکون المجتهد مجتهدا فی کل علم یتعلق به الاجتهاد. [۶۹]

"مجتہد کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اجتہاد سے متعلقہ تمام علوم میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہو۔"

اگر مجتہد کے لیے ان علوم میں بھی مہارت کو ضروری قرار دے دیا جائے تو اس سے کئی دشواریاں پیدا ہوں گی چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"طال الامر و عسر الخطب فی هذا الزمان مع کثرة الوسائط ولا یزال الامر یزداد شدة بتعاقب الاعصار". [۷۰]

"(اس طرح تو) معاملہ نہ صرف طوالت کا شکار ہوگا بلکہ دشواری کا باعث بھی بنے گا حالانکہ اس دور میں تو وسائل (تحقیق) کی بھی بڑی کثرت ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس معاملہ کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔"

عصرِ حاضر میں وہ کتب بہ آسانی دستیاب ہیں جن کے ذریعے کسی حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کا علم لمحوں میں حاصل کیا جا سکتا ہے تو اس سلسلہ میں دیگر علماء کی ان کاوشوں سے استفادہ ہی

کافی رہے گا، نئے سرے سے حدیث وراویانِ حدیث کی تحقیق کی ضرورت نہیں۔[۷۱]

قرآن وسنتِ رسول کی شرط کے حوالے سے ایک اہم بات یہ ہے کہ مجتہد عہد رسالت کے سماجی ومعاشرتی حالات وظروف اور رسوم ورواج سے بھی واقف ہو نیز اس بات سے بھی واقف ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور کے عرف اور رسوم ورواج کو کس حد تک قبول کیا۔[۷۲]

یاد رہے کہ اگر ''مجتہد فیہ'' مسئلہ بارے حدیث کی معرفت مجتہد کو نہ ہو سکے تو یہ چیز اجتہاد سے مانع نہیں بن سکتی بلکہ وہ دیگر ادلہ شرعیہ کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کرلے گا جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیث معلوم نہ ہونے پر اجتہاد کیا اور پیش آمدہ مسئلہ کا حل اپنی دانست کے مطابق کیا مگر جب بعد میں متعلقہ حدیث گرتو موافقت میں ملی تو فبہا لیکن اگر حدیث و اجتہاد کے درمیان موافقت نہ تھی تو فوراً اجتہاد سابق سے رجوع کرلیا جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک اجتہاد حدیث کے موافق ہوا تھا تو آپ رضی اللہ عنہ کو بہت خوشی ہوئی[۷۳] اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کے بعد حدیث مخالفِ اجتہاد ملی تو فوراً رجوع کرلیا۔[۷۴]

عربی زبان ومتعلقات کا علم ومہارت:

اجتہاد کے دو بنیادی مآخذ قرآن وسنت عربی زبان میں ہیں لہٰذا لامحالہ قرآن وسنت کے صحیح فہم کے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان اور اس کے متعلقہ علوم لسانی کو نہ صرف سیکھا جائے بلکہ مہارت پیدا کی جائے[۷۵] فقہائے کرام کے یہاں معروف قاعدہ ہے:

''ما لا یتم الواجب الا به فهو واجب''[۷۶]

''جس چیز کے بغیر فرض کی تکمیل نہ ہوتی ہو تو وہ چیز بھی فرض کے درجہ میں ہو جاتی ہے۔''

لہٰذا چونکہ عربی زبان سیکھے بغیر قرآن وسنت کی نصوص کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں تو عربی زبان کا سیکھنا مجتہد کے لیے لازمی ہوا محض قرآن وسنت کے تراجم کو سامنے رکھ کر اجتہاد کرنا اپنے آپ کو بھی اور امت کو بھی ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ (م۲۰۴ھ) فرماتے ہیں:

'' و کان بخطئه غیر معذور اذا نطق فیما لا یحیط علمه بالفرق بین الصواب و الخطاء فیه ''[۷۷]

''غلطی کرنے پر اسے معذور نہ سمجھا جائے گا کیونکہ اس نے ایسے موضوع پر

گفتگو کی جسارت کی ہے جس کے صحیح اور غلط کے درمیان فرق کرنے کی اسے عملی صلاحیت ہی حاصل نہ تھی۔"

مجتہد کو عربی زبان کا کس قدر علم ہونا چاہیے اس بارے امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عربی زبان کا اتنا علم مجتہد کے لیے کافی ہے جس سے عربوں کے خطاب اور ان کے مستعمل محاوروں وغیرہ کو سمجھ سکے نیز کلام کے صریح ہونے ظاہر، مجمل، حقیقت ومجاز، خاص وعام، محکم ومتشابہ، مطلق ومقید، کلام اور اس کے مفہوم مخالف وغیرہ میں تمیز کر سکے [۷۸] مجتہد کے لیے عربی زبان سیکھنے کے حوالے سے یہ شرط قطعاً نہیں ہے کہ علم لغت میں خلیل نحوی رحمہ اللہ (م ۱۷۵ھ) اور مبرد (م ۲۸۵ھ) وکے درجے کی مہارت حاصل کرے اور جمیع لغت کا علم حاصل کرے اور کل علم نحو کی گہرائی میں اترے بلکہ اس قدر علوم لغت کا سیکھنا کافی ہے جو کتاب وسنت سے متعلقہ ہے اور جس کے ذریعے وہ مواقع خطاب اور مقاصد کے حقائق کا ادراک کر سکے [۷۹] تقریباً تمام اصولیوں کا یہی موقف ہے جن میں امام غزالی رحمہ اللہ، آمدی رحمہ اللہ ، سبکی رحمہ اللہ (م ۷۷۴ھ)، عبد العزیز البخاری رحمہ اللہ (م ۷۰۴ھ) وغیرہ شامل ہیں [۸۰] صرف امام شاطبی رحمہ اللہ کا یہ موقف ہے کہ مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عربیت میں ائمہ لغت جیسے خلیل رحمہ اللہ (م ۱۷۵ھ)، سیبویہ رحمہ اللہ (م ۱۸۰ھ)، الاخفش رحمہ اللہ (م ۱۷۷ھ) اور مازنی رحمہ اللہ (م ۲۴۹ھ) وغیرہ کے درجہ کو پہنچے۔[۸۱]

سابقہ فقہاء کے اجماعی واجتہادی مسائل کا علم اور معاصر فقہی ذخیرہ سے استفادہ:

جدید کے لیے قدیم کی ضرورت بہر حال رہا کرتی ہے لہٰذا اجتہاد کے لیے بھی سابقہ فقہی آراء سے استفادہ کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قدماء کے اسلوب اور ان کے اجتہادی فیصلوں سے استفادہ کرتے ہوئے جدید مسائل کے لیے اجتہاد بہت حد تک صواب ودرست ہو سکتا ہے۔ سابقہ فقہی ذخیرہ سے استفادہ کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے اجتہادات پر ہی نئے اجتہادات کی بنا ڈالی جائے بلکہ دراصل اس سے استفادہ سے مراد اس کا مطالعہ کرنا ہے تاکہ ذہن کو جلا ملے اور ذہن اجتہاد کے لیے تیار ہو سکے نیز استدلال کا ملکہ پیدا ہو سکے اور اجتہادی صلاحیت میں نکھار پیدا ہو سکے وگرنہ اجتہاد تو طے شدہ اصول وضوابط کے مطابق ہی کیا جائے گا اور نہ ہی سابقہ فقہی ذخیرہ سے استفادہ سے مراد تمام علماء ومجتہدین کے اجتہادی فیصلوں کو حفظ وازبر کرنا ہے بلکہ اصل مقصود ان کے اجتہادی

طریقہ کار و اسلوب کو ملحوظ رکھنا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ صرف کسی مخصوص طبقہ، جماعت یا مسلک کے مجتہدین کے فقہی فیصلہ جات کو ہی سامنے نہ رکھا جائے بلکہ تمام فقہاء کرام امت کے مشترکہ فقہاء ہیں اور ان کی چھوڑی ہوئی علمی میراث ہماری مشترکہ میراث ہے لہٰذا تمام فقہاء کی فقہی آراء سے بلا تعصب مسلک استفادہ کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ زیر بحث مسئلہ بارے اگر معاصر مجتہدین کی آراء سامنے آ چکی ہوں تو ان سے آگاہی بھی از بس ضروری ہے۔[۸۲]

سابقہ فقہی ذخیرہ سے استفادہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جن مسائل بارے متقدمین کا اجماع ہو چکا ہے، ان سے ایک مجتہد آگاہ ہوتا کہ ان اجماعی مسائل کے خلاف وہ کوئی اجتہادی فیصلہ نہ کر بیٹھے یا کم از کم ''مجتہد فیہ'' مسئلہ بارے مجتہد کو یقین حاصل کر لینا چاہیے کہ کہیں اس بارے کوئی اجماعی فیصلہ تو زمانہ گزشتہ میں نہیں ہو چکا جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" لا يلزمه ان يحفظ جميع مواقع الاجماع والخلاف بل كل مسئلة يفتي فيها فينبغي ان يعلم ان فتواه ليس مخالفا للاجماع اما بان يعلم انه موافق مذهبا من مذاهب العلماء ايهم كان او يعلم ان هذه الواقعة متولدة في العصر الذي لم يكن لاهل الاجماع فيها خوض فهذا القدر فيه كفاية".[۸۳]

''مجتہد کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ تمام اجماعی و اختلافی مسائل کو ازبر کر لے بلکہ اسے چاہیے کہ جب وہ کسی مسئلہ میں فتویٰ دینے لگے تو اس بارے تسلی کر لے کہ اس مسئلہ میں اس کی رائے اجماع کے مخالف تو نہیں اور اسے جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ معلوم کرے کہ (اس کی رائے) ائمہ کے مذہب میں سے کسی مذہب کے موافق ہے یا اسے معلوم کرنا چاہیے کہ زیر بحث مسئلہ اہل اجماع کے زمانے میں وقوع پذیر ہوا تھا کہ جس میں وہ غور و خوض کرتے۔ بس یہی بات اس سلسلہ میں کافی ہو گی۔''

مقاصد و مصالح شریعت اور علل احکام کا علم:

شریعتِ اسلامی کے تمام احکامات سے اصل مقصود انسانوں کے لیے منافع کا حصول اور مضرت و نقصان سے انہیں محفوظ کرنا ہے لہٰذا ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ احکام کے علل، روح

شریعت یعنی مقاصد شریعت کو جاننے کی کوشش کرے اور جو مصالح مطلوبِ شریعت ہیں ان کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہوئے کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کرے[۸۴] امام شاطبی رحمہ اللہ نے مجتہد کے لیے جو دو شرطیں لگائی ہیں ان میں اولین حیثیت مقاصد شریعت کے علم کو دی ہے۔[۸۵]

''الموافقات'' کے محشی شیخ عبداللہ دراز بجا طور پر لکھتے ہیں کہ مصالح کا تعین کرنا ایک دشوار گزار عمل ہے کیونکہ ہر چیز میں نفع و نقصان اور خیر و شر کا پہلو تو ہوتا ہی ہے اور اگر ایک چیز ایک وقت میں خیر ہو تو دوسرے وقت میں اپنے اندر شر کا پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے اور کبھی ایک ہی چیز ایک شخص کے لیے خیر تو دوسرے کے لیے شر ثابت ہوتی ہے۔[۸۶] اس لیے مقاصد شریعت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان قواعد و ضوابط کو ملحوظ رکھا جائے جو اس بارے فقہائے کرام نے تشکیل دیے ہیں۔[۸۷]

اسی طرح علل احکام کو جاننا بھی مجتہد کے لیے ازبس ضروری ہے۔[۸۸] کیونکہ علل جاننے کے نتیجہ میں ہی قیاس کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں، وہ قیاس جو اجتہاد کا ایک اہم رکن رکین ہے۔

اصول فقہ کا علم:

مجتہد کے لیے یہ بھی لازمی شرط ہے کہ وہ اصولِ فقہ کا عالم ہو کیونکہ اسی علم کی بدولت مجتہد فقہ اسلامی کے بنیادی مآخذ و دلائل سے ترتیب وار استنباط احکام کے طریقوں سے آگاہ ہوتا ہے[۸۹] جلال الدین محلی رحمہ اللہ (م ۸۶۴ھ) اس شرط کے اہم ہونے کا سبب اس طرح لکھتے ہیں:

" اما علم المجتهد باصول الفقه فلانه يعرف به كيفية الاستنباط''[۹۰]

''رہا مجتہد کا اصول فقہ بارے علم (تو وہ بھی بہت ضروری ہے) کیونکہ اسی علم کی بدولت استنباط کی کیفیت کا علم حاصل ہوتا ہے۔''

اصول فقہ کا علم مجتہد کے لیے کیوں ضروری ہے اس بارے میں امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" من لم يعرف شروط الادلة لم يعرف حقيقة الحكم ولا حقيقة الشرع ولم يعرف مقدمة الشارع[۹۱]

''جس کو دلائل کی شرائط کا علم نہیں وہ نہ تو حکم شرعی کی حقیقت کو پہچان سکتا ہے اور نہ ہی شریعت کی حقیقت کو اور نہ ہی شارع کے مقدمہ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔''

اور امام شوکانی رحمہ اللہ (م ۱۲۵۰ھ) لکھتے ہیں:

”فان هذا العلم هو عماد فسطاط الاجتهاد و اساسه الذی تقوم علیه ار کان بنا ئه“.[۹۲]

”یہ علم (اصول فقہ) تو اجتہادی خیمہ و بلڈنگ کی اساس و بنیاد ہے جس پر اس کے ارکان کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔“

اصول فقہ کے علوم میں ایک اہم ترین علم ”قیاس“ ہے جس کے ارکان وشروط سے آگاہی اسی علم کی بدولت ہوتی ہے اور یہ ایسا اہم علم ہے جس کے بارے علماء نے کہا ہے:

”من لم یعرف القیاس فلیس بفقیه“.[۹۳]

”جس کو علم قیاس کی معرفت حاصل نہیں وہ فقیہ نہیں ہو سکتا۔“

سوال یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و ائمہ مجتہدین کے دور میں تو اصول فقہ مدون ہی نہ تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے اجتہادات کیے تو یہ مجتہد کے لیے شرط لازم کیوں؟ اس کے جواب میں ڈاکٹر نادیہ شریف بجا طور پر لکھتی ہیں کہ اگرچہ اس دور میں اصولِ فقہ کتابی صورت میں مدون نہ ہوئے تھے مگر ان کے قلوب واذہان میں موجود تھے جن کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ اجتہاد کرتے رہے۔[۹۴]

یہ ایک حقیقت ہے کہ اصولِ فقہ کا علم کتاب وسنت کی معرفت سے کوئی الگ چیز نہیں اس لیے کہ اس وقت تک کتاب وسنت کا صحیح فہم حاصل ہی نہیں ہو سکتا جب تک اصول فقہ کا علم نہ ہو۔[۹۵]

فقہی اصول وکلیات کا علم:

فقہی کلیات سے مراد وہ قواعد کلیہ ہیں جو دراصل شارع کی نصوص سے ہی مفہوم شدہ ہیں جیسے ”الضرر یزال“ (ضرر وتکلیف کو دور کیا جائے گا)۔ اور ”الو لایة الخاصة اقوی من الو لایة العامة“ (ولایت خاصہ، ولایت عامہ کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہے) وغیرہ[۹۶] اصولیوں نے مجتہد کے لیے فقہی قواعد کلیہ کے علم کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ ان کی بدولت ایک مجتہد اجتہاد میں کئی دشواریوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔[۹۷]

جدید علوم وطرز زندگی نیز عرف حاضر کا علم:

بعض معاصر علماء کا خیال ہے کہ اب مجتہد کے لیے جدید علوم وجدید طرز زندگی سے واقفیت بھی ضروری ہے جیسا کہ مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ جدید علوم وطرز زندگی سے مجتہد کی معرفت کی ضرورت واہمیت کو یوں اجاگر کرتے ہیں۔

''یہ عین ممکن ہے کہ ایک آدمی کتاب و سنت کے نقطۂ نظر سے خوب آگاہ ہو، فقہائے ماسبق کی موشگافیوں کو بھی خوب جانتا ہو لیکن اقتصادیات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک معمولی مسئلے پر بھی صحیح رائے نہ پیش کر سکے اور یہ نہ بتا سکے کہ موجودہ حالات میں اسلام کے حکیمانہ تقاضے کس چیز کے مقتضی ہیں۔'' [۹۸]

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ شرط مجتہد مطلق کے لیے تو لازمی ہو سکتی ہے وگرنہ اکثر علماء نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ مجتہد زیر بحث مسئلہ بارے دیگر متعلقہ افراد سے ضروری معلومات حاصل کر کے اجتہاد کر سکتا ہے[۹۹] مثلاً آج بہت سارے طبی و معاشی مسائل پیدا ہو چکے ہیں تو ایک مجتہد ڈاکٹرز و اطباء اور ماہرین معاشیات سے معلومات لے کر اجتہاد کر سکتا ہے۔ اگر یہ جائز نہ ہو تو مجتہد پر لازم آئے گا کہ تمام قسم کے علوم سے واقف ہو جبکہ یہ محال ہے کیونکہ تمام قسم کے علوم کا احاطہ شخص واحد کے بس میں نہیں ہے۔[۱۰۰]

عرف حاضر کے علم سے مراد مجتہد کا اپنے علاقے، وطن کے حالات و ظروف، رسوم و رواجات اپنے ماحول اور معاشرہ بارے واقفیت ہے نیز مجتہد کو اہل زمانہ کی ضروریات و حالات کا علم ہونا چاہیے بالخصوص زیر بحث مسئلہ بارے تمام قسم کی معاشرتی معلومات حاصل کرنے کے بعد اجتہاد کرنا چاہیے بصورت دیگر اجتہاد کرنے میں غلطی کا امکان بہت زیادہ ہے نیز اس کا اجتہادی فیصلہ لوگوں کے لیے حرج و تنگی کا باعث بن سکتا ہے۔

جس شخص کو اہل زمانہ اور اپنے گرد و پیش بارے کچھ علم نہیں ایسے ہی عالم بارے علماء کے یہاں یہ جملہ مشہور و معروف ہے:

"من لم يعرف اهل زمانه فهو جاهل".

''جسے اہل زمانہ (کے احوال) کی معرفت نہیں وہ تو جاہل ہے۔''

ان کسبی شرائط کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ انسان کچھ عرصہ تعلّم کے بعد تعلیم و تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے کیونکہ علم میں رسوخ و پختگی پڑھانے سے آتی ہے نیز ایسے شخص کو کسی تجربہ کار مجتہد و فقیہہ کے ساتھ طویل عرصہ رہنا چاہئے اور اسے ابتدا میں اجتہادی مسائل میں اجتہاد کرنے کی کوشش و تجربہ کرنا چاہئے اور سینئر (Senior) مجتہد و فقیہہ کے سامنے اپنے اجتہادات پیش کرنے چاہئیں اور اس کی رہنمائی میں آگے بڑھنا چاہئے، اس طرح مستقبل قریب میں وہ یقیناً ایک قابل مجتہد کے طور پر منظرِ عام پر آ سکتا ہے۔

وہبی شرط:

ذیل میں وہ شرط لکھی جاتی ہے جس میں انسان کے کسب واختیار کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہوتی ہے۔

غیر معمولی ذہنی وعقلی صلاحیت:

ایک مجتہد کے لیے غیر معمولی ذہنی وعقلی صلاحیت کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔[۱۰۱] کیونکہ اسی کی بدولت اس میں احکام کے استنباط کا ملکہ وصلاحیت ہوگی۔ اس فطری و وہبی صلاحیت ہی کا دوسرا نام ''ذوقِ اجتہاد'' ہے۔[۱۰۲] اسے ''فقہ النفس'' کا عنوان بھی دیا جاتا ہے[۱۰۳] کوئی عالم محض اپنے علم کی وسعت اور دیگر کسبی شروط کے حصول سے مجتہد نہیں بن سکتا جب تک کہ اس میں یہ فطری صلاحیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کتنے ہی اہل علم تھے مگر وہ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ و فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ وعلی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے درجے کو نہ پہنچ سکے۔

یہ فطری صلاحیت جو اللہ فاطر السمٰوٰت و الارض کی عطیہ خاص ہوتی ہے۔ اس کے لیے تقویٰ شرط لازم ہے کیونکہ تقویٰ سے بھی اللہ تعالیٰ علم کے راستے کھول دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں:

﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ط وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ﴾[۱۰۴]

''اور خدا سے ڈرو اور (دیکھو کہ) وہ تم کو (کیسی مفید باتیں) سکھاتا ہے۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾[۱۰۵]

''مومنو! اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لیے امر فارق پیدا کردے گا (یعنی تم کو ممتاز کردے گا)۔''

فرقان سے مراد وہ نور ہے جس کی بدولت مومن ومتقی شخص حق و باطل، خطا وصواب کے درمیان فرق کر لیتا ہے۔ بندہ اللہ کے جتنا زیادہ قریب ہوگا اتنی ہی اس میں یہ صلاحیت بڑھتی چلی جائے گی۔[۱۰۶] یہ نور اگر تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے تو معصیت سے مٹنے لگ جاتا ہے۔ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ (م ۱۷۹ھ) نے امام شافعی رحمہ اللہ سے پہلی ملاقات میں ہی کہا تھا:

'' انی اری اللہ قد القی علی قلبک نورا فلا تطفئہ بظلمۃ المعصیۃ ''.[۱۰۷]

''بے شک میں دیکھ رہا ہوں کہ اللہ نے تمھارے دل پر نورانیت برسا دی ہے

لہٰذا تم اس نور کو گناہوں کی ظلمت کے ساتھ ختم نہ کر دینا۔“

بسا اوقات آیات قرآنی اور احادیث بظاہر باہم متعارض ہوتی ہیں، ان میں تطبیق دینے کے لیے بھی غیر معمولی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح قدماء کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے تو مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے دلائل میں مقابلہ وموازنہ کرتے ہوئے کسی ایک قول کو ترجیح دے تو اس کے لیے بھی یقیناً غیر معمولی ذہنی وعقلی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ مجتہد کے لیے اس صلاحیت وخوبی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

”أتدری ای الناس اعلم؟قلت الله ورسوله اعلم ، قال اعلم الناس ابصرهم بالحق اذا اختلف الناس وان كان مقصراً فی العمل وان كان يزحف على استه“.[۱۰۸]

”کیا تم جانتے ہو کہ لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں سب سے بڑا عالم وہ ہے جو حق کو اس وقت پہچان لے جب کہ لوگ اس کے پہچاننے میں اختلاف کر رہے ہوں۔ وہ خواہ نیک اعمال بہت زیادہ کرنے والا نہ ہو اور خواہ وہ اپنی پیٹھ پر گھسٹ کر ہی کیوں نہ چلتا ہو۔“

اس فطری صلاحیت کے اضافہ کے لیے اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہئے ﴿رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ [۱۰۹] کیونکہ کوئی مجتہد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے یا اسے حاصل ہوگئی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (م ۷۲۸ھ) خصوصاً پیچیدہ اور مشکل مسائل کے حل کرنے کے موقع پر یہ دعا کرتے تھے:

” یا معلم ابراهیم علّمنی “.[۱۱۰]

”اے ابراہیم علیہ السلام کو علم کی نعمت سے نوازنے والے! مجھے بھی دولت علم سے مالا مال فرما۔“

قبولیت اجتہاد کے لیے شرائط:

قبولیت اجتہاد کے لیے ایک مجتہد میں درج ذیل تین شرطیں ہونا ضروری ہیں:

(i) ایمان (ii) عقل وبلوغت (iii) عدالت وتقویٰ

ایمان:

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مخلص مسلمان و مومن ہو یعنی اس کا اللہ پر ایمان ہو اور اس بات پر ایمان ہو کہ وہ قادر قدیر، سمیع و بصیر ہے جس کی نظر و علم سے مجتہد کی کوئی چیز مخفی نہیں اور یہ کہ قیامت کے دن مجتہد کو اللہ کے حضور جوابدہ ہونا ہے۔ اسی طرح اس بات پر ایمان ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ہی ہادی و پیشوا ہیں لہٰذا قرآن اور حدیث رسول بارے مجتہد کو کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو بلکہ اس پر یقین کامل ہو۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ اسے اللہ کے وجود، اس کی صفات، عالم کے حادث و فانی ہونے بارے علم ہو نیز آپ ﷺ کا صاحب شریعت ہونا، آپ کے معجزات بارے علم و یقین ہونا بھی ضروری ہے۔[۱۱۱]

مجتہد کا مومن ہونا کیوں ضروری ہے اس بارے صاحب ''فواتح الرحموت'' لکھتے ہیں کہ اجتہاد استخراجِ حکم کا نام ہے تو مجتہد کو حاکم حقیقی کی پہچان ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے حاکم حقیقی کو اس کی تمام صفات جیسے قدرت، علم، ارادہ اور کلام و حکمت وغیرہ کے ساتھ جانے اگرچہ ادلہ اجمالیہ کے ساتھ گویا علم کلام کے دقیق اور باریک نکتوں کا علم کہ جس کی بدولت مجادلین کے شبہات کا رد کر سکے، مجتہد کے لیے شرط نہیں ہے۔[۱۱۲]

مجتہد کے مسلمان و مومن ہونے کی شرط متفق علیہ شرط ہے اور یہ اس لیے کہ مجتہد رسول اللہ ﷺ کا نائب بن کر اللہ کے حکم کی خبر دیتا ہے لہٰذا یقیناً مجتہد مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔[۱۱۳]

عقل و بلوغت:

مجتہد کے لیے عاقل و بالغ ہونا بھی شرط ہے۔ غیر عاقل کی تو ذہنی صلاحیتیں کام ہی نہیں کر رہی ہوتیں لہٰذا وہ کیوں کر اجتہاد کر سکتا ہے۔ رہا غیر بالغ تو وہ کم عمری کی وجہ سے اجتہاد کا مجاز ہی نہیں ہے شریعت میں مجنون، صغیر (کم عمر) اور وہ شخص جو نیند کی حالت میں ہے تینوں کو ان حالتوں میں مکلف نہیں بنایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

''رفع القلم عن ثلاثة عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یعقل''[۱۱۴]

''تین افراد مرفوع القلم ہیں: سویا ہوا شخص حتی کہ بیدار ہو جائے، بچہ حتی کہ وہ بالغ ہو جائے اور مجنون شخص یہاں تک کہ وہ عقل مند ہو جائے۔''

لہٰذا جب غیر عاقل مجنون اور صغیر دیگر احکام شرعیہ کے مکلّف ہی نہیں تو صغیر خواہ کتنے ہی علم کا مالک ہو بلوغت سے قبل اس کے اجتہاد کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

مذکورہ تینوں قسم کے افراد کو مکلّف کیوں نہیں بنایا گیا اس بارے امام غزالی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

"مقتضی التکلیف الطاعة والامتثال، ولا یمکن ذلک الا بقصد الامتثال، و شرط القصد العلم بالمقصود والفهم للتکلیف فکل خطاب متضمن للامر بالفهم فمن لا یفهم کیف یقال له افهم"[۱۱۵]

"مکلّف کرنے کا تقاضا اطاعت و فرمانبرداری ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اطاعت کرنے کے لیے قصد و ارادہ موجود ہو اور قصد و ارادہ کے لیے ضروری ہے کہ مقصود کا علم ہو اور حکم کے بارے میں فہم حاصل ہو لہٰذا ہر خطاب اپنے فہم کا تقاضا کرتا ہے اور وہ شخص جو سمجھ ہی نہیں سکتا اسے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ تم سمجھو۔"

عدالت و تقویٰ:

مجتہد کے صفت عدالت سے متصف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے بچتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر دوام و ہمیشگی اختیار نہ کرتا ہو[۱۱۶] تقویٰ بھی عدالت ہی کے ہم معنی ہے تاہم اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ صغائر و کبائر سے بچنے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ کو بجا لانے کی بھی کوشش کرتا ہو۔[۱۱۷] عدالت و تقویٰ ہی وہ صفت و خوبی ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ ذہنی صلاحیتوں میں برکت عطا فرماتا ہے[۱۱۸] یاد رہے عدالت و تقویٰ سے مجتہد کا متصف ہونا قبولِ فتویٰ و اجتہاد کے لیے تو شرط ہے مگر صحت اجتہاد کے لیے یہ شرط نہیں ہے۔[۱۱۹،۱۲۰]

اللہ تعالیٰ کا یہ احسان عظیم ہے کہ امت کے اجتماعی شعور نے آج تک عمل شریعت سے عاری مجتہدین کے اجتہادی فیصلوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ یہی باعث ہے کہ ان کے اجتہادی فیصلوں کو معاشرے میں کبھی کوئی خاص مقام و مرتبہ بھی نہیں مل سکا ہے۔[۱۲۱]

پہلی آٹھ شرائط کسبی ہیں جو ذاتی جدوجہد اور سعی سے حاصل کی جا سکتی ہیں اور نویں حقیقۃً وہبی اور عطیۂ الٰہی ہے جو ترقی کرتے ہوئے کبھی اس مرحلہ میں پہنچ جاتی ہے کہ اجتہاد و قیاس کی بنیاد پر کیا گیا فیصلہ شارع کے بیان کردہ حکم و فیصلہ کے عین مطابق ہوتا ہے۔[۱۲۲]

البتہ وہبی صلاحیت کو بروئے کار لانے اور ترقی دینے میں مذکورہ بالا کسبی واختیاری شرائط کا بڑا دخل ہے بلکہ وہبی صلاحیت کو ظہور میں لانے میں یہ کسبی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ ان امور سے اس قدر شغف واشتغال ہو جانا چاہیے کہ وہ طبیعتِ انسانی میں اس قدر رچ بس جائیں کہ فطرتِ ثانیہ کے درجہ میں ہو جائیں جیسا کہ ہر علم وفن کے کسبی شرائط کا التزام واہتمام کرنے کے نتیجہ میں عموماً ہر علم وفن میں وہبی صلاحیت کو جلا ملتی ہے۔[۱۲۳]

شرائط اجتہاد بارے ایک غلط فہمی کا ازالہ:

عموماً ان شرائط اجتہاد سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ شرائط انتہائی کڑی شرائط ہیں جن پر پورا اترنا کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہیں ہے اور ان شرائط کی پابندی کا مطالبہ کرنا حقیقت میں باب اجتہاد کو بند کرنا ہے جیسا کہ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ (م ۱۹۳۸ء) نے لکھا ہے ''اہل سنت والجماعت (اجتہاد کے) نظریاتی امکان کو اس درجے تک تسلیم کرتے ہیں مگر عملی طور پر (فقہی) مکاتب کے قائم ہونے کے بعد ان سے انکار ہی کیا گیا ہے حتیٰ کہ مکمل اجتہاد پر ایسی شرائط عائد کر دی گئی ہیں کہ کوئی ایک فرد ممکن طور پر انہیں پورا کر ہی نہیں سکتا''[۱۲۴] جبکہ بعض حضرات کا تو یہ خیال ہے کہ شرائط اجتہاد پر پورا اترنے والے ساری اسلامی دنیا میں دس بارہ افراد سے زائد نہ ہوں گے۔[۱۲۵]

حقیقت یہ ہے کہ جن ادوار میں عملِ اجتہاد رکا رہا تو اس کا سبب ''شرائط اجتہاد'' قطعاً نہ تھیں[۱۲۶] اور یہ کہنا کہ یہ شرائط انتہائی کڑی شرائط ہیں جن پر کوئی بھی پورا نہیں اتر سکتا یا زیادہ سے زیادہ عالم اسلام میں ایسے دس بارہ افراد ہوں گے تو اس کا رد کرتے ہوئے مولانا مودودی رحمہ اللہ (م ۱۹۷۹ء) یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ کہنا کہ ساری اسلامی دنیا میں دس بارہ آدمیوں سے زیادہ ایسے نہیں مل سکتے جو ان شرائط پر پورے اترتے ہوں میرے نزدیک دنیا بھر کے مسلمانوں کے متعلق بہت ہی بری رائے ہے غالباً ابھی تک ہمارے مخالفوں نے بھی ہم کو اتنا گرا ہوا نہیں سمجھا ہے کہ چالیس پچاس کروڑ مسلمانوں میں ان صفات کے اشخاص کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ ہو۔''[۱۲۷]

صحیح بات یہ ہے کہ آج بھی یہ ممکن ہے کہ اجتہاد کی مقررہ شرائط بعض معاصر علماء میں پائی جائیں۔ چنانچہ اس بارے شیخ محمد مصطفیٰ المراغی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''آج بھی ممکن ہے کہ اجتہاد مطلق کی شروط بعض معاصر علماء میں پائی جائیں

لہٰذا اجتہاد بھی آج ممکن ہوگا۔ کیونکہ اکثر شروط اجتہاد کا تعلق درج ذیل تین فنون سے ہے۔(i) الحدیث (ii) اللّغۃ (iii) اصول الفقہ۔

علمائے کرام نے آیات احکام کو ایک کتاب میں، اجماع کے مواقع ایک کتاب میں، ناسخ و منسوخ ایک کتاب میں جمع کر دیئے ہیں۔ احکام کتبِ فقہ، کتبِ شروح الحدیث، کتبِ تفسیر میں مدون ہو چکے ہیں، اب حدیث کی روایت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور اب امت مدون کتب پر ہی اعتماد کرتی ہے جس طرح کہ رواۃ بارے ائمہ جرح و تعدیل کی آراء پر اعتماد کرتی ہے علاوہ ازیں رجال کی کتب وافر ہیں جو ان کے حالات واحوال پر تفصیل سے بحث کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ طالب علم کے لیے رواۃ حدیث میں سے کسی راوی بارے بحث و تحقیق کرنا چنداں مشکل نہیں رہا۔ لغت عرب اور اس سے متعلقہ فنون جیسے نحو، صرف اور ادب و بلاغت وغیرہ مدارس دینیہ وغیرہ میں پڑھائے جاتے ہیں جو فہم زبان کے لیے کافی ہیں اسی طرح اصول فقہ کی تعلیم بھی طلبہ کو دی جاتی ہے۔"[۱۲۸]

لہٰذا جب یہ شرائط پائی جائیں گی تو اجتہاد کرنا آج بھی ممکن ہوگا۔ لیکن ایک مجتہد کے لیے یہ جاننا بھی نہایت ضروری ہے کہ اس کے عمل اجتہاد کا میدان کسی حد تک محدود (Limited) ہے چنانچہ اجتہاد کے دائرۂ کار کی تفصیلات رقم کی جاتی ہیں۔

اجتہاد کا دائرۂ کار:

اصولیوں نے "مجتہد فیہ" یعنی قابل اجتہاد مسئلہ کی تعریف کر کے اجتہاد کا دائرہ کار متعین کیا ہے ذیل میں وہ تعریف رقم کی جاتی ہے:

"المجتهد فيه هو كل حكم شرعي ليس فيه دليل قاطع"[۱۲۹]

"ہر وہ حکم شرعی جس کے بارے کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو تو وہ قابل اجتہاد مسئلہ ہوگا۔"

یہاں لفظ "شرعی" کے استعمال سے عقلی اور کلامی مسائل سے احتراز کیا گیا ہے اور "ليس فيه دليل قاطع" کے الفاظ سے وہ احکام جو قطعی دلائل کی وجہ سے معلوم و متعین ہو چکے ہیں خارج ہو جاتے ہیں مثلاً پانچ نمازوں کا ثبوت، زکوٰۃ کی فرضیت اور وہ مسائل جن پر علماء امت کا اتفاق ہو چکا

ہے۔[۱۳۰] لہٰذا اس تعریف سے وہ احکام خارج ہو جاتے ہیں جن میں اجتہاد کی قطعی گنجائش ہی نہیں ہے۔
اجتہاد کا دائرہ کار متعین کرنے کے لیے درج ذیل دو نکات پر بحث کی جاتی ہے۔
(i) نا قابل اجتہاد امور (ii) قابل اجتہاد امور

نا قابل اجتہاد امور:

(i) ان منصوص احکام میں اجتہاد نہیں کیا جا سکتا جن کا تعلق قطعیات سے ہے مثلاً فرضیتِ نماز و حج اور حرمتِ زنا و سرقہ، پانچوں فرض نمازوں کی رکعتیں، ان میں رکوع وسجود کی تعداد، زکوٰۃ کا نصاب و متعین مقداریں وغیرہ۔ یہ اس لیے کہ ان منصوص احکام کے ثبوت میں جو دلیل ہے وہ قطعی اور صریح ہے جبکہ اجتہاد سے حاصل ہونے والا علم ظن وگمان پر مبنی ہوتا ہے اور قطعیت کے مقابلہ میں ظن وتخمین کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا﴾[۱۳۱]

''کچھ شک نہیں کہ ظن حق کے مقابلے میں کچھ بھی کارآمد نہیں ہو سکتا۔''

لہٰذا اگر کسی دور کا فقیہہ لاعلمی و ناواقفیت کی وجہ سے کسی نص سے ثابت شدہ حکم کے خلاف اجتہادی فیصلہ کرتا ہے اور پھر اس کا علم ہو جائے تو اس اجتہاد کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی اور اسے فوراً ترک کرنا ضروری ہوگا اسی لیے فقہاء کرام نے قاعدہ کلیہ بتاتے ہوئے کہا ہے کہ

(i) ''الاجتهاد لا يعارض النص'' ''اجتہاد نص کے معارض نہ ہونا چاہیے۔''

(ii) ''لا اجتهاد مع النص'' ''نص کی موجودگی میں اجتہاد نہ ہوگا۔''

(iii) ''لا مساغ للاجتهاد في مورد النص''[۱۳۲] ''نص کے مقابلہ میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔''

اس لیے قطعیات میں قصداً اجتہاد کرنے والا شخص گناہگار ہوگا جبکہ اجتہادی مسائل (قابل اجتہاد مسائل) میں خطا سرزد ہونے پر مجتہد گناہ گار نہیں ہوتا۔[۱۳۳]

(ii) دین کی وہ بنیادی باتیں جن کا تعلق عقائد سے ہے ان میں بھی اجتہاد نہیں ہو سکتا۔[۱۳۴]

(iii) حدود یعنی بعض جرائم کی شریعت میں جو سزائیں طے کر دی گئی ہیں اور وہ جرائم جن کے کفارات طے کر دیے گئے ہیں ان میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔[۱۳۵] مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمانِ گرامی ہے:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾[۱۳۶]

"بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد (جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو) دونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو"

یہاں عدد بارے اجتہاد کرتے ہوئے کسی قسم کی بھی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ قسم کا کفارہ قرآن مجید میں بایں الفاظ ذکر کیا گیا ہے:

﴿فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ﴾[۱۳۷]

"اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ تین روزے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا لو (اور اسے توڑ دو۔)"

لہٰذا یہاں کفارہ قسم میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔[۱۳۸]

قابل اجتہاد امور:

وہ احکام جن کے بارے نہ کوئی نص ہے اور نہ ہی ان کے بارے کوئی اجماع واقع ہوا، اسی طرح وہ احکام جن بارے نص ظنی الثبوت وظنی الدلالۃ ہے یا صرف ظنی الثبوت یا صرف ظنی الدلالۃ ہے یا قطعی الثبوت مگر ظنی الدلالۃ ہے تو ان میں اجتہاد کیا جائے گا۔ جب نص ظنی الثبوت ہو تو اس کی سند پر داد تحقیق دیتے ہوئے اجتہاد کیا جائے گا نیز اس کے رواۃ کی عدالت وضبط کے اعتبار سے درجات بارے اجتہاد کیا جائے گا۔

جب نص ظنی الدلالۃ ہو تو نص سے مقصود معنی و مراد کو سمجھنے بارے اجتہاد کیا جائے گا نیز اس بارے کہ معنی پر اس کی دلالت کی قوت کس قدر ہے کیونکہ نص کبھی عام ہوتی ہے اور اپنے عموم پر باقی رہتی ہے تو کبھی اپنے کسی مدلول کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے۔ نص کبھی مطلق ہوتی ہے اور اپنے اطلاق پر ہی جاری ہوتی ہے تو کبھی مقید ہو جاتی ہے۔ نص کبھی صیغہ امر کے ساتھ تو کبھی صیغہ نہی کے ساتھ وارد ہوتی ہے۔ کبھی امر وجوب پر دلالت کرتا ہے جس طرح کہ اصلاً وجوب کے لیے ہی ہے اور کبھی اس سے مراد ندب و اباحت ہوتی ہے۔ نہی سے کبھی مراد تحریم ہوتی ہے جبکہ اصلاً تحریم ہی اس کی حقیقت

ہے لیکن کبھی اس سے مقصود تحریم نہیں بلکہ کراہت ہوتی ہے۔ اسی طرح کبھی دلیل اپنے معنی پر بطریق العبارۃ تو کبھی بطریق الاشارۃ وغیرہ دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں جبکہ نص ظنی الدلالۃ ہو تو اس کے معنی و مقصود کو متعین کرنے کے لیے اجتہاد کیا جائے گا۔[۱۳۹] مثلاً آیت:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾[۱۴۰]

''بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد (جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو) دونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو''

میں ''فاجلدوا'' ظنی الدلالہ ہے لہٰذا کوڑے کی نوعیت و ساخت کیا ہو نیز جسم کے کس حصہ پر مارا جائے تو ان امور میں اجتہاد ہو سکتا ہے۔ یاد رہے کہ ظنی احکام کو اجتہاد کر کے قطعی احکام کی شکل نہیں دی جا سکتی۔[۱۴۱]

اجتہاد کا دائرہ کار متعین ہو جانے کے بعد یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا اجتہاد کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی جائے گی یا سابقین ائمہ کرام کے اجتہادات رہتی دنیا تک کے لیے کافی ہیں؟ چنانچہ اس اہم بحث کو قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

اجتہاد کی ضرورت و اہمیت:

انسانی تمدن ہمیشہ سے ارتقاپذیر ہے اس کی رفتار کو نہ تو کبھی روکا جا سکا ہے اور نہ ہی روکا جا سکتا ہے لہٰذا انسانی تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئے نئے مسائل کا منظر عام پہ آنا لازمی امر ہے اسلام انسانی تمدن کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا اور نہ ہی یہ کہتا ہے کہ تمدنی تغیرات کو تسلیم و قبول کر لینے کی بجائے اسے عہد نبوی کے من و عن تمدن پر واپس کر دیا جائے۔ البتہ اسلام کا یہ دعوی ہے کہ وہ ایک کامل و اکمل دین ہے[۱۴۲] جو دنیا کے ہر خطے کے لوگوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ اور اس کی تعلیمات میں قیامت تک پیش آنے والے مسائل کا حل موجود ہے لیکن جب ہم قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی کاملیت و اکملیت دراصل اس لحاظ سے ہے کہ ان میں اصول و کلیات بتا دیئے گئے ہیں جن سے مستفید ہوتے ہوئے نئے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ امام شاطبی رحمہ اللہ قرآن مجید کی جامعیت کا مفہوم یوں واضح کرتے ہیں:

''ولا يكون جامعاً الا والمجموع فيه امور كليات''[۱۴۳]

''قرآن مجید کے جامع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں (ہر دور کے مسائل

کے حل کے لیے) قواعد وکلیات جمع کر دیے گئے ہیں۔"

قرآن وحدیث میں اگرچہ کبھی فروعات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے مگر وہ بھی دراصل اسی لیے ہے کہ ان فروعات وجزئیات سے اصول مستنبط کیے جاسکیں۔[۱۴۴]

شریعت محمدیہ (کتاب وسنت) قیامت تک کے لیے ہے مگر اس میں قیامت تک آنے والے انسانوں کو درپیش مسائل کا جزئیات وفروعات کے انداز میں تذکرہ نہیں ہے اور یہ ممکن بھی نہ تھا کیونکہ نبی ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں تمام معاملات وحالات پیش نہیں آئے بلکہ آج تک نئے حالات ومسائل پیش آرہے ہیں اور قیامت تک پیش آئیں گے۔ اگر تمام مسائل کا ایک ایک کر کے تذکرہ کیا جاتا تو قرآن اس قدر مختصر وجامع نہ رہتا اور حدیث کا موجودہ وسیع ترین ذخیرہ بھی اس کا متحمل نہ ہو سکتا نتیجتاً ان دونوں سے استفادہ اس قدر آسان نہ رہتا۔[۱۴۵]

جب ہر دور میں نئے مسائل کا پیش آنا ناگزیر ہے تو ہر دور میں اجتہاد کرنا بھی ناگزیر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی موجودگی اور غیر موجودگی میں بھی بعض صحابہ رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کی اجازت دی اور انہوں نے عہد نبوی میں بھی اجتہاد کیا اور نبی ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جب خلفائے راشدین کو کئی نئے مسائل کا سامنا ہوا تو انہوں نے بھی اجتہاد کیا اور اسی طرح کئی دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اجتہاد کیا۔[۱۴۶] اور پھر ان کے بعد بھی مسلسل اجتہاد ہوتا رہا۔ آج ہمارے پاس جو ایک بہت بڑا فقہی ذخیرہ موجود ہے وہ درحقیقت ان مجتہدین کے اجتہاد ہی کی برکت سے ہے لیکن چوتھی صدی ہجری کے بعد بعض اسباب کی بنا پر باب اجتہاد کو بعض علماء نے بند کرنے کی رائے دی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلی طور پر اس دروازے کو بند نہ کیا جاسکا کیونکہ نئے مسائل کو جنم لینے سے کون روک سکتا تھا۔ یہی باعث ہے کہ دور تقلید میں بھی ایک خاص حد تک اجتہاد کرنے کے لیے مذاہب اربعہ میں بھی مجتہدین کی اقسام متعین کی گئیں[۱۴۷] یہ الگ بات ہے کہ اجتہاد کی اصل روح کا لحاظ نہ کیا گیا تھا۔ خدا لگتی بات یہ ہے کہ اجتہاد اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کو کسی زمانہ یا بعض مخصوص فقہاء وائمہ کے ساتھ خاص نہیں کیا جاسکتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت قیامت تک کے لیے ہے جس سے ہر دور کے فقہاء فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔[۱۴۸]

عہد رسالت کے متصل بعد نئے مسائل کی وجہ سے اجتہاد کی ضرورت پیش آگئی تھی تو آج جبکہ سیکڑوں مسائل پیدا ہو چکے ہیں خصوصاً گزشتہ ایک صدی میں جو انقلابات وحوادث عالم اور ایجادات وانکشافات ہوئے اسکی تو پوری تاریخ انسانی میں مثال نہیں ملتی تو پھر آج اجتہاد کی ضرورت واہمیت سے کیوں کر انکار کیا جاسکتا ہے اور کیوں کر باب اجتہاد کو تالے لگائے جاسکتے ہیں۔

باب اجتہاد قیامت تک کے لیے کھلا ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں کہ اجتہاد کے اصول وقواعد کی ترتیب وتدوین کا دروازہ ضرور بند ہوا ہے اور اسے علماء وفقہاء نے بند نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے تاریخ کا فطری تسلسل کارفرما ہے [۱۴۹] لہٰذا اب اس میں مزید اضافہ ممکن نہیں ہے۔

اجتہاد کی ضرورت جس طرح ہر دور میں محسوس کی گئی اسی طرح آج بھی اس کی ضرورت ایک مسلمہ امر ہے۔ قرآن وحدیث کی متعدد نصوص سے اجتہاد کا اثبات ہوتا ہے مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا:

﴿لَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ [۱۵۰]

''ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ ہاں اگر آپس کی رضا مندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے۔)''

اس آیت میں ''اکل بالباطل'' سے منع کیا گیا جبکہ باہمی رضا مندی سے کی گئی تجارت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ عہد نبوت کے جائز اور ناجائز طرق تجارت بارے احادیث سے ہمیں آگاہی حاصل ہوتی ہے لیکن آج عصر حاضر میں کئی جدید طرقِ مبایعات سامنے آئے ہیں اور نہ جانے مستقبل میں مزید کیا کچھ سامنے آئے تو گویا ہر دور میں اس بات کی ضرورت محسوس کی جائے گی کہ جدید طرق مبایعات میں سے جو جائز یا ناجائز ہیں ان کی اجتہاد کے ساتھ الگ الگ نشان دہی کی جائے گویا یہ آیت ہمیں ہر دور میں اجتہاد کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اسی لیے مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ''اگر یہ کہا جائے کہ ہم اپنی زندگی کی بقا کے لیے جتنے محتاج ہوا اور پانی کے ہیں، اس سے زیادہ محتاج اپنی روحانی زندگی کی بقا کے لیے اجتہاد کے ہیں تو اس بات میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔'' [۱۵۱]

اجتہاد نہ کرنے کے نقصانات:

اگر علماء وفقہاء نے خدانخواستہ پیش آمدہ مسائل کا شرعی حل بتانے کے لیے اجتہاد نہ کیا تو انفرادی واجتماعی سطح پر کئی طرح کے دینی ودنیوی نقصانات ہو سکتے ہیں مثلاً

(i) لوگ اسلام کے بارے بدگمان ہو جائیں گے اور یہ سمجھنے لگ جائیں گے کہ اسلامی تعلیمات عصر حاضر کے مسائل بارے رہنمائی دینے سے قاصر ہیں۔

(ii) علماء کے خلاف بے اعتمادی کی فضا بن جائے گی اور ان کی قدر ومنزلت عوام کے دلوں سے

ختم ہو جائے گی۔

(iii) گزشتہ صدی میں اہل علماء وفقہاء کے اجتہاد نہ کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ بعض لوگ آزادانہ طریقے سے اجتہاد کرنے لگے۔[۱۵۲]

(iv) امام ابن قیم رحمہ اللہ کے دور میں جب حکمران طبقہ کا غیر اسلامی قوانین کی طرف میلان ہوا تو آپ رحمہ اللہ نے لکھا کہ یہ دراصل اہل علماء کے اجتہاد نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔[۱۵۳]

(v) اور بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ (م ۲۰۰۰ء) مسلمانوں کے تنزل کا پہلا سبب ''اجتہاد وجہاد کا فقدان'' ہے۔[۱۵۴]

(vi) اگر عصری مسائل کا حل اجتہاد کے ذریعہ نہ کیا گیا تو لوگ ہوا وہوس کا شکار ہو کر حلال وحرام کا پتہ چلائے بغیر جو جی میں آئے گا کیے چلے جائیں گے اور دین وشریعت کا صرف نام باقی رہ جائے گا اسی لیے امام شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لا بد من حدوث وقائع لا تكون منصوصا على حكمها ولا يوجد للاولين فيها اجتهاد وعند ذلك فاما ان يترك الناس فيها مع اهواء هم أو ينظر فيها بغير اجتهاد شرعي وهو ايضا اتباع للهوى وذلك كله فساد."[۱۵۵]

''ایسے بعض نئے واقعات وحوادث کا پیش آنا ازبس ضروری ہے جن کا حکم بھی باقاعدہ منصوص نہیں ہوتا اور نہ ہی گذشتہ علماء کا اس بارے کوئی اجتہادی فیصلہ موجود ہوتا ہے۔اب یا تو یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی خواہشات (کی اتباع) میں چھوڑ دیا جائے یا پھر یہ ہے کہ اس معاملہ میں شرعی اجتہاد کے بغیر (یعنی شرائط اجتہاد کے بغیر) غور وفکر کیا جائے تو یہ چیز بھی اتباع نفس کے زمرہ میں ہی آئے گی اور ان دونوں صورتوں کے نتیجے میں سراسر فساد ہی ہوگا۔''

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جو معاشرہ اجتہاد سے بے نیاز ہو جائے گا اس کی پوری زندگی غیر اسلامی ہو کر رہ جائے گی خواہ وہ اپنی زندگی کے بعض گوشوں میں اسلامی احکام و قوانین پر ہی چل رہا ہو۔[۱۵۶]

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج یہ نقصانات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔امت کا جدید پڑھا لکھا طبقہ اسلام اور علماء سے نفرت رکھنے لگا ہے اور وہ مغرب کے لادین فلسفہ، ان کی تہذیب و تمدن کو عملاً قبول کر چکا ہے۔ان حالات میں اہل علماء وفقہاء کی آنکھیں کھل جانی چاہیں کیونکہ اگر اس

سلسلہ میں مزید تاخیر کی گئی تو لوگوں کے اسلام سے بدگمان ہونے کا نتیجہ بالاخر ارتداد کی صورت میں ہی سامنے آئے گا۔[۱۵۷]

اجتہاد کرنے کے فوائد:

اگر نئے پیش آمدہ مسائل کا حل اجتہاد کرتے ہوئے امت کی رہنمائی کی جائے تو اس کے کئی ایک دینی و دنیوی فوائد ہیں جنہیں یہاں رقم کیا جاتا ہے۔

(i) اجتہاد کی بدولت پیش آنے والے نئے واقعات و مسائل کا وحی کے ساتھ رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔[۱۵۸]

(ii) اجتہاد کی بدولت ہی اسلامی تعلیمات کی کاملیت و اکملیت کی خوبی کا اظہار ہوتا ہے۔

(iii) اجتہاد اللہ کی ایسی نعمت لازوال ہے کہ جس کی وجہ سے اسلامی قانون کا دامن کبھی بھی انسانی تمدن کے روز افزوں تغیرات و ضروریات کے لیے تنگ نہیں ہوسکتا۔[۱۵۹]

(iv) اجتہاد کی بدولت ہی لوگ کافی حد تک غلط روی سے بچ جاتے ہیں اور اس طرح وہ شریعت کی حدود و قیود سے آزاد نہیں ہو پاتے۔

(v) اجتہاد ہی کی بدولت اسلام دنیا کے ہر خطے اور ہر نسل و زمانہ کے لوگوں کے لیے قابل عمل بلکہ واجب العمل نظام کی حیثیت اختیار کرتا ہے[۱۶۰] اور اس طرح اسلام کے عالمی و بین الاقوامی دین ہونے کی حقیقت کھلتی ہے۔

(vi) اجتہاد اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کی بدولت ہی یہ ممکن ہوا کہ علماء، فقہاء و مجتہدین کی علمی و عملی اور ذہنی و عقلی صلاحیتوں کا اظہار ہو سکے۔ اللہ کی نعمتوں کا اللہ کے راستے میں استعمال، یہ صلاحیتوں کی زکوٰۃ ہے۔

عصر حاضر اور اجتہاد:

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عصر حاضر میں جدید ٹیکنالوجی بالخصوص کمپیوٹر وغیرہ کی بدولت بھی اجتہاد کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ پہلے کسی چیز کو کتب میں تلاش کرنے کے لیے کئی کئی دن لگ جاتے تھے مگر اب چند لمحات میں دنیا کی اہم ترین لائبریریوں کو کھنگالا جا سکتا ہے۔ نیز جدید ذرائع مواصلات اور کمیونیکیشن وغیرہ کی بدولت علماء کرام باہمی مشاورت، علمی و فقہی تبادلۂ خیال بھی لمحوں میں کر سکتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی سے ہم چند دہائیوں سے مستفید ہو رہے ہیں اور اجتہاد کے آسان ہو جانے کی

باتیں کر رہے ہیں جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے تو مدت ہوئی یہ دعوی کیا تھا کہ قرونِ اولیٰ کی نسبت اب اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ادنیٰ شعور کے مالک شخص کے لیے بھی یہ بات سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ آج متاخرین کے لیے جس قدر اجتہاد آسان ہو گیا ہے اس قدر متقدمین کے لیے آسان نہ تھا کیونکہ آج قرآن مجید کی بے شمار تفاسیر لکھی جا چکی ہیں جن تک ہماری رسائی بھی ممکن ہے۔ اسی طرح کتب احادیث مع شروح ہمارے پاس موجود ہیں، احادیث کی چھان پھٹک ہو چکی ہے، رواۃ بارے توثیق وتضعیف کے فیصلے کیے جا چکے ہیں لہٰذا متاخرین کے لیے متقدمین کی نسبت اجتہاد زیادہ سہل و آسان تر ہو چکا ہے اور اس حقیقت کا انکار کوئی عقل سلیم کا مالک شخص نہیں کر سکتا۔'' [١٦١]

فصل دوم:

تاریخِ اجتہاد

آغازِ اجتہاد:

اسلام میں اجتہاد کا آغاز کس سن میں ہوا اور اس کی ضرورت کب محسوس کی گئی، اس بارے وثوق کے ساتھ تو کچھ کہنا مشکل ہے البتہ اگر رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کو تسلیم کیا جائے تو پھر یقیناً رسول اللہ ﷺ شروع سے ہی حسبِ ضرورت اجتہاد کرتے رہے ہوں گے لیکن قابل غور بات یہ بھی ہے کہ نبوت کے ابتدائی سالوں میں تو اجتہاد کی ضرورت ہی نہ پڑی ہوگی کیونکہ مکی سورتوں میں عقائد و اخلاق بارے زیادہ تر تعلیمات نازل ہوئیں اور ان کی ہی آپ ﷺ دعوت و تبلیغ کر کے تزکیۂ نفوس کرتے رہے۔ یوں بھی مکہ میں مسلمانوں کے لیے اگر مسائل تھے تو محض کفار کی طرف سے آنے والے مصائب و آلام تھے جبکہ مدینہ منورہ آکر دیگر معاشرتی مسائل بارے ہدایات قرآنی کا نزول ہونے لگا اور پھر مسلسل ہوتا رہا۔ اب مدینہ کو اسلامی ریاست کی حیثیت حاصل ہونے والی تھی، یہود کے ساتھ واسطہ پڑنے کی وجہ سے بین الاقوامی ہدایات کی بھی ضرورت تھی تو جہاں قرآن مجید نازل ہوتا رہا وہاں یقیناً اس کے احکام کی موقع و محل پر تطبیق کے لیے نبی اکرم ﷺ کو اجتہاد کی ضرورت بھی پڑتی ہوگی۔

ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے مکی دور میں آپ ﷺ کو ہدایات قرآنی کے ذریعے ابھی اجتہاد کے لیے ضروری صلاحیت عطا کی جا رہی تھی۔ مقاصدِ شریعت القا کیے جا رہے تھے اور ادھر آپ ﷺ مدینہ آ گئے ادھر اجتہاد کی ضرورت بھی پیش آنے لگی۔

ڈاکٹر محمد یوسف کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو باقاعدہ اجتہاد کی اجازت ۵ھ میں اس وقت دی جب آپ ﷺ نے مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کو مختلف علاقوں کی طرف عامل بنا کر بھیجا تو انہیں اسلامی ذمہ داریوں کے ساتھ عدالتی ذمہ داریاں بھی دیں لہٰذا لامحالہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لوگوں کے مسائل حل کرنے تھے اور بسا اوقات ایسا مسئلہ سامنے آ سکتا تھا جس بارے قرآن و سنت خاموش ہوں یا عمال صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس متعلقہ مسئلہ بارے قرآن و سنت کی ہدایات نہ ہوں تو آپ ﷺ نے انہیں اجتہاد کرنے کی اجازت دے دی یعنی وہ درپیش مسئلہ سے متعلق

شریعت کا نقطۂ نگاہ جاننے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کسی نتیجہ تک پہنچنے کی سعی وکوشش کریں۔[۱۶۲]

صحیح بات یہ ہے کہ باقاعدہ اجتہاد کی اجازت آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اگرچہ ۵ھ میں دی لیکن اس سے بھی قبل صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً غزوۂ احزاب کے فوراً بعد فرمانِ رسول ﷺ ''لایصلین احد العصر الا فی بنی قریظه ''[۱۶۳] (تم میں سے کوئی شخص بنو قریظہ میں پہنچے بغیر نمازِ عصر نہ پڑھے)۔ بارے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دو گروہ اور دو طرزِ عمل سامنے آئے تھے۔[۱۶۴]

رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد:

رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد بارے علماء امت کی مختلف آراء ہیں۔ احناف کے نزدیک نبی ﷺ کو حکم الٰہی تھا کہ کوئی نیا واقعہ یا حادثہ پیش آنے پر وحی آنے کا انتظار کریں اور اگر وحی نہ آئے تو پھر اجتہاد کریں اور اگر آپ ﷺ کو اجتہاد کرنے کے بعد اس پر ہی برقرار رکھا جائے تو وہ ہمارے لیے حجت ہوگا[۱۶۵] اور اس کی مخالفت جائز نہ ہوگی۔ جبکہ اکثر اصولیوں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ وحی کا انتظار کیے بغیر مطلق طور پر اجتہاد کرنے پر مامور تھے۔ مگر اشاعرہ، اکثر معتزلہ اور متکلمین کے نزدیک احکام شرعیہ میں اجتہاد کرنا آپ ﷺ کے لیے جائز ہی نہ تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ محض حربی امور میں آپ ﷺ کو اجتہاد کی اجازت تھی۔

ان تمام اقوال میں راجح قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دنیوی، شرعی اور حربی امور وغیرہ میں اجتہاد کیا ہے[۱۶۶] ذیل میں آپ ﷺ کے مجتہد ہونے کے عقلی اور نقلی دلائل ذکر کیے جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے مجتہد ہونے کے عقلی دلائل:

علماء امت نے آیات واحادیث میں مطالعہ کر کے نئے کلیات کا استنباط کیا اور فروع وجزئیات کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کر دیں تو کیا خود صاحب قرآن وحدیث اس صلاحیت سے محروم ہی کر دیے گئے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ ﷺ نے کبھی اجتہاد نہیں کیا تو پھر نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ ﷺ محض مبلغ کی حیثیت رکھتے تھے حقیقت یہ ہے کہ جس صلاحیت سے علماء امت کو نوازا گیا اس خیر سے محمد رسول اللہ ﷺ کو کیونکر محروم رکھا گیا ہوگا[۱۶۷] نیز ''العلماء ورثة الانبياء ''[۱۶۸] (علماء انبیاء کے وارث ہیں)۔ کے مطابق علماء انبیاء کے وارث ہیں لہٰذا جب علماء کو اجتہاد کی اجازت ہے تو گویا

اجتہاد بھی اسی میراث کا ہی حصہ ہے جو انبیاء نے چھوڑی لیکن اگر یہ کہا جائے کہ انبیاء نے اجتہاد ہی نہیں کیا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ اجتہاد انبیاء کی میراث سے ہی نہیں اور علماء کو انبیاء کی میراث سے ایک زائد چیز ملی جس سے حضرات انبیاء کرام محروم رہے[۱۶۹] (العیاذ باللہ) جبکہ ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ ایک طبیب طب کے اصول وقواعد کا گہرا مطالعہ کرنے اور پھر اپنی عملی ممارست کے بعد طبی اجتہاد کے قابل ہو جاتا ہے۔ایک معمار اپنے ہنر میں کامیابی کے بعد کئی طرح کے تاج محل بنانے کے قابل ہو جاتا ہے تو کیا نورِ نبوت سے ایک نبی میں اجتہادی بصیرت پیدا نہیں ہو پاتی اگر آپ ﷺ کو محض مبلغ ہی مانا جائے تو یہ نبوت کا ایک میکانکی تصور ہوگا اور یہ عقیدہ اتنا غیر اسلامی نہیں جتنا کہ یہ غیر عقلی اور غیر واقعی ہے۔[۱۷۰]

رسول اللہ ﷺ کے مجتہد ہونے کے نقلی دلائل:

ذیل میں آپ ﷺ کے مجتہد ہونے کے واقعی اور نقلی دلائل وامثلہ ذکر کیے جاتے ہیں جو آپ ﷺ کے نبی ورسول ہونے کے ساتھ ساتھ مجتہد بھی ہونے کی حیثیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

(i) رسول اللہ ﷺ کو اجتہاد کرنے کا حکم الٰہی:

قرآن مجید میں ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ﴾[۱۷۱]

''اے (بصیرت کی) آنکھیں رکھنے والو! عبرت پکڑو۔''

یہاں اعتبار سے مراد قیاس کرنا ہے[۱۷۲] اور قیاس اجتہاد ہی کا نتیجہ وثمرہ ہوتا ہے اور یہاں خطاب اولی الابصار سے ہے اور رسول ﷺ سے بڑھ کر صاحبِ بصیرت کون ہوسکتا ہے لہٰذا یہاں رسول اللہ ﷺ کو بھی قیاس واجتہاد کرنے کا حکم بالاولیٰ دیا گیا ہے[۱۷۳] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾[۱۷۴]

''اور اپنے کاموں میں ان سے مشاورت کیا کرو۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشاورت کا حکم دیا ہے اور ظاہر ہے کہ مشاورت اس معاملہ میں نہیں ہوتی جس کا حکم منصوص ہو بلکہ مشاورت اجتہادی معاملہ میں ہی ہوسکتی ہے[۱۷۵] اور جب مشاورت کے نتیجہ میں کوئی رائے اجتہاد سے طے ہو جائے تو اس پر عمل کرنے کا حکم

اگلے الفاظ میں یوں دیا گیا:

﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾[۱۷۶]

''اور جب (کسی کام کا) عزم مصمم کرلو تو خدا پر بھروسہ رکھو۔''

معلوم ہوا رسول اللہ ﷺ کو اجتہاد کرنے کا اللہ کی طرف سے حکم بھی ملا ہے۔

(ii) رسول اللہ ﷺ کا دنیوی امور میں اجتہاد:

رسول اللہ ﷺ نے دنیوی امور میں اجتہاد کیا ہے جس طرح کہ معروف ہے کہ جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ذاتی اجتہاد کی بناء پر ''عمل تلقیح'' (نر اور مادہ کھجور کا باہم ملاپ کرانا) سے منع کر دیا لیکن جب پھل کی مقدار گزشتہ سالوں کی نسبت کافی کم حاصل ہوئی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کی وجہ پوچھی انہوں نے جواباً کہا: آپ ﷺ نے ہمیں ''عمل تلقیح'' سے منع کیا تھا حالانکہ اس سے پھل عمدہ اور وافر ہوتا تھا۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''انتم اعلم بامر دنیاکم وانا اعلم بامر دینکم''[۱۷۷]

''تم اپنے امورِ دنیا بارے زیادہ علم رکھتے ہو اور میں تمھارے دینی معاملات بارے زیادہ علم رکھتا ہوں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تلقیح کا عمل خالص دنیوی اور تجربہ کی بنیاد پر تھا جس سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی اجتہاد و رائے سے منع کر دیا مگر جب اس ممانعت میں نقصان کا پہلو نظر آیا تو اجتہاد ہی کی بدولت پھر اس عمل تلقیح کی اجازت دے دی۔

(iii) حربی امور میں اجتہاداتِ رسول ﷺ:

بالاتفاق رسول اللہ ﷺ نے حربی امور میں بعض اوقات اجتہاد کیا ہے[۱۷۸] جس کے لیے درج ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یوم بدر کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک مقام پر ٹھہرانے اور خیمہ زن ہونے کا ارادہ کیا تو حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں بتلایئے کیا یہ مقام ایسا ہے جس کے بارے میں وحی نازل ہوئی ہے اور ہمیں یہ اختیار نہیں کہ ہم آگے بڑھیں یا پیچھے

ہٹیں، یا یہ ایک رائے اور جنگی تدبیر ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"بل هو الرای والحرب والمکیدة"

"بلکہ یہ تو محض رائے اور جنگی چال ہے۔"

اور پھر آپ ﷺ نے حضرت حباب رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو پسند فرماتے ہوئے اسے ہی اختیار کرلیا[۱۷۹] اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے پہلی رائے ذاتی اجتہاد کی روشنی میں قائم کی تھی جسے بعد میں اجتہاد ہی کی بدولت بدل دیا۔

ii۔ اسی طرح غزوۂ احزاب کے موقع پر جب آپ ﷺ نے کفار کی جماعتوں میں سے ایک جماعت کے سردار عیینہ بن حصن کو کچھ دے دلا کر واپس کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے انصار صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس بارے مشورہ کیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر آپ ﷺ کو اس چیز کا حکم دیا گیا ہے تو آپ اللہ کا حکم پورا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لو کنت اُمِرتُ بشیٔ لم استأمر کما ولکن هذا رأی، اعرضه علیکما"

"اگر مجھے کسی بات کا حکم دیا گیا ہوتو پھر میں تم سے مشورہ نہیں کرتا لیکن یہ تو (میری) رائے ہے جسے میں نے تمھارے سامنے پیش کیا ہے۔"

اس پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہمیں یقین ہے کہ آپ ﷺ جن لوگوں کو یہ تازہ پھل بھیجنا چاہتے ہیں وہ انہیں چکھیں گے بھی نہیں بلکہ وہ پھل فروخت کر دیں گے یا کسی اور کو دے دیں گے۔ لہٰذا ہم انہیں اپنے کھانے کی چیز کیوں دیں ۔ ہم تو انہیں صرف اپنی تلواروں کا مزا چکھانا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فنعم اذاً. (ہاں تو پھر ٹھیک ہے)۔[۱۸۰] معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے حربی معاملات میں اجتہاد کیا ہے اور اگر زیادہ فائدہ کسی دوسری رائے میں نظر آیا تو اپنی رائے کو چھوڑتے ہوئے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے کو بھی اختیار کیا ہے۔

(iv) رسول اللہ ﷺ کا قضایا میں اجتہاد:

اسی طرح بالاتفاق رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے معاملات میں فیصلہ کرتے ہوئے بھی ذاتی اجتہاد سے کام لیا ہے جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

" انکم تختصمون الیّ فلعل بعضکم ان یکون الحن بحجته من

بعض فاقضی له علی نحو ما اسمع منه ، فمن قطعت له من حق اخیه شیئا فانما اقطع له قطعة من النار "[١٨١]

"بے شک تم لوگ میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہو اور تم میں سے کبھی کوئی شخص اپنی دلیل پیش کرنے میں زیادہ تیز زبان واقع ہوتا ہے لہٰذا میں اس کی بات سن کر کبھی اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں تو یاد رکھو جس شخص کو میں نے اس کے بھائی کا حق (اس کی چرب زبانی کی وجہ سے) دے دیا تو گویا میں نے اسے جہنم کا قطعہ دے دیا۔"

امام اسنوی رحمہ اللہ (م ۷۷۲ھ) نے قضایا میں رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کرنے بارے اجماع نقل کیا ہے۔ آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اما الاقضية فيجوز الاجتهاد فيها بالاجماع".[١٨٢]

"رہے لوگوں کے درمیان فیصلے تو ان میں (آپ ﷺ کا) اجتہاد بالاتفاق جائز ہے۔"

(v) رسول اللہ ﷺ کے شرعی امور میں اجتہادات:

مدینہ پہنچنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے اجتہاد سے بیت المقدس کو اس بنیاد پر قبلہ قرار دیا کہ جہاں کوئی متعین رہنمائی اللہ کی طرف سے نہیں آئی وہاں گزشتہ شریعت کی سنن کی ہی اتباع کی جائے پھر آپ ﷺ کا بیت اللہ کے قبلہ بننے کی خواہش رکھنا بھی اجتہاد ہی کی بدولت تھا کیونکہ آپ ﷺ کا خیال تھا کہ اسلام دین ابراہیمی کا ہی تکملہ ہے لہٰذا وہی قبلہ ہونا چاہیے جو دین ابراہیمی میں تھا۔[١٨٣] ھدی کو حرم میں لانا اعمال حج سے ہے جو حج قران میں لازم ہے۔ آپ ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر ھدی (قربانی) مدینہ سے اپنے ساتھ مکہ لائے تھے جس پر بعد میں آپ ﷺ نے حسرت کا اظہار یوں کیا:

" لو استقبلت من امری مااستدبرت ما اهديت ولو لا ان معی الهدی لاحللت"[١٨٤]

"اگر مجھے اپنے اس معاملے کا پہلے علم ہو جاتا تو میں قربانی ساتھ نہ لاتا اور اگر میرے ساتھ قربانی کا جانور نہ ہوتا تو میں احرام اتار دیتا (مراد حالتِ احرام سے نکل جاتا)۔"

ظاہر ہے کہ اگر آپ ﷺ قربانی حکمِ الٰہی سے ساتھ لائے تھے تو یوں ندامت کا اظہار کبھی نہ کرتے [۱۸۵] یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ آپ ﷺ قربانی کا جانور اپنے اجتہادی فیصلے کی بدولت ہی ساتھ لائے تھے۔ قرآن مجید میں بیک وقت دو بہنوں کو عقد نکاح میں لانے سے منع کر دیا گیا ہے [۱۸۶] آپ ﷺ نے اس حکم قرآنی کے ساتھ اجتہاداً خالہ اور بھانجی یا پھوپھی اور بھتیجی کے اجتماع کو بھی ملحق کر دیا ہے کیونکہ مضرت کا پہلو تینوں صورتوں میں یکساں ہے۔ [۱۸۷]

(vi) سیاستِ شرعیہ کے تحت رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد:

رسول اللہ ﷺ نے سیاست شرعیہ [۱۸۸] سے متعلقہ امور میں بھی اجتہاد کیا ہے آپ ﷺ نے حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کو جھنڈا دے کر اس شخص کی طرف بھیجا جس نے اپنے باپ کی منکوحہ سے شادی کر لی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے قتل کرنے اور اس کا مال قبضہ میں کر لینے کا حکم دیا [۱۸۹] اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ یہ سزا آپ ﷺ نے زنا کی عام سزاؤں سے ہٹ کر دی ہے جو دراصل اس جرم کے عظیم ہونے کی وجہ سے ہے [۱۹۰] اسی طرح آپ ﷺ نے مانعینِ زکوٰۃ بارے فرمایا کہ ہم ان کا مالِ زکوٰۃ زبردستی وصول کریں گے نیز ان کا مزید نصف مال بھی لیں گے [۱۹۱] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان بن عبداللہ لکھتے ہیں:

"هذه سياسة شرعية و ليست من الفقه العام" [۱۹۲]

"ان فیصلوں کا تعلق سیاست شرعیہ سے ہے اور یہ عام فقہ اسلامی کے قواعد سے ہٹ کر ہیں۔"

نیز اسی طرح آپ ﷺ کا مالِ غنیمت سے خیانت کرنے والے شخص کو اس کے حصے سے محروم کرنا اور اس کے دیگر سامان کو بھی جلا دینا سیاست شرعیہ کے طور پر تھا۔ [۱۹۳]

مذکورہ بالا امثلہ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ رسول ﷺ نے بھی بعض مواقع پر اجتہاد کیا ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے نہ صرف دنیوی و حربی امور میں اور قضایا میں اجتہاد کیا ہے بلکہ بسا اوقات شرعی امور میں اور سیاست شرعیہ کے تحت بھی اجتہادات کیے ہیں مذکورہ بالا امثلہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض مواقع پر آپ ﷺ کی رائے الٰہی رائے کے موافق نہ ہوئی تو وحی جلی کے ذریعہ اس رائے کو تبدیل کرنے کا حکم دیا گیا یا کم از کم آپ ﷺ کی رائے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ لیکن اس سلسلہ میں یاد رکھنے کی اہم بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ایسے اجتہادات میں سے کوئی بھی اجتہاد ایسا نہ تھا جو کسی چیز کے جائز و ناجائز یا حلال و حرام میں سے کسی ایک

کی تعیین بارے ہو بلکہ دراصل وہ صحیح اور اصح یا جائز اور افضل کے درمیان تھا لٰہذا جب آپ ﷺ نے اصح کے مقابلہ میں صحیح یا افضل کے مقابلہ میں جائز کو اختیار کیا تو بذریعہ وحی آپ ﷺ کو اس بارے متنبہ کر دیا گیا[۱۹۴] اور یہ اس لیے کہ افضل الناس کی معمولی غلطی ولغزش بھی رب کو گوارا نہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے:

"حسنات الابرار سیئات المقربین ." [۱۹۵]

"عام لوگوں کی نیکیاں مقربین کے لیے، درجہ میں برائیوں کی حیثیت رکھتی ہیں ۔"

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے بعض مواقع پر یقیناً اجتہاد کیا ہے مگر آپ ﷺ کے اجتہادات اور دیگر مجتہدین کے اجتہادات میں بعض اہم فروق درج ذیل ہیں:۔

(i) عام مجتہدین اکثر طور پر کسی چیز کے جائز و ناجائز یا حلال وحرام کے بارے میں اجتہاد کرتے ہیں مگر آپ ﷺ کے وہ اجتہادات جن کا وحی کے ذریعہ معارضہ کیا گیا، ان کا تعلق محض صحیح اور اصح یا جائز وافضل کے درمیان تھا۔

(ii) آپ ﷺ کے وہ اجتہادات جن پر اللہ نے مواخذہ یا متنبہ کیا وہ وحی آنے کے بعد بھی قانونِ شریعت کا حصہ ہی رہے جیسا کہ قیدیانِ بدر سے فدیہ لینے کا معاملہ ہے البتہ کسی مجتہد کا اجتہاد اگر خلاف نص ثابت ہو جائے تو اس سے رجوع ازبس ضروری ہے۔[۱۹۶]

(iii) کسی بھی مجتہد کا اجتہاد شریعت کا درجہ نہیں رکھتا مگر آپ ﷺ کے اجتہادات انجام کار کے اعتبار سے وحی خفی کی حیثیت رکھتے ہیں نیز ہمیشہ کے لیے شریعت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کے اجتہادات میں اگر غلطی ہو تو اللہ کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے اور اگر اس اجتہاد پر اللہ کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوتا تو یہی اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے اس اجتہاد پر راضی ہیں۔ اسی بات کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے یوں ذکر کیا ہے:

" اجتهاده بمنزلة الوحی لان الله تعالیٰ عصمه من ان یتکرر رایه علی الخطاء " [۱۹۷]

"آپ ﷺ کا اجتہاد بمنزلہ وحی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس بات سے محفوظ کر دیا ہے کہ آپ ﷺ غلطی پر برقرار رہیں۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درج ذیل قول سے بھی دراصل یہی مراد ہے:

" ان الرای انما کان من رسول الله صلی الله علیه وسلم مصیباً لان الله

كان يريه وانما هو منا الظن والتكلف ." [۱۹۸]

''بلاشبہ رائے تو رسول اللہ ﷺ کی ہی درست ہوتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو درست راہ دکھا دیتا تھا جبکہ ہماری رائے تو محض ظن وتخمین پر ہی مبنی ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا منہج اجتہاد:

رسول اللہ ﷺ نے بوقتِ ضرورت اجتہاد کیا اور آپ ﷺ کے اجتہادات کی نظائر وامثال کو سامنے رکھ کر ہی بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک مجتہدین اجتہاد کرتے رہے ہیں اور آپ ﷺ نے اجتہاد میں جن امور کا لحاظ کیا اور جس اجتہادی منہج پر چلے اسی کو بعد میں فقہاء نے با قاعدہ علم وفن کی حیثیت سے مدون کیا لہٰذا آپ ﷺ نے اجتہاد کرتے ہوئے پہلے سے طے شدہ اور لگے بندھے اصول وضوابط کو ملحوظ نہیں رکھا[۱۹۹] اور ایسا اس لیے ہے کہ پیغمبر کو کتاب کے ساتھ ساتھ فہم کتاب، انتہا درجہ کی حکمت و دانائی اور فہم وبصیرت سے اللہ کی طرف سے خصوصی طور پر نوازا جاتا ہے جس کی دلیل میں درج ذیل آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام بارے فرماتے ہیں:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ﴾[۲۰۰]

''اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہی سے ہدایت دی تھی۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام بارے فرمایا:

﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾[۲۰۱]

''ہم نے فیصلہ (کرنے کا طریق) سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا۔''

اور پھر حضرت داود علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں بارے فرمایا:

﴿ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ﴾[۲۰۲]

''اور ہم نے دونوں کو حکم (یعنی حکمت ونبوت) اور علم بخشا تھا۔''

ہمارے پیارے پیغمبر حضرت محمد رسول ﷺ بارے فرمایا

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ﴾[۲۰۳]

''(اے پیغمبر ﷺ) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے، تاکہ خدا کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات فیصل کرو۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ﴾[۲۰۴]

''اور خدا نے تم پر کتاب اور دانائی نازل فرمائی ہے۔''

گویا پیغمبر کو اجتہاد کے لیے پہلے سے متعین اصول وضوابط کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تاہم اگر آپ ﷺ کے اجتہادات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو آپ ﷺ کا منہج اجتہاد بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

آپ ﷺ پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے اپنی خدا داد اجتہادی صلاحیت وبصیرت کے ساتھ قرآن مجید سے استدلال کرتے رہے، اس لیے کہ شریعت کا مصدر اول قرآن ہی ہے اسی طرح آپ ﷺ کے اجتہادات میں ہمیں قیاس، استحسان، مصلحت، شرع ماقبلنا، سد الذرائع، صالح عرف و عادت اور استصحاب کی بنیادیں ملتی ہیں، رہی آپ ﷺ کی حدیث وسنت تو وہ امت کے لیے مصدر شریعت کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح رسول کو کسی اجماع کے منعقد کرانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ رسول کا ذاتی وجود مسعود ہی امت کے لیے حجت ہوا کرتا ہے۔[۲۰۵] رسول اللہ ﷺ کے منہج اجتہاد کے حوالے سے ایک اہم بحث یہ ہے کہ کیا آپ ﷺ نے مصلحت کی بنیاد پر اجتہاد کیا ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک رسول ﷺ نے محض اجتہاد بالقیاس کیا ہے اور اجتہاد بالمصلحت نہیں کیا[۲۰۶] جبکہ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مصلحت کی بنیاد پر بھی کئی مواقع پر اجتہاد کیا ہے۔[۲۰۷] آپ ﷺ کے مصلحت کی بنیاد پر کیے گئے چند اجتہادات کو بطور امثلہ یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(i) آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ''عمل تلقیح'' سے منع کر دیا تھا مگر اگلے سال پھل تھوڑا آیا تو آپ ﷺ نے ''انتم اعلم بامور دنیاکم'' (تم اپنے امور دنیا بارے بہتر سمجھتے ہو) کہہ کر انہیں پھر سے اجازت دے دی[۲۰۸] اس اجازت میں آپ ﷺ نے سراسر جلب منفعت یعنی لوگوں کی مصلحت ہی کو تو ملحوظ رکھا ہے۔[۲۰۹]

(ii) اسی طرح آپ ﷺ نے بیت اللہ کو ابراہیمی بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لیے گرانے کا پروگرام بنایا مگر آپ ﷺ اس لیے باز رہے کہ اہل مکہ جو کہ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے کہیں آپ ﷺ کے اس اقدام کی وجہ سے متنفر ہو کر مرتد نہ ہو جائیں[۲۱۰] اس حدیث بارے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (م۸۵۲ھ) رقم طراز ہیں:

''یستفاد منه ترک المصلحة لامن الوقوع فی المفسدة و منه انکار ترک

المنكر خشية الوقوع فی أنکر منه ."[۲۱۱]

"معلوم ہوا کہ کسی خرابی میں واقع ہونے سے محفوظ رہنے کے لیے کسی مصلحت و مفاد کو ترک کیا جا سکتا ہے اور اس سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ کسی برائی کو روکنے یا ترک کرنے سے جب اس سے بڑی برائی میں واقع ہونے کا خدشہ ہو تو چھوٹی برائی کو برداشت کرنا چاہیے۔"

(iii) اسی طرح جب آپ ﷺ نے مکہ کو حرم قرار دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "لا یختلی شوکها ولا یعضد شجرها" (نہ تو اس کے کانٹوں کو اکھیڑا جائے اور نہ ہی اس کے درختوں کو کاٹا جائے۔) تو آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ "اذخر" بوٹی کو کاٹنے کی اجازت دے دیں کیونکہ اس کا استعمال ہماری مجبوری ہے آپ ﷺ نے "الا الاذخر" کہہ کر اس کے کاٹنے کی اجازت دیدی[۲۱۲] اس حدیث بارے علماء نے لکھا ہے کہ:

" هذا الحديث يدل على انه صلى الله عليه وسلم لما بين له العباس الحاجة الى الاذخر اباحه با لاجتهاد للمصلحة [۲۱۳]

"یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے "اذخر" بوٹی کی ضرورت واحتیاج کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے اجتہاد کرتے ہوئے انسانی مصلحت کے پیش نظر اسے مباح قرار دے دیا۔

اس بحث کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ھ) کی درج ذیل عبارت پر ختم کیا جاتا ہے:

" ليس يجب ان يكو ن اجتهاده استنباطا من المنصوص كما يظن، بل اكثره ان يكون علمه الله تعالى مقاصد الشرع و قانون التشريع و التيسير والاحكام فبين المقاصد المتعلقات با لوحى بذلك القانون."[۲۱۴]

"یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا اجتہاد لازماً کسی نص سے ہی مستنبط ہو جس طرح کہ عموماً سمجھ لیا گیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مقاصد شریعت، قانونِ شریعت سازی، شریعت سازی میں انسانوں کو سہولت دینے اور احکام شریعت کا علم عطا کیا تھا جس کی روشنی میں آپ ﷺ نے اس (نئے) قانونی فیصلہ میں وحی سے متعلقہ مقاصد کو واضح کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کی حکمت:

اللہ تعالیٰ اگر چاہتے تو عہد نبوت کے ہر مسئلہ کا حل وحی کے ذریعہ بتا دیتے:

"وما ذلک علی اللہ بعزیز و ھو علی کل شئی قدیر"

"اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل بھی نہیں وہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ آپ ﷺ کو امت کے لیے ہر لحاظ سے کامل و اکمل اسوہ و نمونہ بنایا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ کو منظور یہ ہوا کہ آپ ﷺ امت کے لیے دین کے شعبہ اجتہاد میں بھی اپنا اسوہ رہتی دنیا تک کے لیے چھوڑ کر جائیں لہٰذا رسول ﷺ نے بعض مواقع پر اجتہاد کیا گویا رسول ﷺ کے اجتہاد کرنے سے اصل مقصود تعلیمِ امت تھا[۲۱۵] تعلیمِ امت کی غرض سے ہی آپ ﷺ نے خود بھی اجتہادات کیے، اجتہاد کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت بھی کی، صحابہ رضی اللہ عنہم کی آراء کو بھی کئی مواقع پر قبول کیا[۲۱۶] صحابہ رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کا اجرو ثواب بتا کر ترغیبِ اجتہاد بھی دی [۲۱۷] بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی موجودگی میں اجتہاد کرنے کا حکم بھی دیا اور جن صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کا آپ ﷺ کو علم ہوا ان کے رد و قبول کا فیصلہ کر کے ان کی صحیح اجتہاد کی طرف رہنمائی بھی کی[۲۱۸] آپ ﷺ کے یہ سارے اقدامات دراصل اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں اجتہادی صلاحیت بیدار کرنے اور اسے مزید ترقی دینے کے لیے تھے تا کہ وہ وفات نبوی کے بعد پیش آمدہ مسائل کا حل شرعی بتا کر امت کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

عہد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد:

حیات نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کی اجازت بارے اصولیوں نے اختلاف کیا ہے[۲۱۹] عہد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے اجتہاد کی اجازت نہ ہونے کے دلائل دیتے ہوئے مصطفیٰ احمد زرقاء (م۱۹۹۹ء) لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ سے علم وحی حاصل کرتے تھے۔ چونکہ نبی ﷺ ان میں موجود تھے لہٰذا انہیں درپیش مسائل میں کوئی غور و فکر کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اس غور و فکر کا کیا فائدہ جو صواب و خطا کا محتمل ہو لہٰذا عصر نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فہم رسول اور توجیہ رسول پر ہی کلی اعتماد کرتے تھے۔[۲۲۰] مگر تاریخی شواہد سے یہی بات راجح لگتی ہے کی حیاتِ نبوی ﷺ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کی ضرورت بھی پیش آئی اور اس کی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے انہیں اجازت بھی تھی۔[۲۲۱] حتیٰ کہ نبی ﷺ کی

مجلس میں بھی اور آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں بھی اجتہاد کی اجازت تھی۔ اس لیے کہ آپ ﷺ نے بذات خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کا اجر و ثواب بتا کر اجتہاد کی نہ صرف ترغیب دی ہے۔[۲۲۲] بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کرنے کا حکم بھی دیا ہے مثلاً آپ ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا تھا ''درپیش مسائل کا فیصلہ کیا کرو'' تو انہوں نے کہا ''کیا میں آپ کی موجودگی کے میں بھی اجتہاد کروں؟'' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"نعم ان اصبت فلک اجران و ان اخطأت فلک اجر "[۲۲۳]

''ہاں! اگر تو درستگی کو پہنچا تو تمھارے لیے دوہرا اجر ہوگا اور اگر تم سے خطا سرزد ہوگئی تو بھی تمھارے لیے اکہرا اجر ہوگا۔''

اسی طرح آپ ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

"اجتهد فاذا اصبت فلک عشر حسنات و اذا اخطات فلک حسنة. "[۲۲۴]

''اجتہاد کرو، اگر (آپ نے) راہِ صواب کو پالیا تو دس نیکیوں کے مستحق ہو گے اور اگر اس اجتہادی فیصلہ میں خطا ہوگئی تو ایک نیکی کے پھر بھی مستحق ہو گے۔''

آپ ﷺ کے منصبِ نبوت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس کا فریضہ سرانجام دیا وہاں آپ ﷺ نے اپنے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عملِ اجتہاد کے لیے بھی تربیت و رہنمائی کی ہے مثلاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب ایک مرتبہ حالت روزہ میں بیوی کا بوسہ لے لیا تو ان کے استفسار پر نبی ﷺ نے فرمایا:

"ارایت لو تمضمضت ماء وانت صائم"[۲۲۵]

''تمھارا کیا خیال ہے اگر تم روزہ کی حالت میں کلی کر لو تو؟''

آپ ﷺ نے بوسہ لینے کو کلی کرنے پر قیاس کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ تعلیم دی کہ یوں قیاس کے ساتھ مسئلہ غیر منصوص کا شرعی حکم معلوم کیا جا سکتا ہے۔[۲۲۶]

مشہور حدیث ہے کہ جب رسول ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا تھا کہ ''کیف تقضی اذا عرض لک قضاء'' (اگر کوئی معاملہ پیش آ گیا تو تم فیصلہ کیسے کرو گے؟) تو انہوں نے جواباً کہا تھا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

اس پر رسول ﷺ نے سوال کیا کہ "فان لم تجد فی کتاب الله" (اگر تم کتاب اللہ میں حکم تلاش نہ کر سکے تو؟) تو معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ پھر سوال کرتے ہیں کہ "فان لم تجد فی سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا فی کتاب الله" (اور اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں سے رہنمائی حاصل نہ کر سکے تو؟) اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ایک تاریخی جواب دیا کہ "اجتهد راي ولا آلو۔" (میں اجتہاد کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کروں گا اور اس سلسلہ میں کوتاہی نہ کروں گا۔) رسول اللہ ﷺ نے یہ سنا تو خوشی سے معمور ہو کر ان کے سینے پر تھپکی دی اور پھر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا:

"الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لما یرضی رسول الله"[۲۲۷]

"ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے رسول اللہ کے نمائندہ کو ایسے کام کی توفیق دی جو رسول اللہ ﷺ کو راضی کر دینے والا ہے۔"

اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے استاذ محمد ابراہیم یوں رقم طراز ہیں۔

"اقراره صلوات الله وسلامه علیه وحثه علی الاجتهاد ان دل علی شئی فانما یدل دلالة قویةواضحة علیٰ انّ للاجتهاد فضلاً لا ینبغی لعاقل قادر ان یفرط فیه اویتهاون فی الحصول علی ثمرته وتحصیل غایته"[۲۲۸]

"آپ ﷺ کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ان کے منہج اجتہاد پر برقرار رکھنا اور انھیں اجتہاد کی رغبت دلانا اس بات پر قوی دلالت کرتا ہے کہ عمل اجتہاد نہایت فضیلت و مرتبہ والا کام ہے لہٰذا اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے کسی عقلمند عالم کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سلسلے میں کسی کوتاہی کا ارتکاب کرے یا اس کے ثمرات کے حصول کو حقیر و کمتر سمجھے۔"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ ﷺ اپنے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی اجتہادی تربیت بھی کریں۔ اور جب اس کے اثرات اپنے صحابی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ میں نظر آئے تو آپ ﷺ اللہ کے حضور تشکر کا اظہار کرتے ہیں نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بذات خود نبی ﷺ نے بوقت ضرورت اجتہاد کی اجازت عنایت فرمائی۔ گویا صحابہ نبی ﷺ سے دور ہوتے تو بوقت ضرورت اجتہاد کر سکتے تھے اور یہ اس لیے کہ اگر دور کے

صحابہ رضی اللہ عنہ معاملہ زیر بحث نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے تک اجتہاد ملتوی کر دیتے تو کئی ایک مصالح کے فوت ہو جانے کا قوی اندیشہ ہوتا[۲۲۹] یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے علاوہ بھی کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو دور دراز علاقہ جات میں بھیجا تو انہیں اجتہاد کی اجازت دی۔[۲۳۰]

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپ ﷺ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کا حکم دیا تھا[۲۳۱] اور مشورہ اس وقت تک صحابہ رضی اللہ عنہم نہ دے سکتے تھے جب تک اجتہاد نہ کریں۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف مواقع پر مشاورت کر کے انہیں اظہار رائے کے مواقع فراہم کیے[۲۳۲] اور یوں ان کی فکری صلاحیتوں کو بیدار کیا تاکہ کل کلاں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل بذریعہ اجتہاد کر سکیں۔ ذیل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کی چند امثلہ ذکر کی جاتی ہیں۔

عہد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کی امثلہ:

(i) غزوۂ احزاب سے واپسی پر جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنو قریظہ کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا تو فرمایا:

"لا يصلين احد العصر الا في بني قريظه"

"کوئی شخص بنو قریظہ تک پہنچے بغیر نماز عصر نہ پڑھے۔"

لیکن نماز عصر کا وقت جب راستے میں ہی ہو گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو گروہ ہو گئے۔ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو راستہ میں ہی نماز پڑھ لی اور یہ کہا کہ نبی ﷺ کا مقصد دراصل جلدی پہنچنا تھا نہ کہ یہ کہ نماز کو قضا کیا جائے جبکہ بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ حکم نبوی کے مطابق ہم تو بنو قریظہ میں ہی پہنچ کر نماز پڑھیں گے[۲۳۳] رسول ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی مگر آپ ﷺ نے سکوت کا اظہار فرمایا[۲۳۴] اور آپ ﷺ کا اظہار سکوت دراصل اظہار رضامندی ہے[۲۳۵] اس طرح دونوں گروہوں کے اجتہاد کو سند توثیق مل گئی۔

(ii) غزوۂ حنین میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک کافر کو قتل کیا اور اس کے متروکہ مال (سلب) کے مستحق ٹھہرے کیونکہ آپ ﷺ نے یہ اعلان کر رکھا تھا:

"من قتل قتيلا فله سلبه"[۲۳۶]

"جس نے کسی (کافر) کو قتل کیا تو اس کا مال اس (قاتل) کے لیے ہے۔"

مگر ایک آدمی نے کہا کہ اللہ کے رسول اس مقتول کا سلب میرے پاس ہے اور آپ ﷺ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس سے دے کر راضی کر لیں۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" لا ھـا الله اذن یعمد الی اسد من اسد الله یقاتل عن الله ورسوله فیعطیک سلبه"

"نہیں، خدا کی قسم! تب وہ اللہ کے شیروں میں سے کسی شیر کی جانب قصد کرے گا جو اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے لڑ رہا ہوگا، تو کیا وہ اپنا مال تمھیں دے دے؟"

یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا "صدق" (ابوبکر نے ٹھیک کہا ہے)۔[۲۳۷] اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اجتہاد کیا جس کا آپ ﷺ نے انکار کرنے کی بجائے تصویب فرمائی۔[۲۳۸]

مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حیاتِ نبوی ﷺ میں بھی عمل اجتہاد بوقت ضرورت مسلسل جاری رہا اور اس کی انجام دہی کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس یا آپ ﷺ سے دور ہونے کی شرط نہ تھی۔ البتہ یہ بات بھی ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ممکن حد تک اور خصوصاً ذاتی مسائل بارے نبی ﷺ سے ہی استفسار کی کوشش کیا کرتے تھے۔[۲۳۹] مگر جو مسائل اجتماعی یا فوری نوعیت کے ہوتے ان میں اجتہاد سے گریز نہ کیا جاتا تھا کیونکہ بسا اوقات ناگزیر حالات میں تاخیر سے کئی انسانی مصالح فوت ہو جاتیں۔[۲۴۰]

اجتہادات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک اہم خاصہ یہ ہے کہ ان کے اجتہادات جب عدالتِ نبوی سے توثیق و تائید کی سند حاصل کر جاتے ہیں تو وہ حدیث تقریری کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور یوں وہ دین یا فقہ اسلامی کے دو بنیادی مآخذ قرآن و حدیث میں سے حدیث و سنت کا ہمیشہ کے لیے حصہ بن جاتے ہیں یعنی وہ اجتہادات اصلاً تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہیں مگر فقہی و قانونی حیثیت سے اب سنت تقریری میں داخل ہیں[۲۴۱] اور یہ شرف بھی غالباً اجتہاداتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہی حاصل ہے کہ وہ بعض کتب احادیث میں مرفوع احادیث کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔[۲۴۲]

حیاتِ نبوی میں اجتہاد کی اجازت ہونے سے دو اہم نتائج نکلتے ہیں: ایک تو یہ کہ شریعت ہر حال میں مکلفین کے مصالح کی حفاظت چاہتی ہے، اسی لیے عہد نبوت میں باوجود اس کے کہ نزول وحی کا ہر وقت امکان تھا، اجتہاد کی اجازت دی گئی تاکہ انسانی مصالح کا حرج نہ ہو سکے۔[۲۴۳]

دوم یہ کہ جب زمانۂ وحی میں بھی اجتہاد کی ضرورت پیش آتی رہی تو بعد کے ادوار میں تو یقیناً اس کی ضرورت و اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ ضرورت قیامت تک کے لیے باقی رہے گی۔[۲۴۴]

عہد نبوی کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد:

گزشتہ بحوث میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کی فقہی اور اجتہادی انداز پر بنفس نفیس تربیت کی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ نبوت کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کی اجازت دی تو عہدِ نبوت کے بعد جب اسلامی ریاست وسعت پذیر تھی اور گونا گوں مسائل پیدا ہو رہے تھے تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی ذمہ داریوں سے کیوں کر غافل ہو سکتے تھے لہٰذا بوقت ضرورت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجتہاد کرتے رہے لیکن اس دور میں محض پیش آمدہ مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں تلاش کیا جاتا تھا، فرضی مسائل کو زیر بحث ہی نہ لایا جاتا تھا۔[۲۴۵] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے موقع پر صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد ایک لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے[۲۴۶] ان میں سے پندرہ سے بیس ہزار کے درمیان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام آج تاریخ کے ریکارڈ پر محفوظ ہیں[۲۴۷] اور یہ ریکارڈ سند حدیث کی برکت سے ہی ہمارے پاس محفوظ ہے ظاہر ہے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علمی، عملی، فکری اور ذہنی صلاحیتوں میں برابر نہ تھے اور اللہ تعالیٰ کا اصول بھی یہی ہے کہ اس نے صلاحیتوں میں تنوع اور تفاوت رکھا ہے لہٰذا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم درجہ اجتہاد پر فائز نہ تھے، جتنے تھے ان میں سے کم وبیش ایک سوتیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ و اجتہادات اور فقہی اقوال منضبط ہو سکے ہیں[۲۴۸] نا معلوم اور بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مجتہدین کے زمرہ میں آتے ہوں گے مگر فی الوقت مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذکورہ بالا تعداد سامنے آئی ہے، اگرچہ یہ تعداد بھی کوئی معمولی نہیں ہے۔

چونکہ ہر باصلاحیت مجتہد کو اجتہاد کی اجازت ہے اس لیے ایسا نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد محض خلفاء راشدین ہی اجتہاد کرتے رہے ہوں یا ان خلفاء نے دیگر مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کسی قسم کی پابندی لگا دی ہو نہیں بلکہ اس سلسلہ میں بڑی وسعت ظرفی سے کام لیا گیا۔ ایک عام آدمی تک کو خلیفہ کے کسی فیصلہ کو چیلنج کرنے کی اجازت تھی اور خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کے بعض فیصلوں کو چیلنج کیا بھی گیا اور اپنی غلطی کا احساس ہونے پر انہوں نے رجوع بھی کر لیا[۲۴۹] یہی باعث ہے کہ بعض معاملات پر یہ خلفاء کرام رضی اللہ عنہم دیگر مجتہدین کی رائے کے مطابق فتویٰ و فیصلہ دیتے ہیں جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طلاق بتہ بارے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کی پیروی کی[۲۵۰] مشہور ترین وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو عہد نبوی کے بعد اجتہاد کرتے رہے یہ ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ وغیرہ۔[۲۵۱]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمومی منہجِ اجتہاد:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت کا وہ عظیم گروہ اور جماعت ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ساری انسانیت میں سے چنا[۲۵۲] دین اسلام کی حفاظت و ترقی اور شجرِ اسلام کی آبیاری کے لیے انہیں بے پناہ ذہنی و عقلی اور فکری صلاحیتوں سے نوازا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت کی برکتوں سے بھی انہوں نے حصہ وافر پایا تھا اور مزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت نے انہیں کندن بنا دیا تھا اور ان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے تھے[۲۵۳] یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگر چہ ابھی تک اجتہاد کے اصول وضوابط کو فنی انداز میں مدون نہ کیا گیا تھا مگر اس کے باوجود مذکورہ بالا اسباب کی بناء پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہ آسانی و سہولت اجتہاد کرتے نظر آتے ہیں[۲۵۴] لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے جسے مانے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ قواعدِ اجتہاد اگر چہ فنی طور پر مرتب و مدون نہ ہوئے تھے مگر بہت سے اصولِ اجتہاد تک ان کے ذہنوں کی رسائی ہو چکی تھی[۲۵۵] جن کا کبھی انہوں نے اپنی زبانوں سے اظہار بھی کیا تھا[۲۵۶] بلکہ بعد میں جب اس فن کو باقاعدہ ترتیب دیا گیا تو دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کو ہی مدنظر رکھا گیا تھا[۲۵۷] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کا بنظر عمیق جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے درج ذیل منہج اجتہاد کو اختیار کیا ہوا تھا۔

(i) کتاب اللہ سے رہنمائی جس کا فہم بھی انہوں نے براہ راست مہبط وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا۔

(ii) سنت رسول سے رہنمائی۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے بھی تھی۔

(iii) قیاس کا استعمال جس طرح کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

(iv) مصلحت کا لحاظ جس کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کو دیکھا جاسکتا ہے۔[۲۵۸]

(v) شیخ محمد خضری رحمہ اللہ نے پہلے تین کے ذکر کے ساتھ ساتھ بجا طور پر اجماع کا بھی ذکر کیا ہے۔[۲۵۹]

(vi-vii-viii) ڈاکٹر نادیہ لکھتی ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات میں مصلحت، سد ذریعہ اور

براءۃ اصلیہ کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔[۲۶۰]

(ix) شیخ السایس نے ''اجتہاداتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ''استحسان'' کے استعمال کا بھی ذکر کیا ہے۔[۲۶۱]

ڈاکٹر معروف دوالیبی لکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نئے مسائل کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لیے درج ذیل امور کا لحاظ کیا:۔

(i) نئے مسائل کے مماثل قرآن وسنت کے احکام سے رہنمائی یعنی قیاس کا استعمال۔

(ii) احکام قرآن وسنت کی روح یعنی روح شریعت یا مقاصدِ شریعت کا لحاظ۔

(iii) درج ذیل دو اصول سامنے رکھے:

(الف) ''ماراہ المسلمون حسنا فھو عنداللہ حسن''

''جسے مسلمان اچھا سمجھتے ہوں تو وہ اللہ کے یہاں بھی اچھا ہے۔''

(ب) ''ان المصلحة حیثما وجدت فثم شرع اللہ'' [۲۶۲]

''جہاں مصلحت ہو (تو اس کا لحاظ) اللہ کی شریعت کا حصہ ہے۔''

ڈاکٹر طٰہٰ جابر فیاض العلوانی ''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' کے پہلے فقہی سیمی نار منعقدہ ۱۹۸۹ء بمقام پٹنہ کے اپنے مقالہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمومی منہج اجتہاد کو یوں واضح کرتے ہیں۔

''قرن اول میں جس طرح سے امت اسلامی کے مسائل اور ضرورت محدود تھی اسی طرح (علم) فقہ ان بہت سارے مسائل وذرائع کا بھی محتاج نہیں تھا جن کی ضرورت کا احساس بعد میں پیدا ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی مسئلہ کے سمجھنے اور اس کا حکم معلوم کرنے کے لیے قرآن کریم کی صرف تلاوت اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کار سے واقفیت ہی کافی تھی۔ ہاں اگر اس سے انہیں کوئی صریح اور واضح رہنمائی نہیں ملتی تو قواعد کلیہ، مقاصد شریعت نیز لوگوں کے مصالح اور ان کے نفع وضرر کو سامنے رکھ کر اجتہاد کیا کرتے تھے''۔[۲۶۳]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے درج ذیل الفاظ میں اپنے منہج اجتہاد کی وضاحت کی ہے:۔

''تم میں سے جس کے سامنے کوئی قضیہ آئے تو کتاب اللہ کے مطابق اس کا فیصلہ کرے، اگر کتاب اللہ میں اس بارے رہنمائی نہ پائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے حکم کے مطابق اس قضیہ کا فیصلہ کرے، اگر کوئی ایسا معاملہ آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں کچھ نہ ہو اور نہ ہی نبی اکرم ﷺ نے اس میں فیصلہ فرمایا ہو تو صالحین کے فیصلے کے مطابق حکم دے اگر اس معاملے میں کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور صالحین کے فیصلوں سے بھی کوئی حکم نہ ملے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے''[۲۶۴]

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جب کسی چیز کے بارے میں پوچھا جاتا تو اگر کتاب اللہ میں اس کے متعلق کوئی حکم پالیتے تو اسے بیان فرما دیتے۔ اگر کتاب اللہ سے رہنمائی لینے میں کامیاب نہ ہوتے اور نبی اکرم ﷺ سے منقول اس بارے کوئی حکم پاتے تو آپ رضی اللہ عنہ حکمِ رسول ﷺ بیان فرما دیتے۔ اگر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے بھی اس چیز کا حکم نہ ملتا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس چیز کے بارے میں کچھ فرمایا ہوتا تو اسے بیان کر دیتے۔ اگر قرآن و سنت سے کچھ نہ ملتا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی کچھ مروی نہ ہوتا تو اپنی اجتہادی رائے کا اظہار فرماتے۔[۲۶۵]

اجتہادی صلاحیت و بصیرت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان تفاوت:

اجتہادی صلاحیت بھی اللہ کی خصوصی دین ہے اور اس کا فضل ہے جیسا کہ اللہ رب العالمین ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾[۲۶۶]

''جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی۔''

یہاں اسی صلاحیت کو حکمت کے الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے نیز بتایا گیا ہے کہ جسے یہ حکمت اور بصیرت ملی تو وہ حقیقت میں خیر کثیر عطا کیا گیا ہے۔ اور یہ نعمتِ الٰہی حقیقت میں تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں ہوا ہے:

﴿ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ﴾[۲۶۷]

''اور خدا سے ڈرو اور (دیکھو کہ) وہ تم کو (کیسی مفید باتیں) سکھاتا ہے۔''

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا ﴾[۲۶۸]

''مومنو! اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لیے امر فارق پیدا کر دے گا۔''

اور اس صلاحیت کی اہمیت بارے امام ابن قیم رحمہ اللہ یوں رقم طراز ہیں:

"صحة الفهم نور يقذفه الله في قلب العبد يميزبه بين الصحيح والفاسد والحق والباطل والهدى والضلال والغي والرشاد" [۲۶۹]

''فہم کا درست ہونا وہ نور اور روشنی ہے جسے اللہ تعالیٰ کسی بندے کے دل میں القا کر دیتا ہے جس کی بدولت وہ بندہ صحیح اور غلط، حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔''

بیشتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اجتہادی صلاحیت و بصیرت موجود تھی کیونکہ یہ بات ہمارے مشاہدہ کی ہے کہ ایک طبیب حاذق جو اپنے تلامذہ کی تعلیم و تربیت فنی بھی کر رہا ہو اس کے شاگرد اپنے استاد کے ساتھ طویل عرصہ گزارنے کے بعد اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ مختلف ادویات کے خواص و اثرات سے واقف ہو جائیں جو اس طبیب کے زیر استعمال رہیں اور نہ صرف ان کے خواص و اثرات سے واقف ہو جائیں بلکہ اس میں مزید اضافے بھی کر سکیں۔ بالکل یہی مثال حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے دی جا سکتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو ذہین و فطین تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عرصہ تک رہنے اور نبوی تعلیم و تربیت کی وجہ سے انہوں نے احکام کے مقاصد اور حکمتِ شریعت کو اچھی طرح جان لیا تھا۔ چونکہ انہوں نے چشمۂ نبوت سے براہ راست استفادہ کیا تھا لہٰذا ان سے بڑھ کر مزاج شناس نبوت کون ہو سکتا ہے۔[۲۷۰]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عموماً اور خصوصاً خلفاء کرام کو اجتہادی بصیرت حاصل ہونے کے اسباب درج ذیل ہیں:۔

i۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نصوص کے موقع و محل کا براہ راست مشاہدہ کیا تھا۔

ii۔ انہیں دین میں تقدم حاصل تھا۔

iii۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے وہ فیض یاب ہوئے تھے۔

iv۔ انہوں نے نزولِ قرآن کے احوال اور شریعت کے اسرار کا مشاہدہ کیا تھا۔

v۔ انہیں اسبابِ نزولِ آیات کی معرفت حاصل تھی۔[۲۷۱]

اللہ رب العزت نے تمام اشیاء میں اصولِ تفاوت کا لحاظ کیا ہے مثلاً انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾[۲۷۲]

''یہ پیغمبر (جو ہم وقتاً فوقتاً بھیجتے رہے ہیں) ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔''

پھلوں کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ﴾[۲۷۳]

''اور ہم بعض میووں کو بعض پر لذت میں فضیلت دیتے ہیں۔''

ملائکہ میں جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت علیہم السلام کا رتبہ باقی سب سے زیادہ ہے اسی لیے خصوصیت سے ان کا تذکرہ قرآن وحدیث میں ملتا ہے۔[۲۷۴] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں مال ودولت کے اعتبار سے تفاوت کا لحاظ کیا ہے جیسا کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾[۲۷۵]

''ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے۔''

اس تفاوت میں یقیناً اللہ رب العزت کی بہت ساری حکمتیں کارفرما ہیں۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی علمی لحاظ سے ایک درجہ پر نہ تھے بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم دوسروں پر علمی لحاظ سے نمایاں طور پر ایک امتیازی مقام رکھتے تھے اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''حلال وحرام بارے سب سے زیادہ علم رکھنے والے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں، علمِ وراثت میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور فنِ قرأت میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سب سے بڑھ کر ہیں۔[۲۷۶]

اجتہادی صلاحیت وبصیرت میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان تفاوت و درجہ بندی تھی۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کی یوں درجہ بندی کی ہے۔

۱۔المکثرون ۲۔المتوسطون ۳۔المقلون

۱۔ مکثرون سے مراد وہ جن کے فتاویٰ زیادہ منقول ہیں یا جنہیں فتویٰ واجتہاد کے مواقع زیادہ ملے یہ حسب ذیل صحابہ رضی اللہ عنہم تھے:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا ام المومنین، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔

۲۔ متوسطون یعنی درمیانہ درجہ کے مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اس طبقہ میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بیس صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا ہے۔ جن میں خصوصیت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ مقلون یعنی جو اجتہاد بارے زیادہ معروف نہ ہو سکے یا جن کے فتاویٰ و اجتہادات ہم تک بہت کم منقول ہیں۔ ان میں آپ رحمۃ اللہ نے تقریباً ایک سو چھبیس مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم وصحابیات کا ذکر کیا ہے۔[۲۷۷]

تفاوت کے اسباب:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اجتہادی صلاحیت وبصیرت میں تفاوت کے درج ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:۔

(i) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے زیادہ مواقع ملے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ فیض زیادہ کیا جبکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو صحبتِ نبوی زیادہ عرصہ میسر نہ آسکی لہٰذا فقہ و اجتہاد سے حصہ وافر انہیں کے نصیب میں آیا تھا جنہوں نے ایک طویل عرصہ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں عمر گزاری تھی اور فیضانِ نبوت سے خصوصی استفادہ کیا تھا یعنی:

"الذین افنوا اعمارهم فی الصحبة و تخلقوا باخلاقه الشریفة کا لخلفاء و الازواج المطهرات والعبادلة و انس و حذیفة و من فی طبقهم.[۲۷۸]

''وہ لوگ جنھوں نے اپنی عمریں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و معیت میں صرف کر دیں اور خود کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کے سانچے میں ڈھال لیا۔ جیسے خلفاء راشدین، ازواج مطہرات، عبادلہ (یعنی عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن عاص، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم) انس حذیفہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ان کے ہم مرتبہ ہیں۔''

(ii) اجتہاد کے لیے فطری صلاحیتوں (عقل وفکر اور اجتہادی سوچ) میں تفاوت من جانب اللہ ہے لہٰذا اجتہادی صلاحیت و بصیرت میں تفاوت ہونا ایک بدیہی امر ہے بالفاظ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو فطری طور پر ''ذوق اجتہاد'' زیادہ عطا ہوا تھا اور کسی کو کم۔[۲۷۹]

(iii) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے فتاوی جات و اجتہادات اس لیے بھی کم ہیں کہ وہ خوف خدا سے مغلوب ہو کر اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ سے خود کو بچاتے ہی رہے جیسا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلی رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ

" ادرکت عشرین و مائة من الانصار من اصحاب رسول الله ما منهم رجل یسئل عن اشیاء الا ودان اخاه کفاه ولا یحدث حدیثا الا ودان اخاه

کفاہ۔[۲۸۰]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک سو بیس سے ملنے کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے ان میں سے ہر حدیث بیان کرنے والے اور ہر فتویٰ دینے والے کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ اس کی جگہ اس کا کوئی دوسرا بھائی ہی حدیث بیان کر دے اور فتویٰ دے دے۔

حواشی وحوالہ جات

[۱] محمد بن مکرم، ابن منظور، افریقی، امام: لسان العرب (دار صادر، بیروت، ۱۹۵۵م) ۳: ۱۳۳ و محمد بن ابی بکر، الرازی، امام: مختار الصحاح (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ص ۱۱۴

[۲] ابن منظور: لسان العرب، ۳: ۱۳۵

[۳] غزالی، محمد بن محمد، امام: المستصفیٰ (مطبع الامیریہ، بولاق، مصر، ۱۴۲۳ھ) ۲: ۳۵۰ وعبد الرحیم جمال الدین، الاسنوی: شرح الاسنوی (دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۴م) ۳: ۲۶۱

[۴] سورۃ المائدۃ، ۵: ۵۳، سورۃ الانعام، ۶: ۱۰۹، سورۃ النحل، ۱۶: ۳۸، سورۃ النور، ۲۴: ۵۳، سورۃ فاطر، ۳۵: ۴۲

[۵] محمد مرتضیٰ، زبیدی، امام: تاج العروس (المطبعۃ الخیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ) ۲: ۳۳۰

[۶] التوبۃ ۹: ۷۹

[۷] عبد اللہ بن عمر، بیضاوی، امام: تفسیر البیضاوی (دار فراس للنشر والتوزیع، س۔ن) ص ۲۶۲

[۸] فواد عبد الباقی: المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم (دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۹۴م) ص ۲۳۲۔۲۳۳

[۹] حسین بن محمد، راغب اصفہانی،، امام: المفردات فی غریب القرآن، مترجم: مولانا محمد عبدہ (اسلامی اکادمی، لاہور، ۱۹۸۷م) ۱: ۱۹۹

[۱۰] احمد بن حنبل، امام: المسند (المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۶۹م) ۲: ۳۵۸

[۱۱] مبارک بن محمد، ابن اثیر، الجزری، امام: النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر (دار احیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن) ۱: ۳۲۰

[۱۲] مسلم بن حجاج، امام: صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی التعوذ من سوء القضاء، حدیث: ۶۸۷۷

[۱۳] محمد مرتضیٰ، زبیدی: تاج العروس، ۲: ۳۲۹ و امام ابن اثیر: النہایۃ، ۱: ۳۲۰

[۱۴] امام احمد بن حنبل،: المسند، ۲: ۲۳۴

[۱۵] امام ابن اثیر: النہایۃ، ۱: ۳۲۰

[۱۶] محمد بن عیسیٰ، ترمذی، امام: جامع ترمذی، ابواب السیر عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی الھجرۃ، حدیث: ۱۵۹۰

[۱۷] محمد مرتضیٰ زبیدی: تاج العروس، ۲:۳۲۹

[۱۸] ابو داود، سلیمان بن اشعث، السجستانی، امام: سنن ابی داود، کتاب القضاء، باب اجتہاد الرای فی القضاء، حدیث نمبر: ۳۵۹۲

[۱۹] ایضاً، کتاب الصلوۃ، باب الدعاء فی الرکوع والسجود، حدیث: ۸۷۶

[۲۰] امام ترمذی: جامع ترمذی، کتاب الصوم، باب ماجاء فی لیلۃ القدر، حدیث: ۷۹۶

[۲۱] امام ابن اثیر: النہایۃ، ۱:۳۱۹

[۲۲] امام غزالی: المستصفیٰ، ۲:۳۵۰

[۲۳] علی بن محمد، سیف الدین، آمدی، امام: الاحکام فی اصول الاحکام (دار الکتاب العربی، بیروت ۱۹۹۸م) ۴:۱۶۹

[۲۴] عبداللہ بن عمر، ناصر الدین، بیضاوی القاضی، امام: نہایۃ السول فی شرح منہاج الاصول (المطبعۃ السلفیہ، قاہرہ، ۱۳۴۵ھ) ۴:۵۲۴

[۲۵] محمد بن بہادر، بدرالدین، زرکشی، امام: البحر المحیط فی اصول الفقہ (دار الصفوۃ، القاہرۃ ۱۹۹۲م) ۶:۱۹۷

[۲۶] ولی اللہ، شاہ، امام: عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (مترجم: مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی) قرآن محل، کراچی، س۔ن، ص ۷۔۸

[۲۷] امام زرکشی: البحر المحیط ۶:۱۹۷

[۲۸] محمد بن اسمٰعیل، ابوعبداللہ، بخاری، امام: صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب اجر الحاکم اذا اجتہد فاصاب اواخطا، حدیث: ۷۳۵۲

[۲۹] محمد بن ادریس، شافعی، امام: الرسالۃ (شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۹۴۰م) ص ۴۹۶

[۳۰] امام ترمذی: جامع الترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء ان الدال علی الخیر کفاعلہ، حدیث: ۲۶۷۱

[۳۱] الرعد، ۱۳:۱۷

[۳۲] علی متقی، امام: کنز العمال (موسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۹م) ۱۶:۱۲۸

[۳۳] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب القضاء، باب فی القاضی یخطئی، حدیث: ۳۵۷۴

[۳۴] امام احمد بن حنبل: مسند احمد ۲:۱۸۷

اسی معنی کی مزید روایات کے لیے دیکھیے:

علی بن عمر، دار قطنی، امام: سنن دار قطنی، کتاب فی الاقضیۃ والاحکام (نشر السنۃ، ملتان س۔ن) ۴:۲۰۳، سلیمان بن احمد، ابوالقاسم، طبرانی، امام: المعجم الاوسط (مکتبۃ المعارف، ریاض، ۱۹۸۶م) ۲:۳۵۰

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان دونوں روایات جن میں ''فلک عشر حسنات یا فلک عشرۃ اجور'' کے الفاظ ہیں ، کے بارے لکھتے ہیں ''وفی سند کل منھما ضعف''۔ (فتح الباری،۱۳:۳۱۹)

[۳۵] سورۃ الانعام ۶:۱۶۱

[۳۶] احمد بن علی بن حجر، عسقلانی، حافظ، امام: فتح الباری (المطبعۃ السلفیۃ، القاھرۃ س۔ن) ۱۳:۳۱۹

[۳۷] محمد تقی امینی، مولانا: اجتہاد (قدیمی کتب خانہ کراچی، س۔ن) ص ۲۷

[۳۸] حافظ ابن حجر: فتح الباری، ۱۳:۳۲۰

[۳۹] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا، حدیث: ۳۶۵۷

[۴۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، حدیث: ۱۰۰

[۴۱] عبدالرحمن بن ابی بکر، جلال الدین، سیوطی،: الرد علی من اخلد الی الارض وجھل ان الاجتہاد فی کل عصر فرض (دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۳م) ص ۱۸۶

امام غزالی رحمہ اللہ کی اصل کتاب ''المنخول'' میں ''الاجتہاد'' کی جگہ ''الفتویٰ'' لکھا ہے تو یہ محض لفظی اختلاف ہے کیونکہ فتویٰ کے لیے بھی مفتی کو اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے۔ اصل حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو:

امام غزالی: المنخول من تعلیقات الاصول (دارالفکر س۔ن) ص ۴۶۲

[۴۲] ابراہیم بن موسی، ابواسحٰق، شاطبی، المالکی، الغرناطی: الموافقات فی اصول الشریعۃ (دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن) ۴:۲۴۵ و محمد تقی امینی: اجتہاد، ص ۴۱

[۴۳] محمد حنیف، ندوی، مولانا: مسئلہ اجتہاد (علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶م) ص ۱۴۳

[۴۴] جعفر شاہ، پھلواری، مولانا: اجتہادی مسائل (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۹م) ص ۲۲

[۴۵] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ خالد بن الولید الی بنی جذیمۃ، حدیث: ۴۳۳۹

[۴۶] عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر: الوجیز فی اصول الفقہ (فاران اکیڈمی، لاہور، س۔ن) ص ۴۰۷ شروط اجتہاد طے کرنے کے اسباب بارے مزید جاننے کے لیے ملاحظہ ہو:

محمد امین احسن اصلاحی، مولانا: اسلامی قانون کی تدوین (ناشر و تاریخ ندارد) ص ۸۷۔۹۷ و محمد عیسی، منصور پوری، مولانا: اجتہاد وقت کی اہم ضرورت (دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۵م) ص ۳۱۔۳۰ و عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر (مرتب): علم اصولِ فقہ ایک تعارف (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۶م) ۳: ۳۴۔۳۵ و گوہر رحمان، مولانا: اجتہاد اور اوصاف مجتہد (حرا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰م) ص ۳۰

[۴۷] ابراہیم بن علی، ابو اسحاق، الشافعی، شیرازی، الفیر وزابادی، امام: کتاب اللمع فی اصول الفقہ (مطبعۃ السعادۃ مصر، س۔ن) ص ۸۵ و امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۰

[۴۸] امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۰

[۴۹] نادیہ شریف، العمری، ڈاکٹر: الاجتہاد فی الاسلام (موسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۹۸۵م) ص ۶۶

[۵۰] سلیمان بن عبداللہ، نجم الدین، طوفی، امام: شرح مختصر الروضۃ (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۰م) ۳: ۵۷۷

[۵۱] محمد بن علی، شوکانی، قاضی، امام: ارشاد الفحول (محل محمد امین الخانجی، مصر، ۱۳۲۷ھ) ص ۲۳۳

[۵۲] امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۱

[۵۳] امام بزدوی: شرح اصول البزدوی، ۴:۱۱۳۵ بحوالہ نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام، ص ۷۰

[۵۴] محمد بن ابی بکر، ابن قیم، ابوعبداللہ، شمس الدین، امام: اعلام الموقعین (دار الجیل، بیروت، ۱۹۷۳م) ۱:۴۶

[۵۵] محمد یوسف فاروقی، ڈاکٹر: اسلام کا نظریہ اجتہاد، علم اصولِ فقہ (مرتب: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں) ص ۲۳

[۵۶] ایضاً

[۵۷] امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۱

[۵۸] امام شوکانی: ارشاد الفحول، ص ۲۳۳

[۵۹] ایضاً

[۶۰] امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۱

[۶۱] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۲:۲۵۷

[۶۲] امام شوکانی: ارشاد الفحول، ص ۲۳۳

[۶۳] ایضاً و امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱:۴۵

[۶۴] امام شوکانی: ارشاد الفحول، ص ۲۳۳

[۶۵] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱:۴۵

[۶۶] ڈاکٹر نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام، ص ۷۵

[۶۷] ڈاکٹر عرفان خالد (مرتب): علم اصول فقہ، ۳:۲۴۔۲۵

[۶۸] امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۱

[۶۹] امام شاطبی: الموافقات، ۴:۱۰۹

[۷۰] المرجع السابق ۲:۳۵۳

[۷۱] محمد امین، امیر بادشاہ، علامہ: تیسیر التحریر (مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۱ھ) ۴:۱۸۲ و ثناء اللہ، امرتسری، مولانا: رسالہ اجتہاد و تقلید (اہلحدیث اکادمی، لاہور، ۱۹۶۸ء) ص ۲۷

[۷۲] ولی اللہ، شاہ، امام: حجۃ اللہ البالغہ (المکتبۃ السلفیہ، لاہور، س۔ن) ۱:۱۲۴

[۷۳] حافظ ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم (دارالسلام، ریاض، ۱۹۹۴ء) ۱:۳۸۳

[۷۴] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رجوع کی امثلہ دوسرے باب کی فصل دوم میں تفصیلاً ملاحظہ فرمائیں۔

[۷۵] عرفان خالد، ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ، ۳:۲۷

[۷۶] عطیہ محمد سالم وغیرہ: تسہیل الوصول الی فہم علم الاصول (فاروقی کتب خانہ، لاہور، س۔ن) ص ۲۱

[۷۷] امام شافعی: الرسالۃ، ص ۵۳

[۷۸] امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۲

[۷۹] ایضاً

[۸۰] نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام، ص ۸۵

[۸۱] امام شاطبی: الموافقات، ۴:۱۱۵

[۸۲] عرفان خالد، ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ، ۲:۲۶

[۸۳] امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۱

[۸۴] امام شاطبی: الموافقات ۴:۱۰۵

[۸۵] ایضاً: ۴:۱۰۵۔۱۰۶

[۸۶] امام شاطبی رحمہ اللہ کے نزدیک دوسری شرط ہے "مقاصدِ شریعت سے واقفیت کی بنیاد پر استنباط کی قدرت" (حوالہ مذکور)

[۸۷] امام شاطبی: الموافقات (حاشیہ نگار: شیخ عبداللہ دراز) ۴:۱۰۶ کا حاشیہ

[۸۸] محمد الخضری بک: اصول الفقہ (المکتبۃ التجاریۃ، مصر، ۱۹۶۹) ۳۶۸ و نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام، ص ۹۸

[۸۹] عرفان خالد، ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ، ص ۲۵

[۹۰] جلال محلی، محمد بن احمد، شمس الدین: شرح الجلال المحلی (مطبع اصح المطابع، بمبئی، س۔ن) ۲:۳۸۳

[۹۱] امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۲

[۹۲] امام شوکانی: ارشاد الفحول ص ۲۴۴

[۹۳] الجامع لمسائل اصول فقہ بحوالہ عرفان خالد ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ، ۳:۲۵

[۹۴] نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام ص ۹۲

[۹۵] ایضاً

[۹۶] نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام ص ۱۰۱

[۹۷] عرفان خالد ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ، ۳: ۲۸

[۹۸] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۴۳

[۹۹] عبدالوہاب ابن السبکی، امام: جمع الجوامع مع حاشیہ البنانی (اصح المطابع بمبئی، س۔ن) ۲: ۳۸۶ و امام غزالی: المستصفی، ۲: ۳۵۳

[۱۰۰] محمد یوسف فاروقی، ڈاکٹر: اسلام کا نظریۂ اجتہاد، علم اصول فقہ (مرتب: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں) ۳: ۳۱

[۱۰۱] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد ص ۱۴۳

[۱۰۲] عرفان خالد (مرتب): علم اصول فقہ، ۳: ۲۹

[۱۰۳] اسعدی، عبیداللہ، مولانا: اصول الفقہ (مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن) ص ۲۶۱

[۱۰۴] البقرۃ، ۲: ۲۸۲

[۱۰۵] الانفال، ۸: ۲۹

[۱۰۶] نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام ص ۱۱۱

[۱۰۷] ابن قیم: اعلام الموقعین ۴: ۲۵۸

[۱۰۸] حافظ ابن حزم: الاحکام فی اصول الاحکام (ضیاء السنۃ، ادارۃ الترجمہ والتالیف فیصل آباد، ۱۴۰۴ھ) جلد ۲، جزء ۶، ص ۱۷۶۔۱۷۷

[۱۰۹] جیسا کہ یہ دعا کرنے کا حکم اللہ رب العلمین نے صاحبِ علمِ وحی نبی کو دیا (طہٰ ۲۰: ۱۱۴)

[۱۱۰] امام ابن قیم رحمہ اللہ: اعلام الموقعین ۴: ۲۵۷۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اس بارے دیگر علماء سلف کے معمولات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

[۱۱۱] امام غزالی: المستصفی، ۲: ۳۵۲ و امام سیف الدین آمدی: الأحکام فی اصول الأحکام، ۴: ۱۷۰

[۱۱۲] محمد بن نظام الدین، عبدالعلی، الانصاری، امام: فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت (مطبع الامیریہ، بولاق مصر، ۱۳۲۳ھ) ۲: ۳۶۳

[۱۱۳] عبدالعزیز بن ربیعہ: شروط الفتوی، ص ۱۵۰ بحوالہ نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام، ص ۶۱
مولانا محمد حنیف ندوی کے بقول صرف امام شاطبی رحمہ اللہ اس بارے منفرد ہیں کہ غیر مسلم بھی مجتہد ہوسکتا ہے۔ امام شاطبی رحمہ اللہ کی اس رائے بارے میں مولانا ندوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں کہ ان کی اس رائے کا عصر حاضر میں ایک دوسرا محمل ہوسکتا ہے چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''یہ ہوسکتا ہے کہ ایک جمہوری اسلامی پالیمنٹ میں کچھ لوگ ایک ایسے مسئلے پر غور کریں جو علاوہ دینی پچھواڑ کے خالص دنیاوی بھی ہو۔ اس میں علمائے اسلام تو یہ واضح کردیں کہ دین کا اس سے کیا علاقہ ہے، اور اس کے کون کون گوشے دین سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اہل دنیا یا کچھ غیر مسلم اس کے ان پہلوؤں کو اجاگر کریں، جن کا لگاؤ کلیہ واقعات اور خارجی دنیا سے ہے، تو ایسا کرنے کے وہ شرعاً مجاز ہیں، بشرطیکہ اس مشورے میں ان کی شرکت ضروری ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس طرح کی ملی جلی فکری و اجتہادی کوششوں سے مسئلہ اور نکھر جائے گا، اور تعیین و اطلاق کی ایک لائق عمل شکل اختیار کرلے گا.................. ہاں یہ البتہ درست ہے کہ ایسا شخص مجتہد کبھی نہیں کہلائے گا، کیوں کہ اس کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے۔''

(محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۴۴)

[۱۱۴] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب الحدود، باب فی المجنون یسرق او یصیب حدا حدیث: ۴۴۰۳ و نسائی، احمد بن شعیب، امام: سنن نسائی، کتاب الطلاق، باب من لا یقع طلاقہ من الازواج، حدیث: ۳۴۶۲ و ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابوعبداللہ، القزوینی، امام: سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق المعتوہ والصغیر والنائم حدیث: ۲۰۴۱

[۱۱۵] امام غزالی: المستصفٰی، ۱:۸۴ و ابن النجار، محمد بن احمد، الفتوحی، الحنبلی، امام: شرح الکوکب المنیر (دارالفکر، دمشق، ۱۹۸۰م) ۱:۴۹۹

[۱۱۶] عبدالکریم مراد و عبدالمحسن العباد: من اطیب المنح فی علم المصطلح (قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن) ص ۱۳

[۱۱۷] جاراللہ، زمخشری، علامہ: الکشاف (مکتبہ و مطبعۃ مصطفٰی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۴۸م) ۱:۹۱-۹۲ محمد رشید رضا: تفسیر المنار (دارالفکر، بیروت، س۔ن) ۱:۱۲۵ و محمد علی صابونی: صفوۃ التفاسیر (دارالقرآن الکریم، بیروت، ۱۹۸۵م) ۱:۳۲

[۱۱۸] جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا (الانفال، ۸:۲۹)

[۱۱۹] امام غزالی: المستصفٰی ۲:۳۵۰ و مقدسی، عبداللہ بن احمد، موفق الدین، امام: روضۃ الناظر وجنۃ المناظر (دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۱م) ص ۳۱۹

[۱۲۰] امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں ''یکون (المجتھد) مع ذلک حسن الطریقۃ، مرضی السیرۃ، عدلا فی اقوالہ وافعالہ متشابہ السر والعلانیۃ فی مدخلہ ومخرجہ واحوالہ''۔ (امام ابن قیم: اعلام الموقعین ۱:۱۱) و محب اللہ بن عبدالشکور، علامہ: مسلم الثبوت (مع شرحہ فواتح الرحموت) (دارصادر، بیروت، ۱۳۲۴ھ) ۲:۳۶۴

[۱۲۱] مودودی، ابوالاعلیٰ، سید: تفہیمات (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱م) ۳:۳۰

[۱۲۲] جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہل عراق کے لیے ''ذات عرق'' نامی جگہ کو اجتہاد کرتے ہوئے بطور میقات حج مقرر کیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا تعین کردیا تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ

تھا۔ (محمد بن اسماعیل صنعانی، امام: سبل السلام شرح بلوغ المرام، جمعیۃ احیاء التراث، الاسلامی، کویت، ۱۹۹۷م، ۲: ۲۷۷)

[۱۲۳] مقدمہ عمدۃ الرعایۃ ص ۹ بحوالہ عبیداللہ اسعدی، : اصول الفقہ ص ۲۶۱۔۲۶۲ کا حاشیہ

[۱۲۴] محمد اقبال، علامہ: اسلامی فکر کی نئی تشکیل (مترجم: شہزاد احمد) (مکتبہ خلیل، لاہور، ۲۰۰۵م) ص ۱۸۰

[۱۲۵] سید مودودی: تفہیمات، ۳: ۱۹

[۱۲۶] باب اجتہاد بند ہونے کے اسباب جاننے کے لیے ملاحظہ ہو: امین احسن اصلاحی، مولانا: اسلامی قانون کی تدوین، ص ۸۶۔۸۹، علامہ محمد اقبال: اسلامی فکر کی نئی تشکیل (مترجم: شہزاد احمد) ص ۱۸۰۔۱۸۱، عرفان خالد (مرتب): علم اصول فقہ، ۳: ۳۱۔۳۵

[۱۲۷] سید مودودی: تفہیمات، ۳: ۱۹۔

[۱۲۸] بحوث فی التشریع الاسلامی، ص ۱۰-۱۱ بحوالہ زکریا البری، ڈاکٹر: الاجتہاد فی الشریعۃ الاسلامیۃ (ادارۃ الثقافۃ و النشر، جامعہ الامام محمد بن سعود، ریاض، ۱۳۹۶ھ) ص ۲۵۲

[۱۲۹] امام غزالی: المستصفی، ۲: ۳۵۴ و امام سیف الدین: الاحکام فی اصول الاحکام، ۴: ۳۹۸

[۱۳۰] امام شوکانی: ارشاد الفحول، ص ۲۳۵

[۱۳۱] یونس، ۱۰: ۳۶

[۱۳۲] نادیہ شریف: الاجتہاد فی الاسلام، ص ۵۲ و محمد یوسف فاروقی، ڈاکٹر: اسلام کا نظریۂ اجتہاد، علم اصول فقہ ایک تعارف (مرتب: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں) ص ۳۷ و محمد صدقی، ڈاکٹر: الوجیز فی ایضاح قواعد الفقہ الکلیہ (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۳م) ص ۲۵۵

[۱۳۳] امام غزالی: المستصفی، ۲: ۳۵۴

[۱۳۴] محمد حنیف، ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۹۷۔ دینی عقائد میں اجتہاد کے نتیجہ میں ہی قرونِ اولی میں کچھ لوگ گمراہ ہوئے جنھوں نے بعد میں معتزلہ، خوارج، جہمیہ اور معطّلہ کا روپ دھارا۔ (پروفیسر قاضی مقبول احمد: اسلام اور اجتہاد، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۲۰۰۱م، ص ۱۴۱۔۱۵۲)

[۱۳۵] ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی: الاجتہاد فی الشریعۃ الاسلامیہ (ادارہ الثقافۃ والنشر، جامعہ الامام محمد بن سعود، الریاض، ۱۹۸۱م) ص ۱۸۶

[۱۳۶] النور، ۲۴: ۲

[۱۳۷] المائدۃ، ۵: ۸۹

[۱۳۸] وھبہ الزحیلی، ڈاکٹر: الاجتھاد فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص ۱۸۶

[۱۳۹] ایضاً،ص ۱۸۶۔۱۸۷

[۱۴۰] النور،۲۴:۲

[۱۴۱] عرفان خالد (مرتب): علم اصول فقہ،۳:۳۸

[۱۴۲] المائدۃ،۵:۳

[۱۴۳] شاطبی: الموافقات،۳:۳۶۷

[۱۴۴] محمد عیسیٰ، منصور پوری، مولانا: اجتہاد وقت کی اہم ضرورت، ص ۹

[۱۴۵] عبیداللہ، الأسعدی: اصول الفقہ، ص ۲۵۷۔۲۵۸

[۱۴۶] رسول اللہ ﷺ، صحابہ رضی اللہ عنہم و خلفاء کرام کے اجتہاد بارے تفصیلات اسی باب کی اگلی فصول اور باب دوم و سوم میں ملاحظہ کریں۔

[۱۴۷] شاہ ولی اللہ: عقد الجید، ص ۱۵۔۱۶

[۱۴۸] عبدالکریم زیدان: الوجیز فی اصول الفقہ، ص ۴۰۷

[۱۴۹] محمد عیسیٰ: اجتہاد وقت کی اہم ضرورت، ص ۱۱

[۱۵۰] النساء،۴:۲۹

[۱۵۱] امین احسن اصلاحی، مولانا: عہد حاضر میں اجتہاد کی اہمیت، ماہنامہ میثاق، لاہور، مارچ ۱۹۶۰ء، ص ۲۶

[۱۵۲] محمد عیسیٰ: اجتہاد وقت کی اہم ضرورت ص ۲۰، ۲۶، ۲۸

[۱۵۳] مصطفیٰ احمد زرقاء: دور حاضر میں تنظیم اجتہاد کی ایک سکیم (مترجم: خالد مسعود) ماہنامہ میثاق لاہور، مارچ اپریل ۱۹۶۴ء، ص ۵۴

[۱۵۴] ابوالحسن علی، ندوی، سید: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر (مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۶ء) ص ۱۹۱، ۱۹۵

[۱۵۵] امام شاطبی: الموافقات ۴:۱۰۷

[۱۵۶] امین احسن اصلاحی: عہد حاضر میں اجتہاد کی اہمیت، ص ۲۶

[۱۵۷] محمد عیسیٰ: اجتہاد وقت کی اہم ضرورت، ص ۱۳

[۱۵۸] ایضاً، ص ۸

[۱۵۹] عبدالشکور، سید: اجتہاد حل مسائل کا اسلامی منہاج، ماہنامہ فکر و نظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۲۹

[۱۶۰] محمد عیسیٰ: اجتہاد وقت کی اہم ضرورت'' ص ۸

[۱۶۱] امام شوکانی: ارشاد الفحول، ص۲۳۶

[۱۶۲] عرفان خالد ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ، ۳:۶۷

[۱۶۳] امام بخاری: صحیح البخاری، کتاب صلوۃ الخوف، باب صلوۃ الطالب والمطلوب راکبًا وایماء، حدیث ۹۴۶

[۱۶۴] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱:۲۰۳۔

[۱۶۵] سرخسی، محمد بن احمد، امام: اصول السرخسی (دار المعرفة، بیروت، س۔ن)، ۲:۹۱

[۱۶۶] محمد خضری بک: اصول الفقہ، ص۳۷۰۔۳۷۲

[۱۶۷] محمد بن احمد، ابوبکر، سمرقندی، امام: میزان الاصول فی نتائج العقول (ادارة الشؤون الاسلامیة، قطر، ۱۹۸۴م) ص۶۴۔۴۶۵

[۱۶۸] دارمی، عبداللہ بن عبدالرحمان، حافظ، امام: سنن دارمی، مقدمہ، باب فی فضل العلم والعالم، حدیث: ۳۴۲ (قدیمی کتب خانہ کراچی، س۔ن) ۱:۱۱۰

[۱۶۹] امام سیف الدین آمدی: الاحکام، ۴:۱۷۴

[۱۷۰] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص۱۵۷۔۱۵۸

[۱۷۱] سورۃ الحشر، ۵۹:۲

[۱۷۲] کیونکہ اعتبار کا معنی ہے ”رد حکم الشئی الی نظیرہ“ اور یہی قیاس کی تعریف کی جاتی ہے۔ (السرخی، محمد بن احمد، امام: اصول السرخسی، ۲:۱۲۵)

[۱۷۳] امام سیف الدین آمدی: الاحکام، ۴:۱۷۲ اور امام سرخسی: اصول السرخسی، ۲:۹۳

[۱۷۴] سورۃ ال عمران، ۳:۱۵۹

[۱۷۵] سیف الدین آمدی: الاحکام، ۴:۱۷۳

[۱۷۶] سورۃ ال عمران، ۳:۱۵۹

[۱۷۷] امام سرخسی: اصول السرخسی، ۲:۹۲۔ امام سرخسی رحمہ اللہ نے یہاں اس کے علاوہ بھی کئی امثلہ ذکر کی ہیں۔ نیز مسند احمد کی روایت کے الفاظ ہیں: ”إذا کان شئی من امر دنیاکم فانتم اعلم به فاذا کان من امر دینکم فالیّ“ (امام احمد بن حنبل: مسند احمد، ۳:۱۵۲)

[۱۷۸] شوکانی: ارشاد الفحول، ص۲۳۸۔

[۱۷۹] عبدالملک، ابن ہشام، ابومحمد، امام: السیرة النبویة (دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۵م) ۲:۲۳۲

[۱۸۰] عبد الرزاق بن ہمام، صنعانی، امام: المصنف، کتاب المغازی (المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۷۲م) ۵:۳۶۷۔۳۶۸

[۱۸۱] مسلم بن الحجاج، امام: صحیح مسلم، کتاب الأقضیۃ باب بیان ان حکم الحاکم لایغیر الباطن، حدیث ۴۴۷۳

[۱۸۲] امام عبدالرحیم اسنوی: شرح الاسنوی علی المنہاج ۳: ۲۶۵

[۱۸۳] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۵۴

[۱۸۴] امام بخاری: صحیح البخاری، کتاب الحج، باب تقضی الحائض المناسک کلھا الّا الطواف بالبیت، حدیث: ۱۶۵۱

[۱۸۵] محمد خضری: اصول الفقہ، ص ۲۳۸

[۱۸۶] سورۃ النساء، ۴: ۲۳

[۱۸۷] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۵۵

[۱۸۸] سیاست شرعیہ سے مراد حاکم وقت کا ایسا اقدام ہے جو کسی شرعی مصلحت کی بنیاد پر ہو اگر چہ اس بارے کوئی جزئی دلیل مروی نہ ہو۔ (ابن نجیم، زین الدین: البحر الرائق (المکتبہ الماجدیہ کوئٹہ، س۔ن) ۵: حاشیہ ص ۷۰

[۱۸۹] امام نسائی: سنن النسائی، کتاب النکاح، باب نکاح ما نکح الاباء، حدیث: ۳۳۳۴

[۱۹۰] سلیمان بن عبداللہ، ڈاکٹر: مقدمہ فی اصول الفقہ (دار العاصمہ الریاض، ۱۹۹۷ء) ص ۷۸-۷۹

[۱۹۱] المرجع السابق: کتاب الزکوۃ، باب سقوط الزکاۃ عن الابل إذا کانت رسلا لاھلھا ولحومھم، حدیث: ۳۴۵۱ وامام احمد بن حنبل: مسند احمد، ۵: ۴

[۱۹۲] سلیمان بن عبداللہ، ڈاکٹر: مقدمہ فی اصول الفقہ ص ۷۸-۷۹

[۱۹۳] ایضاً۔

[۱۹۴] کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا: سیرت المصطفیٰ (مکتبہ عثمانیہ، لاہور، ۱۹۹۲ء) ۱: ۵۵۷_۵۵۸

[۱۹۵] محمد بن عبداللہ الخطیب، امام: مشکوٰۃ المصابیح (حاشیہ نگار: مولانا احمد علی سہارنپوری) قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن ص ۱۶، حاشیہ ۱۴

[۱۹۶] المرجع السابق ۱: ۵۵۷_۵۵۸

[۱۹۷] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغۃ، ۱: ۱۲۸

[۱۹۸] امام ابوداؤد: سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی إذا أخطأ، حدیث: ۳۵۸۶

[۱۹۹] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۶۲

[۲۰۰] سورۃ الانبیاء، ۲۱: ۵۱

[۲۰۱] سورۃ الانبیاء، ۲۱: ۷۹

[۲۰۲] سورۃ الانبیاء، ۲۱: ۷۹

[۲۰۳] سورۃ النساء، ۴: ۱۰۵

[۲۰۴] سورۃ النساء،۴:۱۱۳

[۲۰۵] محمد حمید اللہ، ڈاکٹر: خطباتِ بہاولپور (ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء) ص ۷۵

[۲۰۶] محمد بن عبدالواحد، ابن ہمام، کمال الدین: التحریر فی اصول الفقہ (مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۱ھ) ص ۲۵

[۲۰۷] نادیہ شریف، العمری، ڈاکٹر: اجتہاد الرسول ﷺ (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۷ء) ص ۲۰۲

[۲۰۸] محمد بن احمد سرخسی، امام: اصول السرخسی، ۲:۹۲، مزید دیکھیے: امام ابن ماجہ: سنن ابن ماجہ، ابواب الرھون، باب تلقیح النخل، حدیث: ۲۴۷۰، وامام ابن حنبل، امام: المسند، ۳:۱۵۲

[۲۰۹] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ، ص ۲۰۷

[۲۱۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من ترک بعض الاختیار مخافۃ ان یقصر فھم بعض الناس عنہ فیقعوا فی اشد منہ، حدیث: ۱۲۶

[۲۱۱] حافظ ابن حجر: فتح الباری، ۱:۲۲۵

[۲۱۲] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب من قتل لہ قتیل فھو بخیر النظرین، حدیث: ۶۸۸۰

[۲۱۳] امام قرافی: تنقیح الفصول، ص ۴۳۶ بحوالہ نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ، ص ۲۱۲

[۲۱۴] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغۃ، ۱:۱۲۸

[۲۱۵] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ، ۳۵۹

[۲۱۶] ان تمام کی امثلہ دوسری فصل میں "رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد" کے ضمن میں تفصیلاً دیکھی جا سکتی ہیں۔

[۲۱۷] اس کے لیے فصل "فضیلتِ اجتہاد" دیکھیے

[۲۱۸] اس کی امثلہ کا تفصیلی ذکر دوسری فصل "صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجتہاد عہد نبوی میں" کے ضمن میں ملاحظہ فرمائیں۔

[۲۱۹] احمد بن محمد، ابوبکر، امام: میزان الأصول فی نتائج العقول، ص ۳۶۸

[۲۲۰] مصطفیٰ احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام (دار الفکر، دمشق، ۱۹۶۸ء) ۱:۱۵۶-۱۵۷

[۲۲۱] اس بارے تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر: حیاتِ نبوی میں اجتہاد، سہ ماہی فکر و نظر (جلد ۴۴، شمارہ ۲، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۶م) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۹۷

[۲۲۲] امام بخاری: صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب اجر الحاکم إذا اجتھد فأصاب او اخطأ، حدیث: ۷۳۵۲

[۲۲۳] محمد بن عبداللہ، حاکم، امام: المستدرک (دار الباز، مکۃ المکرمۃ، س۔ن) ۴:۸۸

[۲۲۴] طبرانی، سلیمان بن احمد، ابوالقاسم، امام: المعجم الاوسط، ۲:۳۵۰

[۲۲۵] المرجع السابق ۱:۴۳۱

[۲۲۶] عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر: حیاتِ نبوی میں اجتہاد، سہ ماہی فکر ونظر ص ۹۸

[۲۲۷] امام ابوداؤد: سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، باب اجتھاد الرای فی القضاء، حدیث: ۳۵۹۲، وامام دارمی: سنن دارمی، باب الفتیا و ما فیہ من الشدۃ، ۱:۷۲، امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند پر جو جرح کی ہے۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو (امام ترمذی: جامع الترمذی، ابواب الاحکام، باب ما جاء فی القاضی کیف یقضی، حدیث: ۱۳۲۷۔۱۳۲۸)، (وابن حزم، علی بن حزم، ابو محمد، امام: الاحکام فی اصول الاحکام، ۶:۳۵)، مگر امام غزالی رحمہ اللہ اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے امت کے تلقی بالقبول وغیرہ کی وجہ سے اس حدیث پر جرح کو بے دلائل غلط قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (امام غزالی: المستصفی ۲:۳۵۵)، (امام ابن قیم رحمہ اللہ: اعلام الموقعین، ۱:۲۰۲)

[۲۲۸] محمد ابراہیم شقرہ: الرأی السدید فی الاجتہاد والتقلید (ناشر ندارد، ۱۹۸۱م) ص ۲۲

[۲۲۹] عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر: حیاتِ نبوی میں اجتہاد، سہ ماہی فکر ونظر ص ۱۱۵

[۲۳۰] مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو بھیجنے اور انھیں اجتہاد کی اجازت دیے جانے کے بارے ملاحظہ ہو: (امام ابوداؤد: سنن اَبی داؤد، کتاب القضاء، باب کیف القضاء، حدیث: ۳۵۸۲) وامام حاکم: المستدرک، ۴:۸۸

[۲۳۱] سورۃ اٰل عمران، ۳:۱۵۹

[۲۳۲] اس بارے میں امام سرخسی رحمہ اللہ نے نہایت عمدہ بحث کی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو (امام سرخسی: اصول السرخسی، ۲:۹۳۔۹۴)

[۲۳۳] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب صلوۃ الخوف، باب صلوۃ الطالب والمطلوب راکبا وایماء، حدیث: ۹۴۶

[۲۳۴] ایضا

[۲۳۵] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کسی صحابی کے قول یا فعل پر خاموش رہنے کو "تقریری حدیث" کہا جاتا ہے اور یہ بھی قولی و فعلی حدیث کی طرح حجت ہے (ڈاکٹر محمود طحان: تیسیر مصطلح الحدیث، مکتبہ المعارف، ریاض، ۱۹۸۷م، ص ۱۵)

[۲۳۶] امام ابوداؤد: سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی السلب یعطی القاتل، حدیث: ۲۷۱۷، امام ترمذی: جامع الترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فیمن قتل قتیلا فلہ سلبہ، حدیث: ۱۵۶۲

[۲۳۷] امام ابوداؤد: سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی السلب یعطی القاتل، حدیث: ۲۷۱۷

[۲۳۸] محمد خضری بک: اصول الفقہ، ص ۳۷۳

[۲۳۹] عرفان خالد: حیاتِ نبوی میں اجتہاد، ص ۱۱۶

[۲۴۰] ایضا، ص ۱۱۵

[۲۴۱] ایضاً

[۲۴۲] ایضاً

[۲۴۳] عرفان خالد (مرتب): علم اصول فقہ، ۳: ۲۰

[۲۴۴] عرفان خالد: حیات نبوی میں اجتہاد، ص ۱۱۶

[۲۴۵] محمد تقی امینی، مولانا: اجتہاد، ص ۵۷، مصطفی احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام ۱: ۱۵۸ مقبول احمد، قاضی، پروفیسر: اسلام اور اجتہاد ص ۱۹۰۔

[۲۴۶] حافظ ابن حجر: الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر، ۱۹۳۹م) ۱: ۴

[۲۴۷] محمود احمد غازی، ڈاکٹر: محاضراتِ حدیث (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۵م) ص ۳۳۷

[۲۴۸] حافظ ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱: ۱۲

[۲۴۹] خلفاء راشدین کے رجوع کرنے کی امثلہ کے لیے باب دوم کی فصل دوم ملاحظہ فرمائیں۔

[۲۵۰] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۳۴

[۲۵۱] محمد تقی امینی: اجتہاد، ص ۵۷۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے: المکثرون، المتوسطون اور المقلون۔ (ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱: ۱۲۔۱۴)

[۲۵۲] جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''اللہ نے انسانیت کے دلوں پر جھانکا تو قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بہتر پایا لہٰذا انہیں ختم المرسلین کے لیے چن لیا پھر اللہ نے دوبارہ دیکھا تو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلوب کو (انبیاء ورسل کے بعد) سب سے بہتر پایا لہٰذا انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے منتخب فرما لیا۔ (امام احمد بن حنبل: المسند ۱: ۳۷۹)

[۲۵۳] محمد تقی امینی، مولانا: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، س۔ ن) ص ۱۴۲

[۲۵۴] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول، ص ۲۲۴

[۲۵۵] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۶۲

[۲۵۶] جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام خط دیکھا جا سکتا ہے۔ (امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱: ۸۵)

[۲۵۷] اسی لیے اصول فقہ کی کتب میں جب مصادر شریعت بارے بحث کی جاتی ہے تو ان کی حجیت کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث واجتہادات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کی امثلہ ذکر کی جاتی ہیں۔

[۲۵۸] ابوزھرۃ: تاریخ المذاہب الاسلامیۃ،۲:۲۲بحوالہ نادیہ شریف اجتہاد الرسول،ص۲۲۲

[۲۵۹] محمد خضری بک: تاریخ التشریع الاسلامی (دارالکتب العلمیۃ، بیروت،۱۹۷۰م) ص۸۹

[۲۶۰] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ، ص۲۲۳

[۲۶۱] شیخ السایس: تاریخ التشریع الاسلامی، ص۸۰ بحوالہ نادیہ شریف اجتہاد الرسول ﷺ، ص۲۲۳

[۲۶۲] محمد معروف الدوالیبی: عہد صحابہ کے فقہی اصول، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، مارچ ۱۹۵۹م ص۳۸۔۳۹

[۲۶۳] مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا (مرتب): جدید فقہی مباحث (ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، س۔ن) ۱:۱۴۱ استاذ مصطفیٰ احمد زرقاء نے بھی یہی منہجِ صحابہ بیان کیا ہے (مصطفیٰ احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام،۱:۱۵۸)

[۲۶۴] امام ابن قیم: اعلام الموقعین،۱:۶۳

[۲۶۵] ایضاً،۱:۶۳۔۶۴

[۲۶۶] سورۃ البقرۃ۲:۲۶۹

[۲۶۷] سورۃ البقرۃ۲:۲۸۲

[۲۶۸] سورۃ الانفال،۸:۲۹

[۲۶۹] امام ابن قیم: اعلام الموقعین،۱:۸۷

[۲۷۰] محمد تقی امینی: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۱۴۲

[۲۷۱] محمد بن محمد، حسام الدین، امام: الحسامی، کتاب السنۃ باب متابعۃ اصحاب رسول اللہ ﷺ (نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی، س۔ن) ص۱۹۰۔۱۹۱

[۲۷۲] سورۃ البقرۃ۲:۲۵۳

[۲۷۳] سورۃ الرعد،۱۳:۴

[۲۷۴] مثلاً دیکھیے: سورۃ البقرۃ۲:۹۷۔۹۶

[۲۷۵] سورۃ الزخرف۴۳:۳۲

[۲۷۶] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل وزید بن ثابت وابی بن کعب، حدیث۳۷۹۰۔۳۷۹۱

[۲۷۷] امام ابن قیم: اعلام الموقعین،۱:۱۲۔۱۴

[۲۷۸] محمد تقی امینی: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۱۴۵

[۲۷۹] محمد تقی امینی: اجتہاد، ص۵۸

[۲۸۰] امام ابن قیم: اعلام الموقعین،۱:۳۴

باب دوم:

خلفاء راشدین اور اجتہاد

فصل اوّل:

خلفاء راشدین کا مختصر تعارف

خلفاء راشدین کے حالات:

رسول کائنات ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ عرصہ تیس سال خلافت علی منہاج النبوۃ (بدرجۂ کمال) ہوگی اور اس کے بعد (بتدریج) بادشاہت یعنی ملوکیت ہوگی۔ آپ ﷺ کا فرمانِ گرامی ملاحظہ ہو

"الخلافة فی امتی ثلاثون سنة ثم ملکا بعد ذلک"[۱]
"میری امت میں خلافت تیس سال تک رہے گی اور پھر اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔"

اس حدیث کے مصداق تاریخ اسلام کے پہلے پانچ خلفاء یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ بنتے ہیں اس لیے کہ تیس سال کا عرصہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اختتام کے ساتھ ہی پورا ہو جاتا ہے[۲] چونکہ اس مقالہ میں خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کو واضح کرنا ہے لہٰذا یہاں پہلے چار خلفاء راشدین کے حالات قدرے اختصار سے لکھے جاتے ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صرف عرصہ چھ ماہ حکومت کی اس لئے ان چھ ماہ میں وہ کوئی قابل ذکر اجتہاد نہیں کر سکے ہیں کہ جس سے ان کا اجتہادی منہج سامنے آتا اس لیے ان کے حالاتِ زندگی تحریر کرنے سے بھی صرف نظر کیا گیا ہے۔ زیر بحث موضوع کی مناسبت سے یہاں خلفاء راشدین کے حالات میں درج ذیل امور پر خصوصاً تحقیق (Research) کی جائے گی۔

(i) خلفاء راشدین کی رسول اللہ ﷺ سے قرابت و مصاحبت اور اس کے خلفاء پر اثرات۔

(ii) خلفاء کرام کا رسول اللہ ﷺ سے علمی و اجتہادی استفادہ۔

(iii) خلفاء کرام کی ذہانت و فطانت، حکمت و بصیرت اور فہمِ دین۔

(iv) خلفاء کرام کے عہد نبوی میں اجتہادات۔

(v) خلفاء کرام کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شخصی مقام و مرتبہ۔

(vi) خلفاء راشدین کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں علمی و فقہی مقام و مرتبہ۔

ذیل میں خلفاء اربعہ کے حالات اختصار کے ساتھ رقم کیے جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات:

نام ونسب:

آپ رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ، کنیت ابوبکر اور عتیق لقب ہے، آپ رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عثمان اور کنیت ابو قحافہ ہے۔ والدہ کا نام سلمٰی اور کنیت ابو الخیر ہے۔ آپ قریشی النسل ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب چھٹی پشت پر حضرت محمد ﷺ سے جاملتا ہے۔[۳]

قبل از اسلام:

قبول اسلام سے قبل آپ رضی اللہ عنہ ایک متمول تاجر کی حیثیت رکھتے تھے۔[۴] آپ رضی اللہ عنہ شروع سے ہی خصالِ حمیدہ اور اوصافِ جلیلہ کے مالک تھے لہٰذا زمانہ جاہلیت میں بھی آپ رضی اللہ عنہ دیانتدار اور راست باز سمجھے جاتے تھے لہٰذا اہل مکہ میں آپ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے[۵] آپ رضی اللہ عنہ کے حالات کے ضمن میں خاص بات یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت سے ہی آپ رضی اللہ عنہ کے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ مخلصانہ تعلقات تھے[۶] اور اس کی وجہ ہمیں اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"الارواح جنود مجندہ ما تعارف منھا ائتلف وما تناکر منھا اختلف"[۷]

"روحوں کو (عالم ارواح میں) ایک لشکر کی طرح جمع کیا گیا۔ جو باہم مانوس ہو گئیں وہ (دنیا میں بھی باہم) مانوس و مالوف ہو گئیں اور جو وہاں ایک دوسرے سے اجنبی رہیں وہ یہاں بھی ایک دوسرے سے اجنبی رہیں۔"

گویا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طبیعت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت سے ایک خاص مناسبت شروع ہی سے تھی۔

قبول اسلام کے بعد:

مختلف تاریخی روایات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، اور آزاد و بالغ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تھا۔[۸]

آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر و حضر میں اکٹھے وقت گزار چکے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے کبھی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو جھوٹ، خیانت و بددیانتی تکبر اور دھوکے کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ لہٰذا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا اور نہ کسی غور و فکر اور تامل سے کام لیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا فوری فیصلہ جبکہ اسلام قبول کرنا گویا بھڑوں کے چھتہ میں ہاتھ ڈالنا تھا، آپ رضی اللہ عنہ کی انتہائی دانشمندی اور دور اندیشی کا ثبوت ہے اور اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی فطرت سلیمہ ابھی ہر قسم کی آلائشوں سے پاک رہی تھی آپ رضی اللہ عنہ کے بلا تامل اسلام لانے کا اعتراف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ کیا ہے۔

> ''میں نے جس شخص کو بھی اسلام کی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ تردد کا ضرور اظہار کیا بجز (حضرت) ابوبکر بن ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کے، جب میں نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے فوراً بلا تامل میری بات کو تسلیم کیا اور اسلام قبول کر لیا''۔[۹]

اسلام کے لیے خدمات:

اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اسلام کے پہلے داعی کے طور پر منظر عام پر آئے اور آپ رضی اللہ عنہ کی شبانہ روز محنت و کاوش کے نتیجے میں ہی مکہ کے کئی رؤساء نے اسلام قبول کیا۔ کئی غلام جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر اپنے آقاؤں کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے، اپنی گرہ سے ان کے مالکوں کو ان کی منہ مانگی قیمتیں دے کر آزاد کرایا[۱۰] مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بہ شانہ کفار مکہ کی تکالیف برداشت کیں۔ مکہ سے مدینہ پہنچے تو بھی اسلام کی

خدمت کے لیے کبھی کسی سے پیچھے نہ رہے بلکہ ہر موقع پر صف اول میں نمایاں نظر آئے۔ مسجد نبوی کی جگہ خریدی گئی تو اس کی قیمت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہی اپنی جیب سے ادا کی[۱۱]۔

آپ رضی اللہ عنہ غزوہ بدر سے لے کر غزوہ تبوک تک ہر غزوہ میں بنفس نفیس شرکت کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کی خاطر کافر بیٹے تک کو قتل کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں[۱۲] جنگی تیاری اور مجاہدین کے لیے ضروری سامانِ خوردونوش وغیرہ کی فراہمی کے لیے ہر موقع پر دل کھول کر اپنا مالی حصہ ڈالتے ہیں اور چشم فلک نے کبھی ایسا شخص نہ دیکھا ہوگا جو راہ خدا میں اپنا سارا مال لا کر پیش کر دے[۱۳] غرضیکہ آپ رضی اللہ عنہ نے ہر موقع پر اللہ کی رضا کی خاطر اسلام کی سربلندی کے لیے اپنا تن من دھن پیش کیا جس کی گواہی قرآن نے بایں الفاظ دی ہے۔

﴿الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ○ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ○ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ○ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی﴾[۱۴]

''جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ پاک ہو اور (اس لیے) نہیں (دیتا کہ) اس پر کسی کا احسان (ہے) جس کا وہ بدلہ اتار رہا ہے، بلکہ اپنی خداوند اعلیٰ رضا مندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے، اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا۔''

آپ رضی اللہ عنہ کی غلبۂ اسلام کے لیے خدمات کو سراہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں خراج عقیدت پیش کیا تھا:

''مانفعنی مال قط ما نفعنی مال ابی بکر''[۱۵]

''مجھے جس قدر ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے مال نے نفع پہنچایا ہے اتنا کسی اور کے مال نے نفع نہیں پہنچایا۔''

اور ایک موقع پر فرمایا:

''انہ لیس من الناس احدٌ امن علی فی نفسه وماله من ابی بکر''[۱۶]

''لوگوں میں سے جس قدر ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے جان و مال کا مجھ پر احسان ہے اتنا کسی اور کا نہیں۔''

آپ رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبہ کے بارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی منقول ہے ''ہم نے سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سب کے احسانات کا بدلہ چکا دیا اور ان کے احسانات کا بدلہ خود اللہ رب العالمین ہی قیامت کے دن دیں گے''۔[۱۷]

رسول اللہ ﷺ کی رفاقت و معیت:

قبولِ اسلام سے قبل بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے سفر و حضر کے ساتھی رہ چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یونہی رفاقت کے لیے منتخب نہ کر لیا تھا بلکہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی نگاہ دور بین سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ میں ایک باوفا و مخلص دوست کے تمام اوصافِ حمیدہ کو تاڑ لیا تھا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی وفاداری کا لوہا منوالیا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد اب دوستی کے رشتہ سے آگے مطیع و مطاع، نبی و امتی اور آقا و غلام کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نصیب دیکھیے کہ خود رسول اللہ ﷺ صبح و شام بیتِ صدیقی میں قدم رنجاں فرماتے ہیں اور دیر تک دونوں میں مجلس راز قائم رہتی ہے۔[۱۸]

ہجرتِ مدینہ کا موقع آیا تو رفاقت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی نگاہِ انتخاب اپنے دیرینہ ساتھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر ہی پڑتی ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ شرف ایسا ہے جو رہتی دنیا تک کسی کو نصیب نہ ہو سکے گا کہ اس سفرِ ہجرت میں نہ صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کا پورا خاندان رسول اللہ ﷺ کا راز داں بن کر خدمت کرتا ہے[۱۹] یہ سفرِ ہجرت جان ہتھیلی پر رکھ کر کیا گیا۔

مکہ میں ہی رسول اللہ ﷺ کا نکاح بنتِ صدیق رضی اللہ عنہ صدیقۂ کائنات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہو گیا تھا مگر رخصتی مدینہ آنے کے بعد ہوئی[۲۰] اور اس نکاح کی برکت سے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے میل ملاقات کا سلسلہ یقیناً اور بھی بڑھتا گیا جو وفاتِ نبوی تک جاری و ساری رہا۔ نمازِ عشاء کے بعد (بلاوجہ) جاگنے اور باتیں کرنے سے نبی ﷺ نے منع کر دیا تھا[۲۱] مگر اس ہدایت سے صرف ایک شخصیت مستثنیٰ تھی اور وہ تھے ابو بکر رضی اللہ عنہ جن کے ساتھ بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ اہم امور بارے مشاورت کرتے رہتے۔[۲۲] غرضیکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اکسٹھ سال رہے کیونکہ دو سال کی عمر سے ہی ان کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قربت ہو چکی تھی[۲۳] اسلام قبول کرنے کے بعد عرصہ تیئس سال آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سایہ کی طرح رہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رفاقت و معیت بارے مولانا جعفر شاہ پھلواری رحمہ اللہ نے نہایت خوبصورت الفاظ میں تبصرہ یوں کیا ہے:

> ''دنیا میں ہر کسی کے ایک دو رفیق ہوتے ہیں لیکن یہ رفاقت زندگی کے تمام گوشوں میں نہیں ہوتی۔ معاملات میں رفاقت ہے لیکن نظریات و تصورات میں نہیں۔ رشتے میں رفاقت ہے مگر معاملات میں نہیں۔ صلح میں ہے تو جنگ

میں نہیں۔ مذہب میں ہے تو سیاست میں نہیں۔ سب میں ہے تو بعض میں نہیں لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے رفقاء میں رفاقتِ کلی کی سعادت جس خوش نصیب کے حصے میں آسکی ہے وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی تنہا ذات ہے........ معلوم ہوتا ہے کہ ازل سے ہی اسے رفاقت نبوی کے لیے چن لیا گیا تھا"۔[۲۴]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پرتو:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے اس قدر نمایاں اثرات تھے گویا کہ آپ رضی اللہ عنہ ان کے پرتو تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کی نمایاں جھلک آپ رضی اللہ عنہ میں نظر آتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ ﷺ عالمِ گھبراہٹ میں گھر تشریف لائے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو بایں الفاظ تسلی دی تھی:

"کلا واللہ مایحزنک اللہ ابداً انک لتصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق"۔[۲۵] "ہرگز، بخدا اللہ آپ کو کبھی پریشان و غمگین نہ رہنے دے گا کیونکہ آپ ﷺ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتواں کا بوجھ اپنے سر لیتے ہیں اور جو چیز لوگوں کے پاس نہیں انہیں کما کر دیتے ہیں اور مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور لڑائی جھگڑوں میں حق (والوں) کی مدد کرتے ہیں"۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مکہ سے ہجرت کرنے کا پروگرام بنایا اور باہر نکلے ہی تھے کہ ایک قبائلی سردار ابن الدغنہ نے بھی بعینہٖ اسی مفہوم کے الفاظ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہے اور کہا کہ ایسے اوصاف حمیدہ کے مالک شخص کو شہر سے نکالنا بہت بڑی جسارت ہے چنانچہ قبائلی سردار ابن الدغنہ کہتا ہے۔

"ان مثلک یا ابابکر لا یخرج ولا یخرج، انک تکسب المعدوم تصل الرحم و تحمل الکل و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق"[۲۶]

"بلاشبہ آپ جیسے شخص کو نہیں نکلنا چاہیے اور نہ ہی آپ جیسے شخص کو نکالا جانا چاہیے۔ آپ تو لوگوں کو ان کی ضرورت کی چیز کما کر دیتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتواں کا بوجھ اپنے سر لیتے ہیں، مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور

لڑائی جھگڑوں میں حق (والوں) کی مدد کرتے ہیں۔''

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں باعتبار اخلاق و کردار کس قدر یکسانیت پائی جاتی تھی۔ اور اس یکسانیت کی حد یہ تھی کہ کئی بار ایسا ہوا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے اور سوچ میں بھی موافقت پائی گئی مثلاً اساری بدر بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے ایک ہی تھی کہ ان کے ساتھ رحم و لطف کا معاملہ کرتے ہوئے فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔[۲۷]

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب شرائط لکھی جا رہی تھیں تو بعض شرائط میں بظاہر مسلمانوں کا نقصان تھا اور یوں لگتا تھا جیسے کفار کے دباؤ میں آ کر ان کو قبول کیا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ان شرائط پر چونک اٹھے۔[۲۸]

حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ مکالمہ ہوتا ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے برحق نبی نہیں ہیں؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم: کیوں نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم: کیوں نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: تب ہم اپنے دین کے بارے میں ذلت کیوں برداشت کریں؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم: بیشک میں اللہ کا رسول ہوں اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہ میرا حامی و ناصر بھی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے (یعنی عمرہ)؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم: کیوں نہیں۔ لیکن کیا میں نے کہا تھا کہ ہم اسی سال طواف کعبہ کریں گے۔؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: نہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم: تو پھر آپ رضی اللہ عنہ ضرور بیت اللہ تک پہنچو گے اور اس کا طواف بھی کرو گے۔ (آئندہ سال)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! کیا یہ اللہ کے سچے برحق نبی نہیں ہیں؟

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ: کیوں نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ: کیوں نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: تب ہم اپنے دین کے بارے میں ذلت کیوں برداشت کریں؟

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ: بھئی وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ اپنے رب کی نافرمانی نہیں کرتے جبکہ ان کا رب ان کا حامی و ناصر بھی ہے۔ اللہ کی قسم! وہ حق پر ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: کیا آپ ہمیں بتایا نہ کرتے تھے ہم بیت اللہ پہنچیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ: کیوں نہیں۔ مگر کیا انہوں نے یہ کہا تھا کہ تم اسی سال بیت اللہ آؤ گے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: نہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ: تو پھر تم ضرور اس بیت اللہ تک آؤ گے اور اس کا طواف بھی کرو گے (آئندہ سال)۔[۲۹]

یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوالات کے جوابات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دیئے ان میں کس قدر یکسانیت اور موافقت پائی جاتی ہے، اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ ان مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کے ساتھ ایک خاص قسم کی مناسبت و موافقت حاصل تھی۔

حضرت ابو صدیق رضی اللہ عنہ کی فہم و فراست:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فطرۃً ہی ذہین و فطین اور عقیل و فہیم تھے آپ رضی اللہ عنہ کے اس اہم وصف کی وجہ سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرفہرست ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ہی حسب ضرورت مشورہ کرتے نظر آتے ہیں[۳۰] مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ رضی اللہ عنہم سے بالعموم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بالخصوص مشاورت کرنا دراصل ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا کام دیتا تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فہم و فراست کی امثلہ یوں تو نبوی دور میں بھی دکھائی جا سکتی ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی صلاحیتوں کا زیادہ واضح اظہار اس وقت ہوا جب آپ رضی اللہ عنہ عہدہ خلافت پر متمکن ہوئے۔ یہاں آپ رضی اللہ عنہ کی فہم و بصیرت کے چند واقعات ذکر کیے جاتے ہیں۔

i۔ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں سفرِ ہجرت پر روانہ ہوتے ہیں تو

کفار نے آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ دوسرا شخص تمہارے ساتھ کون ہے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے کمالِ حکمت و دانائی کے ساتھ جواب دیا:

"ھذاالرجل یھدینی السبیل"[۳۱]

"یہ صاحب مجھے راستہ بتاتے ہیں۔"

یہ جواب کس قدر محتاط انداز میں اور دانش مندی کے ساتھ دیا گیا تھا محتاج وضاحت نہیں۔

ii۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ ایک شخص کو اس کے رب نے اختیار دیا کہ جس قدر چاہے دنیا میں رہ لے اور جس قدر چاہے کھا پی لے یا اپنے رب سے ملاقات کو اختیار کرے تو اس بندۂ خدا نے اپنے رب کی ملاقات کو اختیار کر لیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رونے لگ گئے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے کہ اس بندہ سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور گویا اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا وقت قریب آ چکا ہے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہن اس بات کی طرف نہ جا سکے لہٰذا انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رونے پر تعجب کا اظہار کیا مگر جب بات سمجھ آ گئی تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ

" کان ابوبکر ھواعلمنا بہ "[۳۲]

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے سب سے زیادہ علم و معرفت رکھنے والے ہم میں سے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہی ہیں۔

iii۔ وفات رسول کے فوری بعد جب سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ بارے اختلاف ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہی کمال حکمت و دانائی سے کام لیتے ہوئے انصار کو اس اہم نکتے پر قائل کیا کہ تمام عرب قریش کے سوا کسی کی حکومت و سیادت کو تسلیم ہی نہ کریں گے لیکن انصار کی اقتدار میں شرکت کو یقینی بنانے کے لیے فرمایا:

"لا ولکنا الا مراء وانتم الوزراء ، ھم اوسط العرب دارا واعربھم احسابا" [۳۳]

"نہیں، لیکن ہم (قریش) امرا ہوں گے اور تم (ہمارے) وزرا ہو گے کیونکہ وہ (قریش) حسب و نسب میں عرب کا سب سے اچھا خاندان ہے۔"

سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دانش مندی اور بالغ نظری کو محمد حسین ھیکل یوں واضح کرتے ہیں۔

''حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس وقت جو طرز عمل اختیار کیا اور جس نہج سے حالات کی رفتار کو صحیح رخ پر رکھنے کی سعی کی اور اس میں کامیاب رہے اس سے ان کے دوررس ذہن اور بہت بڑے سیاسی فکر کی عکاسی ہوتی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بے حد بالغ نظر اور حالات کی نبض پر گہری نگاہ رکھنے والے تھے''۔[۳۴]

۱۷۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فہم وبصیرت اپنے نقطۂ عروج پر ہمیں اس وقت نظر آتی ہے جب آپ رضی اللہ عنہ وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدمہ دلدوز سینے میں لیے ہونے کے باوجود لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کو فوری طور پر روانہ ہونے کا حکم دیتے ہیں، دوسری طرف مدعیانِ نبوت کی خبر لی جاتی ہے تو تیسری طرف مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے معرکہ آرائی شروع ہو جاتی ہے اس چومکھی جنگ شروع کرنے میں کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک کو تردد اور تحفظات تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی نے منکرین زکوٰۃ سے جنگ کرنے بارے میں اعتراض کیا مگر بالآخر صدیقی رضی اللہ عنہ رائے سے متفق ہونے کو امت کی خیر و بھلائی کا باعث سمجھا[۳۵] آپ رضی اللہ عنہ کے ان نازک حالات میں تمام تر فتنوں کے خلاف اقدامات بارے محمد حسین ھیکل لکھتے ہیں۔

''حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بالکل صحیح تھا اور مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کے ساتھ برسرِ پیکار ہونا نہایت ضروری تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے سے تاریخ کا رخ بدل گیا اور اسلام جس تہذیب وثقافت کا لوگوں کو درس دیتا ہے وہ ہر اعتبار سے برقرار رہی اور پروان چڑھی۔''[۳۶]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت کے کل ستائیس مہینے بنتے ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ نے اتنی تھوڑی مدت میں جس حکمت و دانشمندی کے ساتھ تمام قسم کی سازشیں فروکیں اور فتنوں کا خاتمہ کیا نیز اسلامی حکومت کو غلبہ واستحکام کے راستہ پر ڈال دیا تاریخ عالم میں ایسی کوئی دوسری مثال ڈھونڈے سے نہ مل سکے گی[۳۷] حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بصیرت اور فراست کی یہ چند مثالیں ہیں ورنہ دسیوں ایسی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات:

نام ونسب:

آپ رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی عمر، کنیت ابوالحفص، فاروق لقب اور والد کا نام خطاب تھا۔ سلسلہ نسب کچھ یوں ہے: عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن ریاح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر۔[۳۸]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر مل جاتا ہے۔[۳۹]

قبل از اسلام:

شرفاء عرب کے یہاں بہترین مشغلے نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی اور خطابت وغیرہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کاموں میں مہارت حاصل کی۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھا بلکہ زمانہ جاہلیت کے چند پڑھے لکھے افراد میں آپ رضی اللہ عنہ کا بھی شمار ہوتا تھا۔[۴۰] فکرِ معاش لاحق ہوئی تو دیگر شرفاء عرب کی طرح پیشہ تجارت کو اختیار کیا اور دور دراز ممالک کے سفر بھی کیے۔[۴۱]

قبول اسلام اور اس کے بعد کے حالات:

ابتدا میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے توحید کی آواز سنی تو عرصہ کے کفر و شرک میں ملوث رہنے کی وجہ سے یہ آواز بہت نامانوس لگی۔ نیز آپ رضی اللہ عنہ کی سخت مزاجی، مستقل مزاجی اور خود اعتمادی نے بھی اپنا اثر دکھایا۔ لہٰذا یہی باعث ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ تک اسلام اور مسلمانوں کے سخت ترین دشمن بنے رہے مگر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ نبوت سے سورۃ الحاقہ سنی تو اس وقت اسلام ان کے دل میں گھر کر گیا جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

"وقع الاسلام فی قلبی کل موقع"[۴۲]

"اسلام مکمل طور پر میرے دل میں گھر کر گیا۔"

نیز آپ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام دعاء رسول اللہ کا بھی نتیجہ ہے۔ چونکہ آپ رضی اللہ عنہ کی زمانہ جاہلیت میں بھی معاشرہ میں کوئی معمولی حیثیت نہ تھی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کر لیا تھا کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت سے اوصاف کے مالک ہیں۔اسی لیے ان کے قبول اسلام سے اسلام کے غلبہ کی امید تھی لہٰذا خاتم النبیین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حضور التجا کرنے کے لیے اپنے دستِ مبارک اٹھائے اور یوں گویا ہوئے:

"اللھم اعز الاسلام باحب ھذین الرجلین الیک بابی جھل او بعمر بن الخطاب "[۴۳]

"اے اللہ! ابوجہل اور عمر بن خطاب دونوں میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہے اس کے ذریعے اسلام کو غلبہ عطا فرما۔"

قسامِ ازل نے دولتِ اسلام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قسمت میں لکھ دی تھی لہٰذا قبول اسلام کے بعد اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہمیشہ کے لیے ان کا سب سے بڑا دوست اور اسلام کا جانثار بن گیا۔

اسلام کے لیے خدمات:

اسلام کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کی خدمات گراں پایہ ہیں جبکہ فی الوقت عنوان مقالہ کی مناسبت سے آپ رضی اللہ عنہ کی اجتہادی صلاحیت وبصیرت اور آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادی منہج کو خصوصی طور پر نمایاں کرنا مقصود ہے لہٰذا یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کی اسلام کے لیے خدماتِ جلیلہ کو اشارۃً ذکر کیا جاتا ہے۔

قبول اسلام کے بعد غلبہ اسلام کی ہر کوشش میں آپ رضی اللہ عنہ انتہائی نمایاں نظر آتے ہیں آپ رضی اللہ عنہ کی جرات و بسالت اور ہیبت و دبدبہ کی بدولت ہی یہ ممکن ہوا کہ سب مسلمانوں نے پہلی دفعہ صحن کعبہ میں علانیہ رب کے حضور سجدہ کیا[۴۴]۔مظلوم مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت ملی تو یہ صرف آپ رضی اللہ عنہ ہی تھے جو اس شان سے نکلے کہ صحنِ کعبہ میں پہنچ کر طواف کرنے کے بعد کفارِ مکہ کو للکاریں کہ جس کو ہمت ہو مقابلہ کر لے مگر کسی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کی جرات کیوں کر ہو سکتی تھی لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ انتہائی اطمینان سے مدینہ پہنچ گئے۔[۴۵]

مدینہ پہنچنے کے بعد تمام غزوات میں آپ رضی اللہ عنہ نے شرکت فرمائی اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائے[۴۶] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ ہر موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی مشورہ میں ضرور شامل کیا جاتا۔جس کی واضح دلیل قیدیانِ بدر بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرنا ہے[۴۷] بیعت رضوان میں آپ رضی اللہ عنہ شامل تھے۔صلح حدیبیہ کی شرائط میں

بظاہر اسلام کی مغلوبیت کا اظہار تھا یہی باعث تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تیزی طبع اور جرات اس کو کیوں کر فوری طور پر برداشت کر سکتی تھی لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں معارضہ کیا مگر بالآخر مہبطِ وحی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور اس معاہدہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی دستخط کیے [۴۸] آپ رضی اللہ عنہ نے نیکی و خیر میں ہمیشہ سب سے سبقت لے جانے کی کوشش کی اس خواہش کی وجہ سے تبوک کے موقع پر اپنے گھر کا آدھا سامان لا کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔[۴۹] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدماتِ جلیلہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس تبصرہ کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے:

"ما زلنا اعزة منذ اسلم عمر"[۵۰]

"جب سے عمر (رضی اللہ عنہ) اسلام لائے ہمیں غلبہ ہی حاصل ہوتا گیا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فہم و بصیرت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فطرتی طور پر ہی کمال درجہ کی فہم و فراست کے مالک تھے اور پھر حکمِ الٰہی سے مزید ایسے حالات پیدا ہوتے گئے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی فہم و بصیرت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ آغاز عمر میں آپ رضی اللہ عنہ نے مروجہ ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر فکر معاش لاحق ہوئی تو دیگر شرفاء عرب کی طرح تجارت کو ہی ذریعہ معاش بنایا اور پھر اس کی وجہ سے دور دراز ممالک کے سفر کیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے تجرباتِ زندگی سے بھی بہت کچھ سیکھ جاتا ہے، زندگی کے ان تجربات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کیا اثرات مرتب کیے اس بارے میں شاہ معین الدین ندوی رحمہ اللہ یوں رقم طراز ہیں:

"تجارتی اسفار سے آپ رضی اللہ عنہ کو بڑے تجربے اور فوائد حاصل ہوئے آپ رضی اللہ عنہ کی خودداری، بلند حوصلگی، تجربہ کاری اور معاملہ فہمی اسی کا نتیجہ تھی اور ان ہی اوصاف کی بنا پر قریش نے آپ رضی اللہ عنہ کو سفارت کے منصب پر مامور کر دیا تھا قبائل میں جب کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی تو آپ رضی اللہ عنہ ہی سفیر بن کر جاتے تھے۔ اور اپنے غیر معمولی فہم و تدبر اور تجربہ سے اس عقدہ کو حل کر دیتے تھے"۔[۵۱]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی فہم و فراست پر صحبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی گہرے انمٹ نقوش و اثرات مرتب تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہجرت نبوی سے چالیس برس قبل پیدا ہوئے [۵۲] اس لحاظ سے آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیرہ برس چھوٹے ہوئے اور پھر بعثت نبوی کے ساتویں برس مسلمان ہوئے۔ ہجرتِ مدینہ کے سفر کے علاوہ آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک ہمیشہ ہر معاملے میں

آپ ﷺ کے ساتھ رہے اس عظیم رفاقت و مصاحبت کے کل سولہ سال بنتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے کا آپ رضی اللہ عنہ کو کس قدر موقع ملا اس کی گواہی سیدنا حضرت علیؓ کی زبانی سنیے۔ جب حضرت عمرؓ پر مسجد میں نمازِ فجر کی امامت کراتے حملہ ہوا تو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے دعائیہ کلمات کہنے لگے اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے اور فرمانے لگے:

> ''آپ رضی اللہ عنہ پر اللہ رحم فرمائے مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ جمع فرمائے گا کیونکہ میں نے کئی بار رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے:
>
> ''کنت وابو بکر و عمر و فعلت ابو بکر و عمر و انطلقت و ابوبکرو عمر فان کنت لا رجو ان یجعلک اللہ معھما''[۵۳]
>
> ''میں تھا اور ابوبکر و عمر تھے، میں نے (فلاں کام) کیا اور ابوبکر و عمر نے کیا، میں چلا اور ابوبکر چلے۔ لہٰذا مجھے یقین کی حد تک امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ (رضی اللہ عنہ) کو ان دونوں (یعنی رسول ﷺ) اور ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے ساتھ جمع کردے گا۔''

اس سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخمی حالت میں تھے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ آئے اور یوں آپ رضی اللہ عنہ کو تسلی اور دلاسہ دینے لگے:۔

> ''اے امیر المومنین! آپ رضی اللہ عنہ (ایک عرصہ تک) رسول اللہ ﷺ ۔ کے ساتھ رہے اور آپ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رفاقت و مصاحبت کو بہت اچھے انداز میں گزارا حتیٰ کہ جب رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ رضی اللہ عنہ سے راضی تھے''۔[۵۴]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی فہم و فراست اور بصیرت میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اگر کوئی اشکال پیدا ہوتا تو آپ رضی اللہ عنہ فوراً حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفسار کرتے اور یوں اطمینانِ قلب حاصل کرتے گویا آپ رضی اللہ عنہ حصولِ علم کے لیے بڑے جری واقع ہوئے تھے۔ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم تو رسول اللہ ﷺ کے جسمانی و روحانی رعب و دبدبہ کی وجہ سے سوال کرنے سے اکثر گریز ہی کیا کرتے تھے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب تک پوچھ نہ لیتے چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آیتِ کنز [۵۵] جس میں دولت کو خزانہ کرنے پر وعید سنائی گئی تھی، سب

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر بہت خوفزدہ اور پریشان تھے ۔ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بارے استفسار کرتے ہیں ۔[۵٦]

اسی طرح آیت قصر ﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا﴾[۵۷] (اور جب تم سفر پر جاؤ تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو کم کر کے پڑھو۔) بارے اپنا اشکال رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش فرما کر دور فرما لیا[۵۸] صلح حدیبیہ کی شرائط کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ کی فطرت (Nature) ان شرائط کو جن میں بظاہر مسلمانوں کی مغلوبیت کا اظہار تھا، کیوں کر فوری تسلیم کر سکتی تھی ۔ لہٰذا پہلے رسول اللہ ﷺ اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر اپنے ذہنی خدشات کا اظہار کیا ۔[۵۹] یہ واقعات اس بات کا کافی وشافی ثبوت ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرح نبی ﷺ سے استفسارات سے جہاں آپ رضی اللہ عنہ کے علم میں بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا وہاں اس علمِ وحی کی برکت سے یقیناً آپ رضی اللہ عنہ کی اجتہادی صلاحیت اور فہم و فراست میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں کمال درجہ کی اجتہادی صلاحیت اور دینی و دنیوی معاملات میں فہم و بصیرت حاصل ہونے کا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ خود خالق کائنات، قسامِ ازل نے آپ کے لیے ازل سے ہی مُحدَث و ملہم ہونا قرار دے دیا تھا جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

"لقد کا ن فیماقبلکم من الامم محدثون فان یکن فی امتی احدفانه عمر".[٦۰]

"سابقہ امتوں میں ایسے لوگ ہوئے جنھیں (اللہ کی طرف سے) الہام ہوتا تھا۔ میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہیں۔"

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان الله جعل الحق علی لسان عمر و قلبه"[٦۱]

"بے شک اللہ نے عمر کی زبان اور دل پر حق جاری کر دیا ہے۔"

آپ رضی اللہ عنہ کی کسی رائے اور فکر و نظر میں شیطانی اثرات کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ صادق المصدوق نبی ﷺ نے فرما دیا ہے کہ جس راستے پر عمر رضی اللہ عنہ چلیں شیطان وہاں سے راہ فرار اختیار کر جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"والذی نفسی بیده ما لقیک الشیطان سالکا فجاقط الاسلک فجاغیر فجک"[٦۲]

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جس راستے میں شیطان کا آپ سے سامنا ہوتو وہ راستہ بدل لیتا ہے۔''

ان مذکورہ بالا وجوہات کی وجہ سے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اور سوچ کے مطابق بارہا قرآن مجید کا نزول ہوتا رہا ہے[۶۳] ایسی آیات جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش اور سوچ کی موافقت میں نازل ہوئیں انہیں ''موافقات عمر رضی اللہ عنہ'' کہا جاتا ہے اور وہ کل بیس ہیں [۶۴] گویا آپ رضی اللہ عنہ کی ذہنی مناسبت فطرۃ اللہ رب العزت کے ساتھ تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کو اللہ کی طرف سے الہام ہوتا تھا جیسا کہ آپ رضی اللہ عنہ کو خواب میں اذان کا طریقہ سکھایا گیا اور پھر اسی طریقہ کے مطابق عہدِ نبوی میں اذان کہی جاتی رہی [۶۵] جو آج تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی (ان شاء اللہ)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اصابت رائے کا اندازہ لگایئے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس معاملہ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمادیتے کہ اس کی نسبت میرا خیال یہ ہے تو ان کے گمان کے مطابق ہی ہوجاتا تھا۔[۶۶]

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے حالات:

نام ونسب:

آپ رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی عثمان، کنیت ابوعبداللہ اور ابوعمر اور لقب ذوالنورین ہے۔ والد کا نام عفان اور والدہ کا نام اروی تھا[۶۷] آپ رضی اللہ عنہ ماں کی طرف سے قریشی ہیں اور باپ کی طرف سے آپ رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں عبدمناف پر حضور اکرم ؐ سے مل جاتا ہے۔[۶۸]

قبل از اسلام:

بچپن اور سن رشد کے حالات پردہ راز میں ہیں۔ عنفوانِ شباب میں تجارتی مصروفیات کو اختیار کیا اور اپنی امانت و دیانت، صداقت و راستبازی کی وجہ سے ابتداہی سے شہر مکہ میں اچھی شہرت حاصل کرلی۔ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زندگی کے آخری ایام میں باغیوں کے گھر کے محاصرہ کرلینے کے وقت کہا تھا کہ انھوں نے نہ تو زمانہ جاہلیت میں اور نہ ہی زمانہ اسلام میں کوئی بدکاری کی ہے اور نہ کسی کو قتل کیا۔[۶۹] نیک فطرت لوگوں کے تعلقات بھی یقیناً اپنے ہم خیال لوگوں سے ہی ہوا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی آپ رضی اللہ عنہ کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوستانہ مراسم وتعلقات تھے۔[۷۰]

قبولِ اسلام اور اس کے بعد کے مختصر حالات:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دولتِ اسلام ملی تو پھر اسلام کے اولین مبلغ ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں آپ رضی اللہ عنہ ہی کی تبلیغ اسلام سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قبولِ اسلام کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں ہی آپ رضی اللہ عنہ نیک خصال اور اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے لہٰذا قبولِ اسلام کے لیے کوئی زیادہ پس و پیش کا موقع نہیں آیا کیونکہ انہیں جس اسلام کی دعوت دی جا رہی تھی وہ ایسے اچھے اخلاق ہی کی تو دعوت تھی۔ اسلام کی آواز نے تو گویا ان کی فطرتِ سلیمہ کو مزید بیدار کر دیا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ انہیں قبولِ اسلام کے لیے قائل کر چکے تھے کہ اتنے میں رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم پہنچتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بس اتنا کہا: ''عثمان رضی اللہ عنہ! خدا کی جنت قبول کر لو، میں تمہاری اور ساری انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں''۔ زبانِ نبوت سے نکلنے والے یہ جملے تیر بہدف ثابت ہوتے ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں بے اختیار کلمہ شہادت پڑھنے لگا اور غلامانِ رسول کی صف میں شامل ہو گیا۔[۷۱]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جس وقت اسلام قبول کرتے ہیں اس وقت تک ابھی صرف پینتیس یا چھتیس زن و مرد مسلمان ہوئے تھے [۷۲] اور یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام قبول کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیا بیتی یہ ایک طویل داستانِ عزیمت ہے مگر آپ رضی اللہ عنہ کے پایہ ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے پائی۔ کفارِ مکہ کے مظالم کی جب حد ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت حبشہ کرتے ہیں تو اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> "ان عثمان اول من هاجر با هله من هذه الامة" [۷۳]
>
> ''بلاشبہ عثمان (رضی اللہ عنہ) اس امت کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ہجرت کی۔''

ایک افواہ کی وجہ سے حبشہ سے مکہ واپس آ گئے اور پھر دوبارہ ہجرتِ مدینہ کا بھی شرف حاصل ہوا۔[۷۴]

اسلام کے لیے خدمات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غلبہ اسلام کے لیے خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے علاوہ کوئی

چارہ ہی نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے احسانات جمیع امت پر ہیں۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں وہ کون سا جنگی معرکہ ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مالی تعاون شامل نہ ہو۔ غزوات میں بھی آپ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بہ شانہ شرکت کی۔ غزوہ بدر میں اپنی بیوی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنت محمد کی تیمارداری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے اگرچہ یہ عدمِ شرکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ہی تھی مگر اس کا غم ہمیشہ رہا۔ اور یہ امتیاز بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہی حاصل ہے کہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہونے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ کو شریک سمجھا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اموالِ غنیمت سے انہیں حصہ دیا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:

"ان لک اجر رجل ممّن شهد بدراً وسهمهٗ"۔[۷۵]

"بدر میں شریک ہونے والوں کی طرح آپ کے لیے اجر و ثواب بھی ہے اور مالِ غنیمت سے حصہ بھی۔"

اسی طرح یہ اعزاز بھی آپ رضی اللہ عنہ کو ہی حاصل ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیر بنا کر مکہ بھیجا تھا اور یہ دراصل اہلِ مکہ میں آپ رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت اور مقام و مرتبہ کی وجہ سے تھا جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"لو کا ن احد اعز ببطن مكة من عثمان لبعثه مكانه "[۷۶]

"اگر وادی مکہ میں عثمان (رضی اللہ عنہ) سے بڑھ کر کوئی قابل احترام ہوتا تو آپ ضرور اسے ہی بھیجتے۔"

غزوہ بدر کی طرح بیعتِ رضوان میں بھی باقاعدہ شریک نہ ہونے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ کو اس بیعت میں شامل قرار دیا گیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر رکھتے ہوئے کہا کہ یہ عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ہے[۷۷] غرضیکہ مسلمانوں کے لشکر کی ضرورتیں پوری کرنے کا مسئلہ ہو یا پانی کی فراہمی کا مسئلہ، یا مسجد نبوی کی وسعت کے لیے جگہ کی خریداری کا مسئلہ ہو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر موقع پر پیش پیش نظر آئیں گے۔[۷۸] غزوہ تبوک کے موقع پر تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی سخاوت کی اس قدر حد کر دی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دی ہوئی اشرفیوں کو دستِ مبارک سے اچھالتے جاتے ہیں اور ساتھ یہ کہتے جاتے ہیں:

"ماضرّ عثمان ما عمل بعد هذا اليوم" [۷۹]

"عثمان آج کے بعد جو بھی عمل کرے تو وہ ان کے لیے ضرر رساں نہ ہوگا۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اسلام کے لیے خدمات کا سلسلہ عہدِ نبوی اور عہدِ صدیقی و فاروقی

تک پھیلا ہوا ہے۔خود ان کا عہد حکومت بارہ سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے[۸۰] اللہ تعالیٰ ان کی ان خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔" رضی اللہ عنہ وارضاہ"۔

رسول اللہ ﷺ کی رفاقت اور اس کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اثرات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خاندان بنو امیہ اور رسول اللہ ﷺ کے خاندان (بنو ہاشم) میں زمانہ جاہلیت سے رقابت تھی اور اس رقابت کے اثرات فتح مکہ تک کے تمام غزوات میں نظر آتے ہیں کیونکہ غزوہ بدر کے بعد کفار کی قیادت جس شخص کے ہاتھ میں تھی وہ اموی خاندان سے ہی تعلق رکھتا تھا یعنی ابوسفیان جو بعد میں مسلمان بھی ہو گئے[۸۱] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خاندانی تعصب کو پس پشت ڈال کر اسلام قبول کیا تھا لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے خاندان چھوڑنے کا صلہ یہ دیا کہ انہیں یکے بعد دیگرے اپنی دو بیٹیوں کا رشتہ دے کر بنو ہاشم میں شامل فرما لیا[۸۲] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے دوہرے داماد ہونے کا شرف حاصل ہے اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کو "ذوالنورین" بھی کہا جاتا ہے۔[۸۳]

دامادی کا شرف حاصل ہونے کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یقیناً رسول اللہ ﷺ کے بہت قریب ہونے کے مواقع میسر آئے اور آپ رضی اللہ عنہ نے بھی جی بھر کر چشمہ نبوت سے کسب فیض کیا۔ اسی لیے جب ایک دفعہ بعض لوگوں نے جو صحابیت کے شرف سے محروم تھے، آپ رضی اللہ عنہ پر کسی وجہ سے اعتراض کیا تو فرمایا:

> واللہ! ہم سفر میں بھی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔ہم بیمار ہوتے تو آپ ﷺ ہماری عیادت فرماتے، ہمارے جنازوں کے پیچھے چلتے، ہم کو ساتھ لے کر جہاد کرتے تھے، کم و بیش جو کچھ ہوتا اس سے ہماری غم خواری فرماتے تھے اور اب ایسے لوگ ہم کو آپ ﷺ کی سنت بتانا چاہتے ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کی صورت بھی نہیں دیکھی"[۸۴]

رسول اللہ ﷺ کی رفاقت کے نتیجہ میں جہاں آپ رضی اللہ عنہ نے علم وحی حاصل کر لیا تھا وہاں آپ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے اجتہادات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اجتہادی منہج بھی سیکھا۔ آپ ﷺ کے فیصلوں کو دیکھ کر اجتہادی بصیرت اور فراست میں یقیناً ترقی ہوتی رہی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فراست کا اندازہ لگائیے کہ ایک دفعہ ایک شخص آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھتے ہی فرمایا:

"یدخل علی احدکم والزنا فی عینیه"

"تم میں سے کوئی شخص میرے پاس آتا ہے دراں حالیکہ اس کی آنکھوں میں زنا کے اثرات ہوتے ہیں۔"

اس شخص نے کہا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی کسی پر وحی آسکتی ہے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

"لا ولکن فراسة صادقة"[۸۵]

"نہیں یہ تو سچی فراستِ حقیقی ہے۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا باغیوں نے محاصرہ کر لیا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت آپ رضی اللہ عنہ سے مقابلہ ودفاع کرنے کی اجازت طلب کرتی ہے مگر چونکہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی خداداد بصیرت اور فراست سے معلوم کر لیا تھا کہ اب ان کی شہادت ہو کر رہے گی لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو منع کر دیا تا کہ ان کے خون کے علاوہ کوئی خون نہ بہے اور یوں مسلمان مزید قتل و غارت سے محفوظ ہو جائیں۔[۸۶]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی وصیت لکھوانا چاہی تو اس کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا گیا۔ وصیت لکھوانے کے دوران اپنے جانشین کا نام ابھی نہ لکھوا سکے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر غشی طاری ہو گئی اور بے ہوش ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی فراست وبصیرت سے خود ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوش آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے وصیت دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وصیت سنانا شروع کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بے اختیار اللہ اکبر پکار اٹھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فہم وفراست کی بہت تعریف وتوصیف کی۔[۸۷]

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات:

نام ونسب:

آپ رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی علی رضی اللہ عنہ کنیت ابوتراب اور ابوالحسن ہے اور لقب حیدر ہے والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ ہے[۸۸] خلفاء راشدین میں رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ قریبی ہونے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔

قبل از اسلام:

جب رسول اللہ ﷺ نے اعلانِ نبوت کیا تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر محض دس سال تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس وقت آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی زیر کفالت تھے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ابو طالب کثیر العیال تھے لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے معاشی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنے چچازاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کفالت و تربیت کا ذمہ اٹھا لیا [۸۹] رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اسلام کی دعوت پیش کی تو چونکہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کے پہلے ہی آپ رضی اللہ عنہ پر اثرات مرتب ہو چکے تھے نیز بچپن کی وجہ سے ابھی تک فطرت مسخ نہ ہو سکی تھی لہٰذا اسلام قبول کرنے میں زیادہ دیر نہ کی اور دوسرے ہی دن اسلام قبول کر لیا بلکہ بچوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف و اعزاز حاصل کیا۔[۹۰]

قبول اسلام کے بعد:

اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل رہا کہ اکثر اوقات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی رہتے۔ آپ ﷺ نے اپنے خاندان کو دین کی دعوت دینے کا پروگرام بنایا تو اس کے انتظامات کی ڈیوٹی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لگائی۔ اس مجلس میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے والے صرف آپ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔[۹۱] رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے ہجرت کی اجازت ملی تو یہ شرف بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا کہ ہجرت کی رات رسول اللہ ﷺ کے بستر پر گزارتے ہیں[۹۲] اور بہادری و جوانمردی کی ایک شاندار مثال قائم کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے کے دو تین دن بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مدینہ کی طرف عازمِ سفر ہوتے ہیں۔[۹۳]

مدینہ پہنچنے کے بعد مسجد نبوی کی تعمیر سے لے کر غلبہ اسلام کی ہر سرگرمی اور کوشش میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ غزوہ تبوک کے سوا جس میں رسول اللہ ﷺ نے آپ رضی اللہ عنہ کو اہل بیت کی حفاظت پر مامور کیا تھا تمام غزوات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حصہ لیا اور بہادری و جانثاری کے شاندار کارنامے رقم کیے[۹۴] اکثر غزوات میں اسلامی لشکر کا علم آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہی تھا جسے آپ رضی اللہ عنہ نے کبھی سرنگوں نہ ہونے دیا[۹۵]۔ آپ رضی اللہ عنہ کا شمار کاتبین وحی میں بھی ہوتا ہے[۹۶] اور یہ آپ رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہوں نے صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط اپنے دستِ مبارک سے لکھیں[۹۷] یہود کے قلعہ خیبر کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فتح کرنا تاریخ اسلام کا ایک نہایت زریں باب ہے[۹۸] مورخین لکھتے

ہیں کہ غزوہ حنین میں جبکہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقتی طور پر پاؤں اکھڑ گئے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان معدودے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے صبر و استقامت کی راہ اختیار کی [۹۹] غرضیکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عہد نبوی میں غلبہ اسلام کے لیے خدمات بے پناہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ان خدماتِ جلیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے۔ ''رضی اللہ عنہ وارضاہ''۔

رسول اللہ ﷺ کی رفاقت و مصاحبت کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اثرات:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بچپن ہی سے رسول اللہ ﷺ کے زیرِ کفالت تربیت و پرورش پائی تھی لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے شب و روز کا برابر مشاہدہ کرتے رہے اور اور کسبِ فیض کرتے رہے آپ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کا قرب کس قدر حاصل تھا خود بتلاتے ہیں:

''کانت لی من رسول اللہ منزلۃ لم تکن لاحدمن الخلائق'' [۱۰۰]

''رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ میرے تعلق کا مخلوق میں سے کوئی ثانی نہ تھا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ جوان ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کے داماد ہونے کا شرف حاصل ہو گیا جس سے قربت کی راہیں مزید ہموار ہوتی گئیں۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضل و کمال کی دو وجوہات ذکر کی ہیں۔

i۔ اسلام لانے میں سبقت

ii۔ رسول اللہ ﷺ سے آپ رضی اللہ عنہ کی قربت جو بچپن میں نبی ﷺ کے زیر کفالت رہنے اور پھر داماد بن جانے سے مزید مضبوط ہو گئی تھی۔ [۱۰۱]

رسول اللہ ﷺ کی رفاقت و معیت کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اثرات کا ذکر مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ یوں کرتے ہیں:

> ''رسول اللہ ﷺ سے خاندانی اور نسبی تعلق، ایک عمر رفاقت اور روزمرہ کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپؐ کے مزاج و افتادِ طبع سے اور ذاتِ نبوی کی خاص صفات و کمالات سے گہری مناسبت ہو گئی تھی جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی برحق کو نوازا تھا۔'' [۱۰۲]

رسول اللہ ﷺ کی طویل رفاقت و معیت کا ایک اثر آپ رضی اللہ عنہ پر یہ بھی ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ کی فہم و فراست اور اجتہادی صلاحیت و بصیرت کو جلا ملتی ہے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کی اس صلاحیت کو بھانپتے ہوئے ہی رسول اللہ ﷺ نے آپ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا۔ حضرت

علی رضی اللہ عنہ نے تواضع وانکساری اور کسرِ نفسی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ناتجربہ کاری کا اظہار فرمایا تو رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سینے پر ہاتھ مارا اور آپ رضی اللہ عنہ کے لئے اللہ کے حضور دعا کرتے ہوئے فرمایا:

"اللھم اھد قلبه و ثبت لسانه "[۱۰۳]

"اے اللہ! اس کے دل کو درست راہ دکھا اور اس کی زبان کو حق گوئی پر ثابت رکھ۔"

اور ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی بھی فرمادی:

"ان الله سیهدی لسانک و یثبت قلبک"

"یقین کرلو اللہ تعالیٰ تمھاری زبان اور دل کی راہِ راست کی جانب رہنمائی فرمائے گا۔"

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود ہی بیان کرتے ہیں "(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا اور پیشین گوئی کے بعد) پھر کبھی بھی مقدمات کا فیصلہ کرنے میں مجھے تذبذب نہ ہوا"[۱۰۴]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فہم وفراست اور دانشمندی و ہوشمندی کا اندازہ کیجیے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ ابوسفیان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کا ذکر کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہوکر وہی بات کہو جو برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہی تھی کہ

"تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ"

"خدا کی قسم خدا نے تم کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور بے شک ہم خطا کار تھے۔"

چنانچہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح جواب میں فرمایا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ"[۱۰۵]

"آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (و ملامت) نہیں ہے خدا تم کو معاف کرے اور وہ بہت رحم کرنے والا ہے۔"

اور اس طرح دربارِ نبوت سے عام معافی کا اعلان ہو جاتا ہے۔

خلفاء راشدین کے عہد نبوی میں اجتہادات:

عہد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد بارے گزشتہ باب میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے۔ فی الوقت خلفاء راشدین کے تعارف کے ضمن میں یہ مقصود ہے کہ ان کی زندگی کے اس گوشے کو بالخصوص نمایاں کیا جائے کہ وہ نہ صرف اپنے ادوارِ حکومت میں اجتہاد کرتے رہے بلکہ بوقتِ ضرورت عہدِ نبوی میں بھی اجتہاد کرتے رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اکثر مشاورت کیا کرتے تھے۔ قیدیانِ بدر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ سے مشاورت بارے گزشتہ باب میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ سے دن کی دعوتی و تبلیغی اور دیگر مصروفیات سے فارغ ہو کر مشاورت کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسمر مع ابى بكر فى الامر من امر المسلمين وانا معهما." [۱۰۶]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات بارے رات کو مشاورت کیا کرتے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ دینا ظاہر ہے اجتہاد کی بدولت ہی تھا۔ عہدِ نبوی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی تو دسیوں مثالیں مل جاتی ہے چند ایک کا ذکر حسب ذیل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اول فرصت میں مسجد نبوی کی تعمیر کا کام کیا گیا۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مساعی جمیلہ کی برکت سے مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو نماز کے لیے کیوں کر جمع کیا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی مختلف آرا پیش کرتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بوجوہ مسترد فرما دیتے ہیں۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ رائے دیتے ہیں کہ نماز کے وقت کسی شخص کی ذمہ داری لگادی جائے اور وہ اونچی آواز سے لوگوں کو پکارے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس رائے کو پسند فرماتے ہوئے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو نماز کے وقت "الصلاة جامعة" (نماز کے لیے جمع ہو جاؤ۔) کے الفاظ بلند آواز سے کہنے کا حکم دیا [۱۰۷]۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس سے نکل کر اچانک ایک باغ میں چلے گئے اور کافی دیر تک نہ آئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

تلاش میں نکلے۔ حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو تلاش کرتے کرتے اس باغ تک پہنچ ہی گئے اور رسول اللہ ﷺ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پریشانی کے متعلق بتایا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کو اپنے نعلین مبارک دیئے اور کہا کہ جو شخص بھی کلمہ توحید کی دل سے شہادت دینے والا باغ کے باہر ملے اسے جنت کی بشارت دینا۔ چنانچہ حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملتے ہیں اور حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سارا ماجرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سناتے ہیں اور بشارت دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کے سینے پر ہاتھ مارا اور واپس جانے کا حکم دیا۔ حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ رونے کا سامنہ لے کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واپس کر دینے کا ماجرا سنایا، اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی آگئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کو واپس کر دینے کی وجہ دریافت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر یہ خوشخبری لوگوں کو سنادی جائے تو پھر لوگ محض کلمہ توحید کے قلبی اقرار کو نجات کے لیے کافی سمجھتے ہوئے عمل صالح کرنا چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند آئی اور آپ ﷺ نے پھر دوبارہ ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کو نہ بھیجا۔[۱۰۸]

اس حدیث سے جہاں عہد نبوی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی خبر ملتی ہے وہاں ان کے اجتہاد کی بنیاد ''مصلحت عامہ'' کا بھی علم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی مصلحت کی خاطر ایک خبر نہ پھیلانے کا رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دیا جس کو آپ ﷺ نے قبول فرمایا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مجتہد کو اجتہاد میں ''مصلحت عامہ'' کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔[۱۰۹]

القصہ عہدِ نبوی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں جن میں منافقین کی نماز جنازہ، صلح حدیبیہ اور ازواج مطہرات کے حجاب وغیرہ کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اجتہاد کرتے رہے جس کی واضح مثال جمع قرآن بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قائل کرنا ہے[۱۱۰] چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مشاورتی اجتہاد اکثر و بیشتر کرتے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ کی مجلس مشاورت کے سب سے اہم رکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جتنے بھی اہم امور سرانجام دیئے گئے ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشاورت کا حصہ ضرور نظر آئے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غالباً اپنی زندگی کا آخری اجتہاد یہ کیا اور بجا کیا کہ اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا خلیفہ بنا دیا۔[۱۱۱]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عہد نبوی میں اجتہاد کی کئی مثالیں ملتی ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر حسب ذیل ہے۔

i۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک لونڈی کے متعلق حکم دیا کہ اس پر حد جاری کریں کیونکہ اس نے زنا کیا تھا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ وہ ابھی ابھی حالتِ نفاس سے نکلی ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس خدشہ کی بنا پر اجتہاداً حد نہ لگائی کہ وہ کہیں اس حالت میں حد لگنے سے مر نہ جائے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کو اس بارے بتایا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی تحسین فرماتے ہوئے کہا: ''تم نے بہت اچھا کیا کہ اس حالت میں کوڑے نہ لگائے۔ اب اسے اس وقت تک چھوڑ دو جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائے''۔[۱۱۲]

ii۔ ایک دفعہ یمن سے تین آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ایک بچے کے بارے تینوں نے دعویٰ کیا کیونکہ تینوں نے ایک عورت سے ایک ہی طہر میں ہم بستری کی تھی اور پھر اس کے بطن سے یہ لڑکا پیدا ہوا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے تو کسی ایک کو دے کر باقی دو کو ویسے ہی دستبردار ہونے کا کہا مگر کوئی بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تینوں کے درمیان قرعہ ڈالا جس کے نام قرعہ نکلا اسے بچہ دے دیا اور ساتھ ہی اسے کہا کہ وہ باقی دو کو دو تہائی دیت ادا کر دے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا علم رسول اللہ ﷺ کو ہوا تو آپ ﷺ اس قدر مسکرائے کہ آپ ﷺ کے دندان مبارک نظر آنے لگے۔[۱۱۳]

iii۔ ''مابور'' نامی ایک غلام عہدِ نبوی میں زنا سے متہم ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تلوار دی اور یہ کہا کہ وہ جہاں ملے اسے قتل کر دینا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ تلاش کرتے کرتے اسے ایک کنویں میں نہاتے دیکھتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ تلوار سونتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ نے اسے پکڑ کر کھینچا تو وہ چوں کہ خوف کے مارے پہلے ہی آپ کو دیکھ کر کانپ رہا تھا لہٰذا اس کشمکش میں اس کا تہہ بند کھل گیا۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ تو پیدائشی خنثیٰ ہے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ اسے قتل کیے بغیر واپس رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کیے بغیر واپس آنے کی تحسین فرمائی[۱۱۴] اور یوں آپ رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کی تصویب بھی فرمائی۔

خلفاءراشدین کا دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں مقام ومرتبہ:

خلفاءراشدین کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص قربت ومعیت کی وجہ سے ان کا مقام و مرتبہ عہد نبوی میں ہی بالترتیب مسلمہ حیثیت اختیار کر چکا تھا چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بتلاتے ہیں کہ وہ عہد نبوی میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں درجہ بندی کرتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہ سمجھتے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سمجھتے تھے۔[۱۱۵]

خلفاءراشدین میں بالخصوص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبہ بارے کفارِ مکہ بھی آگاہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں اگر کسی کا مقام ہے تو بالترتیب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کا ہے یہی وجہ ہے کہ غزوہ احد میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت شہید ہوئی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہوئے ،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایک محفوظ مقام پر تشریف فرما تھے۔ اتنے میں کفار میں یہ بات کسی طرح مشہور ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) شہید ہوگئے ہیں۔ ابوسفیان سردارِ کفارِ مکہ نے بلند آواز سے پوچھا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کا جواب نہ دینے کا اشارہ کیا۔ اس نے پھر کہا: کیا ابن ابی قحافہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) موجود ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر جواب نہ دینے کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا۔ وہ پھر پوچھتا ہے: کیا ابن خطاب (عمر رضی اللہ عنہ) ہیں؟[۱۱۶] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خاموشی کی وجہ سے اس نے سمجھا کہ شاید یہ تمام لوگ شہید ہوگئے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کو محفوظ وسلامت رکھا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کفار مکہ تک کو اس بات کا علم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اگر کسی کا مقام ہے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے اور ان کے بعد مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے۔

اس سلسلہ میں نہایت مناسب ہوگا کہ یہاں وہ مکالمہ نقل کر دیا جائے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ کے مابین ہوا۔ امام محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں مقام ومرتبہ میں سب سے بڑھ کر کون ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں'' انہوں نے دوسری بار پھر پوچھا کہ ان کے بعد کون ہیں؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ ہیں'' ۔محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ مجھے خدشہ ہوا کہ اگر تیسری مرتبہ بھی یہی سوال کیا تو کہیں آپ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام نہ لیں لہٰذا محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ میں نے تیسری بار سوال کا انداز بدل کر یوں کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے بعد تو پھر آپ رضی اللہ عنہ ہوں گے؟

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہایت انکساری اور کسرِ نفسی کے ساتھ فرمایا: ''میں تو مسلمانوں کا ایک عام فرد ہوں''۔[۱۱۷]

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین کے امت میں بلند مرتبہ ہونے کے متعدد بار اشارے کیے ہیں اس سلسلہ میں چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

i۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملہ پر بات چیت کرتی ہے جاتے ہوئے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر وہ دوبارہ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ ہو سکے تو؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مل لینا۔[۱۱۸]

ii۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ ایک آدمی نے گائے پر سواری کی تو گائے اس آدمی سے یوں گویا ہوئی: ''میں اس مقصد کے لیے تو نہیں پیدا کی گئی بلکہ میں تو ہل چلانے کے لیے پیدا ہوئی ہوں''۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو حیرت سے ''سبحان اللہ'' کہا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گائے کے اس کلام کرنے پر میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کا ایمان ہے حالانکہ اس وقت اس مجلس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے۔[۱۱۹]

iii۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالخصوص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: اگر میں اس امت میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بناتا۔[۱۲۰]

iv۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں میں سے سب سے محبوب کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: عائشہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مردوں میں سے کون؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ پھر تیسری مرتبہ سوال کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔[۱۲۱]

v۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کرنا۔[۱۲۲]

vi۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''ان الشیطان لیخاف منک یا عمر''۔ [۱۲۳]

''عمر! یقین کرو، شیطان بھی تم سے ڈرتا ہے۔''

vii۔ مرہ بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کا ذکر کیا اس دوران ایک

آدمی کپڑا لپیٹے ہوئے گزرا تو آپ ﷺ نے اس شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ اس دن ہدایت (حق) پر ہو گا۔ حضرت مرہ بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اٹھ کر اس شخص کی طرف گیا تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔[۱۲۴]

viii۔ غزوہ خیبر کے موقع پر نبی ﷺ نے ایک دن فرمایا "میں جھنڈا اب اس شخص کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔ اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھتے ہیں۔ سب صحابہ رضی اللہ عنہم اس سعادت کے حصول کی تمنا کر رہے تھے کہ اتنے میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور پھر انہیں علم عطا فرمایا۔[۱۲۵] ان احادیث کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ خلفاء راشدین کا شخصی مقام و مرتبہ عہدِ نبوی میں ہی متعین ہو چکا تھا۔

خلفاء راشدین کے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں شخصی مقام و مرتبہ کے مختصر ذکر کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کے علمی مقام و مرتبہ کے بارے بیان کیا جاتا ہے۔

خلفاء راشدین کا دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں علمی مقام و مرتبہ:

خلفاء راشدین کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے سسر ہونے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کو دامادِ رسول ہونے کا شرف حاصل ہے لہٰذا اس سے نبی ﷺ اور خلفاء راشدین کی قربت اور اکثر اوقات میل ملاقات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں اور یہی وہ قربت و معیت تھی جس کی وجہ سے خلفاء راشدین کو علمِ دین میں حظِ وافر ملا تھا۔ خلفاء راشدین کاتبینِ وحی تھے لہٰذا کتابتِ وحی اور قرآن مجید سے خصوصی لگاؤ کی برکت سے وہ قرآن مجید کے حافظ بھی تھے، نبی کریم ﷺ کی زندگی ان کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی لہٰذا سنتِ نبوی کے بارے میں ان کے علم کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کو کیسے سمجھا اور کیسے اس کے احکام کی تطبیق کی، اس سلسلہ میں کن کن امور کا لحاظ رکھا اس سب بارے خلفاء راشدین بخوبی آگاہ تھے۔ فطری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ رفاقتِ رسول نے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو نہ صرف بیدار کر دیا تھا بلکہ اس میں مزید جلا بخشی تھی جیسا کہ ڈاکٹر طہ جابر العلوانی بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارے لکھتے ہیں۔

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست تعلیم پائی تھی لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا کہ آپ ﷺ ایک مستحسن کام کا

حکم دینے کا ارادہ کرتے مگر امت کے مشقت میں پڑنے کے ڈر سے اس کا حکم نہ دیتے جیسا کہ آپ ﷺ نے متعدد بار ارشاد فرمایا

"لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بکذا".

"اگر میری امت پر یہ کام مشقت کا باعث نہ ہوتا تو میں انھیں فلاں کام کا حکم دیتا۔"

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تھا کہ آپ ﷺ کبھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک کام سے منع کرتے مگر جب آپ ﷺ دیکھتے کہ روکنے کا سبب اب جاتا رہا ہے تو آپ ﷺ انہیں رخصت دے دیتے کبھی آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو کسی چیز کے حرام ہونے کی خبر دیتے مگر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس چیز کی حرمت سے مشقت وکلفت میں پڑنے کا ذکر کرتے تو نبی ﷺ ان سے مشقت وحرج دور کرنے کے لیے رخصت دے دیتے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو دو امور میں سے آسان ترین کو اختیار کرتے دیکھا تھا ، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے اس منہج کے اثرات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر بھی مرتب ہوئے"۔[۱۲٦]

سچی بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا تبصرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر تو یقیناً منطبق ہوتا ہی ہے مگر اس کا مصداق جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم بالعموم اور دیگر خلفاء ثلاثہ بالخصوص ٹھہرتے ہیں کیونکہ انہیں بھی رفاقت و مصاحبت کے مواقع بہت میسر آئے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فطری صلاحیتوں میں تفاوت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے علوم نبوت سے جو فیض پایا تھا وہ یقیناً برابر نہ تھا بلکہ اس میں بہر صورت فرق موجود تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث "انما انا قاسم واللہ یعطی "[۱۲۷] (یقین کرو میں تو محض تقسیم کرنے والا ہوں جبکہ دیتا تو اللہ ہے۔) کی تشریح میں مولانا عبیداللہ مبارک پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دینی فقاہت میں تفاوت ذہنی صلاحیتوں میں تفاوت کی وجہ سے تھا اسی لیے نبی ﷺ نے" انا قاسم "فرما کر اشارہ کیا کہ یہ تفاوت میری جانب سے نہیں بلکہ میری جانب سے تو محض تقسیم علم وحی ہے اور یہ تفاوت اللہ کی طرف سے ہے اور وہ لوگوں کو ان کا مقرر حصہ اپنے ازلی علم کی بنیاد پر دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ [سورۃ المائدۃ ۵:۵۴]

''یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔''

یہی باعث تھا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو محض حدیث کے ظاہری مفہوم کو ہی لیتے تھے اور بعض دیگر اسی حدیث سے کئی مسائل مستنبط کر لیتے تھے''۔[۱۲۸]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا علمی مقام و مرتبہ:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چشمۂ نبوی سے فیض یاب ہونے کا موقع سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ ملا تھا اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ رضی اللہ عنہ کے بارے کہتے ہیں کہ

" کان ابو بکر ھو اعلمنا به "[۱۲۹]

''ابو بکر (رضی اللہ عنہ) ہم میں سے سب سے زیادہ نبض شناس رسول تھے۔''

یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ علم رکھتے تھے۔آپ رضی اللہ عنہ کے علم بارے مولانا معین الدین ندوی لکھتے ہیں:

''حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ سفر و حضر، خلوت و جلوت، جنگ و صلح غرضیکہ ہر موقع پر مہبط وحی والہام صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت سے مستفید ہوئے اور تمام امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص مشیر تھے اس لیے اسلامی علوم وفنون میں بھی قدرتاً ان کا پایہ سب سے بلند تھا''۔[۱۳۰]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تعلق کی وجہ سے کوئی سوال کرنے سے ہچکچاتے نہ تھے بلکہ مختلف سوالات کر کے اپنے علم میں مسلسل اضافہ کی کوشش میں رہتے تھے مثلاً آیت ﴿مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِہٖ﴾[۱۳۱] (جو شخص برے عمل کرے گا اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائے گا۔) نازل ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی پریشانی کا اظہار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں کیا کہ چھوٹی موٹی برائی اور غلطی تو ہر شخص سے ہو جاتی ہے لہٰذا ہر شخص اپنی اس غلطی کی سزا بھگتے گا؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جواب دیا کہ بندہ مومن جب کسی بیماری، غم یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو یہی دکھ و صدمہ ان چھوٹی موٹی غلطیوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔[۱۳۲]

روایتِ حدیث کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو خلفاء راشدین ''کثیر الروایۃ'' صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے نہیں ہیں۔حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو خصوصاً وفاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زیادہ عرصہ بقید حیات نہ رہ سکے لہٰذا انہیں روایتِ حدیث کا زیادہ موقع ہی نہ مل سکا نیز اس وقت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

بقیدِ حیات تھے جن سے عہد نبوی کی کوئی بات پوشیدہ ہی نہ تھی[۱۳۳] لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وفات رسول ﷺ کے متصل بعد کئی ایک مسائل پیش آئے مثلاً رسول اللہ ﷺ کی تدفین، ورثہ رسول ﷺ کی تقسیم اور خلافت و امارت کا استحقاق وغیرہ۔ ان تمام مسائل بارے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہی احادیث رسول پیش کی تھیں اور یوں امت کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ ہو گیا تھا جس سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حدیث بارے مبلغ علم کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ باقی خلفاء راشدین اور اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ابتدا میں معمول یہ رہا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث و سنت لوگوں کے سامنے ذکر کر دیتے تھے مگر ''قال رسول اللہ ﷺ'' کے الفاظ کہنے سے گریز کرتے تھے مبادا کہ حدیث ''من کذب علیّ متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار''[۱۳۴] (جس شخص نے مجھ پر جھوٹ قصداً گھڑا اسے اپنا ٹھکانہ نارِ جہنم کو سمجھ لینا چاہیے۔) کے مصداق بن جائیں مثلاً ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ نے کثرت سے روایات بیان نہ کرنے کی وجہ یہی بتائی تھی[۱۳۵] اسی لئے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دین کے جو احکام خطبوں وغیرہ میں بیان کیے وہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہی تھیں اگرچہ آنحضرت ﷺ کا نام انہوں نے نہ لیا تھا۔[۱۳۶]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چونکہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تیس برس تک زندگی گزارنے کا موقع ملا تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کی روایات خلفاء ثلاثہ کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ ہیں مگر چونکہ آپ رضی اللہ عنہ بھی اپنے پیشرو خلفاء کی طرف روایتِ حدیث میں محتاط واقع ہوئے تھے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کی منقول روایات کی تعداد بھی صرف پانچ سو چھیاسی تک پہنچتی ہے[۱۳۷] لیکن اس بات میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ خلفاء راشدین کے اجتہادات قرآن و حدیث کی ہی روشنی میں ہوئے تھے کیونکہ اگر وہ قرآن و سنت کے خلاف ہوتے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر خاموشی اختیار کر لیتے اور اصلاح کی کوشش نہ کرتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علمی مقام و مرتبہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علومِ نبوت سے کس قدر وافر حصہ ملا تھا اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کا درج ذیل خواب انتہائی قابل ذکر ہے۔ آپ ﷺ اپنا خواب ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک دفعہ میں سویا ہوا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ میں دودھ پی رہا ہوں میں نے اتنا دودھ پیا کہ اس کی تری و سیرابی کے اثرات اپنے ناخنوں سے نکلتے دیکھے۔ پھر میں نے وہ دودھ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کا

یہ خواب سن کر پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے اس خواب کی تعبیر کیا کی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ علم سے"۔[۱۳۸]

اور پیغمبر کا خواب بھی وحی کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ علم حاصل کرنے کے کس قدر جویا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ باری مقرر کر رکھی تھی کہ ایک دن خود دربار نبوت میں جائیں گے اور دوسرے دن وہ صحابی، اور واپس آ کر ایک دوسرے کو علوم نبوی کے انوار سے مستفید کریں گے۔[۱۳۹]

اسی لیے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین آپ رضی اللہ عنہ کے علمی مقام و مرتبہ بارے رطب اللسان نظر آتے ہیں مثلاً

i۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود نے ایک دفعہ فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی راستہ (نکتہ نظر) کو اختیار کر لیتے تو ہم بھی اسے آسان تر پاتے (یعنی اسکی ضرورت واہمیت کے قائل ہو جاتے)[۱۴۰]

ii۔ اسی طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہی ایک دفعہ فرمایا کہ اگر ترازو کے ایک پلڑے میں تمام لوگوں کا علم رکھ دیا جائے اور دوسرے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا علم تو بھی فاروقی رضی اللہ عنہ علم کا پلڑا بھاری رہے گا۔

iii۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "یوں لگتا ہے گویا تمام لوگوں کا علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں سما گیا ہے"۔

iv۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے ایک دفعہ فرمایا: "اس امت کے سب سے بڑے قاضی چار ہیں: عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، زید رضی اللہ عنہ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ"۔ اسی طرح آپ رحمہ اللہ نے ہی ایک دفعہ فرمایا کہ جب لوگ (مراد علماء امت) کسی مسئلہ میں اختلاف کریں تو قولِ عمر رضی اللہ عنہ کو اختیار کر لو۔[۱۴۱]

ان مذکورہ بالا اقوال سے نہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی علمی حیثیت واضح ہوتی ہے بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی بے پناہ فقہی واجتہادی صلاحیت کو بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین نے تسلیم کیا ہے۔ اس لیے کہ محض قرآن وحدیث کا حافظ و عالم ہونا بھی ایک بہت بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن اس سے بھی بڑے شرف کی بات یہ ہے کہ کوئی عالم قرآن وسنت کا گہرا فہم و درک بھی رکھتا ہو اور نئے پیش آمدہ مسائل کا حل بھی قرآن وسنت کی روشنی میں کر سکتا ہو۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے علمِ وحی کو بارانِ الٰہی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے وضاحت کی کہ روئے زمین پر جب

نزولِ باران ہوتا ہے تو زمین کا ایک حصہ جو سب سے عمدہ ہوتا ہے پانی کو قبول کر لیتا ہے اور جذب کر لینے کے نتیجے میں اس سے سبزہ و ترکاری وغیرہ نکلتی ہے جس سے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ زمین کا ایک حصہ جو سخت ہوتا ہے، بارش کا پانی اس میں جذب نہیں ہوتا البتہ اس پر ٹھہر جاتا ہے جس سے لوگ پانی پی لیتے ہیں اور اپنے جانوروں اور کھیتی کو پلا لیتے ہیں۔[۱۴۲]

اس مثال کی تشریح میں علماء نے لکھا ہے کہ پہلی زمین کے ساتھ فقہاء کرام کو اور دوسری زمین کے ساتھ محدثین کرام کو تشبیہ دی گئی ہے (وفی کل خیر) لہٰذا جب ذکر کرنے میں فقہاء کو محدثین پر مقدم کیا ہے تو فقہاء محدثین سے افضل ہیں۔[۱۴۳] لیکن خدا لگتی بات یہ ہے کہ محدثین کو فقاہت کی ضرورت ہے اور فقہاء حدیث سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ بہر صورت علم نبوت کے ساتھ ساتھ اگر دین کا گہرا فہم و درک بھی حاصل ہو جائے تو یقیناً ایک بہت بڑے مرتبہ و فضیلت کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مفسر قرآن بھی تھے، محدث و فقیہ اور مجتہد بھی تھے، عظیم مدبر اور سیاستدان بھی تھے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا علمی مقام و مرتبہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا علمی پایہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے کچھ کم نہ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کاتبِ وحی رہ چکے تھے اور قرآن مجید سے شغف اس قدر تھا کہ جب آپ رضی اللہ عنہ کا باغیوں نے محاصرہ کر رکھا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کی جان کے درپے تھے تو اس وقت بھی آپ رضی اللہ عنہ تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے اور اسی حالت میں جامِ شہادت نوش کیا۔[۱۴۴] آپ رضی اللہ عنہ کی قلتِ روایت کی وجہ کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو بھی دیگر خلفاء کی طرح اجتہادی و فقہی صلاحیت سے اللہ رب العزت نے بہت نوازا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی مجلس مشاورت کے آپ رضی اللہ عنہ بھی ایک اہم رکن تھے[۱۴۵] اور آپ رضی اللہ عنہ حسبِ ضرورت اپنی رائے کا بھی اظہار فرمایا کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فتویٰ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکہ گئے اور اپنی چادر ایک شخص پر ڈال دی جو بیت اللہ کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اتفاق سے اس شخص پر ایک کبوتر بیٹھ گیا۔ آپؓ نے اس خدشہ سے کہ کہیں کبوتر چادر کو بیٹ سے گندہ نہ کر دے، اسے اڑا دیا۔ کبوتر اڑا اور دوسری جگہ جا بیٹھا۔ جہاں اسے سانپ نے ڈس لیا اور وہ کبوتر اسی وقت مر گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ واقعہ بتایا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کفارہ دینے کا فتویٰ دیا کیونکہ وہ اس کبوتر کو ایک محفوظ مقام سے غیر محفوظ مقام تک پہنچانے کا

باعث ہوئے تھے۔[۱۴۶]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا علم یوں تو تمام علوم شریعت سے متعلقہ تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ حج اور وراثت کے مسائل بارے گویا متخصص (specialist) تھے جس کا اعتراف خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وغیرہ نے بھی کیا ہے۔امام زہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ایک دور ایسا بھی آیا کہ اگر اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو علم وراثت ختم ہو جاتا[۱۴۷] احکامِ حج بارے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علم کی وسعت و گہرائی کس قدر تھی اس بارے امام ابن سیرین رحمہ اللہ (م ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے یہ تھی کہ احکامِ حج بارے سب سے زیادہ علم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ہے اور ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ہے۔[۱۴۸]

حضرت عثمانؓ کو مسائل وراثت میں غیر معمولی دستگاہ حاصل ہونے کا سبب مولانا معین الدین ندوی یوں لکھتے ہیں۔

> ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو چونکہ تجارتی کاروبار سے ہمیشہ سابقہ پڑتا تھا اس لئے ان کو علم حساب سے ضرور دلچسپی رہی ہوگی جس کا ثبوت یہ ہے کہ فرائض یعنی علم تقسیم ترکہ سے جس میں حساب کو بڑا دخل ہے مناسبت تھی۔ چنانچہ اس فن کی تدوین اور ترتیب میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا ہاتھ بھی شامل ہے قرآن شریف میں ذوی الفروض اور بعض عصبات کا ذکر ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنی مجتہدانہ قوت سے اس کو بنیاد قرار دے کر موجودہ علم الفرائض کی عمارت قائم کی۔[۱۴۹]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وراثت اور حج سے متعلقہ مسائل میں متخصص ہونے کے باوجود دیگر مسائل میں اجتہاد کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی مجتہد کے لیے تمام قسم کے علوم شریعت میں درجہ اجتہاد پر فائز ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ دیگر اہل علم سے استفادہ کرتے ہوئے بھی کسی مسئلہ میں اجتہاد کر سکتا ہے جس طرح کہ اس بارے تفصیلاً بحث ''شروط اجتہاد'' کے ضمن میں بھی ہو چکی ہے۔

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا علمی مقام و مرتبہ:

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو بچپن سے ہی درسگاہِ نبوت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا تھا جو قبولِ اسلام کے بعد ہمیشہ کے لیے مزید بڑھتا ہی گیا۔ نتیجۃً آپ رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز کے اعمال وافعال تھے۔آپ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو بڑے قریب سے

دیکھا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کی عالمانہ طبیعت نے اس سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ یہی باعث ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں آپ رضی اللہ عنہ کا علمی مقام و مرتبہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیاتِ نبوی سے دلچسپی دیکھئے کہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک، نماز و مناجات، دعاؤں اور نوافل وغیرہ سے متعلقہ سب سے زیادہ روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔[۱۵۰]

تفسیرِ قرآنِ مجید بارے آپ رضی اللہ عنہ کا علم کس قدر وسیع تھا اس کا اندازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ سے ہوسکتا ہے جس میں آپ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ وہ کتاب اللہ بارے جو چاہیں پوچھ لیں کیونکہ بخدا قرآن کریم کی ہر آیت بارے وہ جانتے ہیں کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، چلتے ہوئے نازل ہوئی یا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی پہاڑی پر تھے۔[۱۵۱]

آپ رضی اللہ عنہ کے علم کی وسعتوں کا ادراک حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی تھا یہی وجہ ہے کہ جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی بسا اوقات کسی مسئلہ کا شرعی حکم معلوم نہ ہونے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے استفادہ کرتے تھے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور آپ رضی اللہ عنہ سے استفسار کرتا ہے کہ وہ کس جگہ سے احرام باندھے جبکہ وہ آپ رضی اللہ عنہ تک اونٹوں، گھوڑوں اور کشتیوں پر سوار ہو کر پہنچا ہے؟ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو۔ وہ شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے میقات سے احرام باندھنے کا حکم دیا۔ وہ شخص واپس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اسی طرح کرو جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تم کو بتایا ہے۔[۱۵۲]

اسی طرح ایک دفعہ شریح بن ہانی (م ۸۷ھ) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے موزوں پر مسح کی مدت بارے سوال کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا کر پوچھو ان کو اس بارہ میں معلومات ہوں گی کیونکہ وہ سفر میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے''۔[۱۵۳]

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے تو اس قرابت کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ شاید آپ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے علاوہ کسی خاص علم و ہدایت سے نوازا ہے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے سختی سے تردید کی۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے علی الاعلان فرمایا: ''جو شخص سمجھتا ہے کہ ہمارے پاس پڑھنے کے لیے قرآن اور اس صحیفہ (جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چند احادیث لکھی ہوئی تھیں) کے علاوہ بھی کوئی اور چیز ہے تو وہ جھوٹ کہتا ہے''۔[۱۵۴] اسی طرح ایک موقع پر

آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے میں شگاف اور جاندار اشیاء کو پیدا کیا میں (ایسی کوئی خفیہ وحی) نہیں جانتا ہاں البتہ مجھے وہ فہمِ خاص ضرور حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن بارے عطا کر دیں''۔[۱۵۵]

لاریب، اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فہمِ دین کا ملکہ خصوصی طور پر عطا کیا تھا جو ان کے اجتہادی فیصلوں سے عیاں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی علمی و فقہی اور اجتہادی صلاحیت کو بھانپتے ہوئے انہیں قاضی یمن بنایا تھا[۱۵۶] نیز یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ بارے ''اقضاکم علی''[۱۵۷] (تم میں سب سے زیادہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت علی (رضی اللہ عنہ) میں ہے) بھی فرمایا ہے۔ صفوان بن سلیم کا قول ہے ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی فتویٰ نہ دیتا تھا۔[۱۵۸] یہ تحدید اگرچہ مبالغہ پر مبنی ہے کیونکہ ہزاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں صرف چار کا فقیہ و مفتی ہونا خلاف عقل معلوم ہوتا ہے[۱۵۹] مگر ایک بات اس سے بہرحال کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عہدِ نبوی میں اجتہاد و افتاء کی اجازت تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی علمی و اجتہادی حیثیت اور فیصلہ کرنے کی خاص صلاحیت کا خلفاء راشدین کو بھی ادراک تھا یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ تمام خلفاء راشدین کی مشاورتی کمیٹی کے نہ صرف ممبر تھے بلکہ قاضی کے درجہ پر بھی فائض رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو قاضی بنانے کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کی نگاہِ انتخاب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ہی پڑتی ہے چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ انہیں فرماتے ہیں:

''اقض بین الناس و تجرد للحرب''[۱۶۰]

''آپ لوگوں کے مابین فیصلہ کیا کریں اور جنگی معاملات سے الگ تھلگ ہو جائیں۔''

ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ بارے فرمایا ''علی اقضانا''[۱۶۱] (ہم میں سے علی (رضی اللہ عنہ) میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہے۔) یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے سب سے بہترین قاضی ہیں۔ خلفاء راشدین نے براہِ راست حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علمی فیض پایا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خلفاء راشدین کے علم میں وسعت اور گہرائی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے علمی مباحثہ اور تبادلہ خیال بھی کیا کرتے تھے اور یوں اخذ و استفادہ کا سلسلہ ہمیشہ جاری و ساری رہتا تھا اس کی تفصیل ''خلفاء راشدین کے دور میں مشاورتی اجتہاد'' کی تفصیلات میں ذکر کی جائے گی۔ سرِ دست یہاں خلفاء راشدین کے باہم اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے

علمی مذاکرہ کرنے کے چند حوالوں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

i۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے چھ اشخاص ایسے تھے کہ جو مسائل فقہیہ میں باہم بحث و مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابی رضی اللہ عنہ اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ ایک ساتھ اور حضرت عمر، رضی اللہ عنہ زید رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ ایک ساتھ مل کر علمی مذاکرہ و مباحثہ کیا کرتے تھے۔[۱۶۲]

ii۔ ایک قاتل جس نے عمداً قتل کیا ہو، اولیائے مقتول میں سے بعض اسے معاف کر دیں اور بعض معاف نہ کریں بلکہ قصاص کا مطالبہ کریں تو کیا اس قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ وہ اس بارے کیا کہتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسی صورت میں قصاصاً قاتل کو قتل نہ کیا جائے گا بلکہ بقیہ اولیاء کو دیت دی جائے گی۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہی صحیح رائے ہے اور یہی بات میرے دل میں بھی تھی۔[۱۶۳]

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حاملہ عورت کو اپنے ہاں بلا بھیجا۔ راستہ میں خوف کے مارے اس کا حمل ساقط ہو گیا، بچے نے چیخیں ماریں اور مر گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ کیونکہ آپ خلیفہ کی حیثیت سے کسی کی بھی تادیب کر سکتے ہیں لہٰذا آپ کے ذمہ کچھ نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابھی خاموش تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بھی اظہارِ رائے کا کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چونکہ اسقاطِ حمل کا سبب آپ رضی اللہ عنہ بنے ہیں لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ پر بچہ کی دیت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے قبول کرتے ہوئے بچے کی دیت قریش (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جدی رشتہ داروں) سے وصول کرنے کا حکم دیا۔[۱۶۴]

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین باہم اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے علمی مباحثہ و مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علمی استفادہ کرتے رہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پہلے تینوں خلفاء بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثرات تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے تینوں خلفاء کا زمانہ دیکھا تھا، علمی و فقہی بحثوں میں ہمیشہ ان کے ساتھ شریک رہے لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ سابقہ خلفاء کے اجتہادی منہج سے بخوبی آگاہ تھے یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ پر فاروقی منہجِ اجتہاد کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی لکھتے ہیں

> ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نصوص کے فہم کے طرق، احکام کی تطبیق اور جزئیات کے کلیات کے ساتھ ربط دینے پر رغبت رکھنے کے حوالے سے سب سے زیادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشابہت رکھتے تھے''۔[۱۶۵]

فصل دوم:

خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اجتہادی منہج:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں غیر معمولی اجتہادی صلاحیت و بصیرت تھی آپ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بننے کے فوراً بعد ہی کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن کا حل آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی اجتہادی بصیرت سے امت کے سامنے پیش کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا منہج اجتہاد بعض محققین علماء نے اختصار کے ساتھ یوں ذکر کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی حل طلب مسئلہ آتا تو آپ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے قرآن مجید پر نظر ڈالتے اگر قرآن مجید سے واضح رہنمائی ملتی تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے لیکن اگر قرآن مجید سے رہنمائی حاصل نہ کر پاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معلوم سنتوں پر غور و فکر کرتے رہتے، اگر سنت سے رہنمائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے وگرنہ پھر آپ رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ ممکن حد تک صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کرتے اور ان سے پوچھتے کہ کیا وہ اس مسئلہ بارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث جانتے ہیں [۱۶۶] بسا اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی زیر بحث مسئلہ بارے حدیث پیش کر دیتا تو اس حدیث کے ملنے پر آپ رضی اللہ عنہ بہت زیادہ خوشی کا اظہار کرتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بایں الفاظ ادا کرتے:

"الحمد لله الذی جعل فینا من یحفظ علی نبینا" [۱۶۷]

"ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے جس نے ہم میں ایسے اشخاص پیدا کیے جو ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و افعال کو یاد رکھتے ہیں۔"

اور پھر اس حدیث کے مطابق فیصلہ سنا دیتے لیکن اگر اس مسئلہ بارے کوئی حدیث بھی منصۂ شہود پر نہ آتی تو پھر آپ رضی اللہ عنہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کرتے، باہم مشاورت کی جاتی اور پھر جس رائے پر تمام جمع ہو جاتے اس کے مطابق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فیصلہ جاری کر دیتے [۱۶۸] ذیل میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا منہج اجتہاد تفصیلاً رقم کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور قرآن مجید:

رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کا صدمہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیوں کر برداشت کر سکتے تھے۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کو تو یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ انہیں داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے بہادر وشجاع اور حوصلہ مند شخص جذبات میں آ کر اس بات کا اعلان کرتے ہیں "میں کسی کو یہ کہتے ہوئے قطعاً نہ سنوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ہیں، آپ ﷺ فوت نہیں ہوئے بلکہ بارگاہ الٰہی میں تشریف لے گئے ہیں جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس راتوں کے لیے قوم سے دور (کوہ طور پر) چلے گئے تھے۔ واللہ! جو یہ سمجھتا ہے کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے ہیں میں ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دوں گا"۔[۱۶۹] اس موقع پر یہ صرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی تھے جو بڑی جرأت اور حوصلہ کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتے ہیں:

"بأبی انت وأمّی، والله لا یجمع الله علیک موتین، امّا الموتة التی کتبت علیک فقد متها" [۱۷۰]

"میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اللہ کی قسم! اللہ آپ پر دو موتیں جمع نہ کرے گا، جو موت آپ کے لیے طے ہو چکی سو وہ آپ پر آ چکی ہے۔"

لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے محض اسی پر اکتفا نہ کیا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے صدمہ کی شدت ہی کچھ ایسی تھی لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے اس نازک ترین موقع پر باقاعدہ خطبہ دیا اور پھر آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے صحابہ رضی اللہ عنہم کو رحلتِ نبوی کا یقین دلایا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"امّا بعد، من کان منکم یعبد محمدا ﷺ فان محمدا قد مات، ومن کان منکم یعبد الله فان الله حی لا یموت، قال الله تعالیٰ: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ" (آل عمران ۳:۱۴۴) [۱۷۱]

"حمد وثنا کے بعد! تم میں سے جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو (وہ سن لے کہ) محمد ﷺ تو بلاشبہ وفات پا چکے ہیں اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو (وہ جان لے) اللہ زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہ آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کا

فرمان ہے ”محمد ﷺ تو محض رسول ہیں۔ بے شک آپ ﷺ سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں۔ کیا پس اگر آپ ﷺ فوت ہو جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو تم لوگ اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاؤ گے (مرادمرتد ہو جاؤ گے) اور جو اپنی ایڑیوں پر پلٹ گیا تو وہ اللہ کو قطعاً کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو جزا دے گا۔“

معلوم ہوا آپ رضی اللہ عنہ آیاتِ قرآنی سے استدلال، استنباطِ احکام اور تفریع مسائل میں مجتہدانہ ملکہ رکھتے تھے۔[۱۷۲] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ آیات سنیں تو انہیں رحلتِ نبوی پر یقین حاصل ہوا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو کہتے ہیں:

”واللہ ما ھو الا ان سمعت ابا بکر تلاھا، فعقرت حتی ما تقلنی رجلای، وحتی أھویت الی الارض حین سمعتہ تلاھا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد مات“[۱۷۳]

”واللہ! جب میں نے ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو سنا تو کانپنے لگا یہاں تک کہ میرے پاؤں بوجھل ہو گئے۔ جب میں نے انھیں ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ نبی ﷺ فوت ہو چکے ہیں تو میں تو زمین پر آ گرا۔“

اس نازک موقع پر آپ رضی اللہ عنہ کے قرآن مجید سے استدلال کرنے سے ہی وقتی طور پر ارتداد کی راہیں بند ہو گئی تھیں وگرنہ منافقین کو اپنی ریشہ دوانیوں اور ناپاک سرگرمیوں کا موقع مل جاتا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حدیثِ رسول:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قرآن مجید کی طرح حدیث وسنت رسول کو بھی بنیادی مصدرِ شریعت سمجھتے تھے اور سنتِ رسول سے رہنمائی لیتے ہوئے پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کرتے تھے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی بھی فیصلہ قرآن وسنت کے مخالف ثابت نہیں کیا جا سکتا[۱۷۴] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حدیث وسنت سے رہنمائی لینے کے چند واقعات ذکر کیے جاتے ہیں۔

i۔ وفات رسول ﷺ کے معاً بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ منصبِ خلافت پر کسے متمکن کیا جائے۔ مہاجرین وانصار میں سے ہر گروہ چاہتا تھا کہ امیر ان کی جماعت سے ہو یہاں تک کہ

حضرت حُباب بن منذر انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا:

"منا امیر و منکم امیر"[۱۷۵]

"ایک امیر ہم میں سے اور ایک آپ لوگوں میں سے بن جائے۔"

لیکن اس نازک موقع پر جناب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حدیث رسول "الائمة من قریش" [۱۷۶] (ائمہ یعنی حکمران) قریش میں سے ہوں گے۔) پیش کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں انصار نے اس حدیث کو قبول کرتے ہوئے اپنی رائے سے رجوع کرلیا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ امام ابن التین کا قول نقل کرتے ہیں:

"فلما سمعوا حدیث "الائمة من قریش" رجعوا عن ذلک وأذعنوا"[۱۷۷]

"پس جب انھوں نے حدیث (الائمہ من قریش) سنی تو اپنی رائے سے رجوع کرتے ہوئے فوراً سر تسلیم خم کردیا۔"

ii۔ وفاتِ رسول کے فوراً بعد دوسرا بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس جگہ دفن کیا جائے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے آبائی وطن مکہ میں دفن کیا جائے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا خیال تھا کہ یہ سعادت مدینة الرسول کے حصہ میں آنی چاہیے جبکہ ایک تیسری رائے یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس لے جایا جائے اور وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین عمل میں لائی جائے کیونکہ وہاں کئی دیگر انبیاء کرام بھی دفن ہیں[۱۷۸] اس موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیش کی "انه لم یدفن نبی قط الاحیث قبض "[۱۷۹] (نبی کو وہیں دفن کیا جاتا ہے جہاں وہ فوت ہوئے ہوں۔) اور یوں یہ اختلافِ صحابہ فوراً ختم ہوجاتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں دفن کیا جاتا ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے تھے۔[۱۸۰]

iii۔ کسی شخص کی وفات کے بعد اس کا ورثہ اس کے ورثاء میں تقسیم کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا ہے[۱۸۱] چنانچہ وفاتِ رسول کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بھی یہی خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ ان کے اعزہ و اقارب میں تقسیم کیا جائے مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ گرامی پیش کیا کہ

"لا نورث ماترکنا صدقة"[۱۸۲]

"ہمارا کوئی (مال و جائداد کا) وارث نہیں ہوتا بلکہ ہم جو مال و متاع چھوڑ جائیں وہ صدقہ

ہی ہوتا ہے۔''
لہٰذا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مطمئن ہوجاتی ہیں اور ورثہ رسول کے مطالبہ کے دعوی سے دستبردار ہوجاتی ہیں۔[۱۸۳]

مذکورہ بالا واقعات اس بات کا کافی وشافی ثبوت ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ حدیث رسول سے بھی رہنمائی لینے کو ضروری سمجھتے تھے۔حتیٰ کہ اگر آپ رضی اللہ عنہ کو کسی مسئلہ بارے خود حدیث معلوم نہ ہوتی تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس بارے استفسار کرتے۔ مثلاً آپ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا جاتا ہے کہ دادی اپنے پوتے کی میراث میں سے کتنا حصہ لے گی۔ چونکہ آپ رضی اللہ عنہ کو اس بارے حدیث معلوم نہ تھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ سوال کیا کہ کیا کسی کو اس بارے حدیث یاد ہے؟ چنانچہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو پوتے کی میراث سے چھٹا حصہ دلوایا ہے۔ یہ حدیث سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا۔[۱۸۴]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور قیاس:

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں ہمیں بعض مواقع پر اصول قیاس کے استعمال بارے بھی رہنمائی ملتی ہے مثلاً آپ رضی اللہ عنہ نے میراث میں دادا کو باپ پر قیاس کرتے ہوئے اسے باپ ہی قرار دیا ہے۔[۱۸۵]

اجارہ کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اجرت ومعاوضہ معلوم و متعین ہونا چاہیے[۱۸۶] لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مزدور کو کھانے اور کپڑوں کے عوض مزدوری پر لگا لیتے تھے حالانکہ کھانا اور کپڑا دونوں معلوم اور متعین نہیں ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ کے اس موقف کی توجیہ یہ ہے کہ شاید آپ رضی اللہ عنہ نے اسے دودھ پلانے کے لیے دایہ کو طعام ولباس کے عوض اجرت پر رکھنے پر قیاس کیا ہے[۱۸۷] کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾[۱۸۸]

''اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے موافق باپ کے ذمہ ہو گا۔''

اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف قتال کرتے وقت زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کیا تھا۔[۱۸۹]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور شرع ماقبلنا (سابقہ شرائع):

مذکورہ بالا صدیقی اجتہاد بارے ڈاکٹر محمد رواس نے ایک دوسری توجیہہ یہ کی ہے کہ شاید آپ رضی اللہ عنہ نے طعام ولباس کے عوض مزدور کو رکھنے کا یہ اصول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ قرآنی سے اخذ کیا ہو [۱۹۰] کیونکہ حضرت موسی علیہ السلام نے بھی کھانے اور کپڑوں نیز شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح ہو جانے کے عوض آٹھ برس تک شعیب علیہ السلام کے یہاں مزدوری کی تھی [۱۹۱] اگر اس توجیہہ کو مانیں تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ''شرع ماقبلنا'' کو بھی حجت تسلیم کیا ہوگا بشرطیکہ اس کی منسوخی کی کوئی دلیل نہ ہو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مصالح مرسلہ:

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں ''مصالح مرسلہ'' کے لحاظ کی بھی ہمیں بہت ساری مثالیں ملتی ہیں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآنِ مجید کی مختلف اجزاء میں کتابت ہوئی تھی مگر ایک جگہ مکمل قرآن کو جمع کرنے کی ابھی تک صورت نہ بنی تھی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بعض وجوہات و اسباب کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قرآن مجید ایک جگہ مدون کرنے کا مشورہ دیا مگر ابتدا میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا:

کیف نفعل شیئا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم؟''

''ہم وہ کام کیوں کر کریں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام نہیں دیا؟''

مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ باصرار کہتے رہے کہ'' انه والله خیر ''(اللہ کی قسم! یقین جانیے اس میں خیر ہی ہے) حتیٰ کہ بالآخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق ہو جاتے ہیں جیسا کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح الله صدری لذلک ورایت فی ذلک الذی رای عمر''

''عمر (رضی اللہ عنہ) مجھ سے مسلسل تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے مجھے بھی اس بارے شرح صدر عطا فرما دیا اور میری سوچ بھی ان کی سوچ کے موافق و مطابق ہوگئی۔''

دونوں کی اتفاق رائے کے بعد اس کام کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا

گیا۔ جب ان کی طرف پیغام بھیجا گیا تو وقتی طور پر انہوں نے بھی یہی کہا کہ

کیف تفعلان شیئا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم؟"

"آپ وہ کام کیونکر کر سکتے ہیں جسے خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔"

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ دونوں نے کہا کہ "انه والله خیر" (اللہ کی قسم! یقین کیجیے اس میں خیر ہے۔) یہاں تک کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی مان جاتے ہیں اور پھر جمع قرآن کے اہم مشن میں مصروف ہو جاتے ہیں۔[۱۹۲]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مذکورہ بالا مکالمہ میں "انه والله خیر" کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ان کے مدنظر یہی بات تھی کہ اس کام میں جمیع امت کے لیے خیر ہے۔ بالفاظ دیگر "جمع القرآن" کا کام مصلحتِ امت کے تحت ہی کیا گیا۔[۱۹۳]

"جمع القرآن بین الدفتین" (قرآن مجید کو دو گتوں کے درمیان جمع کرنا یعنی جلد Binding کی شکل دینا۔) بظاہر خلافِ نص ہے کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اسے ﴿صُحُفًا مُّطَهَّرَةً﴾[۱۹۴] (پاک اوراق) قرار دیا ہے اور اب جمع کرنے سے صحف کی شکل ختم ہو رہی تھی مگر اب چونکہ مقصود حفاظتِ قرآنی تھی جو شرعاً مطلوب ہے تو اس مصلحتِ شرعی کے تقاضے سے "جمع القرآن" کا اہم کام انجام دیا گیا[۱۹۵] اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ظاہر نص پر ہی جمے رہتے تو دین وملت کے عظیم نقصان کا خطرہ پیدا ہونا لازمی امر تھا۔[۱۹۶]

آپ رضی اللہ عنہ کا اپنے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر کے جانا یہ بھی دراصل لوگوں اور دین کی مصلحت کے پیش نظر ہی تھا اگر اس دور کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حالات اسی کے متقاضی تھے وگرنہ اگر آپ رضی اللہ عنہ اپنا جانشین نامزد کر کے نہ جاتے تو شاید امت کا شیرازہ بکھر جاتا اور بہر کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا[۱۹۷] جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی درج ذیل دعا کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے جو آپ رضی اللہ عنہ نے استخلافِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد کی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ بارگاہِ الٰہی میں عجز و نیاز کے ساتھ یوں دست بدعا ہوتے ہیں:

> "اے اللہ! عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنے سے میرا مقصود ان (صحابہ رضی اللہ عنہم وامت) کی صلاح و فلاح ہے، مجھے ان کے بارے میں فتنہ کا ڈر ہے اور میں نے اپنے اس فیصلہ میں بہت زیادہ سوچ بچار سے کام لیا لہٰذا میں نے ان میں سے بہترین شخص کو ان پر نگران بنایا ہے جو ان کی رشد و ہدایت کا ان میں سب سے زیادہ حریص ہے اب مجھ پر تو موت کا وقت آیا چاہتا ہے لہٰذا اے اللہ! تو

ان میں میرا جانشین بن جا، یہ تیرے ہی بندے ہیں"[۱۹۸]

ان مثالوں سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی بعض اجتہادات مصالح کے پیش نظر کیے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیاستِ شرعیہ کے تحت اجتہاد:

اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے سیاست شرعیہ کے تحت بھی اجتہاد کیا ہے۔مثلاً آپ رضی اللہ عنہ کے بارے ثابت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشاورت کے بعد لوطی کو آگ میں جلا دینے کا حکم دیا[۱۹۹] ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حکم دیا تھا کہ پہلے اسے رجم کر دیا جائے اور پھر جلا دیا جائے[۲۰۰] حالانکہ عام حالات میں کسی کو آگ کا عذاب دینا ممنوع ہے کیونکہ یہ اللہ کے ساتھ خاص ہے[۲۰۱] مگر آپ رضی اللہ عنہ نے ایسا اس لیے کیا کہ باقی لوگ عبرت پکڑ سکیں اور طرح اس فعل بد سے بچ سکیں۔اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے بعض مرتدین کو بھی جلانے کا حکم دیا۔[۲۰۲]

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی اجتہاد خلافِ نص نہیں ہے اور نہ ہی آپ رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا فتویٰ موجود ہے جس کا ماخذ کمزور ہو کیونکہ واقعۃً آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت"علی منهاج النبوة"تھی[۲۰۳] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد رواس لکھتے ہیں:"حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے جو کہا درست کہا، اس پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔البتہ ایک ایسا مسئلہ جس میں گفتگو کی گنجائش موجود ہے اور وہ ہے آگ میں جلا کر سزا دینا"۔[۲۰۴] لہٰذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس اقدام بارے حسن ظن رکھتے ہوئے یا تو یہ کہا جائے گا کہ ان تک"تعذیب بالنار" کی حرمت کی حدیث نہ پہنچی تھی اس۔لیے آگ کے عذاب کا حکم دیا یا پھر انہوں نے جانتے بوجھتے مصلحت کے پیش نظر ایسا کیا غالباً اسی لیے حافظ ابن قیم نے اس واقعہ کو"الطرق الحکمیہ"میں سیاست شرعیہ کی امثلہ کے ضمن میں لکھا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اجتہادی منہج:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں چونکہ فتوحات کا ایک طویل سلسلہ جاری ہوا بے شمار علاقے سلطنتِ اسلامی کا حصہ بنے، کئی اقوام دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں لہٰذا کئی طرح کے نئے حل طلب مسائل منصۂ شہود پر آئے اور ان کا حل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بتا کر امت کی رہنمائی فرماتے رہے۔

آپ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع فرماتے پھر سنت نبوی کی طرف مراجعت کرتے لیکن اگر کتاب وسنت میں اس مسئلہ بارے کوئی حکم نہ پاتے تو پھر عوام الناس سے پوچھتے کہ اس بارے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کوئی فیصلہ کیا ہو تو بتایا جائے لہٰذا اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ مل جاتا تو آپ رضی اللہ عنہ ان کے فیصلہ کو ہی اکثر جاری کر دیتے۔ بصورت دیگر آپ رضی اللہ عنہ بھی کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کرتے ان سے مشاورت کی جاتی اور پھر جس رائے پر متفق ہو جاتے اس کا اعلان کر دیا جاتا۔[۲۰۵] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادی منہج کے بالاختصار ذکر کے بعد اب یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا منہجِ اجتہاد تفصیلاً لکھا جاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور قرآن مجید:

ساری امت کا اس مسئلہ پر پہلے دن سے ہی اتفاق ہے کہ شریعت کا مصدرِ اول ''قرآن مجید'' ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے اولاً قرآن مجید کی طرف ہی رجوع کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے دور میں اراضی عراق وشام کی تقسیم کا ایک اہم مسئلہ پیش آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ اسے فاتح فوج میں تقسیم کر دیا جائے جبکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور کئی دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی مصالح عامہ کے پیش نظر رائے یہ تھی کہ مفتوحہ زمینوں کو ان کے اصل باشندوں کے پاس ہی رہنے دیا جائے۔[۲۰۶]

کئی دنوں کی باہمی مشاورت اور بحث وتکرار کے بعد سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ درج ذیل آیتِ قرآنی سے استدلال پیش کرتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾[۲۰۷]

''اور (ان کے لیے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار! تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ نے مالِ فے کے مصارف کا بایں الفاظ ذکر کیا ہے:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَّمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾[۲۰۸]

''جو مال خدا نے اپنے پیغمبر ﷺ کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ خدا کے اور پیغمبر ﷺ کے اور (پیغمبر ﷺ کے) قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور حاجت مندوں کے اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ بے شک خدا سخت عذاب دینے والا ہے۔ (اور) ان مفلسان تارک الوطن کے لیے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور جدا) کر دیے گئے ہیں (اور) خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار اور خدا اور اس کے پیغمبر ﷺ کے مددگار ہیں۔ یہی لوگ سچے (ایمان دار) ہیں۔ اور (ان لوگوں کے لیے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے اور جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور خلش) نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو، اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال یہ تھا کہ یہاں مہاجرین و انصار وغیرہ کو مستحق فے بنایا گیا ہے اور پھر ﴿وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ کے الفاظ میں عطف کر کے بعد والوں کو بھی شامل کر دیا

گیا ہے[۲۰۹] لہٰذا قرآن مجید سے فاروقی رائے کو تائید وتقویت حاصل ہوگئی اور پھر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے فاروقی موقف کو قبول کرلیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حدیثِ رسول:

آپ رضی اللہ عنہ قرآن مجید کے بعد حدیث کو حجت سمجھتے تھے اور حدیث رسول مل جانے پر کبھی اپنی رائے پر نہ جمے رہتے تھے بلکہ حدیث ملنے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے کئی بار اپنی رائے سے رجوع بھی کیا۔ ذیل میں حدیث وسنتِ رسول کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کی عقیدت ووابستگی اور استنباطِ مسائل کی چند امثلہ ذکر کی جاتی ہیں۔

(i) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ صلح حدیبیہ سے اگلے سال ''عمرۃ القضاء'' کے لیے مکہ پہنچے تو طوافِ قدوم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رمل چال (کندھے اٹھا کر تیز چال) چلنے کا حکم دیا تاکہ کفار پر رعب داب طاری ہوسکے کیونکہ اس وقت مشرکینِ مکہ بھی بیت اللہ کی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔[۲۱۰] ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا طواف کرنے لگے تو فرمایا: ''ہم رمل چال مشرکین کو دکھانے کے لیے چلے تھے اب تو اللہ نے مشرکین مکہ کو ہلاک کردیا ہے'' گویا آپ رضی اللہ عنہ کا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب اس کی کوئی ضرورت تو نہیں رہی مگر پھر فرمایا:

"شئی صنعه النبی صلی الله علیه وسلم فلا نحب ان نترکه.[۲۱۱]

''وہ کام جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہوا سے ترک کرنے کو ہم پسند نہیں کرتے۔''

(ii) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا درج ذیل قول حدیث وسنت واصحاب السنن سے عقیدت ومحبت کا منہ بولتا ثبوت ہے، آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

"سیأتی قوم یجادلونکم بشبهات القرآن فخذوهم بالأحادیث، فان أصحاب السنن أعلم بکتاب الله"[۲۱۲]

''عنقریب کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو تم سے قرآنی متشابہات کی بنا پر بحث مباحثہ کریں گے۔ تم لوگ احادیث رسول کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا کیونکہ کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم اصحاب سنن وحدیث ہیں۔''

(iii) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کبھی حدیث رسول کو رد نہیں کیا ہاں البتہ آپ رضی اللہ عنہ حدیث قبول کرنے میں تحقیق سے ضرور کام لیتے تھے لیکن جب حدیث پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی تو آپ رضی اللہ عنہ فوراً

سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔ مثلاً مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کے دروازے پر تین بار دستک دی مگر جواب نہ ملا تو واپس چل دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کو واپس بلا کر کہا کہ آپ میری اجازت کے بغیر واپس کیوں روانہ ہو گئے تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہی اس طرح ہے کہ تین بار دستک دو، جواب نہ ملنے پر واپس چلے آؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر آپ رضی اللہ عنہ کے حق میں اس حدیثِ رسول بارے کسی اور صحابی نے گواہی نہ دی تو پھر تمہیں کوڑے ماروں گا؟ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں صحابی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے گواہی دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً اسے قبول کر لیا۔[۲۱۳]

(iv) جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوۃ کے خلاف قتال کا اعلان کیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کلمہ گو سے قتال کیوں کر کیا جا سکتا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے:

"امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فاذا قالو الا الہ الا اللہ عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحقھا"[۲۱۴]

"جب تک لوگ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہیں کر لیتے اس وقت تک مجھے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جب وہ یہ اقرار کر لیں تو پھر ان کے جان و مال ماسوائے ان کے شرعی حق کے، محفوظ و مامون ہو جائیں گے۔"

مکمل واقعہ سے قطع نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حدیث پیش کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ حدیث کو مصدرِ شریعت سمجھتے ہوئے اس سے رہنمائی لیتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صدیقی اجتہادات سے استفادہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن و حدیث سے رہنمائی نہ پانے کی صورت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فیصلہ کے متلاشی ہوتے تھے۔ اگر زیر بحث مسئلہ بارے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ معلوم ہو جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔[۲۱۵] مثلاً ایک موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

"لا اردشیئاً صنعہ ابو بکر"[۲۱۶]

"جو کام ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے کیا ہو میں اسے رد نہیں کر سکتا۔"

لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کو اس وقت

اختیار کرتے جب اسے مناسبِ حال سمجھتے۔ لہٰذا بعض اوقات آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے اجتہادات کو اختیار نہیں بھی کیا ہے۔ جس کے لیے درج ذیل امثلہ پر غور کیا جاسکتا ہے۔

(i) عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ اور اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ دونوں کو عہدِ نبوت اور عہدِ صدیقی کی ابتدا میں تالیف قلبی کے طور پر اموال زکوٰۃ سے حصہ ملتا رہا ایک دفعہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زمین کا کوئی ٹکڑا اپنے لیے مانگا، آپ رضی اللہ عنہ نے عطا کردیا اور ایک تحریر بھی لکھ دی۔ یہ تحریر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دکھائی گئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے یہ تحریر مٹا دی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ جب تم دونوں کی تالیفِ قلب کرتے تھے تو اس وقت اسلام کمزور تھا لیکن اب تم دونوں جاؤ اور اپنی محنت وکوشش سے کماؤ[۲۱۷] یہاں آپ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ صدیقی کو بوجوہ قبول نہیں کیا ہے۔

(ii) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کردیا تھا[۲۱۸] آپ رضی اللہ عنہ کا یہ اسوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے تھا مگر آپ رضی اللہ عنہ نے خود خلیفہ نامزد ومقرر کرنے کی بجائے چھ اصحاب کی مجلس شوریٰ مقرر کردی کہ وہ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ اس موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر میں اپنا جانشین نامزد کرکے جاؤں تو مجھ سے پہلے جو مجھ سے بہتر تھے (یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ) انہوں نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کرکے نہ جاؤں تو مجھ سے پہلے جو ہم سب سے بہتر تھے (یعنی نبی کریم ﷺ) انہوں نے بھی اپنا جانشین مقرر نہ کیا تھا''۔[۲۱۹]

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صدیقی اجتہادات سے استفادہ ضرور کیا ہے بالخصوص ان کے اجتہادی منہج اور طریق کار سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن ایسا قطعاً نہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے صدیقی اجتہادات کو قرآنی یا حدیثی نصوص کی حیثیت دے دی ہو۔[۲۲۰]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور قیاس:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض مواقع پر اصولِ قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو جو خط لکھا اس میں بھی انہیں قرآن وسنت میں حکم نہ ملنے کی صورت میں قیاس کرنے کی بایں الفاظ تلقین کی:

''الفهم الفهم فيما يختلج في صدرك مما لم يبلغك في الكتب والسنه واعرف الامثال والا شباه ثم قس الامور عند

ذلک فاعمد الی احبّھا عند اللّٰہ عزوجل و اشبھھا بالحق فیما تری "[۲۲۱]

''جس مسئلہ بارے کتاب وسنت کی رہنمائی آپ تک نہیں پہنچ سکی اور وہ مسئلہ آپ کی دلی تشویش کا باعث ہے تو اس بارے گہرے غور وخوض سے کام لو ور اس مسئلہ کی نظائر (کتاب وسنت میں) تلاش کرو پھر ان نظائر وامثال پر اس مسئلہ کو قیاس کرو اور وہ فیصلہ جو تمھاری نظر میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہو اور حق کے قریب محسوس ہو تو اسے اختیار کرلو۔''

یہاں آپ رضی اللہ عنہ نے نہ صرف حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بوقتِ ضرورت قیاس کرنے کی تلقین کی بلکہ قیاس کے چند اصول وضوابط کی طرف بھی رہنمائی کردی ہے مثلاً ایک یہ کہ قیاس اس وقت کیا جائے گا جب کسی مسئلہ کا حکمِ شرعی کتاب وسنت میں موجود نہ ہو دوسرا اصول یہ ہے کہ مقیس و مقیس علیہ میں کوئی علت مشترک ہو جس کی طرف اشارہ'' اعرف الامثال و الاشباہ '' کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔[۲۲۲]

ذیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قیاس کرنے کی چند امثلہ ذکر کی جاتی ہیں:۔

(i) وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ میں جب خلیفہ کی تقرری بارے اختلاف ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی پیش کرتے ہوئے قیاسی استدلال بھی پیش کیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہمارے دینی معاملات کا امین بناتے ہوئے امامتِ صلوۃ کا حکم دیا تھا لہٰذا وہی ہمارے دنیوی معاملات (خلافت مراد ہے) کے بھی امین ہونے چاہئیں۔[۲۲۳]

(ii) آپ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک دفعہ بہت سخت قحط پڑا جس کے نتیجہ میں نوبت بہ ایں جا رسید کہ بعض لوگوں نے مجبور ہو کر چوری کی وارداتیں بھی کیں لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے مجبوری وقحط سالی کی بنا پر چوری کرنے والوں پر حدِ سرقہ نہیں لگائی[۲۲۴] تو یہ دراصل آپ رضی اللہ عنہ کے قیاس کا نتیجہ تھا۔ قرآن مجید میں مضطر شخص کو بامر مجبوری مردار اور سور وغیرہ کھانے کی اجازت دے دی گئی تھی[۲۲۵] حالانکہ عام حالات میں وہ حرام ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے ایسے مجبور شخص پر ہی ''عــام الـمـجـاعـة'' (زمانۂ قحط) کے چوروں کو قیاس کیا اور ان سے حد ساقط کردی۔[۲۲۶]

(iii) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے جہاد وقتال کے موقع پر حد سرقہ لگانے سے منع کیا تھا[۲۲۷]

مبادا کہ وہ محدود شخص کفار سے جا ملے اور انہیں مسلمانوں کے خفیہ راز جا بتائے[۲۲۸] آپ ﷺ نے صرف حدِ سرقہ لگانے سے منع کیا تھا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدِ سرقہ پر قیاس کرتے ہوئے باقی حدود کے نفاذ سے بھی منع کر دیا۔[۲۲۹]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور استحسان:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بعض اوقات ''اصول استحسان'' کا بھی لحاظ کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں ایک عورت کا انتقال ہوا جس کے ورثاء میں خاوند، والدہ، دو سگے بھائی، دو اخیافی (ماں شریک) بھائی تھے [۲۳۰] قانونِ میراث کے مطابق سگے بھائی عصبات میں اور اخیافی بھائی اصحاب الفروض میں شمار ہوتے ہیں اور عام شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اصحابِ فروض کو دینے کے بعد جو بچے وہ عصبات کے حصہ میں آتا ہے۔

مذکورہ متوفیہ کے ترکہ میں سے خاوند کا نصف حصہ، والدہ کا چھٹا حصہ اور اخیافی بھائیوں کا ایک تہائی حصہ بنتا تھا اور انہیں دینے کے بعد سگے بھائیوں کے لیے کچھ نہ بچتا تھا لہٰذا شرعی طور پر وہ محرومِ وراثت تھے[۲۳۱] مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سگے بھائیوں کا یہ نقصان دور کرنے کے لیے میراث کے عام قاعدہ کو ترک کر کے سگے بھائیوں کو اخیافی بھائیوں کے ساتھ شامل کر کے ان سب کو ایک تہائی میں حصہ دار بنا دیا۔[۲۳۲] یہاں دراصل آپ رضی اللہ عنہ نے ''اصول استحسان'' [۲۳۳] کا استعمال کیا ہے جیسا کہ استاذ زرقاء لکھتے ہیں:

> ''بذالک سن عمر رضی اللہ عنہ سنة الا ستحسان المقیم للعدالة الرافع للحرج ''[۲۳۴]
>
> ''اس طرح عمر رضی اللہ عنہ نے استحسان کے طریقے کو متعارف کرایا اور ایسا آپ رضی اللہ عنہ نے دراصل اقامت عدل اور رفع حرج کے لیے ہی کیا تھا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سدِ ذریعہ:

''سد ذریعہ'' کا اصول حقیقت میں مصلحت ہی کی ایک خاص صورت ہے جیسا کہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان رقم طراز ہیں کہ سد ذریعہ کا اصول دراصل ''مصالح'' کے اصول کی توثیق کرتا ہے کیونکہ یہ اصول درحقیقت ان اسباب و وسائل کے اختیار کرنے سے منع کرتا ہے جو مفاسد کی طرف لے جاتے ہیں جبکہ مصلحت ہی کا تقاضا ہوتا ہے کہ ''درء المفاسد'' (نقصانات اور خرابیوں کے ازالہ)

کی صورت پیدا کی جائے۔ لہٰذا یہ اصول "سد ذریعہ" حقیقت میں اصولِ مصلحت کا تتمہ و تکملہ ہے [۲۳۵] اللہ تعالیٰ نے زنا سے روکا تو سدّ ذریعہ کے طور پر نگاہوں کی حفاظت کا بھی حکم دیا [۲۳۶] اور سد ذریعہ کے طور پر ہی کفار و مشرکین کے جھوٹے اور تصوراتی خداؤں کو گالی دینے سے منع کیا کہ مبادا وہ مسلمانوں کے معبودِ حقیقی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیں۔ [۲۳۷]

رسول اللہ ﷺ نے بھی سدّ ذریعہ کے طور پر ہی اجنبی عورت سے خلوت و تنہائی اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔ [۲۳۸] تا کہ کہیں یہ خلوت و تنہائی زنا کاری تک نہ لے جائے [۲۳۹] اسی طرح حاکمِ وقت یا قاضی کو کسی ایسے شخص سے ہدیہ قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے جو اس کو اس عہدہ پر مقرر ہونے سے پہلے نہ دیتا رہا ہو [۲۴۰] اور اس ممانعت کی علت یہی ہے کہ یہ ہدیہ ناجائز تحفوں اور رشوت کا ذریعہ نہ بن جائے [۲۴۱] گویا "سدّ ذریعہ" کے اصول کے تحت ایسا حکم دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث سے "سد ذریعہ" اصول کی طرف ہماری رہنمائی ہوتی ہے قرآن و حدیث کی انہی نصوص کے زیر اثر خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی بوقت ضرورت اس اصول کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں [۲۴۲] چند امثلہ حسب ذیل ہیں:

(i) آپ رضی اللہ عنہ کے بارے ثابت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک ایسی بستی جلانے کا حکم دیا جہاں شراب بیچی جاتی تھی [۲۴۳] اس بستی کے جلا دینے سے یقیناً پوری سلطنت پر اس کا اثر پڑا ہو گا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی مقصود تھا ورنہ تو عام حالات میں اس طرح املاک کو جلانا جائز نہیں۔ [۲۴۴]

(ii) اسی طرح جب آپ رضی اللہ عنہ نے بوجوہ ایک ہی مجلس کی طلاق ثلاثہ کے نافذ و منعقد ہو جانے کا اپنی قلمرو میں اعلان کروا دیا تو لوگوں نے حلالہ کا راستہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ طلاقِ ثلاثہ کے نفاذ کے بعد اگر حلالہ کا دروازہ کھلا رکھا جاتا تو وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا تھا جس کے پیش نظر آپ رضی اللہ عنہ نے طلاق ثلاثہ کے نافذ ہو جانے کا اعلان کیا تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے حلالہ کا دروازہ بند کرنے کے لیے سدّ ذریعہ کے طور پر اعلان فرما دیا کہ

" لا اوتی بمحلل و لا محلل له الا رجمتها " [۲۴۵]

"جس بھی حلالہ کرنے والے کو اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا کو میرے پاس لایا گیا تو میں ان دونوں کو رجم کر دوں گا۔"

(iii) اسی طرح جس درخت کے سایہ تلے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ میں بیعت کی تھی، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سدّ ذریعہ کے

طور پر ہی اسے اکھڑوا دیا تھا۔ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی کہ لوگ حدیبیہ مقام کی طرف خصوصاً سفر کر کے جاتے ہیں اور وہاں اس ''شجرۃ الرضوان'' کے سایہ تلے نماز پڑھتے ہیں اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ نے ایک دن لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

" اراکم ایھا الناس رجعتم الی العزی ، الا لا اوتی منذا لیوم باحد عاد لمثلها الا قتلته بالسیف، کما یقتل المرتد ، ثم امر بھا فقطعت"[۲۴۶]

''لوگو! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پھر عُزّیٰ (مشرکین مکہ کی دیوی) کی پرستش کی طرف لوٹ رہے ہو۔ خبردار! ایسا کرنے والے جس شخص کو بھی میرے پاس لایا گیا تو میں اسے مرتد کی طرح قتل کر دوں گا۔ اور پھر آپ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اس درخت کو ہی کاٹ دیا گیا۔''

آپ رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ اس درخت سے لوگوں کی یہ والہانہ عقیدت و محبت بالآخر کہیں انہیں غلو کی طرف نہ لے جائے اور پھر وہ درخت ہی کو مقدس سمجھ کر اس کی پوجا پاٹ شروع کر دیں کیونکہ گزشتہ امم کے شرک میں ملوث ہونے کا ایک اہم سبب یہی محبت و عقیدت میں غلو اور افراط و تفریط تھا[۲۴۷] لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے درخت ہی کاٹ دینے کا حکم دے دیا کہ ''نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری''۔

iv۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت دانیال علیہ السلام کی قبر کو چھپانے کا حکم دیا کیونکہ خدشہ تھا کہ لوگ اسے تقدس کا درجہ دے کر اس کی پوجا پاٹ نہ شروع کر دیں۔[۲۴۸]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور استصحاب:

مصادرِ شریعت میں سے ایک مصدر ''استصحاب'' کو بھی مانا گیا ہے اور اصول فقہ کی اصطلاح میں ''استصحاب'' سے مراد ہے ''جو چیز جس حالت میں پہلے تھی اس کو اس وقت تک اسی طرح اپنی سابقہ حالت میں باقی سمجھنا جب تک کوئی ایسا سبب نہ پایا جائے جو اس کو تبدیل کر دے''[۲۴۹] یہ اصول بھی دراصل قرآن و حدیث سے ہی مستنبط ہے[۲۵۰] جو عقل کو بھی اپیل (Appeal) کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں بھی اس اصول کا استعمال ملتا ہے مثلاً ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک تالاب کے پاس فروکش ہوئے آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مقامی لوگوں سے پوچھا کہ اس تالاب سے درندے تو پانی نہیں پیتے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسئول سے کہا کہ یہ بات ہمیں نہ بتانا[۲۵۱] گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر یہ اصول تھا کہ جب تک حرمت کی کوئی دلیل نہ ہو اشیاء میں اصل اباحت ہی ہے۔[۲۵۲]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور مصالح مرسلہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ شرعی احکام سے مقصود لوگوں کی مصالح کی حفاظت کرنا ہے لہٰذا لوگوں کی مصالح کی حفاظت بہر صورت ہونی چاہیے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے:

"كان عمر يجتهد في تعرف الحكمة التي نزلت فيها الاية و يحاول معرفة المصلحة التي جاء من اجلها الحديث و ياخذ بالروح لا بالحرف"[۲۵۳]

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس حکمت کی معرفت و پہچان حاصل کرنے کی بڑی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے آیت نازل ہوئی تھی یا نبی رضی اللہ عنہ کی حدیث ظاہر ہوئی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ قرآن وسنت کے الفاظ کی بجائے ان کی روح اور مقصد پر زیادہ تر نظر رکھتے تھے۔"

یہی باعث ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں مصالح مرسلہ کی رعایت رکھنے کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:۔

(i) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ مسئلہ سامنے آیا کہ صنعا میں ایک شخص کو چھ مردوں اور ایک عورت نے مل کر قتل کر دیا اس کے قصاص بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر استفسار کیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشاورت کے بعد امیر صنعاء یعلی بن امیہ کو لکھا کہ قتل میں شریک تمام افراد کو قتل کر دیا جائے اور ساتھ اپنا یہ مشہور جملہ کہا:

"لو اشترک فيه اهل صنعاء لقتلتهم"[۲۵۴]

"اگر اس قتل میں تمام باشندگانِ صنعا بھی شریک ہوتے تو میں ان تمام کو قتل کروا دیتا۔"

آپ رضی اللہ عنہ کا ایک مقتول کے قتل میں شریک تمام افراد کو قتل کرنے کا حکم دراصل مصلحت مرسلہ کے لحاظ کی بدولت ہی ہے تاکہ لوگوں کی جانیں محفوظ ہو جائیں وگرنہ خصوصاً اس بارے کوئی نص موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ امام شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"قد دعت اليه المصلحة فلم يكن مبتدعا مع ما فيه من حفظ مقاصد الشرع في حقن الدماء[۲۵۵]

"دراصل مصلحت کا یہی تقاضا تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے کسی بدعت کا ارتکاب نہیں کیا کیونکہ

اس فیصلہ سے مقصود انسانی جانوں کا تحفظ تھا اور وہ مقاصد شریعت میں سے ایک اہم مقصد ہے۔''

مصلحت کے علاوہ یہاں سدّ ذریعہ اصول کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔[۲۵۶]

(ii) مفقود الخبر شخص کی بیوی بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خاوند کے لاپتہ ہونے کے دن سے لے کر چار سال تک انتظار کرے گی اگر اس کے بارے کچھ اطلاع نہ مل سکی تو وہ عورت اگر چاہے تو چار ماہ دس دن یعنی عدتِ وفات گزارے اور پھر آگے شادی کر سکتی ہے نیز مفقود کی وراثت تقسیم کر دی جائے گی[۲۵۷] استاد زرقاء لکھتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہادی فیصلہ دراصل مصلحتِ مرسلہ کے پیش نظر ہی ہے۔[۲۵۸]

مصلحت کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں (الف) عامہ (ب) خاصہ

مصلحتِ خاصہ سے مراد جس سے چند خاص لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو اور مصلحت عامہ سے مراد جس سے سب لوگوں کو عمومی طور پر فائدہ پہنچتا ہو۔ اصولاً مصلحت خاصہ کے مقابلہ میں مصلحت عامہ کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مصلحت عامہ کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ لیکن اگر عامہ کے ساتھ خاصہ بھی مل جائے تو خوش آئندہ بات ہے۔ لیکن جب دونوں میں تعارض ہوتا تو صرف پہلی کا ہی خیال رکھتے تھے۔ ایسا صرف شریعت کے مقاصدِ عامہ کی وجہ سے کرتے تھے۔[۲۵۹] مثلاً عہدِ نبوی اور عہدِ صدیقی میں مسجد حرام کے اردگرد کوئی دیوار نہ ہوتی تھی۔ سن سترہ ھجری کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ماہ رجب میں عمرہ کیا تو آپ رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی کہ صحنِ کعبہ حج و عمرہ کرنے والوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے تنگی داماں کی شکایت کر رہا ہے۔

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے مسجد حرام کی توسیع کا پرگرام بنایا لہٰذا مسجد حرام کے قرب و جوار میں جو مکانات تھے ان کے مالکوں سے خریدے، انہیں منہدم کیا اور پھر انہیں مسجد میں شامل کر دیا۔ نیز مسجد کے لیے دیوار بھی کھڑی کر دی گئی[۲۶۰] یہاں آپ رضی اللہ عنہ اگر مصلحت خاصہ کا لحاظ رکھتے تو ان کے مکانات مسجد میں شامل نہ کرتے۔ نتیجتاً توسیع مسجد کا کام نہ ہو پاتا۔ لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے مصلحت عامہ کے پیش نظر ان کے مکانات گرا کر مسجد میں شامل کر دیئے۔ لیکن مصلحتِ عامہ کی بنا پر عدل کا خاتمہ نہ کیا بلکہ ان مکانات کی قیمتیں ادا کر دیں۔[۲۶۱]

خلاصہ یہ ہے کہ اگر فاروقی اجتہادات میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصلحت آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی اساس ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ نصوص صحیحہ کے مخالف نہ ہو۔ اگر کسی واقعہ میں نص خاص موجود ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی کا التزام کرتے کیونکہ صاحب اختیار اگر

محض اپنی سمجھ و دانست کے مطابق ایک مصلحت کو ملحوظ رکھتا ہے اور عمداً نص کی مخالفت کرتا ہے تو شرعی طور پر اس کا حکم نافذ العمل نہیں ہوسکتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کسی بھی اجتہاد میں ہمیں اتباع نفس کا شائبہ نہیں ملتا۔ جب کسی مسئلہ میں نص خاص نہ ہوتی تو ایسا نہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مصلحت کی پہچان کے لیے محض اجتہاد و رائے کو اختیار کرتے ہوں بلکہ شریعت کے ہی مقاصد عامہ کی طرف مراجعت کرتے تھے۔[۲۶۲]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عرف کا لحاظ:

(i) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کرتے ہوئے جن امور کو ملحوظ رکھا ہے ان میں سے مروجہ عرف بھی ہے اگر آپ رضی اللہ عنہ نے رائج عرف کے لحاظ میں ہی مصلحت سمجھی تو اسے ہی اختیار کرلیا مثلاً آپ رضی اللہ عنہ ایک دفعہ شام کے علاقہ میں گئے اور وہاں کے غیر مسلموں سے کوئی معاہدہ طے پاتا ہے۔ واپسی کے موقع پر ''اذرعات'' کے باشندے تلواروں اور گلدستوں کا ایک کھیل و کرتب پیش کر کے آپ رضی اللہ عنہ کا استقبال کررہے ہوتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے روکنا چاہا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ امیر المومنین یہ ان عجمیوں کا دستور ہے اگر آپ رضی اللہ عنہ انہیں اس سے روک دیں گے تو یہ لوگ خیال کریں گے کہ شاید آپ رضی اللہ عنہ ان سے کیا ہوا معاہدہ توڑنا چاہتے ہیں اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہیں کر لینے دو۔[۲۶۳]

(ii) اسی طرح جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عراق و شام کے علاقے فتح کیے تو ایرانی دور حکومت سے یہاں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ زمین کا خراج اس کے رقبہ کے حساب سے ایک متعین شرح کے مطابق وصول کیا جاتا تھا آپ رضی اللہ عنہ نے بھی یہی طریقہ برقرار رکھا۔[۲۶۴]

(iii) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرف یہ تھا کہ خاندان وقبیلہ کے لوگ انسان کے دست و بازو بنتے اور ہر موقع پر قوت و مدد کا باعث بنتے تھے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت خاندان و قبیلہ پر مقرر کردی[۲۶۵] مگر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض اسباب کی بنا پر دفاتر کا نظام قائم کیا[۲۶۶] تو اب چونکہ باہم مدد اہل دفاتر سے وابستہ ہوگئی یعنی عرف بدلا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نئے عرف کا لحاظ کرتے ہوئے دیت اہل دیوان (دفتر) پر مقرر کردی[۲۶۷] اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی ذمہ داری خاندان وقبیلہ پر اس لیے ڈالی تھی کہ اس وقت قوت و مدد انہیں کے ذریعہ

حاصل ہوتی تھی پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دفاتر کا نظام قائم کیا تو یہ قوت و مدد اہل دیوان (اہل دفاتر) سے وابستہ ہوگئی" [۲۶۸]

روح شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجتہاد:

آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات پر نظر ڈالی جائے تو بعض اجتہادات بظاہر نصوص سے ٹکراتے نظر آتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے آپ رضی اللہ عنہ نے نص کو قصداً ترک کر دیا ہے لیکن جب بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ راز کھلتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے پیش نظر دیگر کئی نصوص تھیں۔ چونکہ وقتی طور پر ایک خاص نص پر عمل سے کسی مفسدہ کے سامنے آنے کا خطرہ تھا یا لوگوں کی مصالح ضائع ہونے کا خطرہ تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے صرف ایک نص پر اکتفا کرنے اور جم جانے کو حرج کا باعث سمجھا۔ لہٰذا دیگر نصوص کو بھی سامنے رکھا اور پھر کسی حتمی نتیجہ پر پہنچے بالفاظ دیگر آپ رضی اللہ عنہ نے نصوص کے محض الفاظ پر ہی اصرار نہ کیا بلکہ روحِ شریعت کو بھی ملحوظ رکھا جیسا کہ ڈاکٹر نادیہ شریف لکھتی ہیں:

"انه كان يعمل بروح التشريع كما كان يعمل بمنطوقه" [۲۶۹]

"آپ رضی اللہ عنہ جس طرح نصوصِ شریعت کے منطوق (ظاہری معنی ومفہوم) کو اختیار کرتے تھے اسی طرح روحِ شریعت اور اس کے اصل مقصد کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روح شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ واجتہاد کرنے کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوسکتا ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ کے پاس کعب بن سعد رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے کہ ایک عورت نے دبے لفظوں اپنے خاوند کی شکایت کی کہ وہ ہمہ وقت عبادت میں مصروف رہتا ہے اور اس کے حقوق زوجیت بھی ادا نہیں کرتا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ کے حل کے لیے کعب بن سعد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انہوں نے اس کا حل یوں پیش کیا کہ:

" فاني ارى لها يوماً من اربعة ايام كأنّ لزوجها اربع نسوة فاذا لم يكن غيرها فاني اقضى له بثلثة ايام ولياليها يتعبد فيهن و لها يوم وليلة".

"میرے خیال میں اس عورت کے لیے (خاوند کی جانب سے) ہر چوتھا دن مقرر ہونا چاہیے اور یہ اس مفروضہ کی بنیاد پر ہے کہ اس کے خاوند کی

چار بیویاں ہیں لیکن چونکہ بیوی تو صرف یہی اکیلی عورت ہے لہٰذا میرا فیصلہ یہ ہے کہ تین دن اور تین راتیں اس کا خاوند عبادت میں مشغول رہے مگر چوتھا دن اور رات اس عورت (بیوی) کے لیے مخصوص (کرے)۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس فیصلہ سے اتنے خوش ہوئے کہ کعب رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا قاضی مقرر کر دیا۔[۲۷۰]

مذکورہ بالا دعویٰ کی تائید درج ذیل امثلہ سے بھی ہوتی ہے۔

(i) مصارف زکوٰۃ میں سے ایک "مؤلفة القلوب"[۲۷۱] (نومسلموں یا جن غیر مسلموں کے ایمان لانے کی امید ہو ان کی تالیف قلبی کے لیے ان پر خرچ کرنا۔) ہے مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کی اس مد میں اپنے دور میں مال زکوٰۃ کو خرچ نہ کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے نص قرآنی کو اپنے اجتہاد کی بدولت معطل یا منسوخ کر دیا بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کا اس مد میں مال زکوٰۃ خرچ نہ کرنا دراصل عارضی تھا[۲۷۲] اور ایسا دراصل اس لیے تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ظاہر نص کی بجائے علت نص کی طرف دھیان دیا۔ شریعت کے اس حکم کی علت یہ تھی کہ وہ لوگ جن کے ایمان لانے کی امید ہو انہیں کچھ دے دلا کر ایمان کی طرف راغب کیا جائے یا وہ کفار جن کے شر کا خوف و خطرہ ہو تو ان کے شر سے بچنے کے لیے انہیں کچھ دے دیا جائے یا جو نومسلم ہوں تو ان کی اس طرح حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ وہ کہیں ارتداد کی راہ پر نہ چل نکلیں۔[۲۷۳]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ یہ دراصل اس وقت تک تھا جب اسلام کمزور تھا لیکن اب چونکہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کی ضرورت نہیں رہی[۲۷۴] نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصل میں چند متعین افراد کو دائمی طور پر دینے سے انکار کیا تھا جنہیں عہد نبوت سے حصہ ملتا آ رہا تھا جبکہ قرآن میں تو یہ کہیں بھی نہ تھا کہ چند متعین افراد کو ہمیشہ کے لیے اس کا حصہ دار بنا دیا جائے[۲۷۵] یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ اور اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنا حصہ وصول کیا اور ایک تحریر بھی لکھوائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس وہ تحریر لائے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس تحریر کو مٹا دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری تالیف اس وقت کرتے تھے جب اسلام ابھی کمزور تھا لیکن اب تم جاؤ اور دونوں اپنی کوشش سے کماؤ۔[۲۷۶]

معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ کو دراصل یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اس طرح تو یہ لوگ مستقل طور پر بیت المال پر بوجھ بن کر رہ جائیں گے اور خود کمانے کا نہ سوچیں گے جبکہ اسلامی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم اپنی محنت سے روزی کمانا بھی ہے۔[۲۷۷]

(ii) آپ رضی اللہ عنہ سے قبل گھوڑوں پر کوئی زکوٰۃ نہ عہد نبوی میں لی گئی اور نہ ہی عہد صدیقی میں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں گھوڑوں کو پالنا بہت مشکل بھی تھا اور مہنگا بھی ۔ جبکہ اونٹ، بکری اور گائے کو پالنا سنبھالنا نسبتاً آسان تھا لہٰذا عمومی طور پر گھوڑے ذاتی استعمال کے لیے ہی ہوتے تھے[۲۷۸] اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی استعمال میں رہنے والے گھوڑے اور ذاتی خدمت کے لیے غلام کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

"لیس علی المسلم فی عبدہ ولا فی فرسہ صدقة" [۲۷۹]

''مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے کا صدقہ (لازم) نہیں ہے۔''

لیکن عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں بعض اسباب کی بنا پر لوگوں کے پاس مال و دولت کی بہتات ہوئی حتیٰ کہ گھوڑوں کی بھی تجارت کثرت کے ساتھ ہونے لگی [۲۸۰] اس صورت حال میں کچھ نیک فطرت لوگوں نے خود گھوڑوں پر زکوٰۃ ادا کرنے کا خیال ظاہر کیا مگر ابتدا میں آپ رضی اللہ عنہ نے لینے سے انکار کیا۔ ازاں بعد آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ یہ دیا کہ جب لوگ خوش دلی سے دینا چاہتے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ وصول کر لیجیے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ وصول کی۔[۲۸۱]

گویا آپ رضی اللہ عنہ نے قرآنی اصول ﴿اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ﴾ [۲۸۲] (مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اس میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو۔) کی روشنی میں ایسا کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد کوئی بدعت کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ روح شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ کا اجتہادی فیصلہ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سامان تجارت سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیتے تھے۔[۲۸۳] لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے عہد میں گھوڑوں پر زکوٰۃ بطور سامانِ تجارت وصول کی ہے اور روح شریعت کا بھی یہی تقاضا تھا کہ ہر وہ چیز جو بطور سامان تجارت ہو اس سے زکوٰۃ لی جائے ۔

(iii) اسی طرح مشہور واقعہ ہے کہ خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے ایک خاتون کے درج ذیل شعر پڑھنے کی آواز آئی:

لقد طال ھذا اللیل واسود جانبہ   وارقنی ان لا حبیب الاعبہ

فواللہ لو لا اللہ تخشی عواقبہ   لحرک من ھذا السریر جوانبہ

''یہ رات کس قدر طویل اور تاریک ہو چکی ہے اور میں اس وجہ سے بے خوابی کا شکار ہوں کہ میرا محبوب (خاوند) موجود نہیں جس سے میں دل لگی کرتی اور وہ

مجھ سے دل لگی کرتا۔ اللہ کی قسم! اگر اس (اللہ) کی سزاؤں کا ڈر نہ ہوتا تو (کسی زنا کار و بدکار کی وجہ سے) اس چارپائی کی چولیں ہل رہی ہوتیں۔''

یہ وہ نیک سیرت خاتون ہے جس کے خاوند کو میدان جہاد میں گئے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے اور یہ خاتون آج اپنے خاوند کی یاد میں بے چین ہوئے بیٹھی ہے اور اس کی یہ بے چینی و اضطرابی کیفیت اسے مندرجہ بالا شعر پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے [۲۸۴] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے مشورہ کیا کہ ایک عورت کتنا عرصہ اپنے شوہر کی جدائی برداشت کر سکتی ہے۔ مشاورت کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے یہ قانون نافذ کر دیا کہ ہر فوجی چار ماہ کے بعد ضرور اپنے گھر آئے۔[۲۸۵] یہاں آپ رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ روحِ شریعت کے عین مطابق ہے کیونکہ قرآن مجید میں بھی ''ایلاء'' کرنے والے مردوں کو چار ماہ تک بیویوں سے علیحدگی و ناراضی کی اجازت ہے [۲۸۶] نیز یہاں آپ رضی اللہ عنہ کا اہم مقصود زنا کاری و بدکاری کی روک تھام بھی ہے جو شریعت کا ہی مقصود و مطلوب ہے، گویا سدِ ذریعہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔

(iii) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمانوں کو شادی کی اجازت دی ہے [۲۸۷] مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کتابیہ عورت سے شادی پر پابندی تو نہیں لگائی البتہ بعض وجوہات کی بنا پر اس سے شادی کو ناپسند ضرور جانا۔ وہ وجوہات یہ تھیں:

(الف) مسلمان عورتوں کے بے نکاحی رہ جانے کا خدشہ پیدا ہوا جس سے یقیناً ایک فتنہ پیدا ہو سکتا تھا۔

(ب) آپ رضی اللہ عنہ نے خصوصی طور پر وہ علاقہ جو ابھی نیا نیا اسلامی سلطنت میں شامل ہوا تھا اس میں کتابیہ سے شادی کرنے کو مسلمانوں کے لیے بالعموم اور اربابِ اختیار کے لیے بالخصوص ناپسند جانا کیونکہ اس طرح خدشہ یہ تھا کہ نومسلم حضرات بھی اپنے والیوں کو دیکھ کر بلا خوف و خطر کتابیات سے شادی کرنا شروع کر دیں گے اور اس سلسلہ میں ان کے زنا کاری و بدکاری سے پاکدامن ہونے یا نہ ہونے کی بھی پرواہ نہ کریں گے، اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خط میں اس خدشہ کا اظہار بایں الفاظ کیا تھا:

" اخاف ان توقعوا المومسات منهن "[۲۸۸]

''مجھے خدشہ اس بات کا ہے کہ آپ لوگ ان (کتابی عورتوں) میں بدکار عورتوں سے بھی شادی کر بیٹھیں گے۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے مدائن کے گورنر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو جو خط لکھا اس میں آپ رضی اللہ عنہ نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ کہیں لوگ اپنے گورنر کی اقتدا میں کتابی عورتیں جو نسبتاً زیادہ خوبصورت ہیں

ان سے دھڑا دھڑ شادی کرنے لگ جائیں جس سے مسلم عورتیں فتنہ میں واقع ہو جائیں یہی باعث ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بالخصوص اس بات کا حکم دیا کہ وہ یہودیہ عورت کو طلاق دے دیں۔[۲۸۹]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے خط لکھ کر آپ رضی اللہ عنہ سے استفسار کیا تھا کہ آیا اس سے نکاح کرنا حرام ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے نفی میں جواب دیا تھا مگر ان مخصوص حالات میں امکانی خدشات کا اظہار کیا جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے[۲۹۰] آپ رضی اللہ عنہ نے ایک جائز کام کو مخصوص حالات میں نہ کرنے کا مشورہ دیا نہ کہ آپ رضی اللہ عنہ نے نص قرآنی کو منسوخ قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ وطلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے تو آخر وقت تک کتابیہ عورت کو اپنے اپنے عقد میں رکھا مگر سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر کوئی نکیر نہیں کی۔[۲۹۱]

کتابیہ عورت سے نکاح کے سلسلہ میں قرآن نے ان کے "مُحْصَنٰتٍ" یعنی پاکدامن ہونے کو اور ان سے نکاح کرنے والے مردوں کے لیے ﴿مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ﴾ (ان سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو، نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی کرنی۔) کی شرائط و قیود مقرر کی تھیں[۲۹۲] لیکن جس معاشرہ میں ان قیود کے ضائع ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کتابیہ عورت سے نکاح کو ناپسند کرنا یا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو طلاق دینے کا حکم دینا دراصل عین منشاء قرآنی کے مطابق ہے۔[۲۹۳]

حالات وظروف کا اعتبار:

حقیقی مجتہد وہ ہے جو اس بات کا بھی جائزہ لے کہ احکام کا موقع و محل کیا ہے لہٰذا کن حالات میں شریعت کے احکام قابل عمل ہوں گے اور کن حالات میں ان پر عمل کرنے کے نتائج الٹ نکل سکتے ہیں یا احکام پر فوری عمل سے عوام کا ردعمل کیا ہو سکتا ہے بالفاظ دیگر ایک مجتہد کو دوررس نگاہ کا حامل ہونا چاہیے جو اپنے اجتہاد کے نتائج و اثرات کا بھی اچھی طرح جائزہ لے سکے۔ یہ وصف ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں انتہائی نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس کے لیے درج ذیل مثال ذکر کی جاتی ہے۔

عہد فاروقی میں ۱۸ھ کو انتہائی شدت کا قحط پڑا اسی لیے اس سال کو "عام الرمادۃ" یا "عام المجاعۃ" بھی کہتے ہیں[۲۹۴] اس میں عام باشندوں کا حال یہ تھا کہ وہ گھاس پھوس ہی نہیں بلکہ مردار، چمڑے اور ہڈی کا ستو کھانے پر مجبور ہو گئے تھے[۲۹۵] اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ نے عام اعلان کرا دیا تھا کہ

"اگر خدا نے اس قحط سے جلد نجات نہ دی تو میں ہر کھاتے پیتے گھر میں چند

غریبوں اور قحط زدوں کو بھیج دوں گا تاکہ وہ اپنے کھانے میں ان کو شریک کرلیا کریں، کیونکہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمی کھالیں گے تو دونوں ہلاکت سے بچ جائیں گے"[۲۹۶]

قحط کی اس شدت کی بنا پر بعض لوگ اس قدر مجبور ہوئے کہ انہوں نے چوری کی اور وہ پکڑے بھی گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے دو راستے تھے کیونکہ دو طرح کی نصوص موجود تھیں۔ ایک طرف حد سرقہ کی واضح آیت تھی کہ

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾[۲۹۷]

"اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ ان کے فعلوں کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے اور خدا زبردست اور صاحب حکمت ہے۔"

اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ چور بہر حال چور ہے لہٰذا ان کے بھی ہاتھ کاٹ دیئے جائیں اگرچہ انہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کی ہے مگر دوسری طرف درج ذیل نصوص تھیں جن میں بحالتِ مجبوری کیے گئے گناہ اور غلطی کی معافی کا ذکر ملتا ہے۔

i۔ بامرِ مجبوری زبان سے نکلا ہوا کلمہ کفر بھی معاف ہے اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾[۲۹۸]

"جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا سخت عذاب ہوگا۔"

ii۔ مردار، خنزیر، دمِ مسفوح، غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا جانور وغیرہ حرام ہیں مگر حالت مجبوری میں صرف اتنی مقدار میں کھالینا جس سے جان بچ جائے معاف کردیا گیا ہے چنانچہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[۲۹۹]

"اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام

پکارا جائے، حرام کر دیا ہے۔ ہاں جو ناچار ہوئے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک خدا بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔"

گویا قرآن مجید میں مجبوری کا لحاظ کیا گیا ہے اور عارضی و وقتی طور پر محرمات کے استعمال کو بھی جائز کر دیا ہے۔ فقہاء کرام نے ایسی ہی آیات سے یہ اصول اخذ کیا ہے:

" الضرورات تبیح المحظورات "[۳۰۰]

"ضرورت و مجبوری کی بنا پر ممنوع و حرام کام کا استعمال مباح ہو جاتا ہے۔"

iii۔ اسی طرح حدود بارے ایک اہم حدیث نبی ﷺ سے یہ بھی منقول ہے کہ

" ادرء وا الحدود بالشبہات "[۳۰۱]

"شبہات کی بنا پر حدود نافذ نہ کرو۔"

اور یہاں شبہ عامہ موجود تھا۔[۳۰۲]

جب دو طرح کی نصوص باہم متصادم تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان نصوص کو ترجیح دی جن میں فی الحال مصلحت کا پہلو زیادہ تھا اور حالات و ظروف اسی کے متقاضی بھی تھے کیونکہ اگر حد لگا کر چوروں کو سزا دی جاتی تو نتیجتاً لوگ ڈر کے مارے چوری نہ کرتے مگر بھوک و افلاس کی وجہ سے وہ اپنی جانوں سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتے۔ ان حالات میں گویا دو طرح کی مصالح متصادم تھیں، ایک طرف لوگوں کے اموال کی حفاظت کی مصلحت تھی تو دوسری طرف مفلس و غرباء کی جانوں کی حفاظت کی مصلحت تھی اور یقیناً اموال کی حفاظت کے مقابلہ میں جانوں کی حفاظت زیادہ ضروری و اہم ہے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے دوسری مصلحت کو ترجیح دی کیونکہ اس وقت حالات کا تقاضا ہی یہ تھا۔[۳۰۳]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور جدت پسندی (Modernism):

اہل یورپ کے یہاں مشہور زمانہ اصطلاح جدت پسندی کا مفہوم ہر قسم کے جدید نظریے کو قبول کر لینا ہے خواہ اس کے نتیجہ میں دینی عقائد کی بنیادیں ہل جائیں بلکہ ان کے یہاں جدت پسندی کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے دینی عقائد و نظریات میں انتہائی حد تک لچک پیدا کر لی جائے جبکہ بقولِ بعض اہل مغرب نے مذہب سے اپنی آزادی کی تحریک کو جدیدیت (Modernism) کا نام دیا[۳۰۴] مگر اسلام ایک مسلمان کو ایسی جدت پسندی کی قطعاً اجازت نہ دے گا۔ گویا جدت پسندی کے حوالے سے ایک مسلمان اور کافر کی سوچ اور طرز عمل میں نمایاں فرق ہونا چاہیے۔

جدت پسندی کا حقیقی اور صحیح مفہوم نئے افکار ونظریات یا نئی ترقیات ور جحانات کو اختیار کرنا ہے۔[۳۰۵] اسلام تمام ایسے جدید نظریات یا ترقیات کے اختیار کر لینے کی اجازت دیتا ہے جس سے انسانیت کا فائدہ ہو لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات اور روحِ شریعت کے قطعاً متعارض ومنافی نہ ہوں لہٰذا ہر نئے کام کو بدعت قرار دے دینا یا محض اس وجہ سے ٹھکرا دینا کہ وہ کفار کی طرف سے پیش کردہ ہے کوئی صحیح اسلامی طرزِ فکر نہیں ہے۔ ایک اچھی چیز اگر کفار کی جانب سے بھی ملے تو وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے قبول کیا جانا چاہیے۔ راقم الحروف نے ایک دفعہ اپنے مقالہ ''اسلام اور جدت پسندی'' میں لکھا تھا:

> ''اسلام جدت کا ساتھ دیتا ہے مگر اجتہاد کے ذریعے۔ اسلام نئی ترقیات و رجحانات کو خواہ فکری ہوں یا مادی، ان کا دشمن نہیں بلکہ ان کو اپنانے کی اجازت دیتا ہے مگر ان کی تطہیر وتزکیہ کر کے اور ان کے نقصان دہ پہلو کو دور کر کے۔ یہی حقیقت میں جدت پسندی ہے۔ ہر نئی چیز اور فکر کو بے سوچے سمجھے اختیار کر لینا تو حماقت اور بیوقوفی ہے اور ایسی حماقت وجہالت سے اللہ ہر کسی کو محفوظ رکھے''۔[۳۰۶]

اسلام جس جدت پسندی کی اجازت دیتا ہے اس لحاظ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی نہایت جدت پسند واقع ہوئے تھے۔ اسلام سے قبل عرب اور روم وایران کی تہذیبوں اور ان کے نظام حکومت وغیرہ میں نمایاں فرق تھا۔ روم و ایران اس دور کی سب سے بڑی اور برتر طاقتیں (Super Powers) خیال کی جاتی تھیں جب کہ ان کے مقابلہ میں عرب کو غیر منظم، غیر مرتب اور (Uncultured) قوم کہا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر اثر عرب قوم میں تبدیلی کے آثار پیدا ہونا شروع ہوئے بالآخر عرب کے بدو اور بکریوں کے چرواہے دنیا کے امام وپیشوا بن گئے اور اب وہ وقت آیا کہ روم وایران ایسی سپر طاقتیں بھی اسلامی سلطنت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ نئے علاقے جب اسلامی ریاست میں شامل ہوئے تو ظاہر ہے مسلمانوں کو نئی تہذیب، کلچر اور نیا نظامِ حکومت وغیرہ دیکھنے کا موقع ملا جس سے اخذ واستفادہ کی راہیں ہموار ہوئیں۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت امتِ مسلمہ کے لیے خصوصاً قدوہ واسوہ (Ideal) کی حیثیت رکھتی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ہی پہلی مرتبہ کفار کے مفید اور مستحسن اقدامات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس بارے کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی اور نہ ہی اسے باعث عار سمجھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ساجد الرحمان صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''اسلامی ریاست میں موجود اداروں کو مستقل شکل جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

کے دور حکومت میں ہی ملی اور پھر بعد کے دونوں خلفاء نے اس نظم کو قائم رکھا۔

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسلامی روح کے مطابق "الحکمة ضالة المومن" کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جہاں سے بھی کوئی ایسی چیز ملی جوامت کے لیے نفع بخش تھی، اسے قبول کر کے اسلامی نظام کا حصہ بنا دیا اور قطعاً کسی تعصب کو خاطر میں نہیں لائے"۔ [۳۰۷]

ذیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کفار کے تشکیل کردہ انتظامی امور سے استفادہ کی چند امثلہ ذکر کی جاتی ہیں:۔

(i)۔ عہد فاروقی میں جب حکومتی آمدن کی شرح بہت بڑھ گئی تو رعایا (Public) میں اس کی منصفانہ تقسیم کا مسئلہ پیش آیا کہ ہر شخص تک اس کا حق کیوں کر پہنچایا جا سکتا ہے جبکہ کوئی شخص محروم بھی نہ رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا اور مختلف آراء سامنے آئیں۔ بالآخر ولید بن ہشام نے کہا کہ میں نے شام کے والیانِ ملک کو دیکھا ہے کہ انہوں نے (ریکارڈ کے لیے) رجسٹرز (دیوان) بنا رکھے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو قبول کرتے ہوئے رجسٹرز تیار کروائے جس میں لوگوں کے نام ایک خاص ترتیب سے لکھوائے اور اس طرح سب لوگوں تک بہ سہولت ان کا حق پہنچنا ممکن ہوا۔ [۳۰۸]

(ii)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہی رسد کا ایک مستقل محکمہ یونانی طرز پر بنایا گیا جس کا نام "اہرا" بھی یونانیوں سے ہی مستعار لیا گیا تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ اس بارے دادِ تحقیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رفتہ رفتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسد کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا جس کا نام "اہرا" تھا چنانچہ شام میں عمر بن عتبہ اس محکمے کے افسر مقرر ہوئے۔ اہرا ہری کی جمع ہے اور ہری ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی گودام کے ہیں چونکہ رسد کے یکجا جمع ہونے اور وہاں سے تقسیم ہونے کا یہ طریقہ یونانیوں سے لیا گیا تھا اس لیے نام میں بھی وہی یونانی لفظ قائم رہا"۔ [۳۰۹]

(iii)۔ عراق کے کفار سے جزیہ لینے کا موقع آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں وہی اصول ملحوظ رکھے جو نوشیرواں نے اپنی حکومت میں تشکیل دیے تھے چنانچہ نوشیرواں کے اصول و ضوابط جاننے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو اپنے سرکاری مراسلہ میں عراق کے دو بڑے زمینداروں کو اپنے پاس بھیجنے کا حکم

دیا۔ چنانچہ یہ زمیندار ترجمان (Translator) کے ساتھ آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا کہ سلاطینِ عجم کے یہاں مالگزاری کی تشخیص کا کیا طریقہ تھا۔[۳۱۰]

(iv)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خراج کی وصولی کے لیے محض عراق صوبے کی پیائش کرائی البتہ باقی تمام علاقوں میں جس طرح کا نظام (System) پہلے سے رائج تھا اسے ہی برقرار رکھا یہاں تک کہ اس سلسلے میں ریکارڈ کے رجسٹروں کی زبان بھی نہ بدلی اور نہ ہی سابقہ ملازم بدلے تاہم گزشتہ نظام میں جہاں ظلم وستم نظر آیا اس کے فوری بدلنے میں ذرا بھر تاخیر سے کام نہ لیا چنانچہ رومی اہل مصر سے ہر سال خراج کے علاوہ بھی غلہ ایک کثیر مقدار میں لیتے تھے اور فوج کے لیے بھی رسد کا غلہ یہیں سے جاتا تھا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دونوں قسم کے ظالمانہ غلے لینے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے۔[۳۱۱]

مذکورہ بالا امثلہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قدیم سلطنتوں کے حالات وانتظامات بارے واقفیت حاصل کر کے اس سے بلا جھجک استفادہ کرتے رہے البتہ اس سلسلہ میں "خذما صفا ودع ما كدر" (میٹھا میٹھا ہڑپ کڑوا کڑوا تھو۔) کے اصول کا ضرور لحاظ رکھا گیا۔ بالفاظ دیگر جو مفید چیزیں شریعت کی تعلیمات کے منافی نہ تھیں انہیں قبول کر لیا اور جو روحِ شریعت کے منافی تھیں انہیں رد کرنے میں بھی دیر نہ کی بلکہ اس میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے اصلاحی اقدامات اٹھائے۔ اسی لیے علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ (م۱۳۳۲ھ) اس بارے خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ قدیم سلطنتوں اور حکمرانوں کے قواعد اور انتظامات سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور ان میں جو چیزیں پسند کے قابل ہوتیں اس کو اختیار کرتے تھے ۔۔۔۔۔۔البتہ جہاں کوئی نقص پایا اس کی اصلاح کر دی'' [۳۱۲]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اجتہادی منہج:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان سے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ عہد لیا تھا کہ اگر وہ خلیفۃ المسلمین بنا دیے جائیں تو انہیں پہلے دونوں خلفاء کے نقش قدم پر ہی چلنا ہوگا[۳۱۳] لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ شیخین (ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے دور میں پیش آمدہ مسائل کا حل سابقہ خلفاء کی طرح سب سے پہلے قرآن وحدیث سے ہی کرتے ہیں۔ ذیل میں اس کی تفصیلی امثلہ ذکر کی جاتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور قرآن مجید:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن مجید سے تعلق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے بارے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ ایک ایک رات میں اور صرف ایک رکعت میں مکمل قرآن مجید کی تلاوت کر لیا کرتے تھے[۳۱۴] جب آپ رضی اللہ عنہ کا قرآن مجید سے اس قدر شغف تھا تو آپ قرآن مجید سے رہنمائی کیوں نہ لیتے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کئی مواقع پر دلیل کے طور پر قرآنی آیات کو پیش کیا۔

ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص کی ملکیت میں دو ایسی لونڈیاں ہوں جو سگی بہنیں ہوں تو کیا وہ دونوں اپنے مالک کے لئے بیک وقت حلال ہوں گی؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک آیت کی رو سے تو یہ دونوں حلال ہیں اور ایک دوسری آیت کی رو سے دونوں کا بیک وقت جمع کرنا حرام ہے[۳۱۵] آپ رضی اللہ عنہ کا اشارہ درج ذیل دو آیات کی طرف تھا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ O اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾[۳۱۶]

''اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملک ہوتی ہیں۔''

اس آیت سے مملوکہ لونڈیاں خواہ کوئی بھی ہوں حلال ٹھہرتی ہیں مگر دوسری آیت ﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾[۳۱۷] (اور دو بہنوں کو اکٹھا کرنا بھی (حرام ہے۔) سے دو سگی بہنوں کے اجتماع کی حرمت کا علم ہوتا ہے خواہ وہ آزاد ہوں یا لونڈیاں۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواز و عدم جواز میں اشتباہ ہونے پر احوط رائے اختیار کرتے ہوئے بیک وقت دو سگی بہنیں جو ایک ہی آقا کی لونڈیاں ہوں ان سے مالک کے استمتاع کو حرام قرار دیا[۳۱۸] اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جہاں آپ رضی اللہ عنہ حسب ضرورت قرآنی آیات سے استنباط و استدلال کرتے تھے وہاں اجتہاد و فتویٰ کی نزاکتوں کو بھی سمجھتے تھے۔ مشتبہ امور میں حرمت کے پہلو کو غالب کر کے اپنا دامن بچا لینے کی بذات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ تاکید کی ہے:

''ان الحلال بین و ان الحرام بین و بینهما مشتبهات لا یعلمهن کثیر من الناس فمن اتقى الشبهات فقد استبرأ لدینه و عرضه و من وقع فی الشبهات وقع فی الحرام''[۳۱۹]

''بلاشبہ حلال اور حرام واضح ہو چکے ہیں البتہ ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ

امور ہیں جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جو شخص ان مشتبہ امور سے بچ گیا تو اس نے تو اپنا دین اور عزت بچالی مگر جو شخص ان میں واقع ہو گیا تو وہ حرام میں بھی واقع ہو جائے گا۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حدیث رسول:

آپ رضی اللہ عنہ قرآن مجید کے بعد حدیث رسول ﷺ کو حجت سمجھتے تھے اور کسی مسئلہ میں حدیث ملنے پر اسی کے مطابق عمل پیرا ہو جاتے تھے مثلاً ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ عبداللہ بن ولید رضی اللہ عنہ عمرہ کی نیت سے مکہ روانہ ہوئے مگر راستے میں حالت احرام میں ہی فوت ہو گئے چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی تکفین اس طرح کی کہ نہ تو ان کا سر ڈھانپا اور نہ ہی انہیں خوشبو لگائی[۳۲۰] ڈاکٹر رواس قلعہ جی لکھتے ہیں کہ دراصل اس موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے عہد نبوی کے اس واقعہ سے استشہاد کیا ہو گا جس میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حالت احرام میں فوت ہوا تو نبی ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس کو پانی میں بیری کے پتے ابال کر غسل دیا جائے اور اسے احرام کی دو چادروں میں ہی کفن دیا جائے نیز اسے نہ تو خوشبو لگائی جائے اور نہ اس کا سر ڈھانپا جائے کیونکہ قیامت کے روز یہ شخص اپنی قبر سے تلبیہ پڑھتے ہوئے ہی اٹھے گا۔[۳۲۱]

آپ رضی اللہ عنہ کا مذکورہ عمل تجہیز و تکفین مذکورہ بالا حدیث کے مطابق تھا اگرچہ اس وقت آپ رضی اللہ عنہ نے حدیث کو بیان نہیں کیا کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ اکثر و بیشتر روایت حدیث سے احتراز کرتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے کثرت سے احادیث نہ روایت کرنے کی وجہ بایں الفاظ ذکر کی تھی:

"مجھے جو چیز نبی اکرم ﷺ سے حدیث روایت کرنے سے روکتی ہے وہ یہ نہیں کہ میں آپ ﷺ کے زیادہ باخبر ساتھیوں میں سے نہیں ہوں بلکہ یہ ہے کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ

"من قال عليَّ مالم أقل فقد تبوأ مقعده من النار"[۳۲۲]

"جس نے میری طرف کوئی بات منسوب کی حالانکہ میں نے وہ نہیں کی تو ایسے شخص نے اپنا ٹھکانہ جہنم کی آگ بنالیا۔"

معلوم ہوا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حدیث بارے مبلغ علم دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے کم نہ تھا مگر شدت احتیاط کی بنا پر روایت کم کرتے تھے جبکہ حدیث سے رہنمائی بوقت ضرورت لیتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور شیخین (ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ) کے اجتہادات سے استفادہ:

منصب خلافت پر فائز و متمکن ہونے کے وقت آپ رضی اللہ عنہ سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ آپ اپنے پیش رو خلفاء یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلیں گے [۳۲۳] چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس عہد کی پاسداری کی۔ یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں زیادہ تر اندرونی خلفشار پیدا ہوا اور مسائل زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق مسلم ریاست کے اندرون سے تھا جن کو آپ رضی اللہ عنہ نے کمال حکمت و دانائی سے حل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلم ریاست کے بہت زیادہ وسیع ہو جانے اور دیگر اقوام و ملل کے قبولِ اسلام سے بہت سارے نئے مسائل منظر عام پر آئے جنہیں آپ رضی اللہ عنہ نے روح شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس دنیا سے جب تشریف لے گئے تو گویا خلافت راشدہ اپنے نقطہ عروج پر تھی اسلامی ریاست کی انتظامی بنیادیں بڑی حد تک مستحکم ہو چکی تھیں اور حکومت کے مختلف انتظامی ادارے پوری طرح کام کر رہے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نسبتاً کم ہی نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے سابقہ خلفاء کے بیشتر اجتہادات کو ہی نافذ و برقرار رکھنے میں مصلحت سمجھی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی لکھتے ہیں۔ ''جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس وقت جزیہ کا نظام مستحکم ہو چکا تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں ان سارے اداروں کو برقرار رکھا جو ان کے پیش رو خلفاء حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مقصد کے لیے قائم کر رکھے تھے''۔[۳۲۴]

زخم موضحہ (وہ زخم جو ہڈی تک پہنچ کر اسے نمایاں کر دے) اگر کسی شخص کی وجہ سے کسی دوسرے فرد کو بلا قصد لگ جائے تو اس بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے دیت کا فیصلہ کیا تھا[۳۲۵] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں فاروقی فیصلہ کو برقرار رکھا اور اس کے مطابق عمل کیا۔[۳۲۶]

حدیث رسول کے مطابق ایک مسلم شخص فوت ہو تو اس کے وارث مسلمان رشتہ دار ہوں گے۔ کافر رشتہ دار محروم کر دیے جائیں گے[۳۲۷] لیکن اگر فوت شدہ شخص کی وراثت تقسیم نہ ہو سکی اور اس کے کافر رشتہ داروں میں سے کوئی مسلمان ہو جاتا ہے تو کیا وہ اب ورثاء میں شامل ہوگا یا نہیں؟ اس بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہادی فیصلہ یہ ہے کہ اگر وہ تقسیم وراثت سے پہلے مسلمان ہو جاتا ہے تو

وارث ہو گا لیکن اگر وہ تقسیم وراثت کے بعد مسلمان ہو تو وارث نہ ہو گا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دور میں اس مسئلہ میں فاروقی اجتہاد کو ہی اختیار کیا۔[۳۲۸]

لیکن اگر آپ رضی اللہ عنہ نے صدیقی و فاروقی اجتہادات کو اختیار کرنے میں مصلحت نہ سمجھی تو ان کے اجتہاد کی بجائے خود اجتہادی فیصلہ کر کے امت کے لیے رہنمائی کا سامان بہم پہنچایا مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کے لئے منبر کی اس سیڑھی سے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے تھے، ادباً نیچے والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں کا ادب واحترام کرتے ہوئے اس سے بھی نیچے والی سیڑھی پر کھڑے ہوتے تھے لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس طرح تو یہ سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا جائے گا۔لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے اس سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے تھے[۳۲۹]اس موقع پر اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے سابقین کا طرز عمل اختیار کرتے ہوئے مزید نیچے کھڑے ہوتے تو آئندہ آنے والوں کے لیے کس قدر دشواری پیدا ہو جاتی، اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں۔یقیناً اس موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے کمال حکمت و دانائی کا مظاہرہ کیا ہے۔

شیخین کا ایک طرز عمل یہ بھی تھا کہ وہ اگر قرآن وحدیث سے رہنمائی حاصل نہ کر پاتے تو ممکن حد تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کرتے اور ان کے سامنے صورت مسئلہ پیش کر کے ان کی آراء بھی لیتے اور پھر بالآخر جس رائے پر اتفاق ہو جاتا اسے جاری وساری کر دیتے[۳۳۰]عام طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے یہ مشہور ہے کہ چونکہ آپ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں اہل علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کی دعوت وتبلیغ کے لئے اسلامی ریاست کے چہار جانب پھیل گئے تھے لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مشاورتی اجتہاد کے مواقع نہ مل سکے۔مگر یہ بات کلی طور پر درست نہیں ہے کیونکہ بعض ایسے شواہد اور دلائل موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بھی کئی مواقع پر مشاورتی انداز میں اجتہاد کیا ہے بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کے بارے امام بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) روایت کرتے ہیں۔

> ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ جب ان کے پاس دو فریق کوئی مقدمہ لے کر آتے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان میں سے ایک فریق سے کہتے کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کو بلا لائیں اور دوسرے سے کہتے کہ وہ طلحہ و زبیر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا لائیں، جب وہ حضرات آجاتے تو آپ رضی اللہ عنہ دونوں فریقوں سے کہتے کہ وہ اب اپنا مقدمہ پیش کریں، پھر آپ رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متوجہ ہو کر پوچھتے کہ ان کی اس بارے کیا رائے ہے؟ اگر ان

کی رائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق و موافق ہوتی تو فوراً اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے بصورت دیگر اس معاملہ پر بعد میں مزید غور و فکر کرتے۔ (اسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ) دونوں فریق جب وہاں سے اٹھتے تو فیصلے کو تسلیم کر چکے ہوتے"۔[۳۳۱]

آپ رضی اللہ عنہ کے بارے ثابت ہے کہ آپ نے حمیل [۳۳۲] اور اسے لانے والی عورت کے درمیان وراثت جاری ہونے بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کی اور پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کا بھی اظہار کیا۔[۳۳۳]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد عثمانی میں با قاعدہ طور پر "مجلس شوری" موجود تھی جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے شہید ہو جانے کے بعد جب آپ رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبید اللہ بن عمر نے ہیجانی و جذباتی کیفیت میں ہرمزان، جفینہ اور ابولولوۃ کی بیٹی کو قتل کر دیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبید اللہ بن عمر کا معاملہ اپنی مجلس شوری کے سامنے یہ کہتے ہوئے رکھا:

"اشیروا علیّ فی هذا الرجل الذی فتق فی الاسلام ما فتق یعنی عبید الله بن عمر"[۳۳۴]

"مجھے اس نوجوان (عبید اللہ بن عمر) کے بارے مشورہ دو جس نے حالتِ اسلام میں یہ قتل کر ڈالا ہے۔"

ان روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شیخین کے طرز عمل کو اختیار کرتے ہوئے مشاورتی اجتہاد بھی کیا ہے۔ البتہ آپ رضی اللہ عنہ کے شروع دور میں تو بکثرت مشاورتی اجتہاد ہوتا رہا مگر آخر دور میں جب کبار و اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم منتشر ہو گئے تو پھر مشاورتی اجتہاد کے زیادہ مواقع میسر نہ آ سکے جیسا کہ استاذ زرقاء لکھتے ہیں:

"لکنهم تفرقوا بعد ذلک اواخر خلافة عثمان فی الامصار"[۳۳۵]

"لیکن اس کے بعد خلافتِ عثمانی کے اواخر میں وہ (کبار صحابہ و اہل علم اصحاب) مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور قیاس:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جمعہ کے روز مروج اذان سے قبل ایک اذان کا اجراء بعض ناگزیر

حالات کے پیش نظر تھا جس میں لوگوں کی مصلحت ہی مقصود تھی۔اور اس نئی اذان کی حیثیت وہی تھی جو اذانِ فجر سے قبل دی جانے والی اذان کی تھی۔[۳۳۶] جس کے بارے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

"لیرجع قائمکم و ینبه نائمکم"[۳۳۷]

"تاکہ جو قیام کرنے والے ہیں وہ (آرام کے لیے) پلٹ جائیں اور جو سوئے ہوئے ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔"

لہٰذا یہ نئی اذان بھی محض لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے تھی جبکہ اذان کی مشروعیت کا سبب بھی یہی ہے کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کے بارے میں خبر دی جائے اور جماعت میں شرکت کی دعوت دی جائے[۳۳۸] لہٰذا بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہاں اصولِ قیاس سے کام لیا ہے۔اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"تبین ان عثمان احدثه لاعلام الناس بدخول وقت الصلوة قیاسا علی بقیة الصلوات فالحق الجمعة بها وابقی خصوصیتها بالاذان بین یدی الخطیب"[۳۳۹]

"(اس سے) واضح ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جمعہ کے وقت بارے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے اس اذان کا اجرا کیا جو دراصل فرض نمازوں کی اذان پر قیاس کرتے ہوئے کیا تھا۔(اس پہلو سے) جمعہ کو ان نمازوں کے ساتھ تو ضرور ملایا مگر جمعہ کی اس خصوصیت کو بھی باقی رکھا کہ مقررہ اذانِ جمعہ خطیب کے سامنے ہی کہی جائے۔"

ڈاکٹر عبداللہ محفوظ بھی لکھتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ اذان، اذانِ فجر سے قبل دی جانے والی اذان پر قیاس کرتے ہوئے مقرر کی جس طرح اذانِ فجر سے قبل کی اذان کا مقصد حدیث مذکورہ کے مطابق محض اعلام تھا اسی طرح اس کا مقصد بھی محض اعلان و اعلام ہی تھا۔[۳۴۰]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور مصلحت مرسلہ:

حضرت عثمان کے اجتہادات میں مصلحت مرسلہ کے لحاظ کی امثلہ بھی بکثرت ملتی ہیں جن میں سے چند کا ذکر حسب ذیل ہے:

(i) اسلامی حکومت کی حدود عہد فاروقی میں ہی روم و ایران تک پہنچ چکی تھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار سے متاثر ہو کر نو مسلموں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم جس علاقہ میں جاتے وہاں لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے رہے مگر ہر صحابی اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق پڑھاتا تھا جو اس نے رسول اللہ ﷺ سے سیکھی ہوئی تھی۔ نتیجتاً قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پھیلتا چلا گیا جبکہ ان نومسلموں کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث ''انزل القرآن علی سبعة احرف'' [۳۴۱] (قرآن مجید سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔) کے بارے علم نہ تھا جس کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے اور ہر شخص اپنی قراءت کو درست اور دوسرے کی قراءت کو غلط سمجھتا تھا۔ لہٰذا ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ پورے عالم اسلام میں قرآن مجید کے ایسے نسخے پھیلا دیے جائیں کہ جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کونسی قراءت صحیح ہے اور کونسی غلط؟ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس اہم کام کی طرف حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے توجہ دلائی جنہوں نے آرمینیا اور آزربائیجان کے جہاد میں مصروفیت کے دوران اختلاف قراءات کے نتائج بھانپ لیے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہ رضی اللہ عنہم کی کمیٹی بنائی جن میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سعید بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمان بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ شامل تھے اور انھیں لغتِ قریش میں لکھنے کا حکم دیا کیونکہ قرآن لغت قریش میں ہی نازل ہوا ہے اور انہیں اس بات کا حکم دیا کہ قرآنی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما جائیں لہٰذا اس سلسلہ میں کل سات نسخے تیار کرائے گئے جن کو عالم اسلام کے مختلف مشہور شہروں میں بھیج دیا گیا نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے انفرادی نسخے نذر آتش کرنے کا حکم دیا تا کہ رسم الخط میں مسلمہ قراءتوں کا اجتماع ہو سکے اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر سوائے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے رضامندی کا اظہار کیا بلکہ دراصل یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کے بعد ہی ایسا کیا گیا تھا۔ [۳۴۲] آپ رضی اللہ عنہ کا یہ دانشمندانہ اقدام یقیناً مصلحت پر مبنی تھا۔ جیسا کہ امام شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ولم یرد نص عن النبی بما صنعوا من ذلک، ولکنهم راوه مصلحة تناسب تصرفات الشرع قطعاً، فان ذلک راجع الی حفظ الشریعة والامر بحفظها معلوم والی منع الذریعة للاختلاف فی اصلها الذی هو القرآن و قدعلم النهی عن

الاختلاف فی ذلک بما لا مزید علیه"[۳۴۳]

"ان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے جو یہ کام کیا تو اس بارے نبی ﷺ سے مروی کوئی نص صریح موجود نہ تھی لیکن چونکہ اس میں ایسی مصلحت تھی جو کہ قطعی طور پر شرعی تصرفات سے مناسبت رکھتی تھی اور پھر اس سے حفاظت شریعت بھی مقصود تھی جو کہ ایک طے شدہ بات ہے اسی طرح اس عمل سے قرآن مجید بارے پیدا ہونے والے اختلاف کے راستہ کو بھی ہمیشہ کے لیے بند کرنا مقصود تھا جبکہ نہایت شرح وبسط سے اس قرآن مجید بارے اختلاف کرنے سے روکا بھی گیا ہے۔"

(ii) آپ رضی اللہ عنہ کا جمعہ کے دن ایک دوسری اذان کا اجرا بھی دراصل لوگوں کی مصلحت کے پیش نظر تھا[۳۴۴] کیونکہ لوگوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا اور ان کے گھر بھی مسجد نبوی سے بہت دور دور واقع تھے۔[۳۴۵] اس لیے لوگوں کے خطبہ جمعہ میں شرکت کی تیاری کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے اذان کا اجرا کیا۔ یہ اذان پہلے سے رائج شدہ اذان جمعہ سے پہلے مقام "زوراء" میں واقع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کی چھت پر دی جاتی تھی۔ اور اس کی آواز مدینہ منورہ کے تمام بازاروں تک پہنچتی تھی۔[۳۴۶، ۳۴۷]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حالات وظروف کا اعتبار:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی اجتہادی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہادات میں حالات وظروف کا اعتبار بھی کیا ہے۔ اس کے لیے درج ذیل عثمانی اجتہاد کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ سے گمشدہ اونٹ کے بارے سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے سائل سے فرمایا: تجھے اس سے کیا غرض؟ اس کے ساتھ اس کا پانی ہے، وہ خود ہی پانی پر وارد ہو جائے گا اور درختوں کے پتے وغیرہ کھالے گا حتیٰ کہ اس کا مالک اسے پالے گا[۳۴۸] یہ حدیث اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ نبی ﷺ نے گمشدہ اونٹ ملنے پر اسے روک لینے یا باندھ دینے سے منع کر دیا تھا، اس حدیث کے مطابق ہی عہد نبوی سے لے کر عہد فاروقی تک عمل ہوتا رہا[۳۴۹] لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا کہ ایسے جانور کو باندھ لیا جائے۔ اس کی تشہیر کرائی جائے اگر اس کا مالک آجائے تو فبہا ورنہ اسے فروخت کر کے قیمت بیت المال میں رکھ دی جائے۔ اگر اس کے بعد مالک آجائے تو اسے قیمت دے دی جائے۔[۳۵۰]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ دراصل نئے حالات کے پیش نظر تھا۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے گمشدہ اونٹ کے باندھنے سے منع کیا تھا اس دور میں لوگوں کی دینی حالت بہت اچھی تھی لیکن اب عہدِ نبوت سے دوری کی وجہ سے لوگوں کی دینی حالت میں تبدیلی آ چکی تھی لہٰذا یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اگر گمشدہ اونٹوں کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو ممکن ہے کوئی خائن ہاتھ اسے اپنے قبضہ میں کر لے گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیش نظر لوگوں کے اموال کی حفاظت کی مصلحت تھی۔[۳۵۱]

یاد رہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ دینا حکم نبوی کو بدلنا یا منسوخ کرنا نہ تھا۔ کیونکہ حکم شرعی کو بہر صورت نہیں بدلا جا سکتا البتہ فتویٰ بعض ناگزیر حالات میں بدلتا ہے۔ حکم شرعی اپنی اصلی حالت پر اب بھی بدستور برقرار ہے لیکن اس پر عمل کے لئے ضروری ہے کہ اس طرح کے لوگوں کے دینی حالات بھی ہوں جیسے عہد نبوی میں تھے۔

بالکل اسی طرح کی دوسری مثال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا تھا:

"و اتخذ لک مؤذنا لا یأخذ علی اذانه اجرا"[۳۵۲]

"اپنے لیے ایسے شخص کو مؤذن مقرر کرو جو اس ذمہ داری کی اجرت نہ لے۔"

مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں مؤذنین کی تنخواہیں مقرر کر دی تھیں [۳۵۳] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ دراصل حالات وظروف کے بدلنے کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ اب لوگوں میں وہ دینی تڑپ اور شوق عبادت باقی نہ رہا تھا جو عہد نبوی میں تھا لہٰذا اگر آپ رضی اللہ عنہ ایسا نہ کرتے تو شاید کوئی بھی شخص موذن کی ڈیوٹی ادا نہ کرتا کیونکہ ہر شخص نے تو اپنے دنیوی مشاغل میں منہمک ومصروف ہو جانا تھا نتیجتاً اسلام کا ایک عظیم شعار ضائع ہو جاتا۔[۳۵۴]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور سد ذریعہ:

ایک شخص اگر مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور پھر وہ وفات پا جاتا ہے تو ایسے شخص کی بیوی کیا اس کی وارث ہوگی یا نہیں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص کی بیوی کو اس کا وارث بنایا ہے اگرچہ خاوند کی وفات کے وقت اس کی عدت بھی کیوں نہ گزر چکی ہو چنانچہ جب عبد الرحمان بن مکمل نے فالج کے حملہ کے بعد اپنی دونوں بیویوں کو طلاق دے دی اور پھر طلاق دینے کے دو سال بعد فوت ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی دونوں بیویوں کو ان کی وراثت سے ان کا حصہ دلوایا۔[۳۵۵]

آپ رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا اجتہادی فیصلہ دراصل سدّ ذریعہ کے طور پر تھا[۳۵۶] اسی بات کو

ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے یوں واضح کیا ہے۔

''مرض الموت کی حالت میں بیوی کو طلاق دینے کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اسے اپنی وراثت سے محروم کرنا چاہتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جانا چاہیے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اسی بیماری میں فوت ہو جاتا ہے تو اس کی بیوی کو عدت گزرنے کے بعد ترکے میں سے حصہ ملے''۔[۳۵۷]

اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ کا لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کرنا دراصل سد ذریعہ کے طور پر تھا کیونکہ اس سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں میں اختلاف قراءات کی وجہ سے لڑائی جھگڑوں تک نوبت نہ آجائے نیز لوگ سابقہ امم یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح کتاب اللہ میں اختلافات کا شکار نہ ہو جائیں[۳۵۸] جس طرح کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ کہا تھا کہ۔''امیر المومنین! قبل اس کے کہ یہ امت کتاب اللہ بارے یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کا شکار ہو آپ رضی اللہ عنہ اس کا کچھ علاج کیجیے''[۳۵۹]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اجتہادی منہج:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا علمی مقام و مرتبہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو اجتہادی صلاحیت اور فہم و بصیرت کا وافر حصہ اللہ رب العلمین کی طرف سے ملا تھا جس کی برکت سے آپ رضی اللہ عنہ کے لیے مسائل کا ادراک کرنا، اس کے مالہ و ماعلیہ کو جاننا چنداں مشکل نہ رہا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کس منہج پر اجتہاد کرتے رہے اس بارے ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں۔

''آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی قضیہ آتا یا آپ رضی اللہ عنہ سے کسی مسئلہ بارے استفتاء کیا جاتا تو آپ رضی اللہ عنہ کتاب اللہ پھر سنت رسول اللہ سے رہنمائی حاصل کرتے۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے قیاس، استصحابِ حال، استحسان اور مقاصدِ شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے استصلاح (مصالح مرسلہ) سے بھی کام لیا ہے''۔[۳۶۰]

اور اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اجتہادی منہج قدرے تفصیل سے رقم کیا جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قرآن مجید:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قرآن مجید بارے مبلغ علم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے بذات خود ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم جو بھی آیتِ قرآنی نازل ہوئی ہے میں ہر ایک کے بارے جانتا ہوں کہ وہ کس پس منظر میں، کہاں، کس مقام پر اور کس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے''۔[۳۶۱]

لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کے لیے قرآن مجید سے رہنمائی لینا یقیناً بہت سہل و آسان ہوگا۔ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے نوجوانوں کے ایک گروہ کو نرد (شطرنج) کھیلتے ہوئے دیکھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ عجم کی جوئے بازی (میسر) ہے جیسا کہ پانسہ (ازلام) عربوں کی جوئے بازی تھی''۔[۳۶۲] یہاں آپ رضی اللہ عنہ کا اشارہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت کی طرف تھا:

﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾[۳۶۳]

''شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ (سب) ناپاک کام اعمالِ شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔''

بظاہر ''المیسر'' کے لفظ میں عرب میں مروجہ جوئے کی تمام صورتیں تو حرام قرار پائی ہی تھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا اجتہاد سے واضح ہوا کہ جوئے کی تمام صورتیں خواہ عرب کی ہوں یا عجم کی، وہ اسی آیت کے تحت حرام قرار پاتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اجتہادی فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں۔

> ''آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہ صرف اجمالاً معنی کی اہمیت سے آگاہ تھے بلکہ اس تفصیل سے بھی اچھی طرح باخبر تھے کہ اس کے پورے پورے اور دور رس مقتضیات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے اور یہ جاننا بھی لابدی ہے کہ اس میں کوئی علت و لزوم تو پنہاں نہیں اور اس کے کچھ اور اطلاقات بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں''۔[۳۶۴]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قرآن مجید سے استشہاد اور استنباط کی کس قدر غیر معمولی صلاحیت و مہارت حاصل تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب خوارج نے آیت ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾[۳۶۵] (سن رکھو کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔) سے استدلال کرتے ہوئے کہا

کہ اللہ کے سوا کسی کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں قرآن مجید ہی کی ایک آیت کے ساتھ جواب دے کر لاجواب کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے آیت ﴿وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَ حَکَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا﴾ [۳۶۶] (اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔) کی تلاوت کر کے فرمایا کہ اللہ رب العلمین نے زوجین میں اختلاف ہونے پر حَکَم بنانے کی اجازت دی ہے تو جب امت محمد علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں اختلاف ہو تو حَکَم بنانا جائز کیوں نہ ہو؟ کیا ساری امتِ محمد کی حیثیت اللہ کی نگاہ میں ایک عورت اور مرد سے بھی کم ہے؟ [۳۶۷]

حمل (Pregnency) کی اَقل مدت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی دو آیات سے استدلال کے ساتھ چھ ماہ بتائی ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس استدلال کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے کہ عہدِ فاروقی میں ایک عورت کے یہاں چھ ماہ بعد ہی بچہ کی پیدائش ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس بارے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس عورت پر حد نہ لگنے کا ایک عذر موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استفسار پر آپ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حمل اور دودھ پلانے کی کل مدت تیس ماہ آیت ﴿وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا﴾ [۳۶۸] (اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے۔) میں بتائی ہے اور ایک دوسری آیت ﴿وَ الۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ﴾ [۳۶۹] (اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔) میں صرف دودھ پلانے کی کل مدت دو سال (چوبیس ماہ) بتائی ہے لہٰذا اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حمل کی اقل مدت چھ ماہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس محیر العقول استدلال پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے حد کا نفاذ روک دیا۔ [۳۷۰]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حدیث بارے کس قدر وسیع علم تھا اس بارے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بایں الفاظ گواہی دیتی ہیں:

"امانه لاعلم الناس بالسنة" [۳۷۱]

"یاد رکھو! وہ (علی رضی اللہ عنہ) لوگوں میں سے سب سے زیادہ سنت رسول کے عالم ہیں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں سنتِ نبوی شریعت کا جزوِ لازم ہے جس کا اظہار آپ رضی اللہ عنہ نے

ایک دفعہ اپنے ایک سرکاری لیٹر (presidential letter) بنام اہلِ مصر میں بایں الفاظ کیا:
''خبردار! ہم پر تمہارا جو حق ہے وہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کریں اور اس کے احکام تم پر نافذ کریں اور سنت رسول اللہ کا اجراء کریں اور تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے خیر خواہ رہیں۔ حقیقی مددگار اللہ ہی ہے اور وہی ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے''۔[۳۷۲]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دیوانی و مجنونہ عورت پر حد زنا نافذ کرنے لگے تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وہ حدیث پیش کی تھی جس میں ہے کہ تین قسم کے افراد مرفوع القلم ہیں جن میں سے ایک مجنون و پاگل بھی ہے، لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مجنونہ کو حد سے بری کر دیا تھا۔[۳۷۳]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سابقہ خلفاء کے اجتہادات سے استفادہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ سابقہ خلفاء راشدین کے اجتہادات سے بھی استفادہ کرتے رہے لہٰذا کبھی تو ان کی رائے کو ہی اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی اس میں بوجوہ کچھ تبدیلی کی ضرورت محسوس کی تو اسے کچھ تبدیل بھی کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سابقہ خلفاء کے اجتہادات سے استفادہ کی چند امثلہ ملاحظہ ہوں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مالِ غنیمت کے مصارف بارے یوں رہنمائی کی ہے:
﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ﴾[۳۷۴]
''اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ خدا کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔''
اس آیت پر عمل کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کے خمس کے پانچ حصے کرتے، ایک حصہ اپنی ذات اور اہل و عیال کے لیے خرچ کرتے اور ایک حصہ اپنے رشتے داروں یعنی بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کو دے دیتے باقی خمس کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں حصہ یتامیٰ، مساکین اور مسافروں پر خرچ کر دیتے۔[۳۷۵] گویا شروع میں اللہ تعالیٰ کا نام محض تبرک کے لیے ہے کیونکہ اللہ کو تو کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں بلکہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہے[۳۷۶] دراصل ''اللہ'' کے لفظ میں اشارہ ہے کہ یہ مال اصل میں تو اللہ کی ملکیت ہے یہ اسکی نعمت ہے کہ وہ تمہیں خرچ کرنے اجازت دے رہا ہے جبکہ پہلی امتوں کو اس کے استعمال میں لانے کی اجازت ہی نہ تھی۔[۳۷۷]

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے رشتہ دار دونوں حصوں کا مصرف جہاد کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات تو دنیا میں موجود نہ رہی تھی۔ رہے حضور ﷺ کے رشتہ دار تو وہ اس حصے کے مستحق اس لیے بنے تھے کہ وہ زمانہ جاہلیت میں بھی اور قبولِ اسلام کے بعد بھی بہر صورت آپ ﷺ کی نصرت اور مدد کرتے رہے تھے اور ان کی آپ ﷺ سے قرابت بھی تھی لیکن رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ صورت حال نہ رہی تھی یعنی اب ان کی اعانت و نصرتِ رسول کا سلسلہ منقطع ہو گیا[۳۷۸] اس لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور تمام مسلمانوں کی رائے اس بارے یہی ہوئی کہ یہ حصہ اب ان پر صرف نہ کیا جائے بلکہ دونوں حصے راہ جہاد میں گھوڑوں اور سامان حرب کی تیاری میں صرف کیے جائیں۔

حضور اکرم ﷺ کے رشتہ داروں میں جو لوگ فقراء تھے انہیں آپ رضی اللہ عنہ نے ''فقراء مساکین'' میں داخل کر لیا۔ البتہ باقی ماندہ تین حصوں کے مصارف وہی رہے جو زمانہ نبوی میں تھے[۳۷۹] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے خلفاء نے بھی اسی صدیقی طرز عمل کو ہی اختیار کیے رکھا چنانچہ جب امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ سے سوال ہوا کہ اس بارے علوی طرز عمل کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو اس معاملہ میں سب سے سخت تھے۔[۳۸۰] بلکہ اسی مسئلہ بارے ایک سوال کے جواب میں حضرت حسن بن محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ نے کہا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ بات بہت ناپسند تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اختلاف کرنے کا الزام لگے۔[۳۸۱]

ii۔ علماء نے ذمہ (ذمی بنانا) کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جو کفار اور مسلمانوں کے درمیان صلح کی صورت میں ہو اور دوسری قسم وہ ہے جو مسلمان ان لوگوں سے کرتے ہیں جن کا علاقہ بزورِ قوت فتح کر لیا جاتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذمہ کی ان دونوں قسموں بارے عمل درآمد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کار کو ہی اپنایا اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کی۔[۳۸۲]

iii۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فیصلوں کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ اور اہلِ نجران کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا تھا اور اس کے کاتب حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اہلِ نجران نے خود آ کر اس معاہدہ میں تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے مطالبہ کو مان لینے میں ہی مصلحت سمجھی مگر پھر ان لوگوں کو ندامت ہوئی اور دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر اب ان کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس دوبارہ آئے اور اپنا وہی مطالبہ پیش کیا جسے حضرت

عمر رضی اللہ عنہ رد کر چکے تھے۔ ان کی بات سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کم بختو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ معاملات کے بارے میں بڑے ہی راست رو تھے [۳۸۳] اور میں ان کے کیے ہو فیصلے کو ہرگز رد نہ کروں گا۔[۳۸۴]

iv۔ مولفۃ القلوب بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف ذکر کیا جا چکا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ دونوں کا موقف فاروقی موقف کے مطابق ہی رہا۔[۳۸۵]

v۔ عہد عثمانی رضی اللہ عنہ میں ایک شخص جہاد پر گیا اور پھر لاپتہ ہو گیا لہذا اس مفقود الخبر شخص کی بیوی نے چار سال انتظار کرنے کے بعد دوسری شادی کر لی اس کے بعد اس کا پہلا شوہر واپس آ گیا تو وہ عورت اور اس کا دوسرا شوہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور اپنا معاملہ پیش کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ''اس کے پہلے شوہر کو اس کی بیوی اور مہر کی رقم کے درمیان اختیار دیا جائے گا کہ وہ ان دونوں میں سے جسے چاہے قبول کر لے'' اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جلد ہی شہید کر دیے گئے، پھر یہ شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کوفہ گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق ہی فتویٰ دیا۔[۳۸۶]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قیاس:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں اصولِ قیاس کا استعمال بھی بہت نمایاں نظر آتا ہے چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کے ایسے اجتہادات کی چند امثلہ پیش کی جاتی ہیں:

i۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صنعاء علاقے کی ایک عورت کا شوہر کہیں گیا اور اپنا ایک لڑکا جو اس عورت کے بطن سے نہ تھا اس کے پاس چھوڑ گیا۔ بعد میں اس عورت نے ایک شخص سے یارانہ کر لیا اور اپنے یار سے کہا کہ یہ لڑکا کہیں ہمارا راز فاش نہ کر دے چنانچہ اس لڑکے کو قتل کرنے بارے ان دونوں میں اتفاق ہو گیا اور پھر چھ مردوں اور اس عورت نے مل کر اس لڑکے کو قتل کر دیا [۳۸۷] اور پھر اسے کھال کے بنے ایک برتن میں ڈال کر بستی سے باہر ایک گڑھے میں پھینک آئے مگر اس قتل کا پتہ چل گیا اور اس عورت نے اور اس کے عاشق نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا۔

امیر صنعاء یعلیٰ بن امیہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خط لکھا اور اس مسئلہ بارے استفتاء کیا۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

فرمایا کہ امیر المومنین! اگر ایک اونٹ کو کئی افراد مل کر چوری کریں اور اس کا ایک ایک عضو کاٹ کر لے جائیں تو کیا آپ رضی اللہ عنہ ان سب کے ہاتھ کاٹیں گے یا نہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر یہاں بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس قتل میں شریک تمام افراد کو قصاصاً قتل کر دینے کا امیر صنعاء کو خط لکھا۔[۳۸۸]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہاں قتل کو سرقہ پر قیاس کیا ہے کہ جس طرح کسی مال کی چوری میں شریک تمام افراد کے ہاتھ کاٹے جائیں گے اسی طرح ایک مقتول کے قتل میں شریک تمام افراد کو قصاصاً قتل کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ ڈاکٹر طہ جابر العلوانی لکھتے ہیں:

"وفي هذا قاس القتل على السرقة بجامع تحقق القصد الجنائي في كل منهما لدى مرتكبي الجريمتين مما يقتضي الزجر والردع".[۳۸۹]

"اس مسئلہ میں علی (رضی اللہ عنہ) نے قتل کو سرقہ پر قیاس کیا ہے کیونکہ دونوں جرائم کے مرتکبین میں ارادۂ جرم موجود ہے جو کہ زجر و توبیخ اور جرم کے سدباب کا تقاضا کرتا ہے۔"

ii۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہی جب لوگ بکثرت شراب نوشی کرنے لگے اور پہلے سے مروجہ حد خمر کو معمولی سمجھنے لگے تو اس کی شکایت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ابوابرہ کلبی کے ذریعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کی۔ جس وقت ابوابرہ کلبی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اس وقت آپ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ابوابرہ کی بات سن کر کہا کہ یہ سب موجود ہیں ان سے دریافت کرو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تجویز دی کہ اسی کوڑے شراب نوشی کی سزا شرابی کو دی جائے اور اس موقعہ پر ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا تھا:

"انه اذا سكر هذى واذا هذى افترى فحدوه حد المفترى"[۳۹۰]

"بلاشبہ وہ نشے میں مدہوش ہوتا ہے تو ہذیان بکتا ہے اور پھر اس ہذیان گوئی میں تہمت تراشی بھی کرتا ہے لہٰذا اسے تہمت لگانے والے کی سی سزا (اسی کوڑے) لگاؤ۔"

یہاں آپ رضی اللہ عنہ نے دراصل قیاس سے کام لیا ہے جیسا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے اس مذکورہ بالا

استدلال بارے ڈاکٹر طہ جابر لکھتے ہیں:

"قاس السکر علی القذف حین استشیر بزیادۃ حد شارب الخمر مقیمالمظنۃ القذف الذی ھو السکر مقامہ". [۳۹۱]

"جب آپ رضی اللہ عنہ سے شرابی کی حد میں اضافہ کرنے کے بارے مشورہ کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے نشہ کو قذف (تہمت لگانے) پر قیاس کیا اور ایسا اس لیے کیا کہ نشہ کی حالت میں تہمت لگانے کا امکان موجود ہوتا ہے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مصلحتِ مرسلہ:

مصلحت مرسلہ جس سے مقصود جلب منفعت اور دفع مضرت ہے اور یہی شرعی احکام سے مقصود ہے لہٰذا ہر وہ پالیسی (policey) اور قانون جس سے یہ مقصد پورا ہوتا ہو یقیناً شریعت کا مقصود و مطلوب ہے [۳۹۲] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہت سے اجتہادات میں مصلحتِ مرسلہ کی روح نظر آتی ہے مثلاً آپ رضی اللہ عنہ نے درزی، رنگریز اور اس قسم کے دوسرے کاریگروں پر نقصان کی صورت میں تاوان عائد کیا تھا تاکہ لوگوں کے اموال کا تحفظ ہو سکے یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر اس قانون بارے فرمایا تھا:

" لا یصلح الناس الاذلک " [۳۹۳]

"لوگوں کو محض یہی چیز سیدھا اور درست رکھ سکتی ہے۔"

امام شاطبی رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی تشریح میں لکھتے ہیں:

" کاریگروں سے کام کروانا لوگوں کی مجبوری ہوتی ہے اور لوگ اکثر طور پر کاریگروں کو اپنے سامان وغیرہ دے کر چلے جاتے ہیں۔ اغلب یہی ہے کہ کاریگر حضرات ان کے سامان کی حفاظت میں کوتاہی برتتے ہیں لہٰذا اگر ان کاریگروں کو ضامن نہ بنایا جائے تو اس کے دو نتائج ہونگے، یا تو لوگ ان سے کام کروانا چھوڑ دیں گے تو یہ چیز معاشرے کے لیے بڑی اذیت ناک اور تکلیف دہ ثابت ہو گی یا اگر انہیں سے کام لیا جائے اور ضامن نہ بنایا جائے تو پھر کاریگر حضرات سامان وغیرہ کے ضائع ہونے کا اکثر دعویٰ کریں گے اور پھر لوگوں کے اموال ضائع ہوں گے اور کاریگر حضرات کو یہ چیز خیانت تک لے

جائے گی لہٰذا مصلحت (لوگوں کے اموال کی حفاظت اور کاریگروں کو خیانت سے بچانا) کا تقاضا یہی ہے کہ ان کاریگروں کو ضامن بنایا جائے'' [۳۹۴]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کے بارے میں ڈاکٹر مصطفیٰ زید لکھتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ حکم دراصل محض مصلحت کی بنا پر تھا ورنہ اس بارے نہ تو کوئی نص تھی اور نہ کوئی نظیر جس پر قیاس کیا جاتا، اور نہ ہی کوئی سابقہ اجماع۔[۳۹۵]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جس طرح غلو پسندوں نے ''ابن اللہ'' کہہ کر الوہیت کے درجہ پر فائز کرنے کی جسارت کی۔ بدقسمتی سے یہی کچھ اس امت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا چنانچہ کچھ لوگ آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آ کر کہنے لگے کہ آپ رضی اللہ عنہ ''ھو'' (یعنی وہ خدا) ہیں (نعوذ باللہ من ذالک) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر پوچھا کہ میں کون ہوں؟ انہوں نے جواب میں پھر یہی کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غصے میں آ کر پھر پوچھا کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ تو اس پر وہ واضح طور پر کہنے لگے کہ آپ ہمارے رب ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو ان سے توبہ کرنے کو کہا۔ مگر انہوں نے انکار کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان سب کی گردنیں اڑا دیں اور ان کی لاشوں کو زمین پر پھینک دیا۔ پھر اپنے غلام قنبر سے لکڑیوں کا گٹھا لانے کو کہا اور پھر انہیں آگ لگا دی چنانچہ اس موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے یہ شعر پڑھا:

لما رایت الامر امرا منکراً   اججت ناری و دعوت قنبراً[۳۹۶]

''جب میں نے ایک غلط کام دیکھا تو میں نے (اپنے غلام) قنبر کو بلایا اور آگ بھڑکا دی۔''

آپ رضی اللہ عنہ یقیناً قرآن و سنت کے بہت بڑے عالم تھے اور جانتے تھے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا دعویٰ کرنے والے کافر و مرتد ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کافر و مرتد کی سزا قتل کو بھی جانتے تھے مگر اس سب کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں جلانے میں مصلحت سمجھی[۳۹۷] کیونکہ ان کا جرم معمولی نوعیت کا نہ تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کا مقصود یہ تھا کہ ان لوگوں کو دیگر زندیقوں کے لیے سامان عبرت بنا دیا جائے تاکہ اس فتنہ کو مزید بڑھنے سے روک دیا جائے [۳۹۸] چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل بارے ڈاکٹر سلیمان بن عبداللہ لکھتے ہیں:

''رای المصلحة فی الزجر عن الجرم الشنیع بالعقاب الشنیع وھو التحریق''.[۳۹۹]

''آپ رضی اللہ عنہ نے اس سنگین اور بھیانک جرم کے سدباب کے لیے یہ مصلحت سمجھی کہ انہیں آگ میں جلا کر سخت ترین سزا دی جائے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سد ذریعہ:

ضروریاتِ زندگی کی اشیاء بازار سے خرید کر سٹور کر لینا تاکہ لوگوں کی طلب (Demand) بڑھنے سے ان کی قیمتیں چڑھ جائیں اور پھر لوگوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے منہ مانگی قیمت لینا یہ لوگوں کو پریشان کرنا ہے اور اس طرح لوگوں کو پریشان کرنا شرعاً حرام ہے[۴۰۰] لیکن ایسا کرنے والوں کی سزا کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی[۴۰۱] لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذاتی اجتہاد سے ایسے لوگوں کو سخت ترین سزائیں دیں مثلاً ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ فلاں شخص نے ایک لاکھ درھم رقم خرچ کر کے اشیاء خوردنی کا ذخیرہ کر لیا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس کے پورے ذخیرہ کو آگ لگا دی جائے[۴۰۲] کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کا مقصود اس شخص کو اور اس جیسے دیگر لوگوں کو سبق سکھانا تھا تاکہ وہ آئندہ کے لیے اس سے باز آجائیں۔

یہاں درحقیقت آپ رضی اللہ عنہ نے "سد ذریعہ" کے طور پر ایسا کیا ہے ورنہ یوں املاک کو جلانا اور ضائع کرنا عام حالات میں شرعاً جائز نہیں چنانچہ ڈاکٹر محمد رواس لکھتے ہیں کہ "ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کی سزا بارے کوئی نص تو وارد نہیں لہٰذا قاضی ہی کوئی ایسی سزا تعزیراً مقرر کر سکتا ہے جو اسے اور دوسروں کو اس قبیح حرکت سے روک دینے والی ہو۔"[۴۰۳]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حالات وظروف کا اعتبار:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فیصلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ میں فہم وبصیرت اور حالات کا ادراک کرنے کی صلاحیت اللہ رب العزت کی طرف سے ایک خاص عطیہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہادی فیصلوں میں حالات وظروف کا بھی اعتبار کیا ہے۔ چند امثلہ حسب ذیل ہیں۔

i۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ابتدا میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات تنگی و مفلسی کے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فقر و فاقہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ کرنے سے منع کر دیا تھا بلکہ تین دن تک کھا لینے اور جو باقی بچے اس کے تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معاشی حالات کافی حد تک بہتر بنا دیے اور خوشحالی عطا کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اب تین دن سے زیادہ ایام تک بھی ذخیرہ کرنے کی اجازت دے دی۔[۴۰۴] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اجازت دینے سے

معلوم ہوا کہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں دیکھتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی شخص اپنی قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھے[۴۰۵] بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متاخر حکم کی اطلاع نہ ہوئی ہوگی یا اطلاع ہونے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے منسوخ حکم پر عمل کیا۔ چنانچہ اس بارے حافظ ابن حزم رحمہ اللہ (م ۴۵۶ھ) وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ اعلان دراصل اس سال کیا گیا جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا اور اس شورش کی وجہ سے دیہات کے لوگ مدینہ منورہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ان لوگوں کو تنگدستی نے گھیر لیا تھا لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا کہ لوگ قربانی کا گوشت تین دن سے زائد ذخیرہ نہ کریں بلکہ فاضل گوشت ان تنگدستوں میں تقسیم کر دیں"[۴۰۶]

دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں حکم تھے اور آپ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ پہلے حکمِ نبوی کا پس منظر کیا تھا۔ لہٰذا جب اسی طرح کے حالات دوبارہ پیدا ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے حالات و ظروف کا اعتبار کرتے ہوئے اسی پہلے حکم کے مطابق عمل کرنے کا اپنی رعایا سے مطالبہ کیا۔

ii۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قبل کے خلفاء راشدین شبہات کی بنا پر حد زنا جاری نہ کرنے میں بڑی وسعت سے کام لیتے تھے[۴۰۷] کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "ادرء وا الحدود بالشبهات"[۴۰۸] (شبہات کی بدولت حدود کی تنفیذ روک دو۔) ان کے مدنظر تھی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں شبہ کی بنا پر حد زنا کو ساقط کرنے سے گریز کیا لہٰذا جب آپ رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کی لونڈی سے ہم بستری کی ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے اس جرم پر پردہ پوشی کا مشورہ دیا ہے[۴۰۹] تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر اس شخص کو میرے پاس لایا جاتا تو میں سنگسار کر دیتا[۴۱۰] سوال یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہاں شبہ ملکیت کا اعتبار کرتے ہوئے حد ساقط کیوں نہ کی حالانکہ شوہر کو جب بیوی کی ملک بضع (ہم بستری کی حلت) حاصل ہو گئی تھی تو اس کی مملوکہ لونڈی کے ساتھ ہم بستری کی حلت کا شبہ جواز نکل سکتا تھا[۴۱۱] مگر پھر بھی آپ رضی اللہ عنہ حد لگانے کا اظہار کرتے ہیں تو اس کا جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول میں ہے جس میں آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے برہمی اظہار کیا جب انہوں نے اس

شخص کو اپنے جرم پر پردہ کا پوشی مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کیا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں کہ اب (لوگوں کے دینی) حالات کس قدر بدل چکے ہیں"۔[۴۱۲]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور استصحابِ حال:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض اجتہادات سے استصحاب اصول کی طرف بھی ہماری رہنمائی ہوتی ہے۔ چنانچہ مفقود الخبر شخص کی بیوی کب تک اپنے شوہر کا انتظار کرے گی اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف یہ ہے کہ وہ اس وقت تک انتظار کرے گی جب تک اس کا شوہر واپس نہ آجائے یا اس کی موت کی خبر نہ مل جائے۔ لہٰذا وہ عورت اس مدت کے دوران اس کی منکوحہ ہی رہے گی چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں "مفقود کی بیوی اس کی بیوی ہی رہے گی جب تک اس کے شوہر کی موت کی یقینی خبر نہ آجائے"۔[۴۱۳] اس اجتہاد میں دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "استصحاب" اصول کو مدنظر رکھا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی لکھتے ہیں کہ گمشدگی سے اس رشتہ زوجیت کے ٹوٹنے کا شک پیدا ہوتا ہے جو یقینی طور پر پہلے ثابت تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے فتویٰ دیا کہ شک کی بنا پر علیحدگی نہ ہوگی کیونکہ

"الیقین لا یزو ل بالشک "[۴۱۴، ۴۱۵]

"یقین شک کی بدولت زائل نہ ہوگا۔"

چاروں خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج پر ایک دفعہ دوبارہ نظر ڈال لی جائے تو ان تمام کا مجموعی طور پر اجتہادی منہج حسبِ ذیل سامنے آتا ہے۔

- i۔ قرآن مجید سے رہنمائی
- ii۔ حدیث وسنتِ نبوی سے استدلال واستنباط
- iii۔ شورائی طرز کا اجتہاد جو بالآخر "اجماع سکوتی" پر منتج ہوتا رہا۔
- iv۔ قیاس کا استعمال
- v۔ استحسان
- vi۔ استصحاب
- vii۔ مصالح مرسلہ (روح شریعت کا لحاظ)
- viii۔ سدّ ذریعہ
- ix۔ عرف وعادت
- x۔ سابقہ شرائع

xi۔ بدلتے ہوئے حالات وظروف کا لحاظ

xii۔ آیات واحادیث کے احکام کا موقع ومحل متعین کرنا

xiii۔ مباح امور پر بوقتِ ضرورت پابندی لگانا

xiv۔ واقعاتی مسائل بارے اجتہاد نہ کہ فرضی مسائل بارے دماغی وذہنی ریاضتیں

ان چودہ امور میں سے پہلے دس کو اصولیوں نے مآخذ اور مصادرِ شریعت کی حیثیت دی ہے، جبکہ ان کے نزدیک مزید ایک ماخذ شریعت ''اقوال صحابہ'' بھی ہیں لیکن خلفاء راشدین چونکہ خود صحابہ کرام میں جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہ ہیں لہٰذا ان کے اجتہادی منہج میں اس کا خلا یوں پورا ہوسکتا ہے کہ ہر بعد میں آنے والے خلیفہ راشد نے سابقہ خلفاء کی اجتہادی آراء سے علمی استفادہ کیا اور اگر اسی سابقہ فتوی واجتہاد ہی کو اختیار کرنے میں امت کی بھلائی وبہتری سمجھی تو اسے ہی اختیار کرلیا۔

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج بارے کی گئی تحقیق سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان مآخذ شریعت اور مصادرِ شریعت کے لحاظ کرنے اور اختیار کرنے میں ائمہ اربعہ وغیرہ فقہاء کرام کے مقابلہ میں خلفاء راشدین کو اسبقیت کا درجہ ومقام حاصل ہے'' والفضل للمتقدمین. ''(فضیلت سبقت کرجانے والوں کے لیے ہے۔) البتہ ان کی اصطلاحات ایجاد کرنے میں کسی حد تک بعد والوں کو تقدم حاصل ہے۔

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ان خلفاء نے بعض اسباب کی بنا پر کبھی اپنی اجتہادی آراء سے رجوع بھی کیا ہے۔ ان کے رجوعات کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

اجتہادی غلطی پر مطلع ہونے پر خلفاء کا رجوع:

یہ صرف رسول اللہ ﷺ ہی کی ہستی ہے جنہیں اجتہاد میں غلطی ہونے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متنبہ کردیا جاتا تھا اسی معنی میں آپ ﷺ معصوم عن الخطا ہیں۔ باقی امتی خواہ کوئی بھی ہو اس سے غلطی کا بہر حال امکان ہے۔ جیسا کہ ایک موقع پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کلالہ[۴۱۶] بارے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''اگر یہ صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر یہ خطا ہے تو یہ میری طرف سے ہے اور شیطان کی طرف سے ہے[۴۱۷] اسی طرح ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا جبکہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک قضیہ بارے اپنا فیصلہ سنایا تھا کہ

''واللہ مایدری عمر ان ھذا ھو الصواب او الخطا''[۴۱۸]

''اللہ کی قسم! عمر نہیں جانتا کہ یہ درست ہے یا غلط۔''

ان آثار سے معلوم ہوا کہ خلفاء راشدین خود کو معصوم عن الخطاء نہ سمجھتے تھے۔ لیکن ایک مومن

کے قطعاً یہ شایانِ شان نہیں ہے کہ اپنی غلطی خصوصاً اجتہادی غلطی کا علم ہونے کے باوجود اس پر اڑا رہے اور اپنی سابقہ رائے سے رجوع نہ کرے بلکہ ایک مومن کو اس بارے وسیع الظرف ہونا چاہیے۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرات خلفاء راشدین اس بارے بھی ہمارے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ خلفاء راشدین کے بارے یہ ثابت ہے کہ جب بھی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کی۔ جیسا کہ شہزاد اقبال شام لکھتے ہیں ”وہ (صحابہ و خلفاء راشدین) اس بات کا بطور خاص التزام کرتے تھے کہ انہیں کسی حدیث کے مل جانے پر یا کسی اور وجہ سے یہ احساس ہو جائے کہ ان کی رائے درست نہیں ہے تو اپنی رائے بدل لینے میں ذرا تامل نہ کرتے تھے بلکہ وہ اپنی رائے سے رجوع کر کے درست رائے اختیار کر لیتے تھے“[۴۱۹]

ذیل میں بالترتیب خلفاء راشدین کے رجوع کرنے کی چند امثلہ ذکر کی جاتی ہیں:۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اجتہادی رجوع:

قبیلہ اسد اور غطفان کا ایک وفد صلح کی درخواست لے کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو دو باتوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا کہا کہ یا تو وہ ایسی جنگ کے لیے تیار ہو جائیں جس کے نتیجے میں ان کی جلا وطنی عمل میں آئے گی یا پھر وہ رسوا کن صلح کے لیے تیار ہو جائیں۔ وفد نے کہا کہ پہلی بات تو ہم سمجھ گئے ہیں مگر دوسری بات (رسوا کن صلح) سے آپ رضی اللہ عنہ کی کیا مراد ہے؟ اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی چند ایک شرائط پیش کیں۔ لہٰذا ارشاد فرمایا:

> ”تمہارے ہتھیار تم سے رکھوا لیے جائیں گے اور تمہیں نہتا کر دیا جائے گا، تمہارے آدمی اونٹوں کو چرانے کا کام کریں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس کے تحت ہماری طرف سے تمہیں معافی مل جائے، نیز تم ہم سے چھینا ہوا مال واپس کر دو گے مگر ہم تم سے چھینا ہوا مال واپس نہ کریں گے اس کے ساتھ ساتھ تم اس بات کی گواہی دو گے کہ ہمارے مقتولین جنت میں اور تمہارے مقتولین جہنم میں ہیں نیز ہمارے مقتولین کا خون بہا ادا کرو گے جبکہ ہم تمہارے مقتولین کے لئے ایسا نہ کریں گے“۔

اس بات کا علم جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے مقتولین کا خون بہا کیسا؟ ہمارے مقتولین تو راہِ خدا میں شہید ہوئے اور شہداء کا کوئی خون بہا نہیں ہوتا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور پھر فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔[۴۲۰]

معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی رائے کی غلطی کا احساس ہوا تو اس سے رجوع کرنے میں لحہ بھر کی تاخیر سے کام نہ لیا بلکہ فوراً فاروقی رائے کی تصویب کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے رجوعات:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام خط جو اہل علم کے یہاں بہت شہرت و اہمیت رکھتا ہے اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں اس بات کی بھی تاکیدی انداز میں نصیحت کی ہے کہ جب بھی حق بات کا علم ہو جائے تو پہلی رائے کو چھوڑ کر حق کی طرف مراجعت کرنے میں کوئی مانع نہ ہونا چاہیے چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"لایمنعک قضاء قضیتهالیوم فراجعت فیه نفسک ، وهدیت فیه لرشدک ان ترجع الی الحق فان مراجعة الحق خیر من التمادی فی الباطل"[۴۲۱]

"وہ فیصلہ جو آپ نے آج کیا پھر آپ نے اس بارے دوبارہ غور وخوض کیا اور نئی رائے تک پہنچے تو گزشتہ فیصلہ حق کی طرف پلٹنے سے مانع نہ بننے پائے کیونکہ حق کی جانب مراجعت باطل پر اڑے رہنے سے کہیں بہتر ہے۔"

چنانچہ جس بات کی نصیحت آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو کی تھی اس سے آپ رضی اللہ عنہ خود کیوں کر غافل ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کے ضمن میں آپ رضی اللہ عنہ کے رجوعات کی ایک دو نہیں بلکہ متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں، چند کا ذکر یقیناً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا کہ میرے شوہر کی وفات کے بعد عدت کے ایام پورے ہونے سے قبل میرے ہاں بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ زیادہ مدت والی عدت پوری کرو (یعنی ابعد الاجلین) وہ عورت حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزری تو انہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ سنایا۔ اس پر

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ اُبی کہتے ہیں کہ تم حلال ہو گئی ہو۔ وہ عورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس دوبارہ گئی اور حضرت اُبی کا فیصلہ سنایا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کو بلایا اور کہا کہ یہ عورت کیا کہتی ہے؟ اس پر حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے اس بارے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا اور پھر اُبی رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (الطلاق ۶۵:۴)

''اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے۔''

چنانچہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے کہا کہ جیسے ابی رضی اللہ عنہ نے کہا اسی کے مطابق کرو۔[۴۲۲] گویا پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے ایسی عورت بارے ابعد الاجلین کی تھی مگر پھر آپ رضی اللہ عنہ نے آیت قرآنی سن کر رجوع کر لیا۔

ii۔ ابتدا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انگلیوں کی دیت بارے یہ فیصلہ کیا تھا کہ انگوٹھا کاٹنے پر پندرہ اونٹ، انگشتِ شہادت کاٹنے پر دس اونٹ، درمیانی انگلی کاٹنے پر دس اونٹ اور اس کے برابر والی انگلی کاٹنے پر نو اونٹ اور چھنگلی انگلی کاٹنے پر چھ اونٹ دیے جائیں گے مگر کچھ مدت کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آلِ حزم کے پاس موجود رسول اللہ ﷺ کے ایک خط میں یہ بات لکھی ہوئی ملی کہ سب انگلیوں کی دیت برابر ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے اختیار کر لیا اور پھر آپ رضی اللہ عنہ اسی کے مطابق فیصلہ دیا کرتے تھے۔[۴۲۳]

iii۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ابتدا میں یہ خیال تھا کہ وہ عورت جسے طوافِ وداع سے پہلے حیض (Menses) آجائے تو اسے ایامِ حیض ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے اور جب اس کے ایام ختم ہو جائیں تو پھر طوافِ وداع کرے اور پھر چاہے تو روانہ ہو[۴۲۴] مگر بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وہ حدیث پہنچی جس میں ایسی عورت کو طوافِ وداع کے بغیر بھی روانہ ہو جانے کی رخصت ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے حدیث سننے پر اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیا۔[۴۲۵]

iv۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس (مجنونہ) دیوانی عورت لائی گئی جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کے بعد اسے رجم کرنے کا کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ادھر سے گزر ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے اس عورت کو واپس لے جانے کا کہا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ امیر المومنین! کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ تین افراد سے مواخذہ نہیں ہے۔ ایک مجنون سے جب تک وہ تندرست نہ ہو جائے، دوسرا سونے والے سے جب تک نیند سے

بیدار نہ ہو جائے اور تیسرا بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر اس عورت پر حد کیوں کر لگائی جائے گی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو چھوڑ دینے کا حکم دیا۔[۴۲۶]

ان واقعات سے جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حدیث مل جانے پر رجوع کر لینے کا علم ہوتا ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اگر کبھی نص نہ ہوتی تو بھی اجتہاد کرتے ہوئے ذاتی رائے کا اظہار کر لیتے تھے۔ مگر جب اس اجتہاد کے برعکس حدیث مل جاتی تو فوراً سابقہ رائے سے رجوع کر لیتے نیز معلوم ہوا کہ انسان خواہ کتنا بھی بڑا عالم ہو وہ بہرصورت درجہ کمال تک پہنچنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یقیناً قرآن و حدیث کے بہت بڑے عالم تھے مگر بعض احادیث کا علم آپ رضی اللہ عنہ کو بھی نہ تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان کسی چیز کو بھول جائے اور یاد دلانے پر وہ چیز یاد آجائے جیسے موخر الذکر واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک حدیث یاد دلائی تو آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں بھی وہ تازہ ہو گئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے رجوع کی ایک اور اہم مثال ملاحظہ ہو:

۷۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نزدیک کلالہ وہ ہے کہ جس کا نہ باپ زندہ ہو اور نہ اس کی اولاد ہو[۴۲۷] مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کلالہ وہ ہے جو بے اولاد ہو مگر جب آپ رضی اللہ عنہ پر مسجد میں قاتلانہ حملہ کیا گیا تو اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے رجوع کرتے ہوئے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہی اختیار کر لیا اور اس موقع پر فرمایا: ''مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں اس معاملہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کروں لہٰذا کلالہ وہ ہے جس کا نہ باپ زندہ ہو اور نہ اولاد ہو''۔[۴۲۸]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رجوعات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ہمیشہ حق بات کے متلاشی رہتے تھے لہٰذا جب بھی حق کی طرف رہنمائی ہو جاتی تو اسے فوراً اختیار کر لیتے تھے۔ ابتدا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ محرم ایسے شکار کا گوشت کھا سکتا ہے جو غیر محرم نے کیا ہو قطع نظر اس بات کے کہ وہ محرم کے لیے شکار کیا گیا ہو یا کسی اور کے لیے[۴۲۹] مگر بعد میں ان کی رائے تبدیل ہو گئی اور ان کا نقطہ نظر یہی بن گیا کہ اگر شکار محرم کو پیش کرنے کی نیت سے نہ کیا گیا تو اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر اسی کے لیے شکار کیا گیا ہو تو محرم کو پھر اسے نہ کھانا چاہیے۔ جس طرح کہ بسر بن سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں یہی معمول تھا کہ جب آپ رضی اللہ عنہ حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھتے تو راستے میں جن منازل پر قیام کرتے وہاں ان کے لیے جنگلی جانوروں کا شکار کیا جاتا اور وہ ان کا گوشت کھالیا کرتے تھے مگر بعد میں حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان سے اس موضوع پر گفتگو کی تو آپ رضی اللہ عنہ کی رائے بدل گئی۔[۴۳۰]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رجوعات:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کا بیشتر حصہ بحیثیت قاضی گزرا ہے آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی بحیثیت قاضی دنیا بھر کے قاضیوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔آپ رضی اللہ عنہ کی طرف سے قاضیوں اور مجتہدین کے لیے ایک اہم نصیحت یہ ہے کہ ''جب قاضی کوئی فیصلہ کرے اور اس سے غلطی ہو جائے اور پھر اسے اس کا علم ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا سابقہ فیصلہ واپس لے لے''[۴۳۱]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ بذاتِ خود بھی اسی اصول پر کاربند رہے یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے اپنی سابقہ رائے میں غلطی کا احساس ہوا اور درست رائے کا علم ہوا تو بلا تامل اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیا اور اس میں کوئی اپنی بے عزتی اور توہین محسوس نہ کی۔آپ رضی اللہ عنہ کے رجوعات کی چند ایک امثلہ حسب ذیل ہیں:۔

i۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب ایک شخص کے عملِ لواطت کا قضیہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تک بذریعہ خط پہنچایا اور اس کی سزا بارے استفسار کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے معمول کے مطابق اس بارے مشورہ کرنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر فرمایا:

> ''یہ ایسا گناہ ہے کہ پچھلی امتوں میں سے صرف ایک امت اس کی مرتکب ہوئی تھی اور اللہ نے اسے جو سزا (عبرتناک) دی تھی وہ سب کو معلوم ہے اس لیے میری رائے تو یہ ہے کہ اس شخص کو آگ میں ڈال کر جلا دیا جائے''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس رائے پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صاد کیا لہٰذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو یہی سزا لکھ بھیجی تو انھوں نے اس آدمی کو پکڑ کر جلا دیا۔[۴۳۲] لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی اس رائے بارے اطمینان نہ ہوا تو اس سے رجوع کر لیا اور ایسے شخص کے لیے رجم کی سزا تجویز کی، خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔[۴۳۳]

ii۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مرتدین کو آگ میں جلا دیا لیکن جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ تم اللہ کے عذاب کے ساتھ کسی کو سزا نہ دو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابن عباس رضی اللہ عنہ سچ ہی کہتے ہیں۔[۴۳۴] گویا آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے سابقہ موقف سے رجوع فرمالیا۔

iii۔ ایک شخص ایسی دو لونڈیوں کا مالک ہو جو آپس میں سگی بہنیں ہوں تو کیا مالک ان دونوں سے ہم بستری کر سکتا ہے یا نہیں؟ ابتدا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بارے فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کی ایک آیت ان دونوں سے وطی کو حلال قرار دیتی ہے اور دوسری آیت حرام ٹھہراتی ہے لہٰذا میں نہ اس کا حکم دوں گا اور نہ اس سے روکوں گا، نہ حلال ٹھہراؤں گا اور نہ ہی حرام قرار دوں گا[۴۳۵] مگر بعد میں آپ رضی اللہ عنہ نے احتیاطاً اپنے اس قول سے رجوع کر کے تحریم کا قول ہی اختیار کر لیا تھا چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کے بارے مروی ہے کہ ایک شخص نے آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اس کے پاس دو لونڈیاں بہنیں ہیں، ایک سے وہ ہم بستری کرتا اور اب دوسری سے کرنا چاہتا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس وقت تک نہیں جب تک پہلی کو اپنی ملکیت سے نکال نہ دو۔''[۴۳۶]

خلاصہ بحث یہ ہے کہ خلفاء کرام سے کئی مواقع پر اپنی سابقہ رائے سے رجوع تاریخی طور پر ثابت ہے۔گزشتہ صفحات میں مذکورہ مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین کے رجوعات کی حسب ذیل وجوہات تھیں:۔

(i) خلفاء راشدین کاتبین وحی بھی تھے اور قرآن کے حافظ بھی مگر کبھی انسان کے ذہن میں آیت کا استحضار نہیں ہوتا لہٰذا اجتہادی رائے مخالفِ قرآن ہو سکتی ہے، خلفاء راشدین کے ساتھ ایسا نادر ہی ہوا ہے مگر جب آیتِ قرآنی سامنے آئی تو فوراً سابقہ رائے سے رجوع کر لیا۔

(ii) خلفاء راشدین کے سامنے بسا اوقات زیر بحث مسئلہ بارے حدیث نہ تھی مگر انہوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہوئے حکم شرعی حاصل کرنے کی ممکن حد تک کوشش کی مگر جب اپنے اجتہاد کی حدیث سے مخالفت کا علم ہوا تو فوراً رجوع کر لیا۔کبھی ایسا ہوا کہ حدیث یاد نہ رہی تھی جب یاد کرایا گیا تو ذہن میں تازہ ہونے پر فوراً رجوع کر لیا۔

(iii) کبھی اپنی رائے کی مخالفت میں واضح طور تو پر نص موجود نہ تھی مگر اپنی رائے روح شریعت کے منافی و مخالف نظر آئی تو رجوع کرنے میں دیر نہ کی جیسے سیدنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شہدا کا خون بہا لینے کا فیصلہ کیا تھا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مداخلت سے رجوع کر لیا تھا۔

فصل سوم:

خلفاء راشدین کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کی شرعی حیثیت

خلفاء راشدین کے اجتہادات کی شرعی حیثیت:

محققین علماء کرام نے اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم کی نو ممکنہ قسمیں کی ہیں جن میں سے چھ بالاتفاق حجت ہیں۔ کیونکہ انجام کار کے اعتبار سے بالآخر وہ حدیث وسنت کا درجہ اختیار کر جاتی ہیں اور دو بالاتفاق حجت نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے ایک وہ ہے جس کا مخالفت سنت ہونا ثابت ہے۔ اور دوسری وہ ہے جو حقیقت میں قولِ صحابی رہتا ہی نہیں کیونکہ اس سے ان کا رجوع ثابت ہے۔ مگر ایک قسم ایسی ہے جو علماء امت میں مختلف فیہ ہے۔ اور وہ ہے صحابی کا وہ قول جو اس کی ذاتی رائے اور اجتہاد پر مبنی ہو اور وہ اپنے اس قول میں اکیلا ہو یعنی اس پر اجماع واقع نہ ہوا ہو تو علماء کے مابین خلفاء راشدین سمیت جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایسے اقوال و اجتہادات کی حجیت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے[۴۳۷] اس بارے میں دو نقطہ نظر ہیں ذیل میں دونوں گروہوں کے دلائل ذکر کیے جاتے ہیں۔ خلفاء راشدین اور جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایسے اقوال و اجتہادات کی حجیت اور عدم حجیت کے بارے میں دلائل تقریباً یکساں ہیں تاہم یہاں خلفاء راشدین کے حوالے سے خصوصی طور پر بحث کی جائے گی۔

حجیت کے قائلین کے دلائل:

خلفاء راشدین کی خالص اجتہادی آراء و افکار کی حجیت کے قائلین کے دلائل دو طرح کے ہیں۔

i۔ عمومی دلائل   ii۔ خصوصی دلائل

عمومی دلائل کی تفصیل:

ان دلائل میں چند آیات ہیں جن کا مصداق اول یقیناً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ٹھہرتے ہیں وہ آیات اور ان سے استدلال حسبِ ذیل ہے۔

i۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ﴾[۴۳۸]

''اے اہل ایمان! خدا سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ بعض سلف کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہاں صادقین سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں بلکہ وہ تو صادقین کے امام ہیں جن کے ساتھ مل جانے کا (افکار و نظریات کے اعتبار سے) اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔[۴۳۹]

ii۔ اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ﴾[۴۴۰]

''مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کا کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو۔''

''خیر امت'' کا افضل ترین طبقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں لہٰذا جب وہ نیکی کا حکم کریں تو اسے ماننا واجب ہوگا۔[۴۴۱]

iii۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا﴾[۴۴۲]

''اور اسی طرح ہم نے تم کو امت متعدل بنایا ہے۔''

جب اس امت کو عادل قرار دیا جا رہا ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو عدالتِ مطلقہ کے درجے پر فائز ہیں لہٰذا ان کی اطاعت واجب ہے۔ چنانچہ امام شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وان ھم وسط ای عدول باطلاق، واذا کان کذالک فقولھم معتبر، وعملھم مقتدیٰ بہ، وھکذا سائر الآیات التی جاءت بمدحھم''[۴۴۳]

''جب وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مطلق طور پر عادل ہیں تو ان کا قول بھی معتبر ہے اور ان کا عمل بھی قابل اقتدا۔ اسی طرح وہ آیات جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح سرائی کرتی ہیں ان سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔''

iv۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنۡ یَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ہُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴾[۴۴۴]

''اور جس نے خدا کی ہدایت کی رسی) کو پکڑ لیا وہ سیدھے رستے لگ گیا۔''

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یقیناً اللہ کا دامن مضبوطی سے تھاما ہوا تھا لہٰذا وہ راہِ راست پر تھے اس لیے ان کی اتباع واجب ہے۔[۴۴۵]

۷۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾[۴۴۶]

''اوران میں سے ہم نے پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے جب وہ صبر کرتے۔''

اس آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ موسیٰ کو صبر واستقامت اختیار کرنے کے نتیجہ میں درجہ امامت پر فائز کرنے کا ذکر کیا ہے تو اصحاب محمد تو اس رتبہ امامت کے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ ان سے زیادہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنے کی مثال پہلی امم سے بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔[۴۴۷]

عمومی قسم کے دلائل میں چند احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو درج ذیل ہیں۔

i۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک حدیث کی نسبت کی جاتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ستاروں سے تشبیہ دیتے ہوئے ان میں سے کسی کی بھی اقتدا کو معتبر قرار دیا ہے اور وہ ہے زبان زد عام حدیث

''اصحابی کا لنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم''[۴۴۸]

''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کسی کی بھی اقتدا کرو گے تو ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔''

ii۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ایک حدیث میں ہے:

''ان مثل اصحابی فی امتی کمثل الملح فی الطعام ، لایصلح الطعام الا بالملح ''[۴۴۹]

''میرے صحابہ (کے مقام ومرتبہ) کی امت میں مثال ایسے ہے جیسے کھانے میں نمک کی۔ کھانا (سالن) نمک کے بغیر کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔''

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ جس طرح کھانے کی اصلاح وبہتری (Taste) نمک سے ہوتی ہے اسی طرح اس امت کے دین کی اصلاح جماعت صحابہ سے وابستہ ہے۔ اگر اس بات کو جائز اور ممکن قرار دیا جائے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی خطا پر مبنی فتویٰ

دے اوران میں سے کوئی بھی اس کی تصحیح نہ کرے مگر بعد والوں کواس مسئلہ میں حق معلوم ہو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بعد والے نمک قرار پائیں گے حالانکہ یہ محال بھی ہے اور حدیث کے خلاف بھی۔[۴۵۰]

iii۔ امام حمیدی رحمہ اللہ نے ایک حدیث نقل کی ہے جسے امام ابن قیم رحمہ اللہ اور امام شاطبی رحمہ اللہ نے الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔تاہم یہاں امام شاطبی کے ذکر کردہ الفاظ لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان اللہ اختار اصحابی علی جمیع العالمین سوی النبیین والمرسلین واختار لی منہم اربعة : ابابکر و عمر و عثمان وعلیاًفجعلہم خیر أصحابی و فی أصحابی کلہم خیر"[۴۵۱]

"بلاشبہ اللہ نے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو انبیاء ورسل کے بعد تمام انسانیت میں سے منتخب کیا ہے اوران صحابہ میں سے بالخصوص چار کا میرے لیے انتخاب کیا ہے یعنی ابوبکر وعمر،عثمان و علی اورانھیں میرے صحابہ میں سے سب سے بلند تر بنایا ہے جبکہ میرے تمام صحابہ میں خیر ہی خیر ہے۔"

اوراب حجیت کے قائلین کے خصوصی دلائل ملاحظہ ہوں۔

خصوصی دلائل:

i۔ خلفاء راشدین کے اقوال و اجتہادات کی حجیت کے حق میں سب سے قوی ترین دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مشہور حدیث ہے کہ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم (صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت) میں کھڑے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اتنا موثر اور دلنشیں خطبہ دیا کہ اس سے دل خوفزدہ ہو گئے اور آنکھیں (خوف کے مارے) بہہ پڑیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خطبہ دیا ہے گویا کہ الوداعی ہو،آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کوئی خاص وصیت فرمائیں۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"علیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعة وان عبداحبشیا وسترون من بعدی اختلافاً شدیداً ، فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ وایاکم والامور المحدثات فان کل بدعة ضلالة"[۴۵۲]

''اللہ سے تقویٰ اور سمع و طاعت کو اختیار کرو خواہ ایک حبشی غلام ہی (تمھارا حاکم) کیوں نہ ہو۔ عنقریب تم میرے بعد شدید قسم کا اختلاف دیکھو گے لہٰذا تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت (طریقہ کار) کو اختیار کرنا، اسے مضبوطی سے تھام لینا اور دین میں نئے کام ایجاد کرنے سے احتراز کرنا کیونکہ ہر بدعت (دین میں نیا کام) گمراہی ہے۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف اپنی اور اپنے خلفاء کی سنت کی اتباع کا حکم دیا ہے بلکہ آپ ﷺ نے اس اتباع کے حکم میں مبالغہ سے کام لیتے ہوئے ''عضوا علیها بالنواجذ'' (اسے مضبوطی سے تھام لینا۔) کے الفاظ استعمال کیے اور یہ الفاظ ان کے بعض، اکثر اور کل اجتہادات کو ہی شامل ہیں۔ یہ بات بھی ہمیں معلوم ہے کہ ایسا نہیں کہ وہ تمام ایک ہی وقت میں خلفاء رہے ہوں لہٰذا انہوں نے اپنے اپنے ادوار میں جو کام (نیا) جاری کیا تو وہ ''سنة الخلفاء الراشدین'' سے ہی ہے۔[۴۵۳]

امام شاطبی خلفاء راشدین کے اجتہادی فیصلوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان خلفاء نے رسول اللہ ﷺ کے بعد جو بھی نیا کام جاری کیا وہ سنت ہی ہے نہ کہ بدعت، اگرچہ اس بارے میں قرآن وسنت میں خصوصی نص ہمیں معلوم نہ بھی ہو، اس بات کی دلیل حدیث عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہے جس میں آپ ﷺ نے خلفاء راشدین کی سنت کو اپنی سنت کے ساتھ ملا دیا ہے لہٰذا ان خلفاء راشدین کی سنت کی اتباع دراصل رسول اللہ ﷺ کی سنت ہی کی اتباع ہے۔ اس لیے لامحالہ خلفاء کے نئے جاری کردہ کام بدعت نہیں کیونکہ بدعت کی سنتِ نبوی سے کیا نسبت اور تعلق ہو سکتا ہے۔ ان خلفاء راشدین کی اولیات واجتہادات یا تو اتباع سنتِ نبوی ہی ہیں یا سنت نبوی سے ہی مفہوم و مستنبط اور ماخوذ ہیں۔[۴۵۴]

شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ (م۱۸۳۱ء) لکھتے ہیں کہ سنتِ خلفاء بدعات میں شامل نہیں بلکہ ملحق بالسنہ ہیں[۴۵۵] حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ (م۱۹۸۵ء) لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں اپنی سنت کے ساتھ سنتِ خلفاء کو ملا کر دونوں کی اتباع کرنے کا حکم دیا ہے۔ نیز اسی حدیث کے آخر میں بدعات سے بچنے کا حکم دیا ہے گویا اسی حدیث میں یہ اشارہ ہے کہ سنتِ خلفاء بدعات میں شامل نہیں۔[۴۵۶]

مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین کے اجتہادات جس قدر قابل اتباع ہونے کی شان رکھتے ہیں اس قدر دیگر علماء وفقہاء کے اجتہادات نہیں۔ ان خلفاء نے جو بھی نیا

کام جاری کیا اگر چہ اجتہاد ہے مگر خلفاء کا اجتہاد جو حیثیت رکھتا ہے وہ ائمہ مجتہدین کا اجتہاد بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ خلفاء کی اولیات کو اصطلاحی طور پر بدعت کے معنی میں لینا انتہا درجے کی بے ادبی ہے۔ یہ تو انہیں ان کے مقام و مرتبہ سے گرانا، وحی سے تجاہل عارفانہ سے کام لینا بلکہ دین کی اساس کو گرانا اور سید المرسلین نبی کریم ﷺ کی روح کو اذیت پہنچانا ہے[۴۵۷]۔

ڈاکٹر رویعی لکھتے ہیں کہ اس حدیث عرباض رضی اللہ عنہ میں امر کا صیغہ وارد ہوا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان خلفاء کرام نے جو بھی نیا کام یا طریقہ جاری کیا تو اس میں ان کی اتباع کرنا واجب ہے۔[۴۵۸] ڈاکٹر عزت علی عطیہ بھی اس حدیث کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

" فسنة الخلفاء الراشدين او احد هم مامور با تباعها باطلاق و كل ما سنوه هوفى اطار السنة النبوية الشريفة "[۴۵۹]

"لہٰذا چاروں خلفاء راشدین یا ان میں سے کسی بھی ایک کی سنت کو مطلق طور پر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور انھوں نے جو بھی نیا کام (اولیات) جاری کیا وہ دراصل سنت نبوی کے دائرہ میں ہی آتا ہے۔"

حدیث عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ نقل کر کے مولانا عبدالرحمان بھی لکھتے ہیں:

" فهذا الحديث نص فى وجوب التزام سنة الخلفاء الراشدين بعد رسول الله كنظام الولاية و الخلافة و تدوين الدواوين وسياسة الامة ونظام الحرب و شروط الصلح و جمع المصحف وتوحيد القراءة ونحو هذا مماسنّه الخلفاء الراشدون"[۴۶۰]

"پس یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین کی سنت کو لازماً اختیار کرنے کے بارے میں نص کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ (خلفاء راشدین کی اولیات میں) ولایت کا نظام، خلافت (خلیفہ بنانے کا طریقہ کار) دواوین (رجسٹرز) کی تدوین، امت کے امور کی نگہبانی و نگرانی۔ جنگی نظام، صلح کی شرائط، جمع قرآن اور لوگوں کو ایک قراءت (مراد مصحف) پر جمع کرنا وغیرہ وہ امور ہیں جنھیں خلفاء راشدین نے جاری کیا۔"

ii۔ خلفاء راشدین میں سے خصوصاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اقتدوا بالذين من بعدى ابى بكر و عمر "[۴۶۱]

''میرے بعد ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتدا و اطاعت کرنا۔''

iii۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

" ان الله جعل الحق علی لسان عمر و قلبه"[۴۶۲]

''بلاشبہ اللہ نے عمر کی زبان اور دل پر حق بات جاری کر دی ہے۔''

iv۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں خصوصاً رسول اللہ ﷺ کے کئی ایک ایسے فرامین ہیں جن سے ان کی اصابتِ رائے کا پتہ چلتا ہے مثلاً ایک دفعہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" لقد کا ن فیماقبلکم من الامم محد ثون فان یکن فی امتی احد فانه عمر"[۴۶۳]

''یقیناً تم سے پہلی امتوں میں کچھ لوگوں کو (اللہ کی طرف سے) الہام ہوتا تھا۔ اگر میری امت میں کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہیں۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعد کے کسی مجتہد کا اختلاف ہو اور حق بعد والے مجتہد کے ساتھ ہو کیونکہ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ اس مسئلہ میں وہ مجتہد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ محدث و ملہم ہے۔[۴۶۴]

v۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

"لو لم ا بعث فیکم لبعث عمر"[۴۶۵]

''اگر میں (محمد ﷺ بفرض محال) مبعوث نہ کیا جاتا تو عمر رضی اللہ عنہ مبعوث کیے جاتے۔''

ایک اور روایت میں ہے:

" لو کان بعدی نبی لکان عمر"[۴۶۶]

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ لازماً عمر ہوتے۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ بعد کا کوئی مجتہد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں کسی شرعی مسئلہ میں اصابتِ رائے کا حامل ہونے کی وجہ سے آپ سے زیادہ سعادت مند ٹھہرے۔[۴۶۷]

خلفاء راشدین کے اجتہادی اقوال و آراء کی حجیت کے قائلین کے عمومی و خصوصی دلائل ذکر کرنے کے بعد اب ان کا تفصیلاً جائزہ لیا جاتا ہے۔

قائلین کے دلائل کا جائزہ:

ذیل میں قائلین کے دلائل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

i۔ جن آیات سے قائلین نے استدلال کیا ہے وہ عمومی قسم کی ہیں جن سے محض جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت وفضیلت عیاں ہوتی ہے۔[۴۶۸]

ii۔ قائلین نے جو احادیث بطور دلائل ذکر کی ہیں ان میں سے بعض عمومی قسم کی احادیث ہیں جن میں سے بعض تو سنداً ضعیف بھی ہیں لیکن اگر ان کی سندی حیثیت سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفاء راشدین کی علمی حیثیت واضح ہوتی ہے نیز ان سے بوقتِ ضرورت علمی رہنمائی لینے کا اشارہ ملتا ہے۔ لیکن ان احادیث سے ان کا ہر قول وفعل یا اجتہاد شرعاً واجب الاتباع نہیں ٹھہرتا۔[۴۶۹]

iii۔ قائلین کی پیش کردہ بعض احادیث تو موضوع بھی ہیں جیسے۔ ''اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اهتدیتم''[۴۷۰] (میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں تم ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔) اور ''لو کان بعدی نبی لکان عمر رضی اللہ عنہ''[۴۷۱] (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔) اور موضوع احادیث کو بطور شواہد بھی پیش کرنا جائز نہیں ہے۔[۴۷۲] اور اب خصوصی دلائل میں سے جو سنداً صحیح ہیں ان کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

قائلین کے خلفاء کے بارے میں خصوصی دلائل کا جائزہ:

i۔ رسول اللہ ﷺ نے اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کا حکم دیا ہے تو اسی طرح کی احادیث بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی ملتی ہیں مثلاً آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا ''جس چیز پر وہ راضی ہوئے میں بھی اپنی امت کے لیے اسی چیز پر راضی ہوا''۔[۴۷۳] نیز رسول اللہ ﷺ کے کسی کو مقتدا قرار دینے سے اس کے اجتہادات کا قطعی دلیل اور حجت بننا لازم نہیں آتا۔[۴۷۴]

ii۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اللہ کی طرف سے ملہم ومحدث ہونے نیز ان کی زبان وقلب پر حق بات کے جاری ہونے کی رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے جس سے ان کی اصابتِ رائے کا اشارہ تو ملتا ہے۔ مگر محض اس طرح کی احادیث سے ان کے اجتہادات کی حجیت ثابت کرنا سخت مشکل ہے۔

iii۔ حدیث عرباض رضی اللہ عنہ جس کے اولین مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے انہوں نے اس حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے خلفاء راشدین کے اجتہادات کو قرآن وحدیث ایسی قطعاً حیثیت نہیں

دی بلکہ متعدد واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بسا اوقات خلفاء کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے۔ امام آمدی رحمہ اللہ نے تو لکھا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو گیا تھا کہ ایک مجتہد صحابی کا دوسرے مجتہد صحابی سے اختلافِ رائے جائز ہے[۴۷۵] لہٰذا اگر خلفاء راشدین کے اجتہادات قرآن وحدیث کی طرح حجت ہوتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم خلفاء کرام کی بعض مسائل میں مخالفت نہ کرتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خلفاء راشدین کی مخالفت رائے کی چند امثلہ ملاحظہ ہوں۔

i۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا موقف یہ تھا کہ میت کی دادی اپنے بیٹے (یعنی میت کے باپ) کی موجودگی میں وارث نہ ہوگی مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اختلاف تھا۔[۴۷۶]

ii۔ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے استفسار کیا کہ ایک متوفی نے ایک بیٹی اور ایک حقیقی بہن چھوڑی ہے تو اس کی میراث کیسے تقسیم ہوگی؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بیٹی کو نصف ملے گا اور بہن کو کچھ نہ ملے گا اور بقیہ عصبہ کا ہوگا۔ اس شخص نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اس سے مختلف فیصلہ کیا تھا کیونکہ انہوں نے تو نصف بہن کو اور نصف بیٹی کو دیا تھا۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ[۴۷۷] ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی لکھتے ہیں گویا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ پسند نہ تھا۔[۴۷۸]

iii۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک قضیہ پیش ہوا کہ ایک عورت فوت ہو گئی ہے جس نے اپنے پیچھے ورثاء میں اپنا شوہر، بہن اور ماں کو چھوڑا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تقسیم ترکہ کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ ان کے حصوں کے مطابق ان پر مال تقسیم کر دیا جائے یعنی جس طرح متوفی مقروض کا ترکہ تمام قرض خواہوں کا قرض ادا کرنے کی لئے کافی نہ ہو تو اس بات پر اجماع ہے کہ ہر قرض خواہ کو اس کے قرض کی نسبت سے ادائیگی کی جائے گی۔ گویا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں اس مسئلہ کو قرض پر قیاس کیا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول کیا اور اس پر عمل کیا لیکن اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر کوئی مجھ سے مباہلہ کرنا چاہے تو میں تیار ہوں کہ مسائلِ وراثت میں عول نہیں ہے۔[۴۷۹]

جس طرح بسا اوقات دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے خلفاء راشدین سے اجتہادی مسائل میں

اختلاف کیا ہے اسی طرح کئی ایک مسائل میں خلفاء راشدین کے مابین اختلاف رائے ہوا ہے۔ لہٰذا اگر ان کے اجتہادات کو حجت تسلیم کیا جائے تو پھر تناقض لازم آئے گا کیونکہ ظاہر ہے بیک وقت کسی مسئلہ میں دو مختلف آراء پر تو عمل نہ کیا جا سکے گا بلکہ کسی ایک کی رائے کو ہی اختیار کرنا ہوگا اور جب ایک کی رائے کو لیا جائے اور دوسرے کی رائے کو چھوڑ دیا جائے تو بھی حدیث عرباض رضی اللہ عنہ پر صحیح طور پر تو عمل نہ ہو سکا۔ خلفاء راشدین کے باہم اختلاف کی چند امثلہ ملاحظہ ہوں۔

i۔ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی جنہوں نے خلفاء اربعہ کی فقہی آراء کو جمع کرنے میں زندگی کا ایک حصہ کھپا دیا، لکھتے ہیں: ''میں نے دونوں جلیل القدر صحابی (ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ) کی فقہی آراء کا بنظر عمیق مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ماسوائے چند مسائل کے بقیہ تمام مسائل میں ان دونوں کے درمیان اتفاق رائے ہے''۔ اور پھر آپ نے دونوں خلفاء کے مابین اکیس اختلافی مسائل کو بالتفصیل ذکر کیا ہے۔[۴۸۰]

ii۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سرکاری زمینیں آبادکاری کے لیے کسی کو دیتے تو تین سال کی مدت متعین کرتے کہ اگر ان تین سالوں میں وہ زمین کی آبادکاری اہتمام نہ کر سکا تو زمین اس سے واپس لے لی جائے گی۔ جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسی کوئی پابندی عائد نہ کرتے تھے۔[۴۸۱]

iii۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ ام ولد (وہ لونڈی جو اپنے آقا کا بچہ جن دے) کی بیع جائز نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے بھی ابتدا میں یہی تھی مگر پھر ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میری اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے امِ ولد کو فروخت نہ کرنے کے حق میں یکساں تھی مگر اب میری رائے بدل گئی ہے لہٰذا اب میرے نزدیک انہیں فروخت کیا جا سکتا ہے''[۴۸۲]

iv۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نزدیک حج تمتع کی رخصت محض اصحابِ پیغمبر کو تھی مگر بعد والوں کے لیے حج افراد ہی ہے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ حج تمتع اور قران سے منع کیا کرتے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ عثمانی رائے کے سخت مخالف تھے اور ان کے یہاں یہ رخصت صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص نہیں۔[۴۸۳]

v۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض وجوہ کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کے بعد شراب خوروں کو حد خمر اَسی کوڑے لگائی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عادی شراب خور اور غیر عادی میں فرق کیا کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ عادی کو تو اَسی کوڑے اور غیر عادی کو چالیس لگاتے تھے۔[۴۸۴]

خلفاء راشدین کے باہم اختلافِ آراء کی مذکورہ بالا امثلہ کے ذکر کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا

ہے کہ اگر خلفاء راشدین کے اجتہادات کو حجت مانا جائے تو پھر ان کے اختلاف کی صورت میں کسی ایک کی رائے کو قبول کرنے اور دوسرے کی رائے کو ترک کرنے سے حدیثِ عرباض رضی اللہ عنہ پر مکمل طور پر تو عمل نہ ہو سکے گا۔

حدیث عرباض رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بالآخر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسی سنتِ خلفاء ہے جس کی اتباع کرنے کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔ حدیث میں موجود سنتِ خلفاء کے مفہوم کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

سنت الخلفاء سے مراد:

ایک رائے یہ ہے کہ سنت خلفاء سے مراد ان کے تمام اجتہادی فیصلے ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ اور امام شاطبی رحمہ اللہ وغیرہ کی تحریرات سے یہی مترشح ہوتا ہے۔[۴۸۵] جبکہ بعض دیگر علماء کا خیال ہے کہ اس سے مراد ان کا مجموعی اجتہادی منہج ہے کہ جس پر چل کر انہوں نے پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کیا اور نئے حالات میں اسلامی تعلیمات کی تطبیق و انطباق کی صورتیں متعین کر کے رہتی دنیا تک کے خلفاء، علماء و فقہاء، مجتہدین اور عوام الناس کے لیے ایک راستہ و منہج پیش کیا۔ چنانچہ امام سرخسی رحمہ اللہ ''بایھم اقتدیتم اھتدیتم ''(تم ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔) کا معنی و مفہوم ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" المراد الاقتداء بھم فی الجری علی طریقھم فی طلب الصواب فی الاحکام لا تقلید ھم"[۴۸۶]

''ان (خلفاء راشدین) کی اقتدا کا مطلب ہے احکام شریعت کا صحیح راستہ تلاش کرتے ہوئے انہی کے راستہ پر چلنا نہ کہ اس سے مقصود ان کی تقلید ہے۔''

اسی طرح آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حدیث'' علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین '' کا بھی مطلب یہی ہے کہ

" سلوک طریقھم فی اعتبار الرای والاجتھاد فیما لا نص فیه.[۴۸۷]

''وہ معاملہ جس بارے نص وارد نہیں ہے اس بارے اجتہاد و رائے اختیار کرتے ہوئے ان کے طریقہ و راستہ پر چلنا۔''

اسی طرح ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں کہ'' سنت الخلفاء'' سے مراد ہے:

"نهجهم و طریقتهم فی معالجة الامور . [۴۸۸]
''ان کا منہج اور (نئے) معاملات کے حل کے لیے ان کا راستہ۔''

لہٰذا ان علماء کے نزدیک ان کے اجتہادات کو قطعی دلیل کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ یہی باعث ہے کہ ان کے جس اجتہاد کا نص قطعی کے خلاف ہونا ثابت ہوگا اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ چنانچہ امام صنعانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

"لیس المراد بسنة الخلفاء الراشدین الا طریقتهم الموافقة لطریقته صلی اللہ علیه وسلم من جهاد الاعداء وتقویة شعائر الدین و نحو ها ....و معلوم من قواعد الشریعة ان لیس لخلیفة راشد ان یشرع طریقة غیر ما کان علیها النبی صلی اللہ علیه وسلم." [۴۸۹]

''خلفاء راشدین کی سنت سے مراد محض ان کی وہ سنت ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے موافق ہو جیسے دشمنانِ اسلام سے جہاد، دین کے شعائر وغیرہ کی تقویت۔ اور قواعد شریعت میں سے یہ قاعدہ معلوم ہی ہے کہ خلیفہ راشد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا طریقہ جاری کرے جو نبی ﷺ کے طریقہ کے مخالف ہو۔''

گویا خلفاء راشدین کا کوئی اجتہاد بالفرض اگر خلافِ شرع ثابت ہوگا تو اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ حدیث عرباض رضی اللہ عنہ میں بھی رسول اللہ ﷺ نے پہلے اپنی سنت کی اتباع کا حکم دیا پھر خلفاء راشدین کی سنت کی اتباع کا حکم دیا لہٰذا خلفاء کی سنت سنتِ نبوی کی تابع ہے جیسا کہ ڈاکٹر عزت علی عطیہ لکھتے ہیں:

"یمکن القول بان اتباع سنتهم مشروط بان لا تخالف سنة ثبتت عن النبی صلی اللہ علیه وسلم لم یعلموا بها ، فان النبی صلی اللہ علیه وسلم قد رتب الاتباع فجعل سنته مقدمة فی الاعتبار ،ثم جعل سنة الخلفاء تابعة لها فی الرتبة" [۴۹۰]

''یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خلفاء راشدین کی سنت کی اتباع اس بات سے مشروط ہے کہ اس سے نبی ﷺ کی سنت ثابتہ کی مخالفت لازم نہ آئے کیونکہ نبی ﷺ نے پہلے اپنی سنت اور پھر سنت خلفاء کا بالترتیب ذکر کیا ہے اور سنت

خلفا کو مقام و مرتبہ میں اپنی سنت کے تابع ذکر کیا ہے۔''

سنت خلفاء سے مراد ان کا مجموعی اجتہادی منہج ہی ہونے کے دلائل درج ذیل ہیں۔

دنیا بھر کے اول و آخر تمام مجتہدین امت کے مقابلے میں خلفاء کرام کو خصوصاً جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے پہلے انہیں ہی نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن کا حل انہوں نے قرآن و سنت کی روشنی میں کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جن اصول وضوابط کو ملحوظ خاطر رکھا حقیقت میں وہ قرآن و سنت سے ہی مستنبط و ماخوذ تھے اور انہی اصول وضوابط کو بعد میں فنی حیثیت کے ساتھ اور نئے اصطلاحی ناموں کے ساتھ مدون و مرتب کر دیا گیا۔ وہ اصول وضوابط جن کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے اجتہادات کیے، حسب ذیل تھے۔

i۔ قرآن و سنت سے رہنمائی۔

ii۔ بوقت ضرورت مشاورتی و اجتماعی اجتہاد جس میں علم و آراء کا باہم تبادلہ، بحث و تمحیص اور مناقشہ کے بعد اکثر و بیشتر کسی حتمی و متفقہ رائے تک پہنچا جا سکتا ہے۔

iii۔ قیاس مگر اس کے لئے مقیس علیہ کا تعلق قرآن و سنت سے ہو نہ کہ کسی امتی کے اجتہاد کو مقیس علیہ قرار دیا جائے۔ خلفاء راشدین میں سے کسی کے بارے میں یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کسی نے کسی امتی کے اجتہادی فیصلہ کو مقیس علیہ قرار دے کر قیاس کیا ہو۔

iv۔ استحسان و استصحاب کا جائز حد تک استعمال بالفاظ دیگر محرمات کو حلال کرنے کی سوچ نہ ہو۔

v۔ مصلحت اور اس کی اقسام عرف و عادت، قرائن، حاجت و ضرورت اور سد ذریعہ کا استعمال کہ جن کی بدولت بہر صورت مقاصدِ شریعت کی حفاظت ہو، نیز اس بات کا خیال کہ بہر صورت مصلحتِ عامہ کو مصلحتِ خاصہ پر ترجیح دی جائے۔

خلفاء راشدین کے اجتہادات کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں روح شریعت کا لحاظ رکھتے ہوئے بدلتے حالات نیز لوگوں کی دینی حالات میں تغیرات کو پیش نظر رکھا گیا ہے بالفاظ دیگر نصوص کے الفاظ کے ظواہر پر ہی اصرار نہیں کیا بلکہ الفاظ میں موجود احکام کے معنی و مقصود کو بھی ملحوظ رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ نئی اقوام و ملل کی انتظامی اعتبار سے بہت سی مفید چیزوں کو اختیار کرنے میں انہیں کوئی عار محسوس نہ ہوئی اگر چہ اس سلسلہ میں ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' (جو درست ہے اسے اختیار کر لو اور جو نادرست ہے اسے چھوڑ دو۔) کے اصول کا البتہ ضرور خیال رکھا گیا ہے اور اگر کبھی اپنا اجتہاد مخالفِ نص نظر آیا یا کسی اور وجہ سے اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنے کو بہتر سمجھا تو کبھی حیل و

بحث گھڑنے اور تراشنے کا نہ سوچا بلکہ لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر رجوع کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلفاء کا یہی مجموعی منہج ''سنت الخلفاء'' کی حیثیت رکھتا ہے جس کو اختیار کرنے کا رسول اللہ ﷺ نے علماء و مجتہدین اور مسلم حکمرانوں کو حکم دیا ہے۔ اور ان کے اس منہج کے مطابق جو ان کے اجتہادات و فیصلے ہوں گے انہیں قبول کرنے کا عوام و خواص کو حکم دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے اجتہادات کو نصوص قرآنی و حدیثی جیسی حیثیت دے دی جائے کیونکہ نبی ﷺ کے اجتہادات کی اعتراض نہ آنے کی صورت میں توثیق من جانب اللہ، ہو جاتی ہے اور پھر وہ شریعت کا حصہ ہی بن جاتے ہیں لیکن کسی بھی امتی کے اجتہاد کا یہ معاملہ کیوں کر ہو سکتا ہے جبکہ جبریل علیہ السلام کے وحی لے کر آنے کا سلسلہ وفاتِ نبوی کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ کائنات ﷺ کو اللہ عزوجل کی طرف سے بتا دیا گیا تھا کہ آپ ﷺ کے بعد کن لوگوں پر بارِ خلافت ڈالا جائے گا اور انہیں کس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا نیز وہ کس منہج پر چلتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں گے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے منہج کی تصویب کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بالخصوص اور ساری امت کو بالعموم قبول و تسلیم کر لینے کا کہا اور آپ ﷺ کی اسی تاکیدی نصیحت کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے اجتہادات کو قبول کیا ورنہ شاید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے اجتہادات کو دین میں بدعات کی حیثیت دے کر قبول کرنے سے انکار ہی کر دیتے۔

خلفاء کرام کا منہج حقیقت میں قاعدوں کلیوں اور اصول و ضوابط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس منہج کو ہی ''سنت الخلفاء'' کی حیثیت دے دی جائے تو ہی یہ ممکن ہو سکے گا کہ رہتی دنیا تک کے مسلمان ان کی سنت کو اختیار کر سکیں۔ لیکن اگر محض ان کے اجتہادات کو ہی ''سنت الخلفاء'' قرار دے دیا جائے تو پھر عین ممکن ہے کہ ان کے کئی ایک اجتہادات آج کے دور میں قابل عمل نہ ہوں اور وہ صرف قرونِ اولیٰ کے حالات پر ہی منطبق ہو سکتے ہوں لیکن اگر عصر حاضر کے حالات و ضرویات کا لحاظ رکھتے ہوئے نیا اجتہاد بھی کیا جائے گا تو یہی حقیقت میں ان کی سنت کی اتباع ہو گی۔ اسی لیے تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جب فقہاء کرام نے درپیش حالات کے تقاضوں کے پیش نظر خلفاء راشدین کے اجتہادات کو بدلنے میں مصلحت سمجھی تو اسے بدلنے میں تاخیر سے کام لے کر امت کو کسی پریشانی میں مبتلا نہ کیا بلکہ علانیہ بدل کر امت کو فائدہ پہنچایا مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب ایرانی سلطنت، اسلامی سلطنت کا حصہ بنی تو اس وقت ایرانی حکومت اپنی رعایا سے زمین کا خراج اس کے رقبہ کے اعتبار سے ایک متعین شرح وصول کرتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی مصلحت کے تحت اسی

طریقہ کو برقرار رکھا۔[۴۹۱] اصطلاحی طور پر اسکو "نظام المساحۃ" (یعنی زمین کی پیمائش پر مبنی نظام محاصل) کہا جاتا ہے۔[۴۹۲]

تیسرے عباسی خلیفہ مہدی کے دور میں اس طریقہ کار کو بوجوہ تبدیل کر دیا گیا اور اب کاشت کاروں سے ان کی پیداوار پر متعین نسبت سے خراج وصول کیا جانے لگا اس نظام کو "نظام المقاسمہ" (یعنی پیدوار میں شرکت کے اصول پر مبنی نظام محاصل) کہا جاتا ہے۔[۴۹۳]

خلیفہ ہارون الرشید نے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ (م ۱۸۲ھ) سے اپنے عہد حکومت میں یہ سوال کیا کہ اب زمینوں کے خراج کے سلسلہ میں فاروقی طریقہ اختیار کیا جائے یا خلیفہ مہدی کا طریقہ۔[۴۹۴]

معلوم ہوتا ہے کہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس بارے شرعی و انتظامی ہر دو اعتبار سے جائزہ لیا کہ خراج کی شرح میں کمی بیشی اور تبدیلی جائز ہے یا نہیں نیز کون سی صورت حکومت اور رعایا دونوں کے حق میں بہتر ہوگی۔ بالآخر آپ رحمہ اللہ دیگر اہل علم سے مشاورت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ موجودہ حالات میں "نظام المقاسمہ" زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس سے حکومت کے مفاد پر بھی زد نہ پڑتی تھی اور نہ ہی رعایا پر امراء کے ظلم و جور کی راہیں کھلتی تھیں۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس بارے خلیفہ کے نام حسب ذیل خط لکھا:

> "میرے خیال میں پیداوار کے اندر ایک ایسی منصفانہ ہلکی نسبت سے حصہ دار بن جانا (نظام المقاسمہ مراد ہے) جس سے حکومت بھی راضی ہو اور اہل خراج باہمی تعلقات میں ظلم و زیادتی اور ایک دوسرے کی دست درازی سے بچے رہیں اور ان کے لیے بھی کچھ بچ رہے، بیت المال کی آمدنی بڑھانے، خراج بھی ادا کرنے والوں کو ایک دوسرے کی دست درازیوں سے اور ایک دوسرے پر بے جا بار ڈالنے سے بچانے نیز ان کو والیوں اور دوسرے افسران حکومت کے ظلم سے محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ ہے"[۴۹۵]

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی مذکورہ بالا رائے سے معلوم ہوا کہ حالات و ظروف کے تقاضوں کے پیش نظر خلفاء راشدین کے اجتہادات میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے اور یہ تغیر و تبدل کر دینا بھی خلفاء کی سنت کی اتباع ہے۔ کیونکہ انہوں نے بھی بوقت ضرورت فتویٰ و اجتہاد میں تبدیلی کی ہے۔

جن خلفاء راشدین کی سنت کی اتباع کا ہمیں حکم نبوی ہے انہی خلفاء میں سے بعض کی سنت یہ بھی رہی کہ اگر اپنے پیش رو خلیفہ کے اجتہاد کی بجائے نئے اجتہاد کی ضرورت محسوس کی تو بلا

جھجک نیا اجتہاد کیا اسی سنت کی بعد والوں کو اتباع کرنا ہے یعنی نئے حالات کے پیش نظر نیا اجتہاد۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات کو صحابہ و امت نے اگر قبول کیا ہے تو وہ محض حدیثِ عرباض رضی اللہ عنہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس لئے کہ انہوں نے جن اصول وضوابط کو ملحوظ رکھا وہ قرآن و حدیث سے ہی مستفاد و مستنبط تھے لہٰذا ''سنۃ الخلفاء'' کی اتباع سے مراد یہی ہوا کہ ان اصول وضوابط کو ہی امت ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے مسائل کا حل کرے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے غالباً اسی لیے خلفاء راشدین کے مجموعی اجتہادی منہج کے لئے سنت کی بجائے سنن کے الفاظ استعمال فرماتے ہوئے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا:

> "سن رسول الله صلى الله عليه وسلم وولاة الامر من بعده سننا، الاخذ بها تصديق بكتاب الله و استكمال بطاعة الله و قوة على دين الله، من عمل بها فهو مهتد و من استنصر بها فهو منصور ومن خالفها اتبع غير سبيل المومنين وولاه الله ما تولى واصلاه جهنم و ساءت مصيراً". [۴۹۶]

> ''رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد والیانِ سلطنت (خلفاء راشدین) نے کچھ ایسے طریقے جاری کیے ہیں جنھیں اختیار کرنا گویا کتاب اللہ کی تصدیق کرنا، اطاعت الٰہی کو مکمل کرنا اور اللہ کے دین کو تقویت پہنچانا ہے۔ جس نے انہیں اختیار کیا وہ ہدایت یافتہ ہے۔ جس نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی وہ ضرور مستفید ہو سکے گا اور جس نے ان کی مخالفت کی گویا اس نے مومنوں کی راہ کی بجائے کوئی اور راہ اختیار کر لی اور پھر اللہ بھی اسے ادھر ہی جانے دے گا جدھر وہ جا رہا ہے اور پھر اسے جہنم میں ڈال دے گا جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔''

عدمِ حجیت کے دلائل:

ا۔ خلفاء راشدین بہرحال انسان تھے اور معصوم عن الخطا نہیں تھے اس لیے کہ عصمت نبوت کا خاصہ ہے اور اس بات کا خود خلفاء راشدین کو بھی اعتراف ہے۔ مثلاً ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ بارے پوچھا گیا، جس کا آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے جواب دیا تو سائل نے کہا "ھذا ھو الصواب": (یہی درست ہے۔) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا

" واللہ ما یدری عمر ان ھذا ھو الصواب او الخطاء ولکنی لم اٰل عن الحق "[۴۹۷] ''اللہ کی قسم! عمر (رضی اللہ عنہم) نہیں جانتا کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ البتہ میں نے حق (کی تلاش میں) کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

ii۔ خلفاء راشدین سے غلطی کا امکان ہونے کی اس سے بڑی کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ خلفاء نے کئی بار اپنے سابقہ اجتہادات سے رجوع کیا ہے[۴۹۸]۔ لہٰذا ان کے اجتہادات کو قرآن و حدیث ایسی اتھارٹی نہیں دی جاسکتی۔

iii۔ خود خلفاء راشدین نے اپنے اجتہادات کو قرآن و حدیث ایسی حیثیت نہیں دی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ملا اور اس نے اپنا کوئی مسئلہ ذکر کر کے کہا کہ اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس کی بات سن کر آپ رضی اللہ عنہ نے کہا ''اگر میں ہوتا تو ان کے فیصلے کی بجائے یوں فیصلہ کرتا''۔ اس آدمی نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہ کو اپنا فیصلہ کرنے میں کیا امر مانع ہے جب کہ آپ رضی اللہ عنہ تو صاحبِ اختیار ہیں؟ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ معاملہ اگر صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوتا تو میں تجھے ضرور ان کی طرف لوٹا تا مگر یہاں تو معاملہ میری اور علی رضی اللہ عنہ و زید رضی اللہ عنہ کی رائے کا ہے۔[۴۹۹]

اسی طرح ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے کاتب (Secretary) کو اپنا کوئی فتویٰ واجتہاد لکھوایا تو کاتب نے اپنی مرضی سے ساتھ یہ بھی لکھ دیا:

" ھذا ما رای اللہ و رای عمر''

''یہ وہ ہے جو اللہ اور عمر کا خیال (رائے) ہے۔''

آپ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو فرمایا کہ تم نے انتہائی غلط بات کہی، اس کی جگہ پر یہ لکھو:

"فان یکن صواباً فمن اللہ و ان یکن خطافمن عمر ثم قال:

السنة ما سنه اللہ و رسوله لا تجعلوا خطاء الرای سنة لا مة " [۵۰۰]

''اگر تو یہ درست ہے تو یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر یہ مبنی بر خطا ہے تو عمر کی جانب سے ہے۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے مزید ارشاد فرمایا: ''طریقہ وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے جاری کیا۔ وہ رائے جو خطا پر مبنی ہوسکتی ہے اسے امت کے لیے (لازمی) قانون کی حیثیت نہ دے دو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تنبیہ سے معلوم ہوا کہ اجتہاد خواہ کسی بھی صحابی رضی اللہ عنہ کا ہو یا غیر

صحابی کا اس میں بہر حال صواب اور خطا دونوں کا احتمال موجود ہے لہٰذا جب خلفاء راشدین کے اجتہادات میں بھی غلطی کا امکان ہوسکتا ہے تو اسے قطعی دلیل کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے اجتہادات اور کسی امتی کے اجتہادات (خصوصاً اپنے اجتہادات) کے درمیان حد فاصل قائم کرتے ہوئے کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو اپنی رائے واجتہاد میں مصیب ہوتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی حق بات کی طرف رہنمائی کر دیتے تھے جبکہ کسی امتی کا اجتہاد تو ظن و تکلف پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ ممبر پر براجمان ہو کر عوام الناس سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

”ایھا الناس ! ان الرای انما کان من رسول اللہ a لان اللہ کان یریہ وانما ھو منا الظنّ والتکلّف“[۵۰۱]

”لوگو! رائے (معتبر) وہ تھی جو رسول اللہ ﷺ نے دی کیونکہ اللہ آپ ﷺ کو (حق) دکھا دیتا تھا جبکہ ہماری جانب سے تو محض ظن و تکلف ہی ہوتا ہے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ سے معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے قطعاً اپنے اجتہادات کو شریعت کا درجہ نہیں دیا ہے بلکہ آپ رضی اللہ عنہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ایک مجتہد کا کام ظنِ غالب کی بنیاد پر ”مجتھد فیہ“ (قابل اجتہاد) مسئلہ میں حکم شرعی کی تلاش ہے۔

iv۔ ڈاکٹر عرفان خالد کی تحقیق کے مطابق تابعین کے طرز عمل سے بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو حجت نہ سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے بسا اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کے خلاف بھی موقف اختیار کیا ہے۔[۵۰۲] ظاہر ہے صحابہ رضی اللہ عنہم میں خلفاء راشدین بھی شامل ہیں۔

اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اجتہاداتِ صحابہ رضی اللہ عنہم و خلفاء راشدین قرآن و حدیث کی طرح حجت نہیں مگر اس عدم حجیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے اقوال و اجتہادات کو سرے سے ہی اہمیت نہ دی جائے اور یکسر نظر انداز کر دیا جائے بلکہ ان کے اقوال تا قیامت ہمارا قیمتی فقہی سرمایہ ہیں جن کا مطالعہ ہر دور کے مجتہدین کے لئے فوائد کا حامل ہے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان سے قبل امام بغوی رحمہ اللہ وغیرہ نے مجتہد کی شرائط میں صحابہ و تابعین وغیرہ کے اجتہادات سے علم و معرفت کو ضروری قرار دیا ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”لا بد للمستقل من معرفة كلام من مضى من الصحابه و التابعين

و تبعهم فی ابو اب الفقه". [۵۰۳]

''مجتہد مستقل کے لیے ضروری ہے کہ اسے صحابہ وتابعین اور تبع تابعین وغیرہ کے فقہی اقوال کی معرفت حاصل ہو۔''

اور امام بغوی رحمہ اللہ (م ۵۱۰ھ) لکھتے ہیں:

" ویعرف اقاویل الصحابه والتابعین فی الاحکام "[۵۰۴]

''اسے صحابہ وتابعین کے اقوالِ فقہیہ کا علم ہونا چاہیے۔''

خلفاء راشدین کے اجماعی اجتہادات کی شرعی حیثیت:

خلفاء کے اجتہادات کی شرعی حیثیت کے بارے میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے۔ یادرہے خلفاء کرام کے بیشتر اجتہادات ایسے ہیں جنہیں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے قبول کر لیا اور پھر کسی سے بھی ان کا انکار ثابت نہیں ہے۔ گویا ان پر اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم صریحی نہیں تو سکوتی ضرور ہو گیا ہے۔ خلفاء راشدین کے ایسے اجتہادات یقیناً حجت ہیں اور وہ اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی وجہ سے حجت ہیں نہ کہ محض خلفاء کی آراء ہونے کی بنا پر۔[۵۰۵]

شیخین اور خلفاء اربعہ کے اجماع کی شرعی حیثیت:

اس سلسلہ میں علماء اصول نے ایک بحث یہ بھی کی ہے کہ خلفاء اربعہ یا شیخین (ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ) کے اجماع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اجماع شیخین حجت ہے اور دلیل میں حدیث نبوی ''اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر وعمر ''[۵۰۶] (میرے بعد ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتدا کرنا۔) کو پیش کیا ہے۔ اسی طرح احناف میں سے قاضی ابو حازم رحمہ اللہ اور ایک روایت میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہ نقطہ نظر ہے کہ خلفاء اربعہ کا اجماع حجت ہے اگرچہ ان سے کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ نے اختلاف بھی کیا ہو۔ انہوں نے دلیل کے طور پر حدیث عرباض رضی اللہ عنہ کو پیش کیا ہے۔[۵۰۷،۵۰۸]

جمہور علماء وفقہاء کا موقف:

جمہور علماء وفقہاء کا یہ کہنا ہے کہ اجماع شیخین ہو یا اجماع خلفاء اربعہ اصولی اور نظری اعتبار سے کچھ حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی کی اقتداء واتباع کے حکم سے اس مقتدا

کے قول وفعل کا حجت اور قطعی دلیل بننا لازم نہیں آتا لیکن جب خلفاء راشدین کے اتفاقِ رائے کو دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قبول کر لیں اور کسی بھی مجتہد صحابی رضی اللہ عنہ سے اعتراض ومخالفت ثابت نہ ہو تو وہ چونکہ اب اجماع خلفاء اربعہ نہیں رہ جاتا بلکہ اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم بن جاتا ہے تو وہ یقیناً حجت ہے اگر چہ یہ بات اپنی جگہ پر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی ایک بھی ایسی مثال پیش کرنا ناممکن ومحال ہے کہ کسی مسئلہ میں خلفاء اربعہ نے اتفاق کیا ہو اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے دلائل شرعیہ کی بنیاد پر اختلاف کیا ہو اور پھر خلفاء نے اپنی رائے سے رجوع نہ کر لیا ہو بالفاظ دیگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ چاروں خلفاء نے نص کے مقابلہ میں اپنی رائے پر اتفاق کر لیا ہو۔[۵۰۹]

خلفاء اربعہ کے اجماع کی حجیت کے بارے میں امام غزالی رحمہ اللہ نے بڑی فیصلہ کن بات کہی ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے خلفاء اربعہ کے اجماع کو حجت قرار دیا ہے جو محض تحکم ہے وگرنہ اس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے یہ تو محض ان لوگوں کا خیال ہے جو سمجھتے ہیں کہ قولِ صحابی رضی اللہ عنہ حجت ہے۔[۵۱۰]

گزشتہ ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

i۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات قرآن وحدیث کی طرح قطعی دلیل کا درجہ نہیں رکھتے مگر ان کے قطعی دلیل نہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان سے بے اعتنائی کی جائے اور رہنمائی نہ لی جائے بلکہ ان کے اجتہادات قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے انتہائی قیمتی فقہی وعلمی سرمایہ اور خزانہ ہیں۔

ii۔ خلفاء راشدین کے وہ اجتہادات جن پر کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کا انکار ومخالفت ثابت نہیں ہے وہ ''اجماع سکوتی'' کا درجہ رکھتے ہیں لہٰذا جمہور علماء کے نزدیک وہ اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی وجہ سے حجت ہیں۔

iii۔ حدیث عرباض رضی اللہ عنہ میں سنت خلفاء راشدین سے مراد اگر ان کے جمیع اجتہادات لیے جائیں تو کئی طرح کے اعتراضات وارد ہوتے ہیں جن کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں، لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ سنتِ خلفاء سے مراد ان کا مجموعی اجتہادی منہج ہے۔

iv۔ خلفاء کا مجموعی اجتہادی منہج یقیناً ہمارے لیے حجت ہے۔

v۔ شیخین اور خلفاء اربعہ کے اجماع کی نظری اعتبار سے کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے اگر چہ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ خلفاء راشدین نے خلافِ شریعت اجماع کر لیا ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں چاروں خلفاء کی رائے متفق ہوئی ہے تو دیگر

صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس کے خلاف انکار ثابت نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی وہ اتفاقی رائے دراصل قرآن وسنت سے ہی مستنبط و ماخوذ تھی۔

خلفاء راشدین کے باہم اختلاف کی صورت میں علماء کا فیصلہ:

اختلافِ آراء ایک لازمی امر ہے:

غزوہ بنوقریظہ کے موقع پر حدیث رسول ﷺ "لا یصلین احدا لعصر ا لافی بنی قریظه" (تم میں سے کوئی بنوقریظہ تک پہنچے بغیر نماز عصر نہ پڑھے۔) کے معنی ومراد سمجھنے بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف رائے ہوا۔ لہٰذا جب قرآن وحدیث کے فہم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی عظیم جماعت میں اختلاف ہوسکتا ہے[۵۱۱] تو وہ مسائل جن بارے میں صراحت سے قرآن وحدیث سے رہنمائی نہ مل سکے، ان میں اختلافِ رائے کا انکار کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اور خلفاء راشدین میں کئی ایک مواقع پر اجتہادی آرا میں اختلاف ہوا گویا اجتہادی مسائل میں اختلاف ایک لازمی وبدیہی امر ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

" انما کان الخلاف امرا طبیعیا للاجتهاد با لرا ی لان العقول لیست واحدة و مدارک الفقهاء لیست واحدة و عمق الملکة الفقهیه لیست واحدة فی الجمیع و علی هذا فنحن لا نضیق باختلاف الفقهاء و لا نستغرب منها بل نعدها ثروة قانونیة عظیمة خلفها السلف للخلف "[۵۱۲]

"اجتہادی آرا میں اختلاف ہونا ایک فطری بات ہے کیونکہ انسانی عقلیں ایک جیسی نہیں اور فقہاء کی معلومات بھی ایک طرح کی نہیں۔ اسی طرح تمام فقہا میں فقہی ملکہ بھی یکساں نوعیت کا نہیں لہٰذا ہم اختلاف فقہا پر تنگ نظر نہیں ہیں اور نہ ہی اسے نادرالوقوع سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کے اختلافِ آرا کو قانونِ شریعت (فقہ اسلامی) کا عظیم خزانہ سمجھتے ہیں جسے سلف نے خلف (بعد والوں) کے لیے چھوڑا ہے۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلاف آرا کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باہم شیر وشکر رہے اور "رحماء بینهم" کی عملی تصویر بنے رہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بارے مروی ہے کہ وہ جب کسی معاملہ میں خلاف رائے کا اظہار کرتے تو بسا اوقات دیکھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کبھی اتفاق رائے نہ ہو سکے گا مگر جب وہ دونوں جدا ہوتے تو ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی اعلیٰ اخلاق اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے [۵۱۳] لہٰذا خلفاء راشدین کے اختلاف میں بھی ہمارے لیے کئی دروس اور فوائد موجود ہیں۔

اختلافِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے فوائد و برکات:

بعض علماء نے کسی مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہم اختلافِ رائے کو بھی امت کے لیے خیر و برکت کا باعث قرار دیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) فرماتے ہیں کہ اگر کسی مسئلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک ہی قول ہوتا تو وہ لوگوں کے لیے تنگی کا باعث بنتا [۵۱۴]۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات میں اختلاف کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قانون کی دنیا میں وسعت ہوئی چنانچہ امام شعرانی رحمہ اللہ (م ۹۷۳ھ) حدیث ''اختلاف امتی رحمة'' (میری امت کا اختلاف باعث رحمت ہے۔) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"توسعة علیهم و علی اتباعهم فی وقائع الاحوال المتعلقه بفروع الشرعیه" [۵۱۵]

''فروعاتِ شریعہ سے متعلقہ احوال و وقائع کے سلسلے میں ان صحابہ و تابعین وغیرہ پر وسعت کر دی گئی ہے۔''

حضرت قاسم بن محمد رحمہ اللہ (م ۱۰۱ھ) جلیل القدر تابعی ہیں اور مدینہ کے سات نمایاں فقہاء میں سے ہیں۔ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف رائے سے امت کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ لہٰذا جو شخص ان میں سے کسی کے عمل کو بھی اختیار کرے گا تو اس کے اطمینان کے لیے یہ بات کافی ہے کہ کم از کم اس سے بہتر شخص کا عمل بھی اس سے قبل یہی رہا ہے۔ [۵۱۶]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلافِ آراء میں ہمیں ان کے اختلاف کی بنیادیں ملتی ہیں اور اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ جب کسی صحابی کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن و سنت دوسرے صحابی کی رائے کے ساتھ ہیں تو وہ صحابی دوسرے صحابی کے موقف کی طرف رجوع کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتا تھا۔ لہٰذا ہمیں بھی اس اسوہ صحابہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہئے کہ قرآن و سنت جس صحابی کے ساتھ ہوں اسے فوراً قبول کر لیا جائے نہ کہ دوسرے قول کو محض یہ سمجھتے ہوئے قبول کیا جائے کہ وہ قول بھی تو صحابی

کا ہی ہے۔ یہ طرزِ عمل یقیناً دین کے ساتھ تلعب کا ہے جو دین کو بازیچہ اطفال بنا دے گا۔ جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مسئلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے مختلف اقوال میں سے جسے چاہے لے لے اور اختیار و انتخاب کا طریقہ اختیار نہ کرے حالانکہ اس بارے یہی چیز ملحوظ خاطر رکھی جائے گی کہ ان کے اقوال میں سے کس کا قول کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہے'' [۵۱۷]

لیکن جب دونوں آراء کی قرآن و سنت سے تائید ہوتی ہو تو پھر یقیناً کسی بھی ایک موقف کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مطلقہ عورت اگر عدت میں ہی نکاح کر لے اور جماع بھی کر لے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو اور اس کے موجودہ شوہر کو چند کوڑوں کی سزا دے کر دونوں میں حرمت ابدی کا فیصلہ کیا [۵۱۸] مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں پہلے شوہر کی عدت گزرنے کے بعد یہ شخص اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے [۵۱۹] ان دونوں فیصلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد تقی امینی لکھتے ہیں ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ ''مصلحت عامہ'' کی بنا پر تھا جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ''اصول عامہ'' کی بناء پر تھا۔ حالات کے لحاظ سے روحِ شریعت میں دونوں کی گنجائش ہے'' [۵۲۰] مگر ایسی صورت میں کسی ایک موقف پر اڑے رہنے کو دین سمجھنا اور دوسرے موقف کی قطعاً اجازت نہ دینا لوگوں کے لیے تنگی پیدا کرنا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور قاسم بن محمد کے مذکورہ بالا اقوال کو بھی اسی معنی و مراد پر محمول کیا جائے گا۔

خلفاء راشدین کے باہم اختلاف کی صورت میں علماء کا فیصلہ:

اس سلسلہ میں اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم اور بالخصوص خلفاء راشدین کے اقوال و اجتہادات کی حجیت کے قائلین کا خیال ہے کہ اگر خلفاء راشدین کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو جائز ہے کہ ان میں سے کسی بھی ایک کا قول اختیار کر لیا جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا ایک قول ہے کہ

> "لو اخذ رجل بقول احدهم (اصحاب البنى صلى الله عليه وسلم) لكان سنة" [۵۲۱]
>
> ''اگر کوئی شخص ان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میں سے کسی کے قول کو بھی اختیار کرے تو گویا اس نے شرعی طریقہ کو ہی اپنایا۔''

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ (م ۱۵۰ھ) فرماتے ہیں ''جب میں کتاب و سنت میں کوئی مسئلہ نہ پاؤں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جس کے قول کو چاہوں لے لیتا ہوں اور جس کا قول چاہوں چھوڑ

دیتا ہوں مگر میں ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتا (کوئی نیا قول نہیں بناتا)'' [۵۲۲] یہ شاید اس لیے کہ امام صاحب کے نزدیک اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے کسی مسئلہ میں دو یا تین قول ہیں تو گویا انکا دو یا تین قول ہونے پر اجماع ہو چکا ہے لہٰذا اب نیا قول بنا کر ان کے اقوال کو چھوڑنا گویا اجماعِ صحابہ سے نکلنا ہے۔[۵۲۳] خلفاء راشدین کے حوالے سے امام صاحب کا خصوصاً موقف یہ ہے کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں خلفاء راشدین کی رائے راجح ہو گی اور خلفاء راشدین میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی رائے باقی کے مقابلے میں راجح ہو گی۔[۵۲۴]

یہ نظریہ کہ خلفاء راشدین کے باہم اختلاف کی صورت میں ان میں سے کسی کے بھی قول کو اختیار کر لیا جائے اس کی تردید کرتے ہوئے امام ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ تو اسلام سے خروج کرنا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کا دین ہماری مرضی و اختیار کے تابع ہے .... نیز اگر ہم ان خلفاء میں سے کسی ایک کے قول کو لے لیں اور دوسرے کی رائے کو چھوڑ دیں تو بھی ہم ان کے متبع سنت تو نہ ہو سکے۔ (یعنی حدیث عرباض رضی اللہ عنہ پر صحیح عمل نہ کر سکے)۔[۵۲۵]

عبدالوہاب خلاف لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کے قول کو لازماً اختیار کرنے کو حجت نہیں سمجھتے۔ لہٰذا آپ کی رائے یہ ہے کہ کسی ایک مسئلہ میں ان کے تمام اقوال کے مقابلہ میں نیا قول بھی لایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ غیر معصوم عن الخطاء ہیں اور جس طرح ایک صحابی کے لیے دوسرے صحابی کی مخالفت جائز ہے، اسی طرح بعد کے مجتہدین کے لیے بھی ان کی مخالفت جائز ہے[۵۲۶] امام شافعی رحمہ اللہ مصادر شریعت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''کوئی فقہی فیصلہ کرنا یا فتویٰ دینا جائز نہیں ہے جب تک کہ لازمی طور پر خبر یعنی کتاب و سنت سے منقول تعلیمات کی روشنی میں نہ ہو یا اہل علم کے متفقہ فیصلہ پر اس کا مدار نہ ہو یا پھر کتاب و سنت اور اہل علم کے اجماعی فیصلوں پر قیاس نہ کیا گیا ہو'' [۵۲۷]

لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب کسی ایک مسئلہ میں مختلف اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں تو ان میں سے جو کتاب و سنت یا اجماع کے موافق ہو گا یا اس کا قیاساً درست ہونا واضح ہو تو اس کی طرف رجوع کیا جائے گا چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ سے جب اس بارے سوال ہوا تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا:

''نصیر منھا الی ماوافق الکتاب او السنة والاجماع او کان اصح فی القیاس''[۵۲۸]

''ان میں سے جس کا قول کتاب و سنت اور اجماع کے موافق ہو گا یا جو قیاساً

زیادہ صحیح ہوگا تو ہم اس کی جانب رجوع کریں گے۔''

اس طرح امام شافعی رحمہ اللہ (م ۲۰۴ھ) سے منقول ہے کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو صحابہ کسی مسئلہ بارے مختلف اقوال رکھتے ہوں تو ان دونوں میں سے جس کا قول کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہوا اسے میں لے لوں گا کیونکہ اس قول کے ساتھ قرآن وسنت جیسی قوی چیز ہے لیکن اگر ان دونوں اقوال میں سے کسی کے پاس کوئی ایسی دلیل نہ ہو تو پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اقوال کو ہمارے نزدیک ترجیح حاصل ہوگی۔[۵۲۹]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے اصولوں میں سے تیسرا اصول یہ ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کسی مسئلہ میں مختلف ہوں تو ان میں سے جس کا قول کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہوگا اسے اختیار کر لیا جائے گا مگر ان کے اقوال سے نکلا نہ جائے گا۔ (یعنی نیا قول نہ بنایا جائے گا) اور اگر کسی کے بھی قول کے ساتھ کتاب وسنت کی موافقت واضح نہ ہو تو پھر اختلافِ صحابہ رضی اللہ عنہم نقل کرنے کے بعد کسی قول کو ترجیح دینے بارے توقف کیا جائے گا۔[۵۳۰] لیکن اگر کسی مسئلہ میں اختلاف رائے کرتے ہوئے خلفاء راشدین یا ان میں سے بعض ایک طرف اور دوسری طرف دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوں تو اس بارے امام احمد رحمہ اللہ سے منقول دو قول ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ آپ رحمہ اللہ کے یہاں خلفاء راشدین تمام یا ان میں سے بعض جس طرف ہوں گے وہی رائے راجح قرار پائے گی[۵۳۱]۔ اسی طرح چار خلفاء راشدین میں سے اگر تین ایک طرف ہوں تو ان کی رائے ہی راجح ہوگی اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں خلفاء کرام رضی اللہ عنہم دو دو گروہوں میں بٹ جائیں تو اس گروہ کا قول راجح ہوگا جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ ہوں گے اور اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ میں اختلاف رائے ہو تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح حاصل ہوگی کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بارے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا کوئی بھی فتویٰ وفیصلہ خلافِ نص ہے یا اس کا ماخذ ضعیف ہے[۵۳۲] اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ خلفاء راشدین میں ترجیح کا مطلب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذات وکردار پر تنقید وتنقیص ہرگز نہ ہونا چاہیے۔[۵۳۳]

گزشتہ بحث کے نتیجہ میں راجح موقف یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جس کا قول کتاب وسنت کے زیادہ قریب اور موافقت رکھے گا وہ باقی اقوال کے مقابلہ میں راجح قرار پائے گا اور یہ اصول وضابطہ عقل وانصاف کے عین مطابق ہے کیونکہ اس اصول وضابطہ میں اصل اتھارٹی قرآن وسنت کو حاصل ہے۔

لہٰذا اسی اصول کے مطابق خلفاء راشدین کا موقف دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں اگر

کتاب وسنت کے اقرب ہوتو اسے ترجیح حاصل ہوگی اوراسی طرح خلفاء راشدین میں باہم اختلاف ہونے کی صورت میں بھی کتاب وسنت جس کے موید وموافق ہوں گے اسی کی رائے راجح ہوگی۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ خلفاء راشدین میں اختلاف کی صورت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی بات راجح ہوگی یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ میں اختلاف ہونے پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بات راجح ہوگی اس کی وجہ بھی دراصل یہی ہے کہ ان علماء نے ان کے اختلافی مسائل میں حق وصواب کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ زیادہ پایا ہے جس طرح کہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے جس کا پیچھے تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ لیکن دوایسی آراء جوخواہ خلفاء راشدین کی ہوں یا دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی جن کی تائید قرآن وسنت سے ہوتی ہو اور دونوں کی گنجائش نکلتی ہوتو پھر کسی بھی ایک رائے کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم وخلفاء راشدین کی ایسی دوآراء جن میں سے کسی ایک کی بھی تائید وموافقت قرآن وحدیث سے بظاہر نہ ہوتی ہوتو اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا کہ کون سی رائے حالات وظروف کا ساتھ دے سکتی ہے اور اس کے اختیار کرنے سے شریعت کے تقاضے بھی پورے ہوسکتے ہوں، نہایت ضروری ہے۔ اگر اس پہلو سے خدانخواستہ لاپرواہی برتی گئی تو یقیناً یہ کوئی معمولی کوتاہی نہ ہوگی۔

حواشی وحوالہ جات

[۱] احمد بن حنبل، امام: المسند (المکتب الاسلامی بیروت، ۱۹۶۹) ۵:۲۲۰

[۲] محی الدین، نووی، امام: شرح النووی لصحیح مسلم (قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۵۶م) ۲:۱۱۹

[۳] محمد بن عیسی، ترمذی، امام: جامع ترمذی، ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب تسمیۃ عتیقا، حدیث: ۳۶۷۹ ومحمد ابن سعد، امام: الطبقات الکبری (دار صادر، بیروت، ۱۹۵۷م) ۳:۱۶۹۔۱۷۰

[۴] ایضاً، ۳:۱۷۲

[۵] محمد بن جریر، طبری، امام: تاریخ الامم والملوک (دار سویدان، بیروت، ۱۹۶۷م) ۲:۳۱۷

[۶] محب الطبری، ابوجعفر، احمد: الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، س۔ن) ۱:۸۴

[۷] محمد بن اسمعیل، بخاری، امام: صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب الارواح جنود مجندہ، حدیث: ۳۳۳۶

[۸] معین الدین احمد، ندوی شاہ: خلفاء راشدین (نعمانی کتب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳م) ص ۲۰

[۹] علی متقی، الہندی، امام: کنز العمال (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۹م) ۱۱: ۵۵۵ و امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب، حدیث: ۳۶۶۱

[۱۰] جلال الدین سیوطی، امام،: تاریخ الخلفاء (دار الفکر، بیروت، ۱۹۷۴م) ص ۳۶ ومحب الطبری: الریاض النضرۃ، ۱:۱۳۳

[۱۱] عبدالملک بن ھشام، امام: السیرۃ النبویۃ (دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۵م) ۱:۳۸۲

[۱۲] اسماعیل بن کثیر، حافظ: تفسیر القرآن العظیم (مکتبہ دار السلام، ریاض، ۱۹۹۴م) ۴:۴۲۲

[۱۳] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب رجاء ہ ان یکون ابوبکر ممن یدعٰی من جمیع ابواب الجنۃ، حدیث: ۳۶۷۵

[۱۴] سورۃ اللیل، ۹۲: ۱۸۔۲۱ بعض مفسرین نے اس بات پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بارے ہی نازل ہوئیں (حافظ ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۴:۶۷۳)

[۱۵] امام علی متقی: کنز العمال ۱۱: ۵۴۹

[۱۶] ایضاً، ۱۱: ۵۴۴

[۱۷] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب مالاحد یدالا وقد کافیناہ ما خلا ابا بکر، حدیث: ۳۶۶۱

[۱۸] امام بخاری: صحیح بخاری، باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ الی المدینۃ، حدیث: ۳۹۰۵

[۱۹] معین الدین، ندوی: خلفاء راشدین، ص ۶۶

[۲۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب تزویج النبی ﷺ عائشۃ وقدومھا المدینۃ وبنائہ بھا، حدیث: ۳۸۹۴

[۲۱] امام احمد بن حنبل: المسند (المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۶۹م) ۴: ۴۲۱

[۲۲] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب الصلوۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی الرخصۃ فی السمر بعد العشاء، حدیث: ۱۶۹

[۲۳] محمود احمد، غازی، ڈاکٹر: محاضرات فقہ (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۵م) ص ۲۱۸

[۲۴] محمد جعفر، شاہ، پھلواری، مولانا: رفقائے نبی (عظمت صحابہ اکیڈمی، لاہور، س۔ن۔) ص ۲۴

[۲۵] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، حدیث: ۳

[۲۶] ایضاً، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ الی المدینۃ، حدیث: ۳۹۰۵

[۲۷] امام ابن حنبل: المسند، ۱: ۳۰۔۳۱

[۲۸] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب ما یجوز من الشروط فی الاسلام والاحکام والمبایعۃ، حدیث: ۲۷۱۱۔۲۷۱۲، ۴۱۸۰

[۲۹] ایضاً، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اھل الحرب وکتابۃ الشروط، حدیث: ۲۷۳۱۔۲۷۳۲

[۳۰] جیسے ہجرت کے موقع پر یا اساری بدر بارے رسول اللہ ﷺ نے ترجیحاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہی مشاورت کی تھی۔ (صحیح بخاری: ۳۹۰۵، مسند احمد بن حنبل، ۱: ۳۰۔۳۱)

[۳۱] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ الی لمدینہ، حدیث: ۳۹۱۱

[۳۲] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب لوکنت متخذا خلیلا لاتخذت ابا بکر خلیلا، حدیث: ۳۶۶۰

[۳۳] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، حدیث: ۳۶۶۸

[۳۴] محمد حسین، ھیکل: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (مترجم: محمد اسحاق بھٹی) (الفیصل ناشران وتاجران کتب،

لاہور، ۱۹۹۸) ص ۱۰۴

[۳۵] المرجع السابق، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، حدیث: ۱۴۰۰

[۳۶] المرجع السابق، ص، ۲۹

[۳۷] ایضا، ص ۳۰

[۳۸] احمد بن علی، ابن حجر، عسقلانی، حافظ: الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (مکتبہ التجاریہ الکبری، مصر، ۱۹۳۹م) ۲: ۵۱۱

[۳۹] معین الدین، ندوی: خلفاء راشدین، ص ۸۷

[۴۰] عبدالملک بن ھشام: امام: السیرۃ النبویہ (داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۵م) ۱: ۳۸۲

[۴۱] المرجع السابق، ص، ۸۸

[۴۲] امام احمد بن حنبل: المسند، ۱: ۱۷

[۴۳] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب فی مناقب ابی حفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳۶۸۱

[۴۴] امام ابن سعد: الطبقات الکبری ۳: ۲۷۰

[۴۵] عبدالرحمن بن علی، ابن الجوزی، امام: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (داراحیاء العلوم الدین، دمشق، س۔ن) ص ۵۷۔۵۸

[۴۶] ابن عبدالبر، امام: الاستیعاب (مکتبہ التجاریہ الکبریٰ، مصر، ۱۹۳۹م) ۲: ۴۵۱ وامام ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۳۸۰

[۴۷] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۲: ۴۷۶

[۴۸] ایضاً ۲: ۶۳۶

[۴۹] امام ترمذی: ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب مناقب ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳۶۷۵

[۵۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳۶۸۴

[۵۱] معین الدین ندوی: خلفاء راشدین، ص ۸۸ وامام ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲: ۴۵۱

[۵۲] شبلی نعمانی، علامہ: الفاروق (مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن) ص ۵۰

[۵۳] امام بخاری: کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب، حدیث: ۳۶۷۷

[۵۴] ایضاً، حدیث: ۳۶۹۲

[۵۵] سورۃ التوبہ ۹: ۳۴

[۵٦] جلال الدین سیوطی، امام: الدر المنثور (دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۳م)۴:۱۷۸

[۵۷] سورۃ النساء۴:۱۰۱

[۵۸] امام ابن حنبل: المسند، ۱: ۲۵، ۳٦

[۵۹] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد و المصالحۃ مع اھل الحرب، حدیث: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲

[٦۰] ایضاً: کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳٦۸۹

[٦۱] امام ترمذی: ابواب المناقب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳٦۸۲

[٦۲] المرجع السابق، حدیث: ۳٦۸۳

[٦۳] امام ترمذی: ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳٦۸۲

[٦۴] محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (مترجم: ساجد الرحمٰن صدیقی) (ادارہ معارف اسلامی؛ لاہور، ۲۰۰۲م) ص ۱۳ و امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۳۲-۳۴

[٦۵] امام ابن ھشام: السیرۃ النبویہ ۲: ۱۲۳

[٦٦] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳۸٦٦

[٦۷] امام ترمذی: ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب فی مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳٦۹٦ و امام ابن سعد، امام: الطبقات الکبری، ۳: ۵۳-۵۴

[٦۸] معین الدین، ندوی: خلفاء راشدین، ص ۱۵۹

[٦۹] امام ابن حنبل: المسند، ۱: ٦۲

[۷۰] حافظ ابن حجر: الاصابۃ، ۴: ۳۲۱

[۷۱] ایضاً

[۷۲] یہ شاہ معین الدین احمد ندوی کی تحقیق ہے جبکہ بعض تاریخی روایات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چوتھے مسلمان ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ (ابن اثیر، جزری، امام: اسد الغابۃ، ۳: ۵۸۵۔ محمد بن احمد ذھبی، امام: تاریخ الاسلام، عہد الخلفاء الراشدین، ص ۴٦۹)

[۷۳] الراجع السابق، ۴: ۲۹۸

[۷۴] امام ابن سعد: الطبقات الکبری ۱: ۲۰٦، ۳: ۵۵ و عز الدین بن الاثیر، امام: اسد الغابۃ (دار الشعب، شہر ندارد، ۱۹۷۰م) ۳: ۵۸۵

[۷۵]	امام بخاری: کتاب، باب مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳۶۹۹

[۷۶]	ایضاً

[۷۷]	ایضاً

[۷۸]	محمد بن عبداللہ حاکم، امام: المستدرک (دار الباز، مکۃ المکرمہ، س۔ن) ۳: ۱۰۲ او امام ابن حنبل: المسند، ۱: ۵۹ وامام ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۳: ۷۲

[۷۹]	امام ترمذی، ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب فی عد عثمان تسمیۃ شھیدا، حدیث: ۳۷۰۱، ۳۷۰۳

[۸۰]	امام حاکم: المستدرک، ۳: ۱۴۵

[۸۱]	کیونکہ غزوہ بدر کے بعد اکثر و بیشتر غزوات میں کفار مکہ کی سپاہ کے قائد و جرنیل ابوسفیان تھے اور وہ اموی تھے (شاہ معین الدین، ندوی: تاریخ الاسلام، ادارہ نشریات اسلام، لاہور س۔ن) ص ۳۴۸

[۸۲]	امام ابن سعد: الطبقات الکبری ۳: ۵۶

[۸۳]	جلال الدین سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۱۳۸

[۸۴]	امام ابن حنبل: مسند احمد، ۱: ۶۹

[۸۵]	محمد بن ابوبکر، ابن قیم، امام: الطرق الحکمیۃ (دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور، س۔ن) ص ۳۰

[۸۶]	ایضاً، ص ۳۰

[۸۷]	امام ابن سعد: الطبقات الکبری، ۳: ۲۰۰ و ابن الجوزی، امام: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۶۸

[۸۸]	امام ابن سعد: الطبقات الکبری، ۳: ۱۹ ''ابوتراب'' کنیت کے لیے دیکھیے: امام حاکم: المستدرک، ۳: ۱۴۱

[۸۹]	حافظ ابن حجر: الاصابۃ، ۲: ۵۰۱

[۹۰]	امام حاکم: المستدرک، ۳: ۱۱۲

[۹۱]	امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۲: ۳۱۹۔۳۲۰

[۹۲]	امام ابن سعد: الطبقات الکبری، ۳: ۲۲

[۹۳]	ایضاً، ۳: ۲۲

[۹۴]	امام سیوطی، جلال الدین: تاریخ الخلفاء ص ۱۵۶

[۹۵]	امام ابن سعد: الطبقات الکبری، ۳: ۲۳

[۹۶]	محمد علی صابونی: التبیان فی علوم القرآن (مکتبۃ الغزالی، دمشق، ۱۹۸۱ء) ص ۴۸

[۹۷]	محمد بن احمد، القرطبی، امام: الجامع الاحکام القرآن (دار الکاتب العربی، قاھرۃ، ۱۹۶۷ء) ۱۶: ۲۷۵

[۹۸]	امام ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۳: ۳۶

[۹۹] امام ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ ۴:۹۳

[۱۰۰] امام ابن حنبل: المسند، ۱:۸۵

[۱۰۱] شاہ ولی اللہ، امام: ازالۃ الخفاء (مترجم: مولانا اشتیاق احمد دیوبندی) (قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن) ۴:۴۴۱

[۱۰۲] ابوالحسن علی، ندوی، سید، مولانا: المرتضیٰ رضی اللہ عنہ (مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۱ء) ص ۳۳۷

[۱۰۳] امام ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۳:۳۶

[۱۰۴] امام ابن حنبل، ۱:۸۳

[۱۰۵] حافظ ابن قیم: زادالمعاد، ۱:۴۲۱ بحوالہ سید ابوالحسن علی ندوی: المرتضیٰ، ص ۳۳۸۔۳۳۹

[۱۰۶] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب الصلوۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی الرخصۃ فی السمر بعد العشاء، حدیث: ۱۶۹

[۱۰۷] صفی الرحمٰن، مبارکپوری، مولنا: اتحاف الکرام شرح بلوغ المرام (دارالکتب، پشاور، س۔ن) ص ۵۷

[۱۰۸] مسلم بن حجاج، القشیری، امام: صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنۃ قطعاً، حدیث: ۱۴۷

[۱۰۹] محمد قطب الدین خان، نواب، دہلوی: مظاہر حق جدید شرح مشکوۃ المصابیح (دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۹۴ء) ۱:۱۲۷

[۱۱۰] امام بخاری: کتاب فضائل قرآن، باب جمع القرآن، حدیث: ۴۹۸۶

[۱۱۱] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۶۹

[۱۱۲] امام مسلم: صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب تاخیر الحد عن النفساء، حدیث: ۴۴۵۰۔۴۴۵۱ و امام ابن قدامہ: المغنی (مکتبہ الریاض الحدیثہ، الریاض ۱۹۸۱ء) ۸:۱۷۲

[۱۱۳] احمد بن حسین بیہقی، ابوبکر، امام: السنن الکبریٰ (دارالفکر، بیروت، س۔ن) ۱۰:۲۶۷ و محمد بن ادریس، شافعی، امام: الأم (مکتبۃ الکلیات الازہریۃ، مصر، ۱۹۶۱ء) ۷:۱۷۷، ۱۷۸

[۱۱۴] امام ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ۸:۲۱۴

[۱۱۵] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب فضل ابی بکر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: ۳۶۵۵

[۱۱۶] ایضاً، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد، حدیث ۴۰۴۳

[۱۱۷] ایضاً، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: ۳۶۷۱

[۱۱۸] ایضاً، حدیث: ۳۶۵۹

[۱۱۹] ایضاً، حدیث: ۳۶۶۳، ۲۳۲۴

[۱۲۰] ایضاً، حدیث باب قول النبی ﷺ لوکنت متخذ اخلیلا، حدیث: ۳۶۵۸

[۱۲۱] ایضاً، حدیث: ۳۶۶۲

[۱۲۲] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر، حدیث: ۳۶۶۲

[۱۲۳] ایضاً، باب قولہ ﷺ ان الشیطان لیخاف منک یا عمر، حدیث: ۳۶۹۰

[۱۲۴] ایضاً، باب فی عدعثمان تسمیۃ شہیدا، حدیث: ۳۷۰۴

[۱۲۵] ایضاً، باب حدیث غریب: انادار الحکمۃ، حدیث: ۳۷۲۴

[۱۲۶] طہ جابر، العلوانی، ڈاکٹر: اصول الفقہ الاسلامی (المعہد العالمی، امریکہ، ۱۹۹۵م) ص ۲۶

[۱۲۷] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین، حدیث: ۷۱

[۱۲۸] عبید اللہ، مبارکپوری، مولانا: مرعاۃ المفاتیح (مکتبۃ الاثریہ، سانگہ ہل، شیخوپورہ، س۔ن) ۱: ۳۰۴

[۱۲۹] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ھجرۃ النبی ﷺ واصحابہ الی المدینۃ، حدیث: ۳۹۰۴

[۱۳۰] معین الدین، ندوی: خلفاء راشدین ص ۷۱

[۱۳۱] النساء، ۴: ۱۲۳

[۱۳۲] امام حاکم: المستدرک، ۳: ۷۴

[۱۳۳] معین الدین، ندوی: خلفاء راشدین ص ۷۲

[۱۳۴] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی ﷺ، حدیث: ۱۱۰

[۱۳۵] علی متقی، امام: کنز العمال ۱۰: ۲۹۵

[۱۳۶] شاہ ولی اللہ: ازالۃ الخفاء، ۳: ۲۲۔۲۳

[۱۳۷] جلال الدین سیوطی: تاریخ الخلفاء، ص ۱۵۷

[۱۳۸] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳۶۸۱

[۱۳۹] ایضاً، کتاب العلم، باب التناوب فی العلم، حدیث: ۸۹

[۱۴۰] شاہ ولی اللہ، امام: حجۃ اللہ البالغۃ (المکتبۃ السلفیہ، لاہور) ۱: ۱۳۲

[۱۴۱] ان تمام اقوال اور مزید اقوال کے لیے بھی دیکھیے: محمد بن ابوبکر، ابن قیم، امام: اعلام الموقعین (دار الجیل،

بیروت، ۱۹۷۳م)۱:۱۶، ۲۰

[۱۴۲] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم، حدیث ۷۹:

[۱۴۳] بدرالدین، عینی، علامہ: عمدۃ القاری (ناشر و تاریخ ندارد)۱:۴۶۹

[۱۴۴] امام ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۳:۷۸

[۱۴۵] عبدالوہاب النجار: الخلفاء الراشدون (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، س۔ن) ص ۲۶۵

[۱۴۶] محمد بن ادریس شافعی، امام: مسند شافعی (دار الکتب الملکیۃ مصریۃ، مصر، ۱۹۵۱م) ص ۲۳۳

[۱۴۷] عبداللہ بن عبدالرحمٰن، دارمی، امام: سنن دارمی (نشر السنۃ، ملتان، س۔ن) ۲:۲۴۷

[۱۴۸] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱:۱۸ و امام ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ۳:۶۰

[۱۴۹] معین الدّین، ندوی: خلفاء راشدین، ص ۲۱۴

[۱۵۰] شاہ ولی اللہ: ازالۃ الخفاء، ۴:۴۹۸

[۱۵۱] امام ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ۲:۳۳۸

[۱۵۲] علی بن احمد، ابن حزم، ابومحمد، امام: المحلی (ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر، ۱۳۴۹ھ)۷:۷۵، ۷۶

[۱۵۳] امام ابن حنبل: المسند، ۱:۹۶، ۶:۵۵

[۱۵۴] عبدالرزاق بن ہمام، امام: المصنف (المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۷۲م)۹:۲۶۳

[۱۵۵] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب فکاک الاسیر، حدیث: ۳۰۴۷

[۱۵۶] امام ابن عبدالبر، الاستیعاب، ۳:۳۶

[۱۵۷] محمد بن عبدالکریم، شہرستانی، امام: الملل والنحل (دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۷۵م)۱:۱۶۳

[۱۵۸] شمس الدین، ابوعبداللہ، ذہبی، امام: تذکرۃ الحفاظ (دار احیاء التراث العربی، من مطبوعات دائرۃ المعارف العثمانیہ، س۔ن)۱:۲۴

[۱۵۹] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۳۹

[۱۶۰] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۹۰

[۱۶۱] امام ابن سعد: الطبقات الکبری، ۲:۳۳۹

[۱۶۲] محمد بن حسن، شیبانی، امام: کتاب الآثار، باب فضائل الصحابۃ (ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۴۰۷ھ) ص ۱۹۰

[۱۶۳] احمد بن حسین ابوبکر، بیہقی، امام: السنن الکبری، ۸:۶۰ و امام ابن حزم: المحلی، ۱۰:۴۷۸

[۱۶۴] امام بیہقی: سنن بیہقی، ۶:۱۲۳ و امام عبدالرزاق: المصنف، ۹:۴۵۸۔۴۵۹

[۱۶۵] ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی: اصول الفقہ الاسلامی، ص ۲۸

[۱۶۶] امام دارمی: سنن دارمی، باب الفتیا و ما فیہ من الشدۃ، ص ۱: ۷۰

[۱۶۷] ایضاً

[۱۶۸] ایضاً

[۱۶۹] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۶۳

[۱۷۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ، حدیث: ۴۴۵۳

[۱۷۱] ایضاً، حدیث: ۴۴۵۴

[۱۷۲] معین الدین احمد، ندوی: خلفاء راشدین، ص ۲۷

[۱۷۳] المرجع السابق، حدیث: ۴۴۵۴

[۱۷۴] امام ابن قیم: اعلام الموقعین ۴: ۱۲۰

[۱۷۵] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب، حدیث: ۳۶۶۸

[۱۷۶] احمد بن علی، ابن حجر، عسقلانی، حافظ: فتح الباری (المطبعۃ السلفیۃ، القاھرۃ، ۱۳۸۰ھ) ۷: ۳۲

[۱۷۷] ایضاً

[۱۷۸] اسماعیل بن کثیر، حافظ: البدایہ والنھایہ (دار ابی حیان، قاہرہ، ۱۹۹۶م) ۵: ۳۰۶

[۱۷۹] ایضاً

[۱۸۰] مالک بن انس، امام: الموطا، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی دفن المیت (داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵م) ۱: ۲۳۲

[۱۸۱] سورۃ النساء، ۴: ۱۱-۱۲

[۱۸۲] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس، باب فرض الخمس، حدیث: ۳۰۹۳

[۱۸۳] امام بیہقی: السنن الکبری، ۶: ۳۰۱

[۱۸۴] امام مالک: موطا مالک، کتاب الفرائض، باب میراث الجدۃ ۲: ۵۲

[۱۸۵] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث الجد مع الاب و الاخوۃ، ترجمۃ الباب و حدیث: ۶۷۳۸

[۱۸۶] امام بیہقی: السنن الکبری، ۶: ۱۲۰

[۱۸۷] محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: فقہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (مترجم: مولانا عبدالقیوم) (ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۸۹م) ص ۳۴۰

[۱۸۸] البقرۃ۲:۲۳۳

[۱۸۹] عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر (مرتب): علم اصول فقہ (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۶م) ۱: ۳۵۹ و مصطفیٰ جمال الدین: القیاس حقیقتہ وحجیتہ (مطبعہ النعمان، النجف، ۱۹۷۰م) ص۳۹۶_۳۹۹

[۱۹۰] محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: فقہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، ص۳۴

[۱۹۱] سورۃ القصص، ۲۸: ۲۷_۲۸

[۱۹۲] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث: ۴۹۸۶

[۱۹۳] عبداللہ محفوظ محمد الحداد: السنۃ والبدع (دارالقلم، دمشق، ۱۹۹۹م) ص۱۲۱_۱۲۲

[۱۹۴] البینۃ، ۹۸: ۲

[۱۹۵] عرفان خالد، ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ، ۱: ۴۳۴

[۱۹۶] محمد تقی امینی، مولانا: احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، س۔ن) ص۱۶۳

[۱۹۷] مصطفیٰ زید، ڈاکٹر: المصلحۃ فی التشریع الاسلامی ونجم الدین الطّوفی (دارالفکر العربی، قاہرہ، ۱۹۶۴م) ص ۲۹_۳۲

[۱۹۸] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص۶۹

[۱۹۹] امام ابن قیم: الطرق الحکمیہ ص۱۵

[۲۰۰] امام بیہقی: السنن الکبریٰ، ۸: ۲۳۲_۲۳۳

[۲۰۱] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب لایعذّب بعذاب اللہ، حدیث ۳۰۱۶_۳۰۱۷، ۶۹۲۲

[۲۰۲] حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ، ۶: ۳۱۹

[۲۰۳] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۴: ۱۲۰

[۲۰۴] محمد رواس، قلعہ جی، ڈاکٹر، فقہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (مترجم: مولانا عبدالقیوم) ص۱۸

[۲۰۵] امام ابن قیم: اعلام الموقعین ۱: ۶۲

[۲۰۶] ابو یوسف، قاضی: کتاب الخراج (طبع بولاق، ۱۳۰۲ھ) ص۲۷

[۲۰۷] سورۃ الحشر، ۵۹: ۷_۱۰

[۲۰۸] ابوالاعلیٰ، مودودی، سید: تفہیم القرآن (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۴م) ۵: ۴۰۰

[۲۰۹] قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۲۷

[۲۱۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الرمل فی الحج والعمرۃ، حدیث: ۱۶۰۵

[۲۱۱] ایضاً

[۲۱۲] ابراہیم بن موسی شاطبی، امام: الموافقات (دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن) ۴: ۱۷

[۲۱۳] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم والاستئذان ثلاثا، حدیث: ۶۲۴۵

[۲۱۴] ایضاً، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول اللہ تعالیٰ وامرھم شوریٰ بینھم، ترجمۃ الباب۔

[۲۱۵] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱: ۶۲

[۲۱۶] خزانۃ الادب، ۱: ۲۳۸ بحوالہ محمد تقی امینی: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت ص ۱۵۵

[۲۱۷] امام بیہقی: السنن الکبری، ۷: ۴۰

[۲۱۸] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۶۹

[۲۱۹] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الاحکام باب الاستخلاف، حدیث: ۷۲۱۸

[۲۲۰] نادیہ شریف، العمری، ڈاکٹر: اجتہاد الرسول ﷺ (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۷ء) ص ۲۹۹۔۳۰۰

[۲۲۱] علی بن عمر، دارقطنی، امام: سنن الدارقطنی (مع التعلیق المغنی) (نشر السنۃ، ملتان، س۔ن) ۴: ۲۰۶

[۲۲۲] عبدالسلام، ندوی، مولانا: سیر الصحابۃ (ادارہ اسلامیات، لاہور، س۔ن) جلد ۵ حصہ ۹ صفحہ ۲۵۹

[۲۲۳] عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر: علم اصول فقہ، ۳: ۸۳

[۲۲۴] امام عبدالرزاق: المصنف، ۱۰: ۲۴۳

[۲۲۵] چنانچہ درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں: البقرۃ ۲: ۱۷۳، الانعام، ۶: ۱۴۵، النحل، ۱۶: ۱۱۵

[۲۲۶] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ ص ۳۰۶ و محمد حمید اللہ، ڈاکٹر: خطبات بہاول پور (ادارہ تحقیقات اسلامی، جا اسلام آباد، ۱۹۹۵ء) ص ۱۲۴

[۲۲۷] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب الحدود، باب ماجاء ان لا یقطع الایدی فی الغزو، حدیث: ۱۴۵۰

[۲۲۸] عبدالعظیم شرف الدین، ڈاکٹر: تاریخ التشریع الاسلامی (جامع قاریونس، بنغازی، ۱۹۹۳ء) ص ۹۹۔۱۰۰

[۲۲۹] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ ص ۳۰۶

[۲۳۰] امام عبدالرزاق: المصنف، ۱۰: ۲۴۹ و عبداللہ بن محمد، ابن ابی شیبہ، امام: المصنف (دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء) ۷: ۳۳۴ و امام بیہقی: السنن الکبری ۶: ۲۵۵

[۲۳۱] عرفان خالد، ڈھلوں: علم اصول فقہ، ۱: ۴۵۲

[۲۳۲] امام ابن ابی شیبہ: المصنف ۷: ۳۳۴

[۲۳۳] کیونکہ استحسان سے مراد ہے ''قیاس جلی کو چھوڑ کر قیاس خفی کو اختیار کرنا یا کسی حکم اور اصل کلی سے کسی ایک جزئیہ کا استثناء کرنا''۔ (عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر: الوجیز فی اصول الفقہ، فاران اکیڈمی، لاہور، س۔ن، ص ۲۳۱)

[۲۳۴] زرقاء، مصطفی احمد: المدخل الفقہی العام (دار الفکر، دمشق، ۱۹۶۸م) ۱:۸۹

[۲۳۵] عبدالکریم زیدان: الوجیز فی اصول الفقہ، ص ۲۵۰

[۲۳۶] سورۃ النور، ۲۴: ۳۰۔۳۱

[۲۳۷] سورۃ الانعام، ۶: ۱۰۸

[۲۳۸] امام مسلم: صحیح مسلم، کتاب الحج، باب سفر المراۃ مع محرم الی حج وغیرہ، حدیث: ۳۲۷۲

[۲۳۹] ابن تیمیہ، امام: السیاسۃ الشرعیہ (وزارۃ الشوون الاسلامیہ، الریاض، ۱۴۱۸ھ) ص ۱۱۲

[۲۴۰] محمد بن اسماعیل، صنعانی، امام: سبل السلام شرح بلوغ المرام (جمعیہ احیاء التراث الاسلامی، کویت، ۲۰۰۰م) ۴: ۱۹۶

[۲۴۱] عبدالکریم زیدان: الوجیز فی اصول الفقہ، ص ۲۴۹

[۲۴۲] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ ص ۳۱۱

[۲۴۳] امام ابن قیم: الطرق الحکمیہ، ص ۱۶

[۲۴۴] سید مودودی: الجہاد فی الاسلام (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۳م) ص ۲۲۷

[۲۴۵] امام عبدالرزاق: المصنف، ۶: ۲۶۵ وحافظ ابن حزم: المحلی، ۱۰: ۱۸۱، ۱۱: ۲۴۹ وامام ابن قدامۃ: المغنی، ۶: ۶۴۶

[۲۴۶] امام قرطبی: تفسیر القرطبی، ۱۶: ۲۷۴۔۲۷۸ بحوالہ نادیہ شریف، العمری، ڈاکٹر: اجتہاد الرسول ﷺ ص ۳۱۱

[۲۴۷] جس طرح کہ قوم نوح نیک اور صلحاء افراد کی محبت وعقیدت میں غلو کا شکار ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ انہی کی عبادت کرنے لگے (جلال الدین سیوطی: الدر المنثور، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۳م، ۸: ۲۹۳۔۲۹۴)

[۲۴۸] محمد بن ابوبکر، ابن قیم، امام: اغاثۃ اللہفان (المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۹۸م) ۱: ۳۱۹

[۲۶۹] محمد بن علی، شوکانی، امام: ارشاد الفحول (محل محمد امین، مصر، ۱۳۲۷ھ) ص ۲۲۰

[۲۵۰] قرآن و حدیث سے اس کے دلائل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو: عرفان خالد ڈھلوں: علم اصول فقہ ۱: ۴۸۲۔۴۸۳ وعبدالکریم زیدان، الوجیز فی اصول الفقہ، ص ۲۱۷

[۲۵۱] مالک بن انس، امام: الموطا، کتاب الطہارۃ، باب الطہور للوضوء، ۱: ۷ اوامام شاطبی: الموافقات، ۴: ۳۲۰

[۲۵۲] عبدالسلام، ندوی: سیر الصحابۃ جلد ۵، حصہ ۹، صفحہ ۲۵۷

[۲۵۳] القضاء فی الاسلام، ص ۱۰۴ بحوالہ محمد تقی امینی: اجتہاد (قدیمی کتب خانہ کراچی، س۔ن) ص ۴۵

[۲۵۴] امام بیہقی: السنن الکبریٰ ۸: ۴۱ وامام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب اذا اصاب قوم من رجل ھل یعاقب اویقتص منھم کلھم، حدیث: ۶۸۹۶

[۲۵۵] ابراہیم بن موسیٰ، ابواسحٰق، شاطبی، امام: الاعتصام (دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن) ۲: ۱۲۵

[۲۵۶] عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیہ (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۰م) ص ۱۰۵

[۲۵۷] امام ابن حزم: المحلی، ۱۰: ۱۳۶

[۲۵۸] مصطفیٰ احمد زرقا: المدخل الفقہی العام، ۱: ۱۶۱

[۲۵۹] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ ص ۳۰۷۔۳۰۸

[۲۶۰] علی بن ابی الکرم، ابن اثیر، امام: الکامل فی التاریخ (دار صادر، بیروت، ۱۹۶۵ء) ۲: ۵۳۷

[۲۶۱] ایضاً وامام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۴: ۶۸۔۶۹

[۲۶۲] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ ص ۳۰۷

[۲۶۳] قاسم بن سلام، امام: کتاب الاموال (تصحیح وتعلیق: محمد حامد الفقی) (ناشر ندارد) ص ۱۵۲

[۲۶۴] ابو یوسف، قاضی، امام: کتاب الخراج، ۲۸

[۲۶۵] محمد تقی امینی: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص ۹۱

[۲۶۶] ان اسباب بارے تفصیل جاننے کے لیے باب سوم کی فصل اول ملاحظہ ہو۔

[۲۶۷] اہلِ دیوان سے مراد ایک ہی محکمہ کے وہ لوگ جن کے نام ایک دیوان (رجسٹر) میں درج کر لیے جاتے تھے (محمد تقی امینی: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص ۱۸۴)

[۲۶۸] شمس الدین، سرخسی، امام: المبسوط (دار المعرفہ، بیروت، س۔ن) ۲۷: ۱۲۵۔۱۲۶

[۲۶۹] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول ﷺ ص ۲۵۷

[۲۷۰] امام ابن قیم: الطرق الحکمیہ، ص ۲۴۔۲۵

[۲۷۱] سورۃ التوبہ، ۹: ۶۰

[۲۷۲] مجیب اللہ ندوی، مولانا: اجتہاد اور تبدیلی احکام (مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، س۔ن) ص ۸۴۔۸۵

[۲۷۳] محمد رشید رضا: تفسیر المنار (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ۱۰: ۴۹۴۔۴۹۵

[۲۷۴] مصطفیٰ احمد، زرقاء: المدخل الفقہی العام، ۱: ۱۵۹

[۲۷۵] مجیب اللہ ندوی: اجتہاد اور تبدیلی احکام، ص ۸۴۔۸۵

[۲۷۶] امام بیہقی: السنن الکبریٰ، ۷: ۲۰ وامام طبری: تفسیر الطبری، جامع البیان عن تاویل آی القرآن (مکتبہ ومطبعہ مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۹۵۴ء) ۱۰: ۱۶۳

[۲۷۷] مثلاً رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "تم میں سے کسی کا اپنی رسی پکڑ کر اپنی پشت پر لکڑیوں کا گٹھا لانا اور پھر بیچ کر اپنی ضرورت پوری کرنا لوگوں سے سوال کرنے سے بہت بہتر ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۴۷۱)

[۲۷۸] مجیب اللہ ندوی: اجتہاد اور تبدیلی احکام، ص ۱۴۱۔۱۴۲

[۲۷۹] امام مسلم: صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب لا زکاۃ علی المسلم فی عبدہ وفرسہ، حدیث: ۲۲۷۳

[۲۸۰] المرجع السابق، ص۱۴۲

[۲۸۱] امام قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ص۴۶۴، ۴۶۵

[۲۸۲] البقرۃ، ۲:۲۶۷

[۲۸۳] ابوداود، سلیمان بن اشعث، امام: سنن ابی داود، کتاب الزکوۃ، باب العروس اذا کانت للتجارۃ، حدیث:۱۵۶۲

[۲۸۴] امام بیہقی: السنن الکبری، ۹:۲۹

[۲۸۵] امام ابن قدامہ: المغنی، ۷:۳۰۱

[۲۸۶] سورۃ البقرۃ، ۲:۲۲۶

[۲۸۷] سورۃ المائدۃ، ۵:۵

[۲۸۸] احمد بن علی، الرازی، جصاص، امام: احکام القرآن (دارالکتاب العربی، بیروت، س۔ن) باب تزویج الکتابیات، ۲:۳۲۴

[۲۸۹] محمد بن حسن، الشیبانی، امام: کتاب الآثار، ص۸۹

[۲۹۰] المرجع السابق

[۲۹۱] محمد بن عبدالواحد، ابن ہمام، امام: شرح فتح القدیر (مکتبہ التجاریۃ الکبری، مصر، س۔ن) ۲:۳۷۲ وامام حصاص: احکام القرآن، ۲:۳۲۵

[۲۹۲] سورۃ المائدہ، ۵:۵

[۲۹۳] مجیب اللہ ندوی: اجتہاد اور تبدیلی احکام، ص۱۴۰

[۲۹۴] امام ابن اثیر: الکامل، ۲:۵۵۵

''رماد'' خاک اور راکھ کو کہتے ہیں جبکہ ''مجاعۃ'' بھوک کو۔ چونکہ اس قحط میں ایک عرصہ تک بارش نہ ہونے کی وجہ سے ہر طرف خاک اڑتی رہتی تھی اور بھوک کی شدّت سے لوگوں کے چہروں اور جسم کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا لہٰذا اس سال کو ''عام الرمادۃ'' اور ''عام المجاعۃ'' کہا جاتا ہے۔ (مجیب اللہ ندوی: اجتہاد اور تبدیلی احکام، ص۱۰۸)

[۲۹۵] ایضاً

[۲۹۶] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ص ۸۸

[۲۹۷] سورۃ المائدۃ، ۵:۳۸

[۲۹۸] سورۃ النحل، ۱۶:۱۰۶

[۲۹۹] سورۃ البقرۃ، ۲:۱۷۳، الانعام، ۶:۱۴۵

[۳۰۰] محمد عمیم الاحسان، مفتی: قواعد الفقہ (الصدف پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۲م) ص۸۹

[۳۰۱] امام علی متقی: کنز العمال، ۵:۳۰۹

[۳۰۲] مصطفیٰ احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام،۱: ۱۵۹

[۳۰۳] مصطفیٰ زید: المصلحہ فی التشریع الاسلامی ونجم الدین الطوفی ص۲۹_۳۲

[۳۰۴] انیس احمد، ڈاکٹر: جدیدیت، تجدید اور اسلام، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، (جلد ۱۲۸، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۰۱م) ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ص ۴۲

[۳۰۵] فضل الرحمٰن، ڈاکٹر: اسلام اور جدیدیت (مترجم: محمد کاظم) (مشعل عوامی کمپلیکس، لاہور، ۱۹۹۸م) ص۱۱_۱۲

[۳۰۶] شعیب احمد: اسلام اور جدت پسندی، ہفت روزہ الاعتصام (جلد ۵۸، شمارہ ۱۹ تا ۲۴ مئی ۲۰۰۶م) دار الدعوہ السّلفیہ، لاہور، ص ۲۶

[۳۰۷] ساجد الرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر: اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل (ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۷م) ص ۲۰۷_۲۰۸

[۳۰۸] عبدالوہاب النجار: الخلفاء الراشدون، ص۲۴۴_۲۴۵

[۳۰۹] شبلی نعمانی: الفاروق ص۲۵۲_۲۵۳

[۳۱۰] ایضاً، ص ۳۱۰

[۳۱۱] ایضاً، ص ۲۱۰

[۳۱۲] ایضاً، ص ۳۰۹

[۳۱۳] طٰہٰ جابر العلوانی، ڈاکٹر: اصول الفقہ الاسلامی، ص ۲۷

[۳۱۴] امام ابن سعد: الطبقات الکبری، ۳: ۷۵

[۳۱۵] امام عبدالرزاق: المصنف، ۷: ۱۸۹

[۳۱۶] سورۃ المومنون، ۲۳: ۵_۶

[۳۱۷] سورۃ النساء، ۴: ۲۳

[۳۱۸] امام عبدالرزاق: المصنف، ۷: ۱۸۹

[۳۱۹] امام مسلم: صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات، حدیث: ۴۰۹۴

[۳۲۰] امام ابن حزم: المحلی، ۵: ۱۵۱

[۳۲۱] محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (دار النفائس، بیروت، ۱۹۹۱م) ص ۲۲_جبکہ حدیث میں مذکور واقعہ کا حوالہ حسب ذیل ہے: امام ابن ماجہ: سنن ابن ماجہ: ابواب المناسک، باب المحرم یموت، حدیث: ۳۰۸۴

[۳۲۲] امام علی متقی: کنز العمال: ۱۰: ۲۹۵

[۳۲۳] عبدالوہاب النجار: الخلفاء راشدون، ص ۲۵۶_۲۵۷

[۳۲۴] محمد رواس قلعہ جی: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص ۹۵

[۳۲۵] امام عبد الرزاق: المصنف، ۹: ۳۰۹-۳۱۰

[۳۲۶] المرجع السابق، ص ۱۰۴

[۳۲۷] امام ابن ماجہ: سنن ابن ماجہ: ابواب الفرائض، باب میراث اھل الاسلام من اھل الشرک، حدیث: ۲۷۲۹

[۳۲۸] امام عبد الرزاق: المصنف، ۶: ۲۶ سعید بن منصور، امام: سنن سعید بن منصور (دار الکتب العلمیہ، بیروت، س۔ن) ۱: ۷۵

[۳۲۹] امام ابن کثیر: البدایۃ والنھایۃ، ۷: ۱۴۸

[۳۳۰] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱: ۸۴

[۳۳۱] امام بیہقی: السنن الکبری، ۱۰: ۱۱۲

[۳۳۲] حمیل سے مراد وہ بچہ ہے جو کافرہ عورت قید میں ساتھ لے کر آئی ہو اور اس کا یہ دعوی ہو کہ یہ اسی کا ہے۔ (محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص ۲۸)

[۳۳۳] امام علی متقی: کنز العمال، ۱۱: ۷۰

[۳۳۴] امام ابن حزم: المحلی، ۱۱: ۱۱۴ حافظ ابن کثیر: البدایۃ والنھایۃ، ۷: ۱۴۹، امام بیہقی: السنن الکبری، ۸: ۶۲

[۳۳۵] مصطفی احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام، ۱: ۶۵-۶۶

[۳۳۶] محمد بن اسمعیل، صنعانی، امام: سبل السلام شرح بلوغ المرام (جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی، کویت، ۱۹۹۷م) ۱: ۱۹۲

[۳۳۷] امام ابن حنبل: المسند، ۱: ۳۸۶

[۳۳۸] المرجع السابق

[۳۳۹] حافظ ابن حجر: فتح الباری، ۲: ۳۹۴

[۳۴۰] عبد اللہ محفوظ: السنۃ والبدعۃ، ص ۱۳۲

[۳۴۱] امام ابن حنبل: المسند، ۲: ۴۴۰

[۳۴۲] حافظ ابن حجر: فتح الباری، ۹: ۱۶-۲۰ محمد عبد العظیم، زرقانی، شیخ: مناھل العرفان فی علوم القران (دار احیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن) ۱: ۲۴۸

[۳۴۳] امام شاطبی: الاعتصام ۲: ۱۱۷

[۳۴۴] سلیمان بن عبد اللہ، ڈاکٹر: مقدمہ فی الفقہ (دار العاصمہ، الریاض، ۱۹۹۷م) ص ۸۱

[۳۴۵] ایضاً و عبد اللہ محفوظ: السنۃ والبدعۃ، ص ۱۳۲

[۳۴۶] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، باب الاذان یوم الجمعۃ، حدیث: ۹۱۲

[۳۴۷] مگر حضرت عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اذان صرف ایک ہی دی جاتی تھی البتہ اذان سے کچھ دیر پہلے لوگوں کو محض جمعہ کے لیے پکارا جاتا تھا۔ (امام عبد الرزاق: المصنف، ۳: ۲۰۶)

[۳۴۸] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فی اللقطۃ، باب ضالۃ الغنم، حدیث: ۲۴۲۸

[۳۴۹] عبد الکریم زیدان: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ، ص۱۰۴ و محمد رواس قلعہ جی: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص ۲۶۵

[۳۵۰] امام ابن حزم: المحلی، ۸: ۲۷۱

[۳۵۱] عبد الکریم زیدان: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ، ص۱۰۴

[۳۵۲] احمد بن شعیب، نسائی امام: سنن نسائی، کتاب الاذان، باب اتخاذ المومن لا یاخذ علی اذانہ اجرا، حدیث: ۶۷۳

[۳۵۳] امام بیہقی: السنن الکبری، ۱: ۴۲۹

[۳۵۴] عبد اللہ محفوظ: السنۃ والبدعۃ، ص۱۳۴

[۳۵۵] امام ابن حزم: المحلی، ۱۰: ۲۱۸۔۲۱۹

[۳۵۶] عبد الکریم زیدان: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ، ص۱۰۵

[۳۵۷] محمد رواس قلعہ جی: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص۲۹

[۳۵۸] محمد تقی امینی: اجتہاد، ص۲۱۹

[۳۵۹] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث: ۴۹۸۷

[۳۶۰] طٰہٰ جابر العلوانی: اصول الفقہ الاسلامی، ص۲۹

[۳۶۱] امام ابن سعد، الطبقات الکبری، ۲: ۳۳۸

[۳۶۲] امام ابن قدامۃ: المغنی، ۹: ۱۷۱

[۳۶۳] سورۃ المائدۃ، ۵: ۹۰

[۳۶۴] محمد حنیف ندوی، مولانا: مسئلہ اجتہاد (علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶م) ص۱۶۳

[۳۶۵] سورۃ یوسف، ۱۲: ۴۰

[۳۶۶] سورۃ النساء، ۴: ۳۵

[۳۶۷] امام بن حنبل: المسند، ۱: ۸۶

[۳۶۸] سورۃ الاحقاف، ۴۶: ۱۵

[۳۶۹] سورۃ البقرۃ، ۲: ۲۳۳

[۳۷۰] امام عبد الرزاق: المصنف، ۷: ۳۵۰

[۳۷۱] امام ابن عبد البر: الاستیعاب، ۳: ۴۰

[۳۷۲] امام طبری: تاریخ الطبری (اردو ترجمہ: سید محمد ابراہیم ندوی) نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۰ء م) ۳: ۲۸۷

[۳۷۳] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب الحدود، باب فی المجنون یسرق او یصیب حدا، حدیث: ۴۳۹۹

[۳۷۴] سورۃ الانفال، ۸: ۴۱

[۳۷۵] محمد رواس قلعہ جی: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص ۲۳۸

[۳۷۶] اسماعیل بن کثیر، حافظ: تفسیر القرآن العظیم، ۲: ۴۱۱

[۳۷۷] محمد شفیع، مفتی: معارف القرآن (ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۸۵ء م) ۴: ۲۴۰

[۳۷۸] محمد رواس قلعہ جی: فقہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، ص ۲۲۳

[۳۷۹] ایضاً: فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ص ۶۲۰

[۳۸۰] حافظ ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۲: ۴۱۳

[۳۸۱] امام عبد الرزاق: المصنف، ۵: ۲۳۸

[۳۸۲] محمد رواس قلعہ جی: فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ص ۳۳۴۔۳۳۵

[۳۸۳] امام بیہقی: السنن الکبری، ۱۰: ۱۲۰

[۳۸۴] امام ابن قدامۃ: المغنی، ۹: ۵۷

[۳۸۵] ایضاً، ۶: ۴۲۷

[۳۸۶] ایضاً، ۷: ۴۹۹ و امام بیہقی: السنن الکبری، ۷: ۴۴۷

[۳۸۷] بعض روایات میں قاتلوں کی تعداد اس سے کم بیان کی گئی ہے۔ (محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ص ۲۴۳)

[۳۸۸] امام عبد الرزاق: المصنف، ۹: ۴۷۵

[۳۸۹] طہ جابر العلوانی: اصول الفقہ الاسلامی، ص ۲۹

[۳۹۰] امام ابن قدامۃ: المغنی، ۸: ۳۰۷

[۳۹۱] المرجع السابق، ص ۲۹

[۳۹۲] عبد الکریم زیدان: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ، ص ۱۰۱

[۳۹۳] امام بیہقی: السنن الکبری، ۶: ۱۲۲ و امام ابن حزم: المحلی ۸: ۲۰۲

[۳۹۴] امام شاطبی: الاعتصام ۲: ۱۱۹

[۳۹۵] مصطفیٰ زید: المصلحۃ فی التشریع الاسلامی ونجم الدین الطوفی، ص ۳۰۔۳۱

[۳۹۶] ابن عساکر، حافظ: تاریخ دمشق، ترجمہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، رقم ۱۲۱۷ بحوالہ محمد رواس قلعہ: فقہ حضرت

علی رضی اللہ عنہ (مترجم : مولنا عبد القیوم) (ادارہ معارف اسلامی ، لاہور ۲۰۰۲م) : ص ۳۴۸ وابن قیم : الطرق الحکمیۃ ، ص ۱۹

[۳۹۷] عبد الوہاب خلاف : علم اصول الفقہ (دار القلم ، کویت ، ۱۹۷۸م) ص ۸۶

[۳۹۸] طٰہٰ جابر العلوانی : اصول الفقہ الاسلامی ، ص ۲۹

[۳۹۹] سلیمان بن عبد اللہ ، ڈاکٹر : مقدمہ فی الفقہ ، ص ۸۱

[۴۰۰] جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے : ''من احتکر فھو خاطئ'' امام بیہقی : السنن الکبری ، ۶ : ۲۹

[۴۰۱] محمد رواس قلعہ جی : فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ، ص ۲۹

[۴۰۲] امام ابن ابی شیبۃ : المصنف ، ۵ : ۴۷ وامام ابن حزم ، حافظ : المحلی ، ۹ : ۶۵

[۴۰۳] المرجع السابق محمد رواس قلعہ جی ، ڈاکٹر : فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ، ص ۲۹

[۴۰۴] امام مالک : الموطا ، کتاب الضحایا ، باب ادخار لحوم الاضاحی ۲ : ۴۸۴

[۴۰۵] امام بیہقی : السنن الکبری ، ۹ : ۲۹۰ وامام ابن حزم : المحلی ، ۷ : ۳۸۵

[۴۰۶] وامام ابن حزم : المحلی ، ۷ : ۳۸۵

[۴۰۷] محمد رواس قلعہ جی : فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ، ص ۳۹۲

[۴۰۸] امام علی متقی : کنز العمال ، ۵ : ۳۰۹

[۴۰۹] یہ اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے شبہ ملکیت کو حد زنا کے اسقاط کے لیے معتبر تسلیم کیا ہے ۔ (محمد رواس قلعہ جی : فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ، ص ۳۹۳)

[۴۱۰] امام عبد الرزاق : المصنف ، ۷ : ۳۴۴ وعلی متقی : کنز العمال ، ۵ : ۴۳۵

[۴۱۱] محمد رواس قلعہ جی : فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ، ص ۳۹۳

[۴۱۲] امام عبد الرزاق : المصنف ، ۷ : ۳۴۴

[۴۱۳] امام ابن حزم : المحلی ، ۱۰ : ۱۳۸ ـ ۱۳۹ وبیہقی : السنن الکبری ، ۷ : ۴۴۴

[۴۱۴] محمد رواس قلعہ جی : فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ، ص ۴۰۷

[۴۱۵] اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مفقود الخبر کی بیوی بارے ایک دوسری رائے بھی مروی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ہے یعنی وہ چار سال تک انتظار کرے ۔ (امام ابن حزم : المحلی ، ۱۰ : ۱۳۷) معلوم ہوتا ہے شاید آپ رضی اللہ عنہ نے سابقہ قول سے رجوع فرمالیا تھا ۔

[۴۱۶] کلالہ کی تعریف بارے قولِ راجح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہی ہے کہ وہ جو لاولد بھی ہو اور اس کے باپ دادا بھی نہ ہوں ۔

[۴۱۷] امام ابن ابی شیبۃ : المصنف ، ۷ : ۴۰۲ وامام بیہقی : السنن الکبری ، ۶ : ۲۲۳

[۴۱۸] محمد بن احمد، سرخسی، امام: اصول السرخسی ،۲: ۱۰۷۔۱۰۸

[۴۱۹] شہزاد اقبال شام: ماخذ القیاس (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۴م) ص ۹

[۴۲۰] قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ص ۱۹۸

[۴۲۱] امام بیہقی: السنن الکبری، ۱۰: ۱۵۰ و ابن قیم: اعلام الموقعین ،۱: ۸۶

[۴۲۲] امام عبد الرزاق: المصنف، ۶: ۴۷۲

[۴۲۳] امام ابن حزم: المحلی ،۱۰: ۴۳۷

[۴۲۴] ایضاً ۷: ۱۷۱۔۱۷۲

[۴۲۵] ایضاً، ص ۱۷۲

[۴۲۶] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب الحدود، باب فی المجنون یسرق اویصیب حدا، حدیث: ۴۳۹۹

[۴۲۷] امام بیہقی: السنن الکبری، ۶: ۲۲۳ و امام ابن قدامۃ: المغنی، ۶: ۱۶۷

[۴۲۸] امام عبد الرزاق: المصنف ،۱۰: ۳۰۴ و امام بیہقی: السنن الکبری، ۶: ۲۲۳۔۲۲۴ و امام طبری: جامع البیان عن تاویل آی القرآن ۶: ۴۲

[۴۲۹] امام ابن حزم: المحلی ،۷: ۲۵۴

[۴۳۰] ایضاً۔

[۴۳۱] مسند زید، ۴: ۱۲۳ بحوالہ محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر، فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ: ص ۶۵۱

[۴۳۲] امام علی متقی: کنز العمال، ۵: ۴۶۹ و امام ابن قدامۃ: المغنی، ۸: ۱۸۸

[۴۳۳] ایضاً و شافعی، محمد بن ادریس، امام: الام (مکتبۃ الکلیات الازھریۃ، مصر، ۱۹۶۱م) ۷: ۱۸۳

[۴۳۴] امام ترمذی: جامع ترمذی، باب ماجاء فی المرتد، حدیث: ۱۴۵۸

[۴۳۵] امام بیہقی: السنن الکبری، ۷: ۱۶۴

[۴۳۶] ایضاً

[۴۳۷] عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر: علم اصول فقہ، ۱: ۴۱۰۔۴۱۴

[۴۳۸] سورۃ التوبۃ، ۹: ۱۱۹

[۴۳۹] امام ابن قیم: اعلام الموقعین ،۴: ۱۳۲

[۴۴۰] سورۃ آل عمران، ۳: ۱۱۰

[۴۴۱] عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر: علم اصول فقہ، ۱: ۴۱۵

[۴۴۲] سورۃ البقرۃ، ۲: ۱۴۳

[۴۴۳] امام شاطبی: الموافقات، ۴: ۴۷۔۷۶

[۴۴۴] سورۃ آل عمران، ۳:۱۰۱

[۴۴۵] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۴:۱۳۴

[۴۴۶] سورۃ السجدۃ، ۳۲:۲۴

[۴۴۷] المرجع السابق، ۴:۱۳۵

[۴۴۸] حافظ ابن حجر: تلخیص الحبیر (المکتبۃ الاثریہ، سانگلہ ہل، ۱۹۶۴م) ۴:۱۹۰

[۴۴۹] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۴:۱۳۷ اور امام شاطبی: الموافقات، ۴:۷۶

[۴۵۰] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۴:۱۳۷

[۴۵۱] امام شاطبی: الموافقات، ۴:۷۶ و امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۴:۱۳۸

[۴۵۲] محمد بن یزید، ابن ماجہ، امام: سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب اتباع سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین، حدیث: ۴۲ و امام ابوداود: سنن ابی داود، حدیث: ۴۶۰۷

[۴۵۳] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۴:۱۴۰ اور امام شاطبی: الموافقات، ۴:۶۔۷

[۴۵۴] امام شاطبی: الاعتصام، ۵۸ بحوالہ ڈاکٹر عزت علی عطیہ: البدعۃ تحدیدھا وموقف الاسلام منھا (دار الکتب العربی، بیروت، ۱۹۸۰م) ص ۱۵۳

[۴۵۵] شاہ محمد اسماعیل، شہید: ایضاح الحق الصریح (ترجمہ: مترجم محمد بارق) (قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن) ص ۱۰۲

[۴۵۶] حافظ محمد، گوندلوی: النبراس فی الفرق بین البدعۃ والقیاس (مکتبہ اعظم منہاس، گوجرانوالہ، س۔ن) ص ۸۸

[۴۵۷] محمد یوسف، بنوری، مولانا: معارف السنن شرح سنن الترمذی (المکتبۃ البنوریۃ، کراچی، ۱۳۸۳ھ) ۴:۴۰۰

[۴۵۸] رویعی بن راجح، الرحیلی، ڈاکٹر: فقہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ) ص ۶۰

[۴۵۹] عزت علی عطیہ، ڈاکٹر: البدعۃ تحدیدھا وموقف الاسلام منھا (دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۰م) ص ۱۵۱

[۴۶۰] عبدالرحمٰن بن عبدالخالق، مولانا: البیان المامول فی علم الاصول (ناشر ندارد) ص ۱۷۳

[۴۶۱] امام بیہقی: السنن الکبری، ۸:۱۵۳

[۴۶۲] امام ترمذی: جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر قلبہ، حدیث: ۳۶۸۲

[۴۶۳] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل صحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳۶۸۹

[۴۶۴] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۴:۱۴۲

[۴۶۵] محمد طاہر بن علی، امام: تذکرۃ الموضوعات (ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۳ھ) ص ۹۴ عبداللہ بن عدی، امام: الکامل فی ضعفاء الرجال (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ۳:۱۰۷۱

[۴۶۶] امام حاکم: المستدرک ۳:۸۵

[۴۶۷] امام ابن قیم رحمہ اللہ: اعلام الموقعین، ۴:۱۴۲

[۴۶۸] عرفان خالد، ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ ۱: ۴۲۰

[۴۶۹] ایضاً

[۴۷۰] جیسا کہ ماضی قریب کے عظیم محدث شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے (ناصر الدین، البانی، شیخ: سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعۃ، مکتبۃ المعارف، ریاض، ۲۰۰۰م) ۱: ۱۴۴، رقم ۵۸)

[۴۷۱] علی قاری، ملاں: الموضوعات الکبری (المکتبۃ الاثریہ، سانگلہ ہل، شیخوپورہ، س۔ن) ص ۲۹۲

[۴۷۲] محمود طحان، ڈاکٹر: تیسیر مصطلح الحدیث (مکتبۃ المعارف، ریاض، ۱۹۸۷م) ص ۸۹۔۹۰

[۴۷۳] امام حاکم: المستدرک، ۳: ۳۱۷

[۴۷۴] عرفان خالد، ڈھلوں (مرتب) علم اصول فقہ، ۱: ۴۲۱

[۴۷۵] سیف الدین، آمدی، امام: الاحکام فی اصول الاحکام (دار الکتاب العربی، ۱۹۹۸م) ۴: ۱۵۶

[۴۷۶] امام ابن ابی شیبۃ: المصنف، ۷: ۳۶۸

[۴۷۷] امام عبد الرزاق: المصنف، ۱۰: ۲۵۴۔۲۵۵

[۴۷۸] محمد رواس قلعہ جی: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ص ۵۹

[۴۷۹] امام ابن قدامۃ: المغنی، ۶: ۱۸۴۔۱۸۵

[۴۸۰] محمد رواس قلعہ جی: فقہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، ص ۲۶۔۲۹

[۴۸۱] امام عبد الرزاق: المصنف، ۱۱: ۹ بحوالہ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص ۲۳

[۴۸۲] ایضاً، ۷: ۲۹۱۔۲۹۲

[۴۸۳] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الحج، باب التمتع والقران والافراد، حدیث: ۱۵۶۳

[۴۸۴] امام علی متقی: کنز العمال، ۵: ۴۸۳

[۴۸۵] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۴: ۱۴۰۔۱۴۲ و امام شاطبی: الموافقات، ۴: ۶۔۷

[۴۸۶] امام سرخسی: اصول السرخسی ۲: ۱۰۷۔۱۰۸

[۴۸۷] ایضاً۔

[۴۸۸] عبد الکریم زیدان، ڈاکٹر: مجموعہ بحوث فقہیہ (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۲م) ص ۳۲۔۳۳

[۴۸۹] امام صنعانی: سبل السلام شرح بلوغ المرام، ۱: ۳۳۷

[۴۹۰] عزت علی عطیہ: البدعۃ تحدیدھا وموقف الاسلام منھا، ص ۱۵۲

[۴۹۱] قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۳۸، ۴۱

[۴۹۲] مبشر حسین، حافظ: کتاب الخراج ایک تعارفی مطالعہ، سہ ماہی فکر و نظر (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷م) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۵۳

[۴۹۳] ایضاً

[۴۹۴] ابو یوسف، قاضی، امام: کتاب الخراج، ص ۴۷ بحوالہ مبشر حسین: کتاب الخراج ایک تعارفی مطالعہ ص ۵۳

[۴۹۵] ایضاً ص ۵۶

[۴۹۶] امام شاطبی: الموافقات، ۴: ۷۹

[۴۹۷] امام سرخسی: اصول السرخسی، ۲: ۱۰۷۔۱۰۸

[۴۹۸] خلفاء راشدین کے اجتہاد میں رجوع کی امثلہ اسی باب کی دوسری فصل میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

[۴۹۹] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱: ۶۵

[۵۰۰] محمد خضری بک: تاریخ التشریع الاسلامی (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۷۰م) ص ۸۹

[۵۰۱] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطا، حدیث: ۳۵۸۶

[۵۰۲] عرفان خالد، ڈھلوں (مرتب) علم اصول فقہ، ۱: ۴۱۹

[۵۰۳] شاہ ولی اللہ، امام: عقد الجید (مترجم: مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی) قرآن محل، کراچی س۔ن، ص ۱۰

[۵۰۴] ایضاً ص ۱۳

[۵۰۵] حافظ ابن حزم: الاحکام فی اصول الاحکام (ضیاء السنۃ ادارۃ الترجمۃ والتالیف، فیصل آباد، ۱۴۰۴ھ) جلد ۲، جزء ۶، ص ۷۷

[۵۰۶] امام بیہقی: السنن الکبری، ۸: ۱۵۳

[۵۰۷] وھبہ الزحیلی، ڈاکٹر: اصول الفقہ الاسلامی (دار الفکر، دمشق، ۱۹۸۶م) ۱: ۵۱۲۔۵۱۵ و امام ابن تیمیہ وغیرہ: المسودۃ فی اصول الفقہ (مطبعۃ المدنی، قاھرۃ، س۔ن) ص ۳۴۰

[۵۰۸] امام صنعانی رحمہ اللہ نے بھی امام برماوی رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حدیث عرباض رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوا کہ جب خلفاء اربعہ کسی قول پر متفق ہو جائیں تو وہ حجت ہے (امام صنعانی: سبل السلام، ۱: ۳۲۷)

[۵۰۹] وھبہ الزحیلی: اصول الفقہ الاسلامی، ۱: ۵۱۲۔۵۱۵

[۵۱۰] ایضاً

[۵۱۱] حافظ ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱: ۲۰۳

[۵۱۲] عبد الکریم زیدان: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیہ، ص ۱۰۷

[۵۱۳] امام علی متقی: کنز العمال، ۱۰: ۳۰۱

[۵۱۴] امام شاطبی: الاعتصام، ۲: ۱۲۵

[۵۱۵] عبد الوہاب، شعرانی، امام: کتاب المیزان بحوالہ محمد تقی امینی: اجتہاد، ص ۵۶

[۵۱۶] المرجع السابق

باب سوم:

خلافتِ راشدہ میں مسائل کی نوعیت اور خلفاء راشدین کے اجتہادات کی نوعیت

فصل اول:

خلافتِ راشدہ میں نئے مسائل پیدا ہونے کی وجوہات اور ان کی نوعیت

عہدِ خلفاء کے مسائل پیدا ہونے کی وجوہات:

انسان کے ہر فعل واقدام کا کوئی محرک وسبب اور پس منظر (Background) ہوتا ہے اور پھر وہ فعل یا اقدام کسی نئے واقعہ کا سبب بن جاتا ہے مثلاً غزوہ بدر کے چند خاص اسباب تھے جن کے نتیجہ میں معرکہ بدر پیش آیا لیکن یہی معرکہ بدر پھر غزوہ احد کا سبب بن جاتا ہے یوں اسباب و واقعات کی کڑیاں آپس میں ہمیشہ ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے تیئس سالہ دور میں بھی کئی طرح کے واقعات پیش آئے اور نئے مسائل نے جنم لیا اور یہی واقعات ومسائل خلفاء راشدین کے اجتہادات کا باعث بن گئے۔ خلفاء راشدین کے مبارک دور پر اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو نئے پیش آمدہ مسائل کے اسباب حسبِ ذیل سامنے آتے ہیں۔

1۔ اندرونی و بیرونی شورشیں اور ان کا انسداد:

خلافتِ راشدہ میں، جس کا آغاز عہد صدیقی سے ہوتا ہے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عہدہ خلافت پر متمکن ہوتے ہی مختلف محاذوں پر چومکھی جنگ لڑنی پڑی۔ اس میں کچھ تو بیرونی شورشیں تھیں لیکن زیادہ تر کا تعلق اندرون سے تھا ان جنگوں کے نتیجہ میں دوطرفہ جانی و مالی نقصانات کے ساتھ ساتھ حفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک معتد بہ جماعت کے وجود مسعود سے روئے زمین محروم ہوتی

جاری تھی لہٰذا قرآن مجید کے ابھی تک ایک جگہ اکٹھا مدون نہ ہونے کی وجہ سے جمع قرآن کا مسئلہ پیش آیا۔[۱] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں تو جنگوں کا ایک طویل سلسلہ ہی جاری ہو گیا تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کے دور میں کئی طرح کے عسکری مسائل بھی سامنے آئے مثلاً جدید اسلحہ جیسے دبابہ وغیرہ کا استعمال۔[۲] اسی طرح اس دور میں دشمنانِ اسلام کے ساتھ طویل عرصہ جنگ جاری رکھنے اور پھر مفتوحہ علاقوں پر قبضہ وکنٹرول برقرار رکھنے کے لیے مستقل طور پر فوج بھرتی کرنے کا مسئلہ پیش آیا۔[۳] فوج کو بھرتی کیا تو انہیں تنخواہیں وغیرہ دینے کا مسئلہ بھی سر اٹھاتا ہے۔[۴] فوج کی مستقل بھرتی کے بعد ہر علاقے کے فوجیوں کے لیے مستقل چھاؤنیاں بنانے، طبیب (Docter) قاضی (Judge) اور خزانہ کے افسروں کی بھی ضرورت پیش آئی۔[۵]

مسلم ریاست کی سرحدوں نے سمندر کے پانیوں کو چھوا تو بحری فوج بنانے اور بحری جہاز تیار کرنے کا مسئلہ بھی پیش آتا ہے[۶] شوقِ شہادت سے لبریز عرصہ تک جنگوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے ایک انتہائی نازک اور حساس مسئلہ مجاہدین کی عورتوں کے ازدواجی حقوق کی ادائیگی کا جنم لیتا ہے۔[۷] مذکورہ بالا تمام مسائل کے بارے میں یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام مسائل اندرونی و بیرونی جنگوں کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

"ان الحروب التی وقعت وما نتج عنها من قضایا و علاقات بین المسلمین وبین غیر هم فی اثناء الحرب وبعد ها ادت الی کثرة المسائل الفقهیة".[۸]

"(عہد خلفاء میں) ان جنگوں کے وقوع کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوئے اور دورانِ جنگ و بعد جنگ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان جو تعلقات قائم ہوئے ان کے نتیجے میں بہت سے فقہی سوالات نے جنم لیا۔"

2۔ فتوحات:

ایک مسلمان اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد و قتال کرتا ہے نہ کہ محض مالِ غنیمت اور کشورکشائی کی غرض سے۔ لیکن اس جہاد کی برکت سے وہ رضاء الٰہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی دیگر نعمتوں سے بھی مستفید ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے اختتام تک فتوحات کا ایک طویل سلسلہ جاری رہتا ہے اور مسلم ریاست کی حدود کس قدر وسیع وعریض ہو چکی تھیں اس بارے علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقبوضہ ممالک

کا کل رقبہ 2251030 مربع میل یعنی مکہ معظمہ سے شمال کی جانب 1036، مشرق کی جانب 1087، جنوب کی جانب 483 میل تھا، مغرب کی جانب چونکہ صرف جدہ تک حکومت تھی اس لیے وہ قابل ذکر نہیں۔'' [۹] اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں تو اسلامی سلطنت کا دائرہ اور بھی پھیلتا چلا گیا۔[۱۰]

ان فتوحات کی تفصیلات جان کر ایک مومن کا دل یقیناً خوشی سے جھوم اٹھتا ہے مگر انہی فتوحات کے نتیجہ میں جہاں روم و ایران کے علاقے سلطنتِ اسلامی کا حصہ بنے وہاں دسیوں مسائل بھی معرضِ وجود میں آتے چلے گئے چنانچہ استاد مصطفیٰ احمد زرقاء لکھتے ہیں:

''فکان تحت حکم المسلین امم ذات حضارات عریقة فی مصر و فارس و سو ریه ثم شما ل ا فر یقیه و ما جت المد ن الاسلا میه الکبری با مشاج من الا مم و عنا صر مختلفة الاجناس فکا ن لا بد اذن من ان یحد فی شئو ن الا جتما ع و السیاسة احد اث تستد عی النظر فیما یصلح لها من الحلول الفقهیة و ان یحتا ج المسلمو ن الی نظم واحکا م من روح الاسلام لم یکن فی عهد الرسول ما یضطرهم الیها و ید فعهم الی التفکیر فیهما'' [۱۱]

''مسلمانوں کے زیر حکومت کی کئی ایک قدیم تہذیبیں جیسے مصر، فارس، سوریہ اور شمالی افریقہ وغیرہ میں آ گئیں اور بڑے بڑے اسلامی شہر مختلف اقوام سے پر رونق ہو گئے لہٰذا ایسے اجتماعی و سیاسی مسائل پیدا ہوئے جو اپنے فقہی حل کے لیے غور فکر کا تقاضا کر رہے تھے۔ نیز مسلمانوں کو روح اسلام کی روشنی میں ایسے نظم اور احکام کی ضرورت پیش آئی جس پر غور فکر کی ضرورت عہد نبوی میں نہ آئی تھی۔''

ان فتوحات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل میں سے چند کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔ ان فتوحات کے نتیجہ میں مسلمانوں کو مالِ غنیمت (خراج اور جزیہ) کے طور پر انتہائی وافر مال وغیرہ حاصل ہونے لگا جس کے نتیجہ میں اس مال کی منصفانہ تقسیم کا مسئلہ پیش آیا چنانچہ اس مسئلہ کا حل کرنے کے لیے ہی دیوان مرتب کیے گئے۔ اس لیے علامہ عبدالوہاب النجار لکھتے ہیں:

'' جب فتوحات کے نتیجہ میں مسلمانوں کو وسعت و فراخی حاصل ہوئی تو وہ

مختلف بلاد و امصار میں پھیل گئے، حکومت و خلافت کے ذرائع آمدن بڑھ گئے اور خراج و جزیہ کی مقدار بہت بڑھ گئی تو خلیفہ اور امراء سلطنت کے بس میں نہ رہا کہ اموال کی آمد و رفت کو زبانی یاد رکھا جا سکے لہٰذا اس قدر کثیر مال کو ان کے تمام مستحقین تک عدل و انصاف کے ساتھ پہنچانے کے لیے باقاعدہ تحریری صورت میں ریکارڈ (Record) بنانے کا سوچا گیا"۔[۱۲]

انہی فتوحات کے نتیجہ میں مفتوحہ اراضی کی تقسیم کا مسئلہ پیش آیا کہ اگر اسے غانمین و مجاہدین میں ہی تقسیم کر دیا جائے تو مستقبل قریب میں جاگیردارانہ نظام کے منظر عام پر آنے کا خدشہ تھا۔[۱۳] مفتوحہ اقوام کو اگر فاتحین میں تقسیم کر دیا جاتا تو ایک ایک شخص کے حصہ میں دو دو تین تین غلام آ جاتے جبکہ روحِ شریعت انسانوں کی آزادی و حریت کا تقاضا کر رہی تھی۔ اسی پس منظر میں علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "فتوحات کی وسعت اور نو مسلموں کی کثرت نے سیکڑوں نئے مسائل پیدا کر دیے تھے"۔[۱۴]

انہی فتوحات کے نتیجہ میں اہل کتاب کے علاقے بھی اسلامی سلطنت کے زیرِ نگیں آئے تو ایک اہم مسئلہ یہ بھی پیش آیا کہ مسلمان، اہل کتاب کی عورتوں سے ان کی خوبصورتی اور حسن (Beauty) کی وجہ سے بہت زیادہ شادیاں کرنے لگے نتیجۃً بے نکاحی مسلمان عورتوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ کا خدشہ منڈلانے لگا۔[۱۵]

اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں جہاں دیگر اموال منقولہ و غیر منقولہ حاصل ہوئے ان میں حاصل ہونے والے جانوروں کی تعداد بھی کوئی معمولی نہ تھی چنانچہ ان جانوروں خصوصاً اونٹوں اور گھوڑوں کے سنبھالنے کے لیے وسیع چراگاہیں بنانے کی ضرورت پڑی۔[۱۶] عہدِ نبوی میں عرب کے یہاں گھوڑوں کی تعداد اونٹوں اور بکریوں کے مقابلہ میں انتہائی کم تھی اور اکثر طور پر لوگوں نے گھوڑے محض اپنی ضرورت کے لیے ہی رکھے تھے جن کو رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ لیکن اب وہ وقت آیا کہ گھوڑوں کی تعداد اس قدر بڑھی کہ ان کی بھی بہت زیادہ تجارت ہونے لگی اور اس دور کے مسلمانوں کا خوف خدا اور خشیت الٰہی کا اندازہ کیجیے کہ وہ خود خلیفہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گھوڑوں کی زکوٰۃ وصول کر لینے کا مطالبہ کرتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس بارے مشاورت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ گھوڑوں پر دیگر اموالِ تجارت کی طرح زکوٰۃ وصول کی جائے یا نہیں۔[۱۷]

اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں مسلمان دولتِ دنیا سے مالا مال ہو گئے تھے اور خوشحالی کے اثرات ان کے چہروں مہروں سے نمایاں ہوتے تھے۔ خوشحالی کی انتہا یہ تھی کہ لوگ اپنے اموالِ زکوٰۃ

تقسیم کرنے کے لیے اٹھائے پھرتے تھے مگر کوئی وصول کرنے والا نہ ملتا تھا۔[۱۸] دنیا کی دولت جسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ذریعہ آزمائش قرار دیا ہے[۱۹] اس آزمائش میں پورا اترنے والے لوگ کم ہی ہوتے ہیں وگرنہ مال و دولت کی کثرت سے اکثر لوگ بہک ہی جاتے ہیں اور بجائے اللہ کے شکر ادا کرنے کے اس کی معصیت و نافرمانی پر اتر آتے ہیں۔ مال و دولت کی کثرت کے یہ منفی اثرات قرونِ اولیٰ میں بھی اپنا اثر دکھاتے ہیں اور یہ اثرات کیوں نہ ظاہر ہوتے جبکہ صادق المصدوق ہستی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس بارے پیش گوئی بھی کردی تھی۔[۲۰]

خلافت راشدہ میں مال و دولت کی کثرت اور بہتات سے لوگوں کی دینی و روحانی حالت میں اضمحلال کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہمارے لیے یہ راز کھلتا ہے کہ عہد فاروقی میں بہ کثرت شراب پینے کے واقعات دراصل اسی لیے پیش آئے اور خلیفۃ المسلمین کو چالیس کوڑوں کی سزا میں مزید اضافہ کرنا پڑا۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ (م ۶۷۷ ھ) لکھتے ہیں ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شام و عراق فتح ہوئے تو لوگوں کو کھانے پینے میں وسعت اور خوشحالی و فراخی حاصل ہوئی۔ اب پھلوں خصوصاً انگور کی پیداوار بہت زیادہ بڑھ گئی تھی لہٰذا لوگوں میں شراب پینے کی وبا پھیل گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس گناہ سے روکنے کے لیے سختی کرتے ہوئے حد خمر میں اضافہ کردیا۔[۲۱] اور غالباً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں طلاق کی شرح بڑھ جانے کی بھی وجہ یہی مال و دولت کی کثرت اور دینی اثرت میں کمی تھی۔ اور اس شرح کو گھٹانے کے لیے ہی آپ رضی اللہ عنہ کو اکٹھی طلاق ثلاثہ نافذ کرنے کا قانون بنانا پڑا تاکہ لوگ اس سے باز آسکیں۔ اسی لیے استاذ غالب عبدالکافی لکھتے ہیں

"لما كان زمن عمر ____ و خاصة بعد الفتح العظيم الذى حصل فى عهده ____ تحسنت اموال الناس المادية وأثْرُو إثْرَاءً لم يعرفوه من قبل و بدا يظهر فيهم شئى من التساهل فى بعض الامور كالا قدام على الطلاق الثلاث و شرب الخمرو غير ذلك" [۲۲]

''جب خلافت عمر (رضی اللہ عنہ) میں ____ خصوصاً ان فتوحات کے بعد جو آپ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئیں ____ لوگوں کی مالی حالت بہت اچھی ہو گئی۔ اتنی اچھی کہ جس سے وہ پہلے آج تک آشنا ہی نہ ہوئے تھے تو ان میں بعض امورِ (دینیہ) کے حوالے کسی قدر تساہل اور سستی و کوتاہی نے بھی جنم لیا جس طرح کہ ان کا اکٹھی تین طلاقیں دینے کا اقدام اور (بعض حضرات کا

کثرت سے) شراب پینا وغیرہ ہیں۔"

مال و دولت کی کثرت جہاں اکثر طور پر دینی اثرات کو مٹانے پر تل جاتی ہے (الا ماشاء اللہ) وہاں اس کا ایک فیض یہ بھی ہوتا ہے کہ اہل دولت وقت گزاری کے لیے فضول اور بے مقصد کام کرنے لگ جاتے ہیں اسی لیے عہد عثمانی میں ہمیں کبوتر بازی اور غلیل سے پتھر وغیرہ پھینکنے کی وبا تیزی سے پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ حکم بن عباد کہتے ہیں "آسائش دنیا کی فراوانی کے دور میں جب لوگ خوب موٹے تازے ہو گئے تو مدینہ منورہ میں جو برائی سب سے پہلے ظہور پذیر ہوئی وہ کبوتر اڑانے اور غلیل سے پتھر وغیرہ پھینکنے کے مشاغل تھے"۔[۲۳] اور پھر اس کے سدِ باب کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہنگامی نوعیت کے اقدامات کرنے پڑے۔

خلفاء راشدین کے کتنے ہی اجتہادات کے پس منظر میں لوگوں کی دینی حالت کا بدل جانا ایک محرک کے طور پر نظر آتا ہے مثلاً انہوں نے درزی، دھوبی، اور اس قسم کے دیگر کاریگروں کو لوگوں کی اشیاء ضائع ہو جانے پر ذمہ دار ٹھہرایا تا کہ عوام کاریگروں کی خیانت و بد دیانتی اور جھوٹ و دھوکہ سے بچ سکیں۔[۲۴] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آوارہ اونٹ کو روک لینے اور باندھ لینے کا حکم دیا حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باندھ لینے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس حکم کا سبب یہی تھا کہ کوئی خائن ہاتھ اس اونٹ تک نہ پہنچ سکے۔[۲۵]

لوگوں کی دینی حالت میں کمزوری آجانے کی وجہ سے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شبہ کی بنا پر حد ساقط نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس پہلو کو ایک دفعہ ملحوظ خاطر نہ رکھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: "کیا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں کہ اب (لوگوں کے دینی) حالات کس قدر بدل چکے ہیں"۔[۲۶]

مذکورہ بالا بحث سے یہ بدگمانی قطعاً نہ پیدا ہونے پائے کہ مال و دولت کی بہتات اور کثرت کے منفی (Negative) اثرات نے سارے اسلامی معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، دراصل حقیقت یہ ہے کہ خلفاء راشدین اور مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تیزی سے بدلتے حالات کے خطرات کو بھانپتے ہوئے مستقبل کی پیش بینی کی اور آئندہ آنے والے مجتہدین کی رہنمائی کی کہ بدلتے حالات میں مجتہد کا فتویٰ بدل بھی سکتا ہے مگر یاد رہے اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ شریعت بھی بدل سکتی ہے۔

اسلامی فتوحات کی برکت سے نئی اقوام اور نئی تہذیبوں سے بھی اختلاط ہوا تھا جس کے نتیجہ میں ان کے رسوم و رواج بالفاظ دیگر ان کے عرف سے یگانگت پیدا کرنے کا ایک اہم مسئلہ درپیش آیا[۲۷] اسی طرح ان نئی اقوام کے انتظامی اعتبار سے کئی مفید کام سامنے آئے لہٰذا یہ شدید خطرہ تھا کہ

کہیں ان مفید انتظامی کاموں کو محض یہ سمجھ کر اختیار نہ کیا جائے کہ وہ غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے تھے، لیکن خلفاء راشدین بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کمال حکمت و دانائی سے ان کے مفید اور مثبت تجربات سے فائدہ اٹھایا، ان کے عرف کا لحاظ کیا لیکن جہاں کوئی پہلو خلافِ شریعت نظر آیا تو اسے بدلنے میں بھی ذرا تاخیر نہ کی۔ فتوحات اور اس کے نتیجہ میں نئی اقوام کے عرف سے کس قدر مسائل نے جنم لیا اس بارے ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

"الفتوحات الاسلامیه و ما ترتب علیها من امتداد سلطان الاسلام علی بلاد کثیرة و اتصال المسلمین باهل تلک البلاد و لکل بلد اعرافه و عاداته و تقالیده و نظمه، کل ذلک ادی الی ظهور مسائل و قضایا جدیدة تستلزم معرفة حکم الشارع فیها"[۲۸]

''اسلامی فتوحات کے نتیجے میں اسلامی اقتدار کا بہت سے دیگر ممالک تک پھیلنا اور مسلمانوں کا ان ممالک کے باشندوں میں میل جول نیز ہر علاقے کے لوگوں کی مختلف عادات، رسوم اور مختلف عرف یہ وہ اسباب تھے جن کے نتیجے میں کئی نئے مسائل و قضیوں نے جنم لیا جو اپنے بارے حکم شرعی کی معرفت کا لازمی طور پر مطالبہ کر رہے تھے۔''

فتوحات کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کو وسعت ملی تو ایک وسیع و عریض مملکت کے نظامِ حکومت کو چلانے کا مسئلہ پیدا ہوا بالفاظِ دیگر انتظامی نوعیت کے مسائل نے جنم لیا۔ ان مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اتنی بڑی مملکت کے مسلم عوام سے نقدی کی صورت میں اموالِ زکوٰۃ حکومتی سطح پر کیوں کر جمع و خرچ کیے جائیں یا عوام کو اپنے تئیں خود ہی زکوٰۃ ادا کر دینے کی اجازت دے دی جائے۔[۲۹] آبادی کے زیادہ ہونے سے جمعہ کے روز خطبہ جمعہ کے لیے لوگوں کو قبل از وقت متنبہ کرنے کا مسئلہ زور پکڑ گیا۔[۳۰] غرضیکہ خلافتِ راشدہ میں اسلامی سلطنت کا بہت وسیع ہو جانا بھی انتظامی نوعیت کے مسائل پیدا ہونے کا ایک اہم سبب تھا۔

بعض ہنگامی نوعیت کے حالات:

خلافتِ راشدہ میں حکم الٰہی سے بعض ہنگامی نوعیت کے حالات کی وجہ سے بھی کئی مسائل نے جنم لیا مثلاً ۱۷ھ میں طاعون عمواس پیش آیا تو ایسے علاقے میں آمد و رفت بارے صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر ذاتی اجتہاد کر لیا تھا اگرچہ بعد میں ان کے اجتہاد کی

موافقت میں حدیث بھی مل گئی تھی۔[۳۱] اسی طرح عہدِ فاروقی میں ہی انتہائی شدت کا قحط پڑتا ہے تو اس قحط کے نتیجہ میں بھی کئی مسائل سر اٹھاتے ہیں مثلاً امراء سے زبردستی سامانِ خورد و نوش لے کر غرباء میں دینا۔ ایسے مجبوری کے حالات میں اگر کوئی چوری کرتا ہے تو اس پر شرعاً حد سرقہ لگانے کا حکم۔[۳۲] ایسے ہی بدحالی کے حالات میں قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ کرنے کا شرعی حکم وغیرہ۔[۳۳] یہ ہنگامی نوعیت کے حالات جو قحط یا طاعون وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہوئے خالص تقدیرِ الٰہی کا نتیجہ تھے۔

4۔ ہمسایہ ممالک سے تعلقات:

خلفاء راشدین کے دور میں ہمسایہ ممالک سے تعلقات کے نتیجہ میں بھی کئی مسائل پیدا ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک اہم ترین اور قابل ذکر ''عشور'' یعنی غیر مسلموں سے تجارتی ٹیکس کا وصول کرنا تھا وغیرہ۔[۳۴] یہ مسائل دراصل بین الاقوامی امور (International Affairs) سے متعلقہ تھے۔

5۔ تمدنی ترقی:

تمدنی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ بن کے کھڑا ہو سکتا ہے۔ زمانہ ہمیشہ وقت کو مہمیز دے کر برق رفتاری سے آگے کی طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور جو لوگ زمانہ کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں وقت ان کی پرواہ کیے بغیر انہیں بڑی شدت سے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اپنے لئے نت نئی سہولیات کی تلاش میں رہتا ہے جس کے نتیجہ میں کبھی سہولیات حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ کئی مسائل بھی جنم لیتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ میں بھی تمدنی ترقی کروٹ لیتی ہے اور نتیجتاً کئی طرح کے مسائل شرعی حکم کی تلاش میں سر اٹھاتے ہیں چنانچہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''چونکہ ان (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے زمانے میں فتوحات نہایت تیزی سے بڑھتی جاتی تھیں اور تمدن روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا اس لیے نہایت کثرت سے معاملات کی نئی نئی شکلیں پیش آتی تھیں''۔[۳۵]

گزشتہ بحث پر اگر ایک بار دوبارہ نظر ڈال لی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر خلافتِ راشدہ میں نئے مسائل جنم لینے کے لیے غالباً پانچ اسباب تھے لیکن کچھ اسباب ذیلی ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں یہاں خلاصۃً بنیادی اور ذیلی اسباب کی فہرست دی جاتی ہے۔

i۔ اندرونی و بیرونی شورشیں اور انہیں کچلنے کے لیے جنگیں۔
ii۔ اسلامی فتوحات۔
iii۔ اموال منقولہ وغیر منقولہ کی کثرت۔
iv۔ دینی وروحانی حالت میں اضمحلال کا آغاز۔
v۔ نئی اقوام کا عرف اور رسوم ورواج۔
vi۔ اسلامی مملکت کی وسعت۔
vii۔ بعض ہنگامی نوعیت کے حالات۔
viii۔ ہمسایہ ممالک سے تعلقات۔
ix۔ تمدنی ترقی وغیرہ۔

عہد خلفاء کے مسائل کی نوعیت:

عہدِ خلفاء میں نئے مسائل پیدا ہونے کی وجوہات واسباب کے ضمن میں خلافت راشدہ کے مسائل کو قدرے تفصیل کے ساتھ رقم کیا جا چکا ہے۔ اگر خلافت راشدہ کے ان مسائل پر ایک بار پھر نظر ڈال لی جائے تو ان کی نوعیت کا تعین کرنا بھی چنداں مشکل نہیں رہتا۔ چنانچہ عہد خلفاء کے مسائل درج ذیل نوعیتوں (Categories) سے تعلق رکھتے ہیں۔

i۔ عبادات سے متعلقہ مسائل۔
ii۔ اقتصادی ومعاشی مسائل۔
iii۔ مناکحات سے متعلقہ مسائل۔
iv۔ حربی مسائل۔
v۔ انتظامی نوعیت کے مسائل جن کا تعلق اصطلاحی طور پر ''سیاست شرعیہ'' سے ہوتا ہے۔
vi۔ حدود سے متعلقہ مسائل۔
vii۔ ذمیوں وغیر مسلموں سے متعلقہ مسائل۔

حقیقت یہ ہے کہ مندرجہ بالا مسائل اولاً خلفاء راشدین کے دور میں پیش آئے اور ان کے حل کے لیے خلفاء راشدین نے قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کیا اور پھر ان خلفاء کے اجتہادات اور اجتہادی منہج نے رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کے لیے رہنمائی کا سامان فراہم کیا۔ اگر ہم بنظر غور دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین کے دور میں ہر طرح کے بنیادی قسم کے حالات ومسائل پیش

آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے تمام قسم کے اسباب و وسائل بھی فراہم کر دیے تھے مثلاً کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی باہم مشاورت، خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا فقیہہ الامت اور بارعب شخص کیونکہ نئے اجتہادات کی تنفیذ کے لیے طاقت وحکومت بھی درکار تھی۔

غرضیکہ خلافتِ راشدہ میں پیش آنے والے مسائل و حالات میں ہر دور کے مسلمانوں اور علماء وفقہاء کے لیے بہت سے دروس موجود ہیں۔ اسی لیے سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ اس بارے یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:

> ''میرے نزدیک اسلام کی زندگی میں پیش آنے والے تمام ادوار و مراحل کی نمائندگی خلافتِ راشدہ کے اس مختصر سے دور میں (جو تیس سال سے متجاوز نہیں) کردی گئی ہے اور ہر آنے والے ناگزیر دور کے لیے اس میں رہنمائی کا سامان ہے'' [۳۶]

خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کے ادوار حکومت میں جن نوعیتوں کے مسائل پیش آئے ان کی مزید تفصیلات اور ان مسائل کے حل کے لیے خلفاء راشدین کے اجتہادات تفصیلاً اگلی فصل میں بیان کیے جائیں گے۔

فصل دوم:

خلفاءراشدین کے اجتہادات کی نوعیت

خلفاءراشدین کے عبادات میں اجتہادات:

ذیل میں خلفاءراشدین کے عبادات میں بعض اجتہادات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

1۔ عہد صدیقی میں کچھ لوگوں نے خلیفہ وقت کو زکوۃ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں سے قتال کا اعلان کیا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اللہ کی قسم میں اس شخص سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوۃ میں فرق کرے گا، زکوۃ مال کا حق ہے۔ واللہ! اگر وہ مجھ سے بھیڑ کا ایک بچہ بھی روکیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس کے روکنے پر ان سے لڑوں گا"۔[۳۷]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا منکرین زکوۃ کے خلاف جہاد و قتال کا فیصلہ اجتہاداً تھا کیونکہ ایسی کوئی نظیر پہلے موجود نہ تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد سیاساتِ شرعیہ کے تحت ہے یا عبادات کے ضمن میں ہے؟ اس بارے "السنة و البدع" کے مصنف عبداللہ محفوظ بایں الفاظ خامہ فرسائی کرتے ہیں۔

> "صحیح بات یہ ہے کہ جانوں کی حفاظت وعصمت اللہ کی حرمتوں میں سے ہے اور ان کی حفاظت کرنا فرض عبادت ہے جبکہ انہیں مباح الدم قرار دینا کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے لہٰذا یہ اجتہاد ان عبادات کے ضمن سے ہے جن کے ذریعے قربِ الٰہی حاصل کیا جاتا ہے نیز اسی حدیث سے امام ابن العربی المالکی نے بھی عبادات میں اجتہاد اور قیاس کرنے پر استدلال کیا ہے مگر "قیاس الشبہ" نہ کہ "قیاس العلۃ"[۳۸]

2۔ حج وعمرہ کے وقت مسنون یہ ہے کہ حالتِ احرام میں تلبیہ کے الفاظ بار بار زبان سے ادا کیے جائیں یعنی

"لبیک اللھم لبیک ،لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد و النعمة لک و الملک لا شریک لک."[۳۹]

"حاضر ہوں میں اے اللہ! میں بارہا حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بلاشبہ ہر قسم کی حمد تیرے ہی لیے ہے۔ تمام نعمتیں تیری عطا کردہ ہیں (حقیقی) بادشاہی بھی فقط تیری ہے جس میں تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہ نے وہی تلبیہ کہا جو بیت اللہ کے حج وعمرہ کے موقع پر کہا جاتا ہے۔ گویا یہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کیا ہے کہ جس طرح بیت اللہ ہمارا قبلہ ہے اسی طرح بیت المقدس چونکہ ہمارا قبلہ اول رہا تھا لہٰذا اس میں بھی وہی تلبیہ پکارا جائے، بالفاظ دیگر آپ رضی اللہ عنہ نے یہاں اصولِ قیاس سے کام لیا ہے۔ لیکن یہ "قیاس علت" نہیں کیونکہ عبادات تعبدی امور ہیں جن کی علت ہمیں معلوم نہیں بلکہ یہاں "قیاس الشبہ" سے کام لیا گیا ہے، جس کا عبادات کے ضمن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کئی بار استعمال کیا ہے [۴۰] مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سائلہ کے جواب میں "لو کان علی امک دین اکنت قاضیته ؟ (اگر تمھاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا کرتی؟) کہنا اور پھر "فدین الله احق ان یقضٰی "[۴۱] (اللہ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔) کہنا اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک استفسار کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا "ارایت لو تمضمضت بماء وانت صائم "[۴۲] (آپ کا کیا خیال ہے اگر آپ روزہ کی حالت میں کلی کریں تو؟) کہنا بھی اسی قبیل سے ہے[۴۳] اسی لیے امام ابن العربی المالکی (م ۵۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ قیاس الشبہ عبادات میں ہو جاتا ہے یہی سنتِ خلفاء رہی اور یہی علماء کا طریقہ رہا ہے۔[۴۴]

3۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تلبیہ کے مسنون الفاظ پر اضافہ کرتے ہوئے مزید الفاظ بھی کہے ہیں جیسا کہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ (م ۶۲۰ھ) ذکر کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ مزید الفاظ یہ بھی کہا کرتے تھے:

"لبیک ذاالنعماء و الفضل لبیک لبیک مرھوبا و مرغوباً الیک لبیک"[۴۵]

"اے نعمت وفضل فرمانے والے رب! میں حاضر ہوں۔ میں تیری بارگاہ میں بارہا حاضر ہوں تجھی سے رحمت کی امید ہے اور تیرا ہی خوف شامل حال ہے۔ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔"

جبکہ بعض روایات میں آپ رضی اللہ عنہ سے منقول یہ الفاظ آئے ہیں:

"لبیک اللھم لبیک لبیک و سعدیک والخیر فی یدیک لبیک والرغباء الیک والعمل" [۴۶]

"اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں بار ہا حاضر ہوں تجھی سے سعادت کا طلبگار ہوں۔ خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔ میرا شوقِ (ملاقات) تیری ہی طرف ہے اور میرے نیک اعمال تیرے ہی لیے خاص ہیں۔"

گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک تلبیہ کے مسنون الفاظ پر بعض الفاظ کا اضافہ کر دینا جائز ہے[۴۷] اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ دعاؤں کے قبول و عدمِ قبول کا مدار خلوص و تضرع پر ہے نہ کہ الفاظ پر۔[۴۸]

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ سلسلہ حج چند مقامات کو خود مخصوص فرمایا ہے کہ ان مقامات سے احرام باندھ کر آگے حرم میں آیا جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مبارک دور میں جب فتوحات کے نتیجہ میں کوفہ و بصرہ وغیرہ کے علاقے اسلامی سلطنت کا حصہ بنے تو وہاں کے لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنے لئے میقات کے تعین کا مطالبہ کیا۔[۴۹]

ایک روایت میں ہے اہل عراق نے حج کے موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ "قرن المنازل" نامی میقات ان سے دور پڑتا ہے لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرن منازل کے بالمقابل "ذاتِ عرق" نامی جگہ کو اپنے اجتہاد کی روشنی میں اہل عراق کے لیے مقرر کر دیا۔[۵۰] یہ الگ بات ہے کہ یہی مقام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اہلِ عراق کے لیے متعین کیا تھا[۵۱] لیکن چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس حدیث کا علم نہ تھا لہٰذا انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ مقام متعین کر دیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اصابت رائے دیکھیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعین کردہ میقات کے موافق ہی ہوتا ہے[۵۲] میقات کا تعلق امور حج سے ہے اور حج جامع العبادات ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا اجتہاد جو اگرچہ بعد میں حدیث کے موافق نکلا، عبادات کے زمرہ میں کیا گیا۔

حج تمتع جس میں عمرہ اور حج دونوں ایک ہی سفر میں کر لیے جاتے ہیں۔ اس کے جواز کے دلائل قرآن و سنت میں بہت سے موجود ہیں مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس سے لوگوں کو منع کرنے لگے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کے اسباب درج ذیل تھے:-

1۔ حج تمتع میں چونکہ ایک ہی سفر میں حج و عمرہ دونوں کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے لہٰذا جب لوگ کثرت سے حج تمتع کرنے لگے تو اس کے نتیجہ میں بیت اللہ میں ایام حج کے علاوہ لوگوں کی آمد و رفت

میں بہت کمی آ رہی تھی لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج تمتع سے منع کر دیا تا کہ لوگ ایام حج کے علاوہ دیگر ایام میں بھی مکہ عمرہ کی غرض سے آئیں اور یوں حرم سارا سال آباد رہے گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خاص مصلحت کے پیش نظر ایسا کیا تھا۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کا یہ مطلب قطعاً نہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے خلافتی اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے حج تمتع کو حرام ہی قرار دے دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہ کے بارے یہ غلط فہمی پھیلی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود ایک موقع پر فرمایا: ''میں تمہیں حج تمتع سے منع نہیں کرتا کیونکہ یہ تو کتاب اللہ میں موجود ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا کیا ہے۔'' [۵۳] اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ سے اس بارے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حج تمتع سے روکنے کا میرا ارادہ محض یہ تھا کہ اس طرح بیت اللہ کی کثرت سے زیارت کی جائے۔'' [۵۴]

ظاہر ہے باپ کو بیٹے سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارے معروف غلط فہمی بارے تبصرہ کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا: ''(حضرت) عمر رضی اللہ عنہ نے کبھی وہ نہ کہا تھا جو تم کہہ رہے ہو بلکہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ عمرہ حج سے علیحدہ کرو اور ان کا مقصود یہ تھا کہ حج کے مہینوں کے علاوہ بھی بیت اللہ کی زیارت جاری رہے مگر تم نے خود ہی اسے حرام قرار دے لیا''۔ [۵۵]

2۔ بیت اللہ کی سارا سال آبادکاری کے علاوہ لگتا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حج تمتع سے روکنے کا شاید ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کے نزدیک حج افراد کرنا حج تمتع سے افضل تھا کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ حج و عمرہ کے امور کو الگ الگ زیادہ بہتر طریقہ سے ادا کیا جا سکتا ہے [۵۶] چنانچہ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی اس بارے لکھتے ہیں:

> ''بعض دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو حج تمتع سے منع فرمایا تھا اس سے مراد یہ نہ تھا کہ حج تمتع حرام ہے بلکہ اس کا مقصد دراصل صرف یہ بیان کرنا تھا کہ افضل کیا ہے۔ غرضیکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کم فضیلت والے امر سے اس لیے منع کیا تا کہ لوگ زیادہ فضیلت والے امر کی طرف رجوع کریں''۔ [۵۷]

3۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس اقدام کے لیے قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال بھی کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے حج و عمرہ کو پورا کرنے کا حکم بایں الفاظ دیا ہے:

﴿ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ﴾۔ [۵۸]

''اور خدا (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے تھے کہ حج و عمرہ میں ہر ایک کا اتمام یہ ہے کہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ ادا کیا جائے اور عمرہ، حج کے مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں کیا جائے۔[۵۹]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی حج تمتع اور قران سے منع کیا کرتے تھے[۶۰] مگر آپ رضی اللہ عنہ محض اہل مکہ کو اس سے منع کرتے تھے۔ جبکہ آپ رضی اللہ عنہ کے خیال میں حج تمتع وقِران محض آفاقیوں (مکہ شہر سے باہر والوں) کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اہل مکہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''حج کے ساتھ عمرہ کی سہولت صرف ہمارے لیے ہے، آپ لوگوں کے لیے نہیں ہے''۔[۶۱] آفاقیوں وغیر آفاقیوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فرق کرنے کی بھی وجہ غالباً یہی تھی کہ اس طرح بیت اللہ سارا سال آباد رہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تین دن نمازِ عشاء کے بعد نماز تراویح باجماعت پڑھائی مگر چوتھی رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھانے کے لیے نہ نکلے۔ نمازِ فجر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مختصر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''تمہارا انتظار کرنا مجھ پر مخفی نہ تھا لیکن (میں اس لیے نہیں نکلا کہ) مجھے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض ہی نہ کر دی جائے اور پھر تم اس کی ادائیگی سے عاجز آ جاؤ۔''[۶۲]

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامِ رمضان کی بہت زیادہ فضیلت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بیان کی تھی لہٰذا اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے گھروں میں قیامِ رمضان کرتے رہے۔ عہد صدیقی میں بھی یہی صورت حال رہی یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مبارک دور آیا تو صورتِ حال یہ ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسجد نبوی میں آ کر قیامِ رمضان کرنے لگے لیکن بعض تو اکیلے قیام کرتے تھے اور بعض مختلف ٹولیوں کی صورت میں کرتے تھے۔[۶۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کے باوجود عہد فاروقی میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا مسجد میں آ کر نماز تراویح اکیلے یا مختلف گروہوں کی صورت میں پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی علت اور پس منظر کو سمجھتے تھے کہ جس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں باجماعت تراویح پڑھنے سے منع کیا تھا، وفاتِ رسول کے بعد وہ علت باقی نہ رہی تھی کیونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اور اب اس کی فرضیت کا خطرہ ٹل چکا تھا لہٰذا اصل حکم اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔[۶۴]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مذکورہ بالا طرز عمل کو دیکھا تو ان کے مسجد میں اور باجماعت نماز تراویح پڑھنے پر قطعاً انکار نہ کیا، گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی سمجھتے تھے کہ ممانعت کا سبب بائی

نہ رہنے کی وجہ سے اب یہ جائز ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ سوچا کہ اتحاد و اجتماعیت بہر صورت شرعاً مطلوب و محمود ہے، لہٰذا بجائے مختلف گروہوں یا ٹولیوں کی صورت میں پڑھنے کے لوگوں کے لیے ایک امام مقرر کر دیا جائے [۶۵] اور پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کر دیا۔ [۶۶]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمان عورتیں یا تو وہ گھروں میں نماز پڑھتی تھیں یا مسجد نبوی میں مرد امام کے پیچھے [۶۷] عہد فاروقی میں جب نماز تراویح کے لیے باجماعت نماز کا اہتمام کیا گیا تو عورتیں بھی ذوق شوق سے آنے لگیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے ایک الگ امام حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو مقرر کر دیا [۶۸] اور ایک روایت کے مطابق حضرت سلیمان بن ابی حثمہ کو مقرر کیا تھا [۶۹] عورتوں کے لیے الگ امام مقرر کرنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ قیام رمضان سے اصل مقصود سماعِ قرآن تھا لیکن مردوں کی کثرتِ تعداد کی بنا پر عورتیں اس سے محروم ہو رہی تھیں اور ظاہر ہے کہ جب قرآن مجید کا سماع بھی ممکن نہ ہو تو زیادہ دیر (خشوع و خضوع کے ساتھ) کھڑے رہنا بھی ممکن نہیں ہوتا لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورتوں کے لیے الگ سے امام مقرر کر دیا۔ [۷۰]

اذان جو کہ اصلاً نماز کے لیے دعوت دینا ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے مواقع و اوقات طے کر دیے تھے مگر اس کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعض وجوہات کی بنا پر جمعہ کے دن ایک اذان کا اضافہ اپنے اجتہاد سے کیا۔ اس کے اسباب و وجوہات کا تفصیلاً ذکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہادی منہج کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ اس اذان کا اجراء بھی دراصل عبادات میں اجتہاد کی گنجائش کے ساتھ ہوا ہے۔

عہدِ صدیقی میں جب لوگوں نے خلیفہ کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں لوگوں کے مال و دولت کی اس حد تک کثرت ہو گئی کہ سرکاری طور پر عاملین زکوٰۃ کا لوگوں کے پاس جا کر مال زکوٰۃ کو وصول کرنا پھر اسے سنبھالنا اور پھر مصارف میں خرچ کرنا ان کے لیے اور عوام کے لیے بھی ایک مسئلہ بن گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ادائیگی زکوٰۃ کی ذمہ داری لوگوں پر ہی ڈال دی کہ وہ از خود زکوٰۃ خرچ کر دیا کریں۔ [۷۱]

ظاہر ہے یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حالات کی تبدیلی کی وجہ سے ایک اجتہادی فیصلہ تھا اگرچہ اس سے قبل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک اموالِ زکوٰۃ خلیفہ کے سپرد کیے جاتے تھے اور پھر خلفاء ہی اپنی زیر نگرانی تقسیم کرا دیتے تھے۔

زکوٰۃ ارکانِ اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے جس کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ زکوٰۃ بارے جو تفصیلات رسول اللہ ﷺ نے امت کو بتادی تھیں ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ "فی الرکاز الخمس"[۷۲] یعنی دفینہ (مال مدفون جو زمین کی کھدائی کے درمیان ملے) پر خمس ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معدن کو دفینہ پر قیاس کرتے ہوئے یا "رکاز" کلمہ کے معنی کو وسعت دیتے ہوئے معدن سے بھی خمس بطور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا[۷۳] جو بہر صورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عبادات کے زمرہ میں ایک اجتہاد ہے کیونکہ معدن پر زکوٰۃ بارے نبی ﷺ سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔[۷۴]

خلفاء راشدین اور اقتصادیات میں اجتہادات:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی ریاست کے چہار جانب فتوحات کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا حتیٰ کہ اس دور کی روم و ایران جیسی سپر طاقتیں (Super Powers) بھی مفتوح ہوگئیں۔ عراق و شام کی زمینیں فتح ہوئیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں غیر منقولہ غنائم یعنی اراضی کی فاتحین میں تقسیم یا عدم تقسیم بارے ایک اختلاف پیدا ہوا۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ سرفہرست ہیں ان کا خیال تھا کہ مفتوحہ اراضی غانمین اور غازیوں میں تقسیم کر دی جائے جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دوسرا گروہ جن میں سرفہرست حضرت عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر اور اساطینِ علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زمین کو ان کے اصل باشندوں کے پاس ہی رہنے دیا جائے اور ان سے زمینی پیداوار سے حصہ (خراج) وصول کیا جائے۔[۷۵] اس سلسلہ میں دونوں گروہوں کے دلائل تفصیلاً ذکر کیے جاتے ہیں۔

پہلے گروہ کے دلائل:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے غنائم کی تقسیم کے بارے میں یوں رہنمائی دی ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾[۷۶]۔

"اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لُوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ خدا کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ غنائم کا پانچواں حصہ آیت میں مذکور مصارف میں خرچ کر دیا جائے اور بقیہ چار حصے فاتحین کے لیے ہیں نیز رسول اللہ ﷺ نے خیبر اور بنو قریظہ کی زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی تھیں[۷۷]۔ اسی بنیاد پر حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ جن کی تلواروں نے ملک کو فتح کیا ہے انہی کو زمینیں بھی ملنی چاہئیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے کہا ''یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں ان کے بیٹوں اور پوتوں کے خیال سے ہماری حق تلفی کی جائے۔ ہم اپنی اولاد کے لیے ہیں اور بعد والے اپنی اولاد کے لیے ہوں گے۔''[۷۸]

دوسرے گروہ کے دلائل:

ان کے دلائل حسب ذیل تھے:۔

1۔ اگر اس زمین کو فاتحین میں تقسیم کر دیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے گی اور نسلاً بعد نسلٍ اسی میں منتقل ہوتی رہے گی۔[۷۹] گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں اصولِ فقہ کی اصطلاح میں ''درء المفسدة'' (خرابی دور کرنا) سے کام لیا یعنی آپ رضی اللہ عنہ کو جاگیردارانہ نظام اور اس کے مفاسد کے اسلامی معاشرے میں در آنے کا خدشہ لاحق ہوا جس کے پیشگی ازالہ کے طور پر آپ رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ اراضی کو فاتحین میں تقسیم نہ کرنے کا ارادہ کیا۔

2۔ اگر مفتوحہ اراضی کو فاتحین میں تقسیم کر دیا گیا تو اس کے فوائد و منافع انہیں تک محدود ہوں گے جب کہ عدمِ تقسیم کی صورت میں اس کے فوائد و منافع اسلامی ریاست کے مشترکہ ہوں گے جو یقیناً محدود نہ ہوں گے۔ لیکن اگر اس زمین کو غازیوں میں ہی تقسیم کر دیا جائے تو اسلامی ریاست کے اخراجات مثلاً افواج کی تیاری، سرحدوں پر بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے اور ملک کے امن وامان قائم رکھنے کے مصارف کا مسئلہ جنم لے گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں ''کسریٰ کی زمین عراق و شام فتح ہونے کے بعد اب اور کون سی زمین رہ گئی ہے جس کی آمدنی سے خلافت کا انتظام سنبھالا جا سکے گا۔''[۸۰] اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> ''کیا آپ لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اسلامی مملکت کی سرحدوں کے لیے ایک مستقل فوج کی ضرورت ہے جو وہاں ہر وقت موجود رہے۔ کیا آپ نے اس پہلو پر بھی غور کیا ہے کہ اسلامی مملکت کے بڑے بڑے خطے اور شہر مثلاً جزیرہ شام، کوفہ، بصرہ اور مصر کی حفاظت کے لیے بھی مستقل ایک فوج کی ضرورت ہے؟ اگر میں یہ اراضی اس کے باشندوں سمیت فاتحین میں تقسیم کر

دوں تو اتنی بڑی فوج کا خرچ کہاں سے چلے گا؟"۔[۸۱]

3۔ اگر مفتوحہ اراضی کو غانمین میں ہی تقسیم کر دیا گیا تو ظاہر ہے وہ زمین انہی کی اگلی نسلوں تک منتقل ہو گی اور پھر کبھی ایسا ہو گا کہ ایک بہت بڑے قطعہ زمین کا مالک یا تو صرف ایک مرد ہو گا یا صرف ایک عورت ہو گی جو اتنی بڑی زمین کو خاطر خواہ استعمال میں نہ لا سکیں گے اور یوں زمین برباد ہو گی۔[۸۲]

4۔ اگر مفتوحہ اراضی فاتحین میں بانٹ دی گئی تو آئندہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنے والوں کے لیے کچھ نہ بچے گا کیونکہ زمینیں تو تقسیم ہو چکی ہوں گی۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اگر اس امت کے بعد میں آنے والے افراد کا خیال نہ ہوتا تو میں یہ اراضی اسی طرح تقسیم کر دیتا جیسے رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی اراضی تقسیم کر دی تھی۔" [۸۳] موخرالذکر دو استدلالات حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بھی مجلس شوریٰ میں پیش کیے تھے۔[۸۴]

بالآخر حکمِ الٰہی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کے حق میں استدلال کرتے ہوئے یہ آیت پیش کی ﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ [۸۵] اس آیت اور اس سے گزشتہ تین آیات میں اللہ تعالیٰ نے مالِ فے (غنیمت) کے مصارف کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

i۔ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، یتامیٰ، مساکین، اور مسافر۔

ii۔ مفلس مہاجرین۔

iii۔ انصار۔

iv۔ مہاجرین و انصار کے بعد آنے والے مسلمان۔

گویا اس آیت میں غنائم کے لیے محض فاتح افواج کو ہی مستحق نہ قرار دیا گیا تھا بلکہ اس کے دیگر مستحقین کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی تھی۔ اس آیت کا پیش کرنا تھا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس استدلال کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی رائے کے موافق اور ہم خیال ہو جاتے ہیں۔[۸۶]

مذکورہ بالا اختلافِ صحابہ اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آیتِ قرآنی پیش کرنے سے اپنے انجام کو پہنچا، لیکن اس آیت سے قطع نظر اگر فریقین کے دلائل کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گروہ کو محض چند لوگوں کے منافع کا ہی احساس تھا اور ان کی نظر محض رسول اللہ ﷺ کے ایک طرزِ عمل پر تھی حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا اراضی خیبر کی تقسیم کا اقدام اس وقت کی مصلحت کے مطابق تھا۔ جبکہ دوسرے گروہ کے تمام تر دلائل کا تعلق مصلحتِ عامہ کے ساتھ تھا جس میں جلبِ منفعت اور دفع

مصرت دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا جا رہا تھا۔ اسی لیے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ (م ۱۸۲ھ) نے لکھا ہے:

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ (مذکورہ بالا) اجتہادی فیصلہ خاص اللہ تعالیٰ کی توفیق سے تھا جس میں تمام مسلمانوں کی خیر و بھلائی (مصلحت) تھی۔ اور آپ رضی اللہ عنہ نے زمینوں کے خراج کو وصول کر کے سارے مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی جو رائے اختیار کی تھی وہ اسلامی معاشرے کے مفاد عامہ کی ضامن تھی۔ اگر یہ زمینیں عطیہ دینے اور روزینے جاری کرنے کے لیے سارے انسانوں کے لیے وقف قرار نہ دی جاتیں تو نہ سرحدوں کی حفاظت ممکن ہوتی، نہ جہاد کے لیے لشکر مستحکم کیے جا سکتے تھے۔ نیز فوجیوں اور تنخواہ دار محافظوں کی غیر موجودگی میں اس کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی کہ اہل کفر پھر دوبارہ اپنے شہروں پر قبضہ نہ کر لیں''۔[۸۷]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقتصادی امور میں اجتہادات میں سے ایک اجتہاد یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ہی سب سے پہلے کافر ملکوں سے آنے والے تاجروں سے ان کے اموال تجارت کا عشر وصول کیا اسے اصطلاح میں ''عشور'' کہتے ہیں۔ اس کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے کہ عہد فاروقی میں مسلمان تاجر تجارت کی غرض سے کافر ملکوں میں جاتے تو وہ مسلمان تاجروں سے ان کے اموال کا دسواں حصہ وصول کرتے تھے جو ایک طرح کا ٹیکس تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی اور آپ رضی اللہ عنہ سے اس بارے استفسار کیا گیا کہ کفار تاجروں سے مسلمان حکومت کیا سلوک کرے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مسلمان بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کریں جو وہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں یعنی ان سے عشر وصول کیا جائے تا کہ معاملہ برابر برابر رہے۔[۸۸]

بعض روایات سے معلوم ہوتا کہ اہل منبج اور بحر عدن کے اس پار کے لوگوں نے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ پیش کش (Offer) کی کہ انہیں اسلامی ریاست میں تجارت کی اجازت دی جائے اور اس کے عوض وہ عشر یعنی دسواں حصہ بطور ٹیکس ادا کریں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور اتفاق رائے سے انہیں تجارت کی اجازت دے دی[۸۹] لیکن ان پر دسواں حصہ ٹیکس لینے کا فیصلہ دراصل اسی بنیاد پر تھا کہ وہ مسلمان تاجروں سے دسواں حصہ لیتے تھے۔[۹۰]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں مصلحتِ عامہ کے لحاظ کا عنصر بہت زیادہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ عمومی طور پر تو کفار تاجروں پر ان کے اموال کا دسواں حصہ بطور ٹیکس لاگو کیا گیا اور وجہ اس کی یہی تھی کہ وہ مسلمان تاجروں سے بھی اتنا ہی لیتے تھے مگر آپ رضی اللہ عنہ نے کفار کی لائی ہوئی بعض اشیاء

پر عشر کی بجائے نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ٹیکس مقرر کیا اور یہ وہ اشیاء تھیں جن کی مسلمانوں کو ضرورت زیادہ پیش آتی تھی۔ [۹۱] ان اشیاءِ ضرورت پر ٹیکس کم مقرر کرنے کی وجہ یہ مصلحت تھی کہ اس کی بدولت کفار یہ سامان فروخت کے لیے زیادہ سے زیادہ لائیں گے اور یوں مسلمانوں کے لیے اشیاءِ ضرورت کی فراہمی زیادہ آسان اور ارزاں قیمتوں پر ہو سکے گی۔ [۹۲]

تاریخ اسلام میں اسلامی حکومت کا سب سے پہلی بار اپنا سکہ اور کرنسی جاری کرنے کا سہرا بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں میں ہرقلِ روم کے دینار اور کسریٰ ایران کے درہم چلتے تھے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور تک چلتے رہے۔ [۹۳]

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے عرف کا لحاظ رکھتے ہوئے مروجہ سکہ کا اعتبار کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا اعتبار کیا۔ عہد فاروقی جو خلافتِ راشدہ کا دورِ عروج ہے اور خلافتِ راشدہ چوں کہ نبوی مشن کا تتمہ و تکملہ ہے لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوچ یہ ہوئی کہ جب اسلام اور مسلمانوں کا اپنا ایک تشخص ہے اور اسلام نے اقتصادیات بارے بھی انقلابی اقدامات اٹھائے ہیں لہٰذا مسلمانوں کا سکہ کے حوالے سے بھی اپنا تشخص ہونا چاہیے۔ یہی باعث ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اسلامی حکومت کی طرف سے نیا سکہ جاری کرنے کا پروگرام (Programe) بنایا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ عجم کے بنائے ہوئے سکوں کو اس لیے ناپسند کرتے تھے کہ ان میں کھوٹے سکے بھی ہوتے تھے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی ذاتی ٹکسال بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ قلتِ وسائل کی بنا پر ابتدا میں اونٹوں کے چمڑے کے سکے بنوانے کا ارادہ کیا مگر اس خیال سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ اس طرح تو اونٹ ہی ختم ہو جائیں گے۔ [۹۴] لیکن وسائل کی دستیابی پر فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی سکے بنوائے اور دوسرے سکوں سے ممتاز کرنے کے لیے ان پر اسلامی عبارتیں کندہ کروائیں مثلاً بعض پر "محمد رسول الله ﷺ"، بعض پر "الحمد لله" اور بعض پر "لاالہ الاالله" تحریر کیا گیا [۹۵] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ رضی اللہ عنہ نے جب نئے سکے تیار کروائے تو ان پر "اللہ اکبر" کندہ کروایا۔ [۹۶]

اقتصادیات (Economics) سے متعلقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اہم اجتہاد یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے زمین کو پانی لگانے کے لیے کسی کی زمین سے نہر یا نالہ گزارنے کی اجازت دی اور انکار کرنے والے کو زبردستی نہر گزار لینے کی دھمکی بھی دی چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ضحاک بن خلیفہ انصاری رضی اللہ عنہ نے پانی کا ایک نالہ جو عریض (مدینہ کی ایک وادی) سے نکلتا تھا، حضرت محمد بن

مسلمہ رضی اللہ عنہ کی زمین سے گزار کر اپنی زمین تک لانا چاہا تو حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کا شکوہ کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر سمجھایا مگر وہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم اپنے بھائی کو کیوں روکتے ہو حالانکہ اس میں اس کا بھی فائدہ ہے تو تمہارا بھی فائدہ ہے اور تمہارا نقصان بھی نہیں بلکہ تم شروع میں بھی اور آخر میں بھی اپنی کھیتی کو سیراب کر سکو گے''۔ لیکن اس کے باوجود محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دھمکی آمیز انداز میں ارشاد فرمایا: بخدا! اگر اس (نہر گزارنے) کے لیے سوائے تیرے پیٹ کے کوئی اور جگہ نہ ملی تو میں اس پر سے بھی گزار دوں گا۔[۹۷]

یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحتِ خاصہ کے مقابلہ میں مصلحت عامہ کا لحاظ رکھا کیونکہ اگر آپ رضی اللہ عنہ محض حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی مصلحت و منفعت کو ملحوظ رکھتے تو اس کی زمین میں سے نہر نہ گزارتے مگر آپ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اگر اس کی زمین سے نہر گزار کر ضحاک بن خلیفہ رضی اللہ عنہ کی زمین تک پانی پہنچتا ہے تو اس سے نہ صرف دونوں کو فائدہ ہوگا بلکہ اس پانی کی وجہ سے زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار سے دیگر تمام لوگوں کو بھی فوائد پہنچ سکیں گے۔ اور اگر آپ مذکورہ بالا حکیمانہ اجتہاد و فیصلہ نہ کرتے تو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے اس سلسلہ میں بہت دقت پیش آتی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اس مذکورہ بالا اجتہاد سے خلیفۃ المسلمین کے اختیارات کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

کسی ملک و ریاست کی معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کی اراضی بے کار نہ پڑی رہے بلکہ اس کو کاشت کاری کے لیے زیر استعمال رکھا جائے۔ عہد عثمانی رضی اللہ عنہ میں جب کچھ زمینیں ان کے مالکان کی بے توجہی کی وجہ سے فارغ و بے کار پڑی تھیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان زمینوں کو عامۃ المسلمین میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ بلا کاشت پڑی رہنے سے خراب ہی نہ ہو جائیں اور پھر ان کی زرخیزی ہی جاتی رہے نتیجۃً اسلامی ریاست کی اقتصادی ترقی بھی متاثر ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی لکھتے ہیں:

> ''جب حالات کا تقاضا یہ ہوا کہ ایسی زمینوں کو جن کے مالکان کو بے دخل کر دیا گیا تھا، حکومت اپنی تحویل میں لے کر آبادکاری کی غرض سے عامۃ المسلمین میں تقسیم کر دے تو آپ رضی اللہ عنہ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) نے بغیر کسی تردد کے شکار ہوئے فوراً یہ فیصلہ کر دیا کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ زمینیں اگر بلا کاشت پڑی رہیں تو خراب ہو جائیں گی اور یوں اسلامی ریاست کی معاشی و اقتصادی ترقی متاثر ہو گی''۔[۹۸]

خلفاء راشدین کے مناکحات میں اجتہادات:

شرعی طور پر اگر خاوند بیوی کو تین طلاقیں دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے سے جدا کر دے اور ان کا نابالغ بچہ ہو تو مطلقہ ماں جب تک آگے دوسرا نکاح نہ کرے اس کی پرورش کی زیادہ حقدار ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے اپنے بیوی کو طلاق دی اور بچہ اس سے لینا چاہا تو وہ مطلقہ عورت نبی ﷺ کے پاس حاضرِ خدمت ہو کر یوں شکوہ و شکایت کرتی ہے۔ ''یارسول اللہ ﷺ میرا پیٹ اس بچہ کے لیے ظرف تھا، میری چھاتی اس کے لیے مشکیزہ تھی اور میری گود اس کا گھروندا تھا اور اب اس کے باپ نے مجھے طلاق دی ہے اور بچہ کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے''۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انت احق به مالم تنكحي ''[۹۹]

''جب تک تم آگے نکاح نہیں کر لیتی تم ہی اس کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہو۔''

یعنی جب تک تو آگے دوسرا نکاح نہ کر لے تو ہی اس بچے کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے۔ شریعت نے باپ کے مقابلہ میں ماں کو حقِ حضانت (پرورش کا حق) کیوں دیا ہے؟ اس کی فلاسفی و حکمت ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی لکھتے ہیں:

> ''اس کی وجہ یہ ہے کہ پرورش کے زمانہ میں بچے کو باپ کی نسبت ماں کی دیکھ بھال، توجہ اور پیار کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے بلکہ ماں فطرتی طور پر باپ سے بڑھ کر بچے کی دیکھ بھال کی قدرت رکھتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں مامتا کا جذبہ پیدا کیا ہے''۔[۱۰۰]

مذکورہ بالا حدیثِ رسول سے معلوم ہوا کہ جب تک مطلقہ عورت آگے شادی نہیں کرتی اس وقت تک اپنے نابالغ بچہ کا حقِ حضانت اسے حاصل ہے اور اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ جب وہ آگے نکاح ثانی کر لے گی تو پھر یہ حق حضانت باپ کا ہوگا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسی صورت میں یہ حق باپ کو دینے کی بجائے ماں کی ماں یعنی نانی کو دیا ہے جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عقد میں ایک انصاری خاتون تھی جس سے عاصم بن عمر پیدا ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے طلاق دے دی اور بچہ بھی اسے دے دیا۔ بچہ اس خاتون کے پاس پرورش پاتا رہا جب اس عورت نے کسی دوسرے مرد سے شادی کر لی تو اس بچہ کی پرورش اس کی نانی کرنے لگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صدیقی عدالت میں حقِ دعویٰ دائر کر دیا مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بچہ

اس کی نانی کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔[۱۰۱]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جس طرح مسائلِ وراثت میں دادا کو باپ پر قیاس کرتے ہوئے باپ ہی قرار دیتے ہیں[۱۰۲] غالباً یہاں بھی انہوں نے ماں کی ماں یعنی نانی کو بھی ماں ہی قرار دیتے ہوئے اسے حق حضانت دیا ہے اور شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ نابالغی کی عمر میں مرد کی نسبت ایک عورت کا پیار و محبت بچہ کے لیے زیادہ ضروری ہے خصوصاً جبکہ اس عورت کا رشتہ بھی قریبی ہو۔

قرآنِ مجید میں اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ شادی کی اللہ نے اجازت بعض شرائط کے ساتھ دی ہے[۱۰۳] مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض مخصوص وجوہات کے پیش نظر ان سے شادی کرنے کو ناپسند جانا اور مسلمان امراء کو خصوصاً ان سے شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن یہ بات مشورہ کی حد تک ہی تھی نہ کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کوئی ایسا سرکاری حکم (Ordinance) جاری کیا تھا کیوں کہ بہر صورت قرآن نے اجازت دی تھی۔ کتابیہ عورت سے نکاح کو ناپسند کرنے کی کیا وجوہات تھیں اس بارے تفصیلاً ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منہج اجتہاد'' میں لکھا جاچکا ہے۔ بہر حال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد ''مناکحات'' سے تعلق رکھتا ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ رب العلمین نے وہ عورت جسے ازدواجی تعلقات قائم کرنے سے قبل طلاق دے دی جائے مقررہ حق مہر میں سے نصف حق مہر دینے کا حکم دیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ اِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَ قَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ ﴾[۱۰۴]

''اور اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے سے پہلے طلاق دے دو لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا۔''

لیکن اگر ایک مرد و عورت نکاح کے بعد خلوت میں چلے گئے اور انہیں جماع کرنے کے تمام اسباب و وسائل میسر تھے اور کوئی مانع نہ تھا تو ایسی صورت میں اگر مرد عورت کو طلاق دے دیتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کے لیے حق مہر مکمل دینے کا فیصلہ دیا ہے خواہ مرد اس سے تعلقات نہ قائم کرنے کا دعوی کرے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان گرامی ہے: ''جب دروازہ بند کریں اور پردے گرا دیں اور دلہن گھونگٹ اٹھا دے تو مکمل مہر لازم ہو جاتا ہے'' [۱۰۵] گویا یہاں سبب کے پائے جانے پر مسبب کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور یہ ایک عظیم مصلحت کی بنا پر ہے۔ اگر ایسا قانون نہ بنایا جاتا تو کتنی ہی عورتیں مکمل حق مہر سے محروم کر دی جاتیں گویا اس میں عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی مصلحت کارفرما ہے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عہد صدیقی اور خلافتِ عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی سالوں میں ایک مجلس میں دی گئی تین (یا تین سے زائد طلاقیں) ایک ہی شمار کی جاتی تھیں[۱۰۶] لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجلس کی تین یا تین سے زائد دی گئی طلاقوں کو تین ہی نافذ کرنے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کسی ایسے شخص کو لایا جاتا جس نے یکبارگی تینوں طلاقیں دی ہوتیں تو آپ رضی اللہ عنہ اسے (کوڑے وغیرہ کے ساتھ) سزا دیتے اور دونوں خاوند بیوی میں تفریق کرا دیتے۔[۱۰۷]

لوگوں کے کثرت سے طلاق دینے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ نیا حکم جاری کرنے کے وجوہات واسباب درج ذیل تھے۔

i۔ فتوحات کے نتیجہ میں جب مال و دولت کی فراوانی ہوئی تو لوگوں میں کثرتِ طلاق کی وبا پھیلی [۱۰۸] لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے سدِ ذریعہ کے طور پر تینوں طلاق کی تنفیذ کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے بذات خود ارشاد فرمایا: ''لوگوں نے ایک ایسے معاملہ میں جلد بازی شروع کر دی ہے جس میں انہیں بہت تامل سے کام لینا چاہیے تھا لہٰذا کیوں نہ ہم اسے (ان تینوں طلاقوں کو) ان پر جاری کر دیں۔ اور پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کر دیا۔[۱۰۹]

ii۔ کثرتِ طلاق کی ایک اہم وجہ تقویٰ اور خوف خدا کے اثرات میں کمی آ جانا تھا۔ چنانچہ زید بن وھب کہتے ہیں کہ مدینہ کے ایک آوارہ منش آدمی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا جس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ میں تو بس ذرا دل لگی کر رہا تھا[۱۱۰] لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس قسم کے لوگوں کو سزا دے کر باقی لوگوں کو بھی اس طرزِ عمل سے محفوظ رکھنے کے لیے تینوں طلاقیں نافذ کرنے کا اعلان کیا جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ (م ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عموماً اور خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ لوگوں نے طلاق کے سلسلہ میں سہل انگاری شروع کر دی ہے اور رخصت کا برا استعمال کرنے لگے ہیں اور وہ طلاق کے شرعی طریقہ کو اختیار کرنے میں اللہ سے نہیں ڈر رہے اور وہ اپنے اوپر خود ہی سختی ڈال رہے ہیں اور وہ ایک جائز حد پر آ کر نہیں ٹھہر رہے تو جو انہوں نے کہا تھا وہی ان پر لاد دیا اور جس آسانی و رخصت کی انہوں نے بے قدری کی تھی اس کو ان سے دور کر دیا اور سختی ان پر

جاری کر دی۔ فی الواقع جو اللہ کی آسانی، شریعت کی نرمی اور رخصت کو قبول نہ کرے وہ ایسی ہی سزا کا مستحق ہے۔[۱۱۱]

iii۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام محض سیاستِ شرعیہ کے طور پر تعزیری قسم کا نہ تھا بلکہ یہ بعض دلائلِ شرعیہ ہی کی بنیاد پر تھا۔[۱۱۲]

گزشتہ بحث سے ایک بات بہر صورت طے ہو جاتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طلاقِ ثلاثہ کی تنفیذ کا اقدام خواہ دلائل شرعیہ کی بنیاد پر کیا ہو (جس طرح احناف کہتے ہیں) یا تعزیراً کیا ہو (جس طرح عموماً محدثین کا نقطہ نظر ہے) مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے قبل یہ طریقہ رائج نہ تھا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ''مناکحات'' کے حوالے سے ایک اجتہاد تھا جو درحقیقت حالات وظروف کے بدل جانے کی وجہ سے تھا۔[۱۱۳]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مجبوری کی صورت میں مردار، خنزیر، خون اور وہ چیز جس کو غیر اللہ کے لیے خاص کر دیا گیا ہو، کھانے کو بعض شرائط کے ساتھ حلال قرار دیا ہے۔[۱۱۴] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اکراہ وجبر کی صورت میں کفریہ کلمہ زبان سے ادا کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ دل ایمان واسلام پر مطمئن ہو۔[۱۱۵] اب سوال یہ ہے کہ جبر واکراہ کا اعتبار کیا ان منصوص امور کے علاوہ بھی ہو گا یا نہیں؟ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درج ذیل اجتہادات بڑی اہمیت کے حامل ہیں جو مناکحات اور حدود سے متعلقہ ہیں۔

ایک شخص کو اس کے سسرالی رشتہ داروں نے پکڑ کر محبوس کر دیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اس نے اپنی بیوی کو طلاق نہ دے دی۔ چونکہ وہ شخص سفر پر روانہ ہونا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ایک ماہ کے لیے اپنی مطلقہ بیوی کے لیے نان ونفقہ بھیجنے کا بھی وعدہ کیا مگر جب اس نے اس وعدہ کے مطابق نان ونفقہ نہ بھیجا تو یہ معاملہ عدالتِ علوی میں پیش کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سارا ماجرا سن کر ارشاد فرمایا ''بیوی کے رشتہ داروں نے اس پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو گیا اور پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اس طلاق مکرہ کو کالعدم قرار دیتے ہوئے اس کی بیوی اسے واپس کرادی۔[۱۱۶]

اسی طرح عہدِ فاروقی میں ایک دفعہ ایک عورت نے خود زنا کا اعتراف کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حد لگانے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ اس کے چار دفعہ اقرار کر لینے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رجم کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ اس مجلس میں موجود تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ اس کو بلا کر ارتکاب زنا کی وجہ پوچھ لیجیے، شاید اس کے لیے کوئی عذر نکل آئے۔ چنانچہ اس عورت سے استفسار پر اس نے بتایا کہ پانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پیاس سے اس کی جان نکلی

جارہی تھی جب کہ ایک مرد نے جو اس کے ساتھ ہی اونٹ چراتا تھا اس شرط پر پانی دینے پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ اپنا جسم اس کے حوالے کر دے گی، چنانچہ مجبوراً اس نے ایسا کر لیا۔ روای کہتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو "اللہ اکبر" کہہ کر آیت ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ (ہاں جو ناچار ہوئے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے۔) پڑھی اور کہا کہ مجھے تو اس کے لیے صاف عذر نظر آرہا ہے۔[۱۱۷]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان دو اجتہادات سے معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے یہاں غیر منصوص امور میں بھی جبر و اکراہ کا اعتبار کیا جائے گا۔

قرآن و حدیث میں بسا اوقات ایسا ہوسکتا ہے کہ دو آیات یا دو احادیث بظاہر باہم متعارض ہوں تو ان کے تعارض کو دور کرتے ہوئے تطبیق کی کوشش کرنا اور دونوں آیات یا دونوں احادیث کے لیے موقع و محل کا تعین کرنا بھی اجتہادی امور سے تعلق رکھتا ہے۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات میں ہمیں اجتہاد کی یہ قسم بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ایک مثال ملاحظہ ہو جو دراصل مناکحات سے متعلقہ اجتہادات سے تعلق رکھتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے عمومی انداز میں ارشاد فرمایا ہے ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾[۱۱۸] (اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے۔) اور یہ آیت مطلقہ (Divorced) اور بیوہ دونوں قسم کی عورتوں کو شامل ہے مگر ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے متوفی عنها (بیوہ) کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کر دی ہے۔[۱۱۹]

اب سوال یہ ہے کہ ایک بیوہ عورت جو خاوند کی وفات کے وقت حاملہ بھی ہو وہ دوسری آیت کے مطابق چار ماہ دس دن کی عدت گزارے گی یا پہلی آیت کے مطابق وضع حمل تک حالتِ عدت میں رہے گی۔ ان دونوں آیات میں بظاہر تعارض ہے۔ چنانچہ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کا الگ الگ اجتہادی موقف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ دونوں آیات میں جمع و تطبیق ممکن ہے لہٰذا ایسی عورت ابعد الاجلین (دونوں مدتوں میں سے جو طویل ترین ہو) کی عدت پوری کرے گی۔[۱۲۰]

گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں آیت ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ اگرچہ دوسری آیت کے مقابلہ میں بعد میں نازل ہوئی ہے مگر یہاں بعد والی آیت پہلی آیت کے لیے نہ تو ناسخ کی حیثیت رکھتی ہے اور نہ ہی اس کی تخصیص کرتی ہے[۱۲۱] کیونکہ جب جمع و تطبیق ممکن ہو تو نسخ یا تخصیص کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

ابتداء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی یہی تھی کہ وہ ''ابعد الاجلین'' عدت گزارے مگر بعد میں آپ رضی اللہ عنہ کا اجتہادی موقف یہ ہوا کہ ایسی عورت کی عدت وضع حمل ہوگی [۱۲۲] کیونکہ سورۃ بقرہ کی آیت کا زمانہ نزول سورۃ الطلاق کی آیت سے پہلے کا ہے وہ عمومی معنی رکھتی ہے جو حاملہ متوفی عنھا یا غیر حاملہ دونوں کو شامل ہے جبکہ سورۃ الطلاق کی آیت کا زمانہ نزول بھی بعد کا ہے نیز وہ صرف حاملہ متوفی عنھا سے متعلقہ ہے۔[۱۲۳] گویا بعد والی آیت پہلی آیت کے لیے ناسخ یا مخصص کی حیثیت رکھتی ہے۔

خلفاء راشدین کے فنون حرب میں اجتہادات:

خلفاء راشدین کے فنونِ حرب میں اجتہادات کے ذکر سے پہلے نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی کے عسکری نظام کا قدرے اختصار سے جائزہ لے لیا جائے تاکہ واضح ہو کہ بعد میں خلفاء راشدین نے اس سلسلہ میں کیا انقلابی اقدامات کیے۔

عہد نبوی اور فنونِ حرب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل عرب میں مستقل فوج کا کوئی تصور نہ تھا لیکن عرب کے کچھ حالات ہی اس طرح کے بن چکے تھے کہ قبیلہ کا ہر فرد ایک سپاہی بھی ہوتا تھا۔ شہسواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی، تیراندازی اور سخت کوشی تو گویا عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ قبائل باہم اکثر برسرِ پیکار ہی رہتے تھے مگر ان کی یہ جنگیں محض خاندانی تعصبات کی بنیاد پر ہی ہوتی تھیں۔[۱۲۴] چونکہ وہ پیدائشی جنگجو واقع ہوئے تھے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے قبولِ اسلام کے بعد ان کی جنگی تربیت کی ضرورت پیش نہیں آئی البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دورانِ جنگ بعض اخلاقی تعلیمات سے نوازا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت تیار ہوئی تو مدینہ میں لشکرِ اسلام کو مکہ کے نہایت مسلح لشکرِ کفار کا کئی بار سامنا کرنا پڑا جس میں اس دور کے رائج اسلحہ کا مسلمانوں نے بھی استعمال کیا، اگرچہ وہ کفار کے مقابلہ میں نسبتاً بہت کم تھا۔[۱۲۵] غزواتِ رسول پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ بدر میں مقامِ پڑاؤ بارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی رائے اور مشورہ کو قبول کرتے ہیں۔[۱۲۶] غزوہ احد کے موقع پر اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے باہر نکل کر جنگ کرنے کی تھی جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا،[۱۲۷] خندق حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے کھودی گئی اور یہ ایسی جنگی تدبیر (Technique) تھی جس سے عرب اس سے قبل بالکل نابلد تھے۔ یہی باعث ہے کہ انہوں نے جب اسے دیکھا تو ورطہ حیرت میں ڈوب کر بیک زبان بول اٹھے:

"ان هذه لمکیدة ما کانت العرب تصنعها".[۱۲۸]

"یہ تو (ایسی جنگی) تدبیر ہے جسے عرب پہلے نہیں جانتے۔"

اسی غزوہ احزاب کے موقع پر ہی رسول اللہ ﷺ نے "الحرب خدعہ" ارشاد فرمایا تھا۔[۱۲۹]

حضرت داود علیہ السلام نے زرہ بنانے کا آغاز کیا تھا[۱۳۰] جسے عرب بھی استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيلَ تَقِيكُمْ بَأْسَكُمْ﴾[۱۳۱]

"اور کُرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور (ایسے) کُرتے (بھی) جو تم کو (اسلحہ) جنگ (کے ضرر) سے محفوظ رکھیں۔"

لہٰذا عہدِ نبوی میں بھی زرہ اور خود (سر پر لوہے کی ٹوپی) کے استعمال کا سراغ ملتا ہے[۱۳۲] اسی طرح خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت غیلان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو "جرش" بھیجا کہ وہاں سے منجنیق اور دبابہ کے استعمال کا طریقہ سیکھ کر آئیں چنانچہ وہ لوگ وہاں سے یہ حربی تعلیم پا کر آئے تو محاصرہ طائف میں ان آلات کا استعمال بھی کیا گیا۔[۱۳۳]

مذکورہ بالا عہدِ نبوی کی مختصر عسکری تاریخ سے حسبِ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

1۔ اس دور کے مروجہ اسلحہ یعنی تیر و تفنگ، نیزہ اور تلوار وغیرہ کا استعمال کیا گیا نیز اپنے جسمانی دفاع کے لیے لوہے کا لباس زیب تن کیا جاتا تھا۔

2۔ اہل فارس کی جنگی تکنیک کی افادیت کے پیش نظر اس کا استعمال کرنے میں کوئی عار نہ سمجھا گیا۔ اسی طرح دیگر اقوام (کفار وغیرہ) کی طرف سے نئے آلاتِ حربی جیسے منجنیق وغیرہ سیکھنے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ غیر مسلموں سے اگر تعلیم خصوصاً حربی تعلیم حاصل کرنے کی نوبت آجائے تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

3۔ حربی امور میں اجتہاد کی کس قدر وسیع گنجائش ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بلا روک ٹوک اپنا مشورہ پیش کرتے تھے جن کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اسی کے مطابق کبھی اپنا حکم جاری کر دیتے۔

4۔ رسول اللہ ﷺ کے عظیم جملہ "الحرب خدعة" (جنگ تو دھوکہ دہی اور چال چلنے کا نام ہے۔) میں مسلمانوں کے لیے حربی امور میں اجتہاد کی ہر دور میں ضرورت و اہمیت کو

اجاگر کیا گیا ہے یعنی ہر دور میں جو بھی جنگی تدبیر کارگر ثابت ہو سکے اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ''اسلامی جنگی اخلاقیات'' پر زد نہ پڑے۔

عہد خلافت راشدہ اور فنون حرب میں اجتہادات:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے نہایت ہی مختصر ہونے کے باعث عسکری نظام میں کوئی زیادہ ترقی نہ ہو سکی اور شاید اس کی کوئی زیادہ ضرورت اس لیے پیش نہ آ سکی کہ عہد صدیقی میں جس قدر جنگیں ہوئیں ان میں سے اکثر کا تعلق اندرونی شورشوں سے تھا اور ظاہر ہے کہ ان میں عربوں سے ہی پالا پڑتا تھا لہٰذا جو تدبیر مخالف گروہ استعمال کرتا رہا انہی کو مسلمان عرب بھی استعمال کرتے تھے۔ فنونِ حرب میں زیادہ تر ترقی عہدِ فاروقی میں ہوئی جس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اب دیگر کافر اقوام سے جہادی معرکے ہوئے تو اس دور کی متمدن اقوام کے عسکری نظام بارے معرفت ہوئی تو اس کی افادیت کے پیش نظر اسے اسلامی عسکری نظام کا حصہ بنانے میں ذرا برابر بھی تاخیر نہ کی گئی۔

عہدِ صدیقی میں اس بات کا پہلے کی نسبت انتہائی زیادہ اہتمام کیا گیا کہ فوج کے مختلف دستے بنائے جاتے اور ہر دستہ کا الگ الگ سپہ سالار مقرر کیا جاتا۔[۱۳۴] طالب ہاشمی لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فتح مکہ کے موقع پر کیے گئے اقدام کی اتباع میں تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس موقع پر تمام قبائل کے الگ الگ دستے بنائے تھے اور ہر دستے کو الگ الگ پرچم عطاء کیا تھا۔[۱۳۵]

عہدِ صدیقی میں الگ الگ دستوں کے سپہ سالار بنانے کے علاوہ ایک نیا عہدہ ''امیر الامراء'' بھی قائم کیا گیا جس کو آج کی اصطلاح میں کمانڈر انچیف کہا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس عہدہ پر مامور کیے گئے۔[۱۳۶]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی فوج میں وسعت دیتے ہوئے غیر مسلموں کو بھی شامل کیا اور ان کی تنخواہیں مقرر کیں چنانچہ یزدگرد کی طرف سے ایک کمانڈر ''سیاہ'' نے اپنے ساتھیوں سمیت مسلم فوج کے کمانڈر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے چند شرائط کے ساتھ صلح کی درخواست کی جس کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی گئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان کی تمام شرائط منظور کر لینے کا لکھا چنانچہ وہ سب بصرہ میں آباد ہو گئے، ان میں سے چھ کے نام یہ تھے۔ سیاہ، خسرو، شہریار، شیرویہ، شہرویہ اور افرودین۔ تستر کے معرکہ میں سیاہ ہی کی تدبیر سے فتح حاصل ہوئی تھی[۱۳۷] اسی طرح ہرمزان نامی ایک ایرانی

غیر مسلم تھا جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بار ہا سیاسی اور جنگی معاملات میں مشاورت کی۔[۱۳۸]

آپ رضی اللہ عنہ کا غیر مسلم سے مشاورت کرنا ''الحکمة ضالة المومن فمن حيث وجدها فهوا حق بها'' (حکمت و دانائی مومن کی گمشدہ (دولت) ہے وہ اسے جہاں سے بھی ملے وہی اس پر زیادہ حق رکھتا ہے۔) نیز ''انظر الى ما قال و لا تنظر الى من قال'' (بات کرنے والے کو نہ دیکھو بلکہ اس کی بات کی طرف توجہ کرو۔) کے اصولوں کے تحت تھا۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ کا غیر مسلموں کے خلاف غیر مسلموں کو ہی استعمال کرنا ایک بہت بڑا جنگی حربہ تھا[۱۳۹] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ جنگی امور میں کس قدر بصیرت کے حامل تھے۔

لیکن اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غیر مسلموں کو کلیدی عہدوں پر بھی فائز کرتے ہوں گے بلکہ اسے آپ رضی اللہ عنہ نے سختی سے ناپسند کیا چنانچہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جو کہ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی دیگر صلاحیتوں کا ادراک کرتے ہوئے انہیں بصرے کا گورنر بنا دیا تھا، انہوں نے ایک اچھے پڑھے لکھے عیسائی کو اپنا کاتب (Secretary) مقرر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں سرزنش کی اور فرمایا: ''جب اللہ نے ان کو رسوا کر دیا ہے تو تم ان کی عزت افزائی نہ کرو، جب اللہ نے انہیں دور کر دیا ہے تو تم انہیں قریب نہ کرو، اور جب اللہ نے انہیں خائن قرار دے دیا ہے تو تم ان پر بھروسہ نہ کرو''۔[۱۴۰] اسی لیے ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں: ''وہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) غیر مسلم افسروں سے بوقت ضرورت استفادہ کرتے تھے۔ صرف اس وقت روکتے تھے جب عقل سلیم اس کی متقاضی ہوتی کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے''۔[۱۴۱]

لشکرِ اسلام میں نئے شعبہ جات کا مستقل اجراء:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں فوج میں مستقل کئی شعبے بنا دیے گئے مثلاً ہر جگہ فوج میں ایک خزانہ کا افسر، ایک قاضی، مترجم، طبیب اور جراح وغیرہ ہوتے تھے۔[۱۴۲] اسی طرح میدان جنگ میں مقتولین و مجروحین کو اٹھانے کے لیے الگ سے کچھ لوگ مقرر ہوتے تھے۔[۱۴۳]

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہی خبر رسانی اور جاسوسی (Intelligence) کا شعبہ بھی مستقل قائم کر دیا گیا تھا۔ شام و عراق کے نومسلموں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دی کہ وہ اپنا اسلام ظاہر نہ کریں اور جاسوسی کی ذمہ داری ادا کریں۔ چونکہ یہ لوگ بظاہر وضع قطع میں پارسی یا

عیسائی ہی لگتے تھے لہٰذا یہ بے خوف وخطر دشمن فوج میں جاتے اور واپس آ کر ان کے جنگی راز بتلاتے۔ یرموک، قادسیہ اور تکریت وغیرہ کے معرکوں میں انہی جاسوسوں کی وجہ سے بہت فائدہ ہوا۔[۱۴۴] حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض مفتوحہ علاقوں کے کفار مسلمانوں کی سیرت، حسنِ سلوک اور کردار سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ ازخود قیصرِ روم کی فوجی تیاریوں اور نقل وحرکت بارے مسلمانوں کو آ کر خبر دیتے تھے۔[۱۴۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لشکرِ اسلام پر کڑی نظر رکھنے اور ان کی کسی غلطی وکوتاہی سامنے آنے پر اصلاح کی غرض سے فوج میں کچھ لوگوں کو مستقل پرچہ نویس (Reporters) کی حیثیت سے مقرر کر رکھا تھا، اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کو ہر آن فوج بارے خبریں ملتی رہتی تھیں۔ چنانچہ علامہ طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وكانت تكون لعمر العيون فى كل جيش فكتب الى بما كان فى تلك الغزاة"[۱۴۶]

"ہر لشکر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جاسوس ہوتے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ جنگوں میں پیش آنے والی صورتحال کے مطابق خط لکھ کر رہنمائی کرتے رہتے تھے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک بہترین منتظم (Administrator) واقع ہوئے تھے جس کا بیّن ثبوت آپ رضی اللہ عنہ کا فوج میں مذکورہ بالا شعبوں کو قائم کرنا تھا۔ اگر مختلف امور کے لیے مختلف ماہرین کو مختص کر دیا جائے تو وہ امور یقیناً بحسن وخوبی انجام پاتے ہیں جس کے نمایاں اثرات ہمیں عہدِ فاروقی کی فوج میں نظر آتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس خوبی کے ساتھ تمام افواجِ اسلام کو کنٹرول کیا ہوا تھا اور اس کی نگرانی کرتے تھے اس کو مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ یوں دادِ تحسین پیش کرتے ہیں:

"فوجی انتظام کے سلسلے میں جو چیز سب سے بڑھ کر حیرت انگیز ہے یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اس قدر بے شمار فوجیں تھیں اور مختلف ملک، مختلف قبائل، مختلف طبائع کے لوگ اس سلسلے میں داخل تھے اس کے ساتھ وہ نہایت دور دراز مقامات تک پھیلی ہوئی تھیں، جہاں سے دار الخلافہ تک سینکڑوں ہزاروں کوس کا فاصلہ تھا تاہم تمام فوج اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبضہ قدرت میں تھی کہ گویا وہ خود ہر جگہ فوج کے ساتھ موجود ہیں"۔[۱۴۷]

قلعہ شکن جدید آلات کا استعمال:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بڑے بڑے قلعوں کو منجنیق اور دبابہ کے ذریعے فتح کیا گیا۔ منجنیق اور دبابہ کا استعمال اگرچہ عہدِ نبوی میں محاصرہ طائف کے موقع پر ہو چکا تھا جس کا ذکر پیچھے اسی فصل میں ہو چکا ہے۔ تاہم عہد فاروقی میں اس کے استعمال کی نوبت کچھ زیادہ ہی آئی حتیٰ کہ بعض قلعوں کو فتح کرنے کے موقع پر بیس بیس منجنیقیں بھی استعمال کی گئیں۔[۱۴۸] دبابہ لکڑی کا بنا ہوتا تھا جس کے پہیے لگے ہوتے تھے اس میں مجاہدین دشمن کے تیروں سے محفوظ رہتے ہوئے قلعے کی دیواروں تک پہنچ جاتے تھے اور پھر قلعے کی دیواروں کو توڑنے کے لیے بہ آسانی جنگی کاروائی کر لیتے تھے۔[۱۴۹]

دبابہ کا استعمال اس سے قبل صرف محاصرہ طائف کے دوران کیا گیا تھا بلکہ درج ذیل واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھی ابتدائی دور میں اس کا استعمال نہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ مروی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر تم کسی شہر کا محاصرہ کرو تو کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم ایک شخص کو کھال کے خیمہ میں لپیٹ کر روانہ کر دیں گے۔ (تاکہ دشمن کے تیر اس پر اثر نہ کر سکیں اور وہ شہر پناہ کا دوراز کھول دے)۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر وہ تیر کی بجائے پتھر پھینک ماریں تو؟ اس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس سے تو وہ شخص مر ہی جائے گا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”پھر ایسا نہ کرو کیونکہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تم ایسا شہر فتح کر لو جس میں چار ہزار جنگجو بیٹھے ہوں لیکن اس سلسلہ میں ایک مسلمان کی جان ضائع ہو جائے“۔[۱۵۰] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دبابہ کا استعمال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں نہیں بلکہ کہیں بعد کے زمانہ میں ہوا تھا۔ دبابہ کا استعمال مذکورہ بالا واقعہ میں مذکور خدشہ وخطرہ کا ایک حل تھا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے ”ضرورت ایجاد کی ماں ہے“۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بحریہ:

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں ایک مسلمان کی جان کس قدر قیمتی تھی۔ بس یہی باعث تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کو کوئی ایسا اقدام کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے جس میں ہلاکت وخطرہ کا امکان غالب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ اسلامی لشکر کے امیر نے راستہ میں حائل نہر کے پانی کی گہرائی معلوم کرنے کے لیے ایک بوڑھے آدمی کو زبردستی داخل ہونے کا حکم دیا جس کے نتیجے میں وہ شہید ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو شدید برہمی کا اظہار کیا اور فرمایا: ”ایک مسلمان (کی جان) میرے لیے ان تمام اشیاء (اموال غنیمت) سے محبوب تر

ہے جو تم نے حاصل کیں''۔[۱۵۱]

چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں بحری جنگ گویا لشکر کو ہلاکت میں ڈالنا تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے اس کی اجازت نہ دی۔ اس اجازت نہ دینے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ سے جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بحری جنگ کی اجازت طلب کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو غزوہ بحری بارے معلومات اور مشکلات وغیرہ کا جائزہ لینے کا کہا۔ انہوں نے عدم تسلی کا اظہار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے خود بھی توجہ ہٹالی اور مسلمان فوج کو بھی منع کر دیا[۱۵۲] تیسرا سبب یہ ہوا کہ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے علقمہ بن مجزز کو کچھ دیگر لوگوں کے ساتھ بحری راستہ سے حبشہ بھیجا مگر وہ سمندر میں ہی کسی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ اس کا علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھا کر کہا کہ آئندہ کسی کو بحری سفر پر روانہ نہ کروں گا۔[۱۵۳] لیکن اس کے باوجود بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے طور پر چند ایک بحری حملے کیے جس میں ناکام رہے۔ اس ناکامی کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو ان کی سخت سرزنش کی اور معزول کیے جانے کی دھمکی دی۔[۱۵۴] چنانچہ اس کے بعد عہد فاروقی میں کسی بحری جنگ کا تاریخ میں ذکر نہیں ملتا۔[۱۵۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس دنیا فانی سے عالمِ بقا میں سدھارے تو نظامِ حکومت کو ہر لحاظ سے منظم و مرتب چھوڑ کر گئے تھے لہٰذا اس میں ایک عرصہ تک کوئی خاص تبدیلی کی ضرورت ہی نہ محسوس کی گئی۔ یہی باعث ہے کہ عہدِ عثمانی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عسکری نظام کو نہ صرف بحال رکھا گیا بلکہ جو حربی پلان (Plan) آپ رضی اللہ عنہ نے تشکیل دے دیا تھا اسی کے مطابق ہی مزید اقدامات کیے گئے مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے پیش رو خلیفہ کی طرح حسبِ ضرورت مزید فوجی مراکز بعض مقامات پر قائم کیے۔[۱۵۶] عہد فاروقی اور پھر عہد عثمانی کی فتوحات کی برکت سے اموال غنیمت سے مسلمان اور بیت المال مالا مال ہو چکے تھے۔ اس میں حاصل ہونے والے گھوڑوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی جن کی پرورش و پرداخت کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصطبل بنوائے تھے جن میں چار چار ہزار گھوڑے ہمہ وقت ساز و سامان سمیت تیار رہتے تھے اور ان کے چرنے کے لیے چراگاہیں الگ سے بنائی گئی تھیں[۱۵۷] جنھیں اصطلاح میں ''حمی'' کہا جاتا تھا۔[۱۵۸]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ضرورت و مصلحت اس کی متقاضی ہوئی کہ بیت المال کے جانوروں کے لیے مختص کی گئی چراگاہوں کو نہ صرف مزید وسیع کیا جائے بلکہ مزید بھی بنوائی جائیں جس کا آپ رضی اللہ عنہ نے اہتمام کیا۔ اسی لیے ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے چند معترضین کے ایک اعتراض کے

جواب میں فرمایا تھا: ''مجھ سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی بعض قطعات ارضی کو بیت المال کے اونٹوں کے لیے ''حمیٰ'' قرار دے چکے ہیں اور اب میرے خلیفہ بننے کے بعد چونکہ بیت المال کے اونٹوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے، اس لیے میں نے اسی ضرورت سے ان کے لیے مختص کی جانے والی چراگاہوں میں بھی اضافہ کر دیا ہے''۔[۱۵۹]

عہدِ فاروقی میں بحری فوج نہ بنانے اور بحری جنگ نہ لڑنے کے کیا اسباب تھے اس بارے تفصیلاً گزشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے مگر تقدیر کے قاضی نے ازل سے ہی یہ لکھ دیا تھا کہ یہ سعادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئے گی۔ چنانچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بار بار اصرار پر آپ رضی اللہ عنہ نے بحری جنگ لڑنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انہوں نے سنہ 28 ھ میں قبرص پر پہلا بحری حملہ کیا اور دشمن کی طرف سے صلح کی پیش کش کرنے پر چند شرائط پر صلح کر کے واپس لوٹے مگر ان لوگوں نے سنہ 32 ھ میں بعض شرائطِ صلح کی خلاف ورزی کی تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پانچ سو بحری جہازوں کے ساتھ حملہ کر کے قبرص فتح کر لیا[۱۶۰] اور اس کے بعد تو غزوات بحریہ کا ایک سلسلہ ہی جاری ہو گیا جیسا کہ مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت جنادہ بن ابی امیہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے یزید کے دور تک امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے رومیوں کے ساتھ غزواتِ بحری میں برسر پیکار رہے۔[۱۶۱] لیکن یاد رہے کہ عہدِ عثمانی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے امیر البحر عبداللہ بن قیس تھے۔[۱۶۲]

فتح قبرص جس میں پانچ سو بحری جہازوں کا استعمال کیا گیا تھا، اس طرح کی بڑی بڑی بحری جنگیں جہاز سازی کے کارخانے بنائے بغیر کیسے لڑی جا سکتی تھیں، چنانچہ عہد عثمانی میں ہی جہاز سازی کے کارخانے بھی باقاعدہ بنا دیے گئے تھے جس میں مزید وسعت اور ترقی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی۔[۱۶۳]

سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فطری طور پر فوجی منش انسان تھے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شرکت نے آپ رضی اللہ عنہ کی سپاہیانہ صلاحیتوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

''قریش سمجھتے ہیں ابو طالب کا بیٹا بہادر تو ہے مگر جنگی فنون سے آشنا نہیں، خاک آلود ہوں ان کے ہاتھ (عربی کا محاورہ ہے جس سے مقصود ناراضی اور غصے کا اظہار ہوتا ہے) کیا ان میں کوئی مجھ سے زیادہ جنگی فنون میں ماہر ہے؟ میں تو

اس وقت سے معرکہ آرائیوں میں مصروف رہا ہوں جب میری عمر ابھی بیس برس بھی نہ تھی اور اب تو میں زندگی کی ساٹھ منزلوں سے بھی تجاوز کر چکا ہوں''۔[۱۶۴]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بیان جس قدر خود اعتمادی (Self-confidence) سے دیا ہے اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ہے جس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عسکری و جنگی امور کے بارے آپ رضی اللہ عنہ کو مکمل بصیرت حاصل تھی۔ یہی باعث ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بھی سابقہ خلفاء کی طرح حسبِ ضرورت فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور قلعے تعمیر کرائے۔ اصطخر کا ''حصن زیاد'' نامی قلعہ آپ رضی اللہ عنہ نے ہی تعمیر کرایا تھا۔[۱۶۵] لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے دورِ حکومت میں اندرونی نا مساعد و ناموافق حالات اور مسلسل لڑائیوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے عسکری نظام کو مزید ترقی دینے کے زیادہ مواقع نہ مل سکے تھے۔[۱۶۶]

خلفاء راشدین کے سیاسیات میں اجتہادات:

خلفاء راشدین کے سیاسیات میں اجتہادات کے تذکرہ سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قدرے تفصیل کے ساتھ سیاست اسلامی یا سیاستِ شرعیہ بارے وضاحت کر دی جائے۔

سیاست کا لغوی و اصطلاحی مفہوم:

لغوی طور پر سیاست کا معنی ہے ''القیام علی الشئی بما یصلحه ''[۱۶۷] یعنی کسی چیز کی اصلاح و بہتری کے لیے جہد و کاوش بروئے کار لانا۔

اس لفظ کا اسی معنی میں استعمال حدیثِ رسول میں بھی ملتا ہے چنانچہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کانت بنواسرائیل تسوسهم الانبیاء کلما هلک نبی خلفه نبی''[۱۶۸]

''بنی اسرائیل کے انبیاء ان کے امور زندگی (اجتماعی) کی نگرانی و تدبیر کرتے تھے۔ جب کوئی فوت ہو جاتا تو کوئی دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا۔''

اس طرح ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا:

''قد علمت و رب الکعبة، متی تهلک العرب :اذاساس امر هم

من لم يصحب الرسول صلى الله علی وسلم ولم يعالج امر الجاهلية "[۱۶۹]

''کعبہ کے رب کی قسم! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ عرب کب ہلاک و برباد ہوں گے؟ جب ان کے (اجتماعی) امور کی نگرانی ایسا شخص کرے گا جسے صحابیٔ رسول ہونے کا شرف حاصل نہ ہوگا اور نہ ہی اسے جاہلی امور کی اصلاح کا کوئی تجربہ ہوگا۔ (تو تب وہ ہلاک ہو جائیں گے)۔''

کلامِ عرب میں اس کے اس استعمال سے معلوم ہوا کہ یہ کلمہ خالص عربی ہے نہ کہ عجمی یا معرب۔[۱۷۰]

اصطلاحی طور پر اس کی چند تعریفیں حسب ذیل ہیں۔

1۔ امام ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ (م ۹۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ سیاستِ شرعیہ سے مراد ہے حاکمِ وقت کا کوئی کام کسی مصلحت کے تحت کرنا، اگرچہ اس بارے کوئی جزئی دلیل وارد نہ ہوئی ہو۔[۱۷۱]

2۔ امام ابن عقیل رحمہ اللہ (م ۵۱۳ھ) لکھتے ہیں کہ سیاستِ شرعیہ سے مراد کوئی ایسا کام کرنا جس کے ذریعے لوگ صلاح و فلاح کے قریب اور فساد و شر سے دور ہو جائیں خواہ اس کام کو نہ تو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہو اور نہ اس بارے کوئی وحی نازل ہوئی ہو۔[۱۷۲]

3۔ ڈاکٹر عبدالعال عطوۃ نے ایک تیسری تعریف کی ہے جس کو جامع مانع ہونے کی بنا پر بعض محققین نے راجح قرار دیا ہے، جو کہ حسب ذیل ہے:

" السياسة الشرعية فعل شئى من الحاكم لمصلحة يراهافيما لم يرد فيه نص خاص وفي الامور التي من شانها الا تبقى على وجه واحدبل تتغير و تتبدل تبعاً لتغير الظروف و الاحوال "[۱۷۳]

''سیاست شرعیہ سے مراد مصلحت کی بنا پر کوئی ایسا کام انجام دینا جس کے بارے کوئی خاص نص بھی وارد نہ ہوئی ہو، اسی طرح ان امور منصوصہ میں (قدرے) تبدیلی کرنا بھی سیاست شرعیہ ہے جن کی شان یہ ہے کہ وہ ایک ہی حالت پر برقرار نہیں رہتے بلکہ حالت و ظروف کے بدلنے سے ان میں بھی کچھ (بظاہر) تبدیلی ہو جاتی ہے۔''

پہلی اور تیسری تعریف میں سیاستِ شرعیہ کا تعلق حاکمِ وقت سے جوڑا گیا ہے جبکہ دوسری تعریف کا یہ امتیاز ہے کہ اس میں ''حاکمِ وقت'' کا ذکر نہیں ہے گویا حاکمِ وقت اگر علوم دینیہ سے نابلد

ہو یا عالم تو ہو مگر مجتہد نہ ہو تو سیاستِ شرعیہ کا ظہور علماء و مجتہدین کی جانب سے بھی ہو سکتا ہے۔

تیسری تعریف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیاستِ شرعیہ کی دو قسمیں ہیں:

1۔ مصلحت کے زیر اثر کوئی نیا اقدام جس کے لیے شرع میں کوئی جزئی دلیل وارد نہیں ہوئی ہوتی اور نہ ہی اس کی کوئی نظیر موجود ہوتی ہے کہ جس پر اسے قیاس کیا جا سکے۔

2۔ وہ امور جو حالات و ظروف کے بدلنے سے تبدیلی کا تقاضا کرتے ہیں ان میں تغیر و تبدل کر دینا۔

ان تعریفوں سے یہ بات بھی کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ سیاستِ شرعیہ کی اصل بنیاد (Base) مصلحتِ عامہ ہوتی ہے اور مصلحتِ عامہ کو ملحوظ رکھنا یہ شرعاً مطلوب ہے، اسی لیے ''سیاستِ شرعیہ'' کی شرعی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے حافظ ابن قیم رحمہ اللہ (۷۵۱ھ) رقم طراز ہیں کہ یہ تو شریعت کے اجزاء میں سے ہی ایک جز ہے نہ کہ شریعت کے مخالف بلکہ یہ تو اللہ اور اس کے رسول کا ہی عدل ہے۔[۱۷۴]

یاد رہے سیاستِ شرعیہ ہی کو بعض علماء نے ''سیاستِ عادلہ'' کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسری قسم کو ''سیاستِ ظالمہ'' کا نام دیا ہے چنانچہ امام ابن فرحون رحمہ اللہ (م۷۹۹ھ) لکھتے ہیں:

> ''سیاست کی دو قسمیں ہیں: سیاستِ ظالمہ جو کہ شرعاً حرام ہے اور سیاستِ عادلہ جو ظالم سے حق (مظلوم کو) دلاتی ہے۔ بہت سے مظالم کا سد باب کرتی ہے اور فسادیوں کی سرکوبی کرتی ہے۔ اسی سیاستِ عادلہ کے ذریعے مقاصدِ شرعیہ تک پہنچا جاتا ہے۔ لہٰذا شریعت اس سیاستِ عادلہ کی طرف رجوع کرنے اور حق کے اظہار میں اس پر اعتماد کرنے کو لازم ٹھہراتی ہے۔''[۱۷۵]

خلفاء راشدین کے بہت سارے اجتہادات کا تعلق سیاستِ شرعیہ سے ہے ان میں سے چند اجتہادات کا بطور امثلہ ذکر کیا جاتا ہے۔

i۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو قبول کرتے ہوئے جمع قرآن کے اہم مشن (Mission) پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تھا جس کے نتیجہ میں قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام دراصل سیاستِ شریعہ کے طور پر تھا۔[۱۷۶]

ii- اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق اتفاق صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد لوطی کو جلانے کا حکم صادر فرمایا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ''سیاستِ شرعیہ'' میں شمار کیا ہے۔[۱۷۷]

iii- حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک خوبصورت وخوبرو اور بے ریش لڑکا نصر بن حجاج نامی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض عورتوں کو اس کے بارے شعر گاتے سنا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا سر منڈوا دیا مگر وہ مزید خوبصورت نظر آنے لگا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے مدینہ سے بصرہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔[۱۷۸]

iv- حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب شراب نوشی کی شرح بڑھ گئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے مشاورتِ صحابہ کے بعد نہ صرف حد خمر اسّی کوڑے مقرر کر دی بلکہ تمام ایسی دکانیں اور گھر جہاں شراب تیار کی جاتی تھی، انہیں بھی جلانے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رویشد ثقفی کا گھر اسی لیے جلا دیا تھا۔[۱۷۹]

v- عہد فاروقی میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کوفہ کے گورنر تھے۔ انہوں نے ایک ذاتی محل تعمیر کروایا جس کی وجہ سے لوگوں کا ان سے ربط اور میل جول کا سلسلہ کم ہو گیا۔ اس بات کا علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ روانہ ہونے کا حکم دیا اور ساتھ کہا کہ جاتے ہی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا وہ محل جلا دو۔ چنانچہ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا جس کے نتیجہ میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو باہر لائے اور انہیں کہا کہ یہاں لوگوں کے درمیان بیٹھا کریں۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے سابقہ رویہ پر معذرت کی۔[۱۸۰]

vi- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کم روایت کرنے کا حکم اس بنا پر دیا مبادا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے غلطی کا ارتکاب کر بیٹھیں نیز لوگ کہیں اس طرح حدیث کی طرف زیادہ مشغول ہو جائیں اور حفظ قرآن سے غافل ہو جائیں۔[۱۸۱]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا تمام اقدامات کو امام ابن قیم رحمہ اللہ نے سیاستِ شرعیہ سے متعلق قرار دیا ہے۔[۱۸۲] حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مصلحت کے تحت ایسے تمام نئے اقدامات جیسے باقاعدہ فوج بھرتی کرنا، فوجی چھاؤنیاں بنانا، ہر فوجی کے لیے چار ماہ کے بعد گھر جانے کو لازم قرار دینا، تقسیمِ وظائف کے لیے رجسٹرز تیار کروانا، اسلامی سکہ تیار کروانا وغیرہ دراصل

سیاستِ شرعیہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں اوران تمام کا ذکراسی باب میں تفصیلاً کیا جاچکا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا امت کے اختلاف و انتشار میں پڑنے کے خدشہ کے پیش نظر جمع قرآن کے حوالے سے اقدام اوراسی طرح آپ رضی اللہ عنہ کا قریشی کتابت کے علاوہ دیگر کتابت کے قرآنی نسخوں کو جلانا، دراصل سیاستِ شرعیہ کے طور پر ہی تھا۔ [۱۸۳]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زندیقوں کو جلایا [۱۸۴] اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے ذخیرہ اندوز کے سارے ذخیرہ کو آگ لگانے کا حکم دیا [۱۸۵] نیز کوفے کا ایک محلّہ زرارہ بھی جلا دینے کا حکم دیا جس میں شراب کی خرید وفرخت ہوتی تھی۔ [۱۸۶]

ایک شخص نے بیوی کو طلاق رجعی دینے کے بعد خفیہ رجوع کرلیا اوراس پر دو مردوں کو گواہ بھی بنالیا مگر بیوی کواس کی اطلاع نہ کی۔ عدت گزرگئی تو اس نے رجوع کا دعوی کر دیا مگر آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے رجوع کو کالعدم قرار دیا۔ [۱۸۷]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ تمام اجتہادات دراصل سیاستِ شرعیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

فصل سوم:

خلفاء راشدین کی اجتہادی نوعیت

کوئی مجتہد یا تو محض ذاتی سوچ بچار کے بعد کوئی اجتہادی رائے قائم کرے گا یا وہ دیگر مجتہدین سے مشاورت کے بعد اجتماعی رائے قائم کرے گا لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں:

1- انفرادی و شخصی اجتہاد 2- مشاورتی و اجتماعی اجتہاد۔

خلفاء راشدین سے یہ دونوں قسم کے اجتہادی انداز ثابت ہیں۔

ذیل میں اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ خلفاء راشدین نے شخصی و انفرادی اجتہاد کب کیا اور مشاورتی طرز کے اجتہاد کی انہیں کس وقت ضرورت پیش آئی۔

خلفاء راشدین کے شخصی و انفرادی اجتہادات:

شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اگر ایک شخص اپنے اندر اجتہادی صلاحیت و اہلیت پاتا ہے تو وہ بوقتِ ضرورت اکیلا بھی اجتہاد کر سکتا ہے جس طرح کے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کہا تھا" اجتھد راي و لا آلو "(میں اجتہاد کرتے ہوئے (قرآن وسنت کی روشنی میں) اپنی رائے پیش کروں گا اور اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اس عزم و ارادہ پر انتہائی اطمینان اور مسرت کا اظہار فرمایا تھا[۱۸۸] یہی وجہ ہے کہ خلفاء راشدین کے بھی کئی اجتہادات شخصی و انفرادی اجتہادات ہیں۔ اس لیے کہ اگر انہیں اپنی اجتہادی رائے کے درست ہونے میں مکمل ظنِ غالب حاصل تھا تو مشاورت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی چنانچہ ڈاکٹر عبدالعظیم لکھتے ہیں" (عہدِ خلفاء میں) انفرادی و شخصی اجتہادات ان جزئی حادثات میں ہوتا تھا کہ جن میں حکم شرعی تک پہنچنا آسان تھا جس طرح کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بھی جزئی حوادثات میں اجتہاد شخصی کرتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کی اجازت بھی دی تھی۔[۱۸۹] ذیل میں خلفاء راشدین کے چند شخصی اجتہادات کی امثلہ ذکر کی جاتی ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شخصی و انفرادی اجتہادات:

i۔ عہدِ صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے دعویٰ اسلام کے باوجود زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جہاد و قتال کا اعلانِ عام کر دیا۔ یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذاتی انفرادی و شخصی اجتہاد تھا کیونکہ اس کے واضح دلائل آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں موجود تھے اور آپ رضی اللہ عنہ اپنے اس اجتہادی فیصلے پر مطمئن بھی تھے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے اس بارے مزید مشاورت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی بلکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے چند خدشات کا اظہار کیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انتہائی تسلی بخش اور مسکت جوابات دیے جس پر بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔[۱۹۰]

ii۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شخصی و انفرادی اجتہادات میں سے ایک آپ رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کرنا ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانشین واضح طور پر مقرر نہ کیا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد انفرادی و شخصی ہے آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنا جانشین نامزد کرنے میں انتہائی زیادہ سوچ بچار سے کام لیا تھا۔[۱۹۱]

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے ان سے اس بارے مشاورت بھی کی لیکن یہ مشاورت درحقیقت ان کے خیالات معلوم کر کے ان کے ممکنہ خدشات دور کرنے کے لیے تھی چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کا اظہار حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا۔ اور ان سے علیحدہ علیحدہ پوچھا کہ ان کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارے کیا خیال ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو مکمل اتفاق رائے کا اظہار کیا اور فرمایا ''میرے علم کے مطابق ان کا باطن، ظاہر سے اچھا ہے اور ہم میں ان جیسا کوئی نہیں''۔[۱۹۲] حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ سخت مزاج ہیں لہٰذا ان کی یہ سخت مزاجی امت کے لیے کہیں تنگی کا باعث نہ بن جائے۔ اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کی سختی میری نرمی کی وجہ سے تھی لیکن جب ان کے کندھوں پر بارِ خلافت پڑے گا تو ان کی سختی بہت حد تک جاتی رہے گی۔[۱۹۳]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنے کا علم جب کچھ دیگر لوگوں کو ہوا تو وہ بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ رضی اللہ عنہ اپنے رب کو کیا جواب دیں گے، اگر اس نے آپ رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنے بارے پوچھ لیا، حالانکہ آپ رضی اللہ عنہ

ان کی سختی و درشتی کو بھی جانتے ہیں؟ یہ سن کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جو کہ لیٹے ہوئے تھے کہا: "مجھے بٹھا دو"۔ اور پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کیا تم مجھے اللہ (کے غضب) سے ڈراتے ہو بخدا، جب مجھے اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا تو میں نہات عاجزی سے عرض کروں گا کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں کا خلیفہ تیرے سب سے بہتر بندے کو مقرر کیا۔" [۱۹۴]

غرض اس طرح آپ رضی اللہ عنہ نے سب کی تشفی کرادی۔ مذکورہ بالا تمام تاریخ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک ذاتی رائے قائم کر لی تھی مگر اس کے بعد مشاورت بھی کی اور لوگوں کے خدشات دور کر کے انہیں اپنا ہم خیال بنالیا۔ اس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کے دو مرحلے ہیں۔ پہلے مرحلے میں یہ اجتہاد، انفرادی و شخصی اجتہاد کی حیثیت رکھتا ہے مگر دوسرے مرحلہ میں چونکہ اس میں مشاورت کا عنصر بھی موجود ہے لہٰذا اس دوسرے مرحلہ میں یہ "اجتماعی اور شورائی اجتہاد" کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ [۱۹۵]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے شخصی و انفرادی اجتہادات:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس امت کا سب سے بڑا فقیہ قرار دیا جائے تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا یقیناً آپ رضی اللہ عنہ مجتہد مطلق کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی وسعتِ علمی اور فقاہت سے کسے انکار ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کئی بار انتہائی وثوق اور اعتماد کے ساتھ اکیلے ہی اجتہاد کیا اور مشاورت کی ضرورت محسوس نہ کی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے انفرادی و شخصی اجتہادات کی چند ایک امثلہ حسب ذیل ہیں۔

i۔ اراضی عراق و شام جو غنیمت میں حاصل ہوئی تھیں اور اموال غیر منقولہ کی حیثیت رکھتی تھیں ان کے بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذاتی طور پر اپنی اجتہادی رائے پہلے سے ہی یہ قائم کر لی تھی کہ زمین ان کے اصل باشندوں کے پاس ہی رہنے دی جائے اور ان سے اس پر خراج وصول کیا جائے۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح عراق کے ساتھ ہی آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو وہاں کی مردم شماری کرنے کا حکم دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نہایت احتیاط اور جانچ پڑتال کے ساتھ یہ کام مکمل کر کے ریکارڈ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اندازہ لگایا کہ اگر کفار کو بطور غلام مسلمان فوجیوں میں بانٹ دیا جائے تو ایک ایک کے حصے میں تین تین آئیں گے لہٰذا اسی وقت آپ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہوئی کہ نہ تو زمین مجاہدین میں تقسیم کی جائے اور نہ ہی کفار کو بطور غلام مسلمان فوج میں تقسیم کیا جائے۔ [۱۹۶]

یہ درست ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس بارے دیگر علماء وفقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی بعد میں مشاورت کی اور مشاورت کا یہ سلسلہ کئی روز تک جاری وساری رہا اور بالآخر آپ رضی اللہ عنہ کے قرآن مجید کی ایک آیت سے استدلال کرنے پر تمام صحابہ فاروقی رائے کے موافق ہو گئے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد اپنے پہلے مرحلے میں تو انفرادی نوعیت کا تھا مگر دوسرے مرحلہ میں ''شورائی اور اجتماعی اجتہاد'' کی نوعیت اختیار کر گیا۔

ii۔ عہدِ صدیقی کے آغاز میں بیک وقت کئی محاذوں پر جنگیں لڑی گئیں جن میں سے بعض جنگی معرکے جھوٹے مدعیان نبوت اور ان کے گمراہ پیروکاروں کے ساتھ بھی ہوئے۔ جن میں سے ایک تاریخی معرکہ وہ ہے جو یمامہ کے علاقہ میں مسیلمہ کذاب سے پیش آیا اگر چہ مسلمان عساکر کامیاب و کامران لوٹتے رہے مگر مسلمانوں کا بھی جانی نقصان کافی ہوا۔ کفار تو جہنم واصل ہوئے مگر مسلمان مجاہدین شہادت کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

اللہ کی قدرت دیکھیے کہ کبھی شر سے بھی خیر کا پہلو نکل آتا ہے۔ جنگِ یمامہ میں رتبہ شہادت پر فائز ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد تھی۔ چنانچہ اس وقت پوری امت میں سے صرف ایک ہی شخص تھا جسے پوری امت کی دینی مصلحت نے ایک ایسے اقدام پر سوچنے پر مجبور کیا جو بذاتِ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض وجوہات کی بنا پر نہ کیا تھا۔ امت کا درد رکھنے والے وہ دور اندیش، مستقبل پہ گہری نظر رکھنے والے، جن کے ملہم ومحدث ہونے کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق کر دی تھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے جنھیں جنگِ یمامہ کے شہید ہونے والے حفاظ کی ایک بہت بڑی جماعت نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر اسی طرح جہادی معرکے جاری رہے اور حفاظ صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوتے گئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ حفاظ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے ساتھ ہی قرآن بھی ان کے ساتھ ہی رخصت ہو جائے اور انسانیت پھر ظلمت وتاریکی کی گہرائیوں میں ڈوب جائے ،لہٰذا انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اس مسئلہ کا حل کیوں کر ہو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں ''جنگِ یمامہ میں قرآن مجید کے حفاظ وقراء کی ایک بہت بڑی تعداد جامِ شہادت نوش کر چکی ہے اور مجھے تو یہ خطرہ لاحق ہوا ہے کہ اگر اسی طرح دیگر مقامات پر بھی قراء کا قتل ہوتا رہا تو قرآنِ مجید کا بہت سا حصہ چلا جائے گا۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ جمع قرآن کا حکم جاری فرمائیں''۔[۱۹۷]

عصرِ حاضر کے نامور مصنف ومورخ محمد حسین ھیکل لکھتے ہیں کہ جمع قرآن کی سوچ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں آئی تھی۔ یہی باعث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنہوں نے کئی دنوں کے غور و

فکر اور سوچ بچار کے بعد اپنی رائے کا اظہار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا[۱۹۸] تو انہوں نے سنتے ہی حیرت و استعجاب کے ساتھ فوری ہچکچاہٹ کا اظہار یوں کیا تھا: ''آپ رضی اللہ عنہ وہ کام کیوں کر کر سکتے ہیں جو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا ہے''؟[۱۹۹]

صحیح بخاری کی مذکورہ روایت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جمع قرآن کی اجتہادی فکر اور سوچ محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی اور آپ رضی اللہ عنہ جمع قرآن کے کام بارے عزم بالجزم کر چکے تھے گویا آپ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرنے نہ آئے تھے بلکہ قائل کرنے ہی آئے تھے جیسا کہ خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بتایا: ''میرے انکار پر مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''واللہ خیر'' اور پھر مجھ سے اس بارے تکرار کرتے رہے حتیٰ کہ اس بارے اللہ نے میرا سینہ بھی کھول دیا''۔[۲۰۰]

معلوم ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا اجتہاد انفرادی و شخصی اجتہاد تھا جس کی ضرورت و اہمیت اور افادیت کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور پھر دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی بالآخر قائل ہو گئے تھے۔

iii۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اسلامی ریاست میں رہنے والے اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر کیا ہے[۲۰۱] اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے مالدار اور فقیر اہل کتاب میں کسی قسم کے فرق کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ یمن پر صرف ایک دینار سالانہ جزیہ مقرر کیا تھا جو ہر کس و ناکس کے لیے ایک معمولی رقم تھی کیونکہ اس کی ادائیگی بھی سال میں ایک مرتبہ کرنی ہوتی تھی[۲۰۲] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بارے بھی یہی ثابت ہے کہ ان کے دور میں بھی جزیہ کی مقدار مذکورہ بالا ہی رہی اور اس سلسلہ میں امیر و غریب کا کچھ فرق روا نہ رکھا گیا اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی گئی[۲۰۳] بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے اہلِ نجران کے ساتھ اسی معاہدہ کی تجدید کر دی جو عہدِ نبوی میں ہوا تھا۔[۲۰۴]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اہلِ کتاب کی مالی حالتوں میں اختلاف کی بنا پر مالداروں پر اڑتالیس درہم اور متوسط درجہ کے اہل کتاب پر چوبیس درہم اور تیسرے درجہ (Third class) کے اہل کتاب پر بارہ درہم سالانہ مقرر کر دیے۔[۲۰۵] مزید برآں آپ رضی اللہ عنہ نے ان میں سے بوڑھے اور معذور قسم کے افراد سے جزیہ ویسے ہی نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ان کی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے ان کی مالی اعانت بھی کی۔ چنانچہ مروی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے نابینے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے بھیک مانگنے کی وجہ پوچھی۔ اس

نے کہا: ''بوڑھا ضرورت مند ہوں اور جزیہ بھی دینا ہے''۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ پکڑا، اسے گھر لائے اور اپنے گھر سے کچھ دیا اور اسے بیت المال کے خازن کے پاس بھیج کر حکم دیا: ''اس کا اور اس جیسے دیگر بوڑھوں کا خیال رکھو، اللہ کی قسم! یہ کوئی انصاف کی بات نہیں کہ ہم ان کی جوانی میں تو ان سے جزیہ وصول کریں، اور اب بڑھاپے میں ان کو اس طرح رسوا کریں''۔[۲۰۶] اور آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے اور اس جیسے دیگر بوڑھے عاجز افراد سے جزیہ ساقط کر دیا۔[۲۰۷]

گویا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آیتِ جزیہ سے بوڑھے، معذور اور کمائی کے نا قابل افراد کو مستثنیٰ قرار دے دیا اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شخصی و انفرادی اجتہاد تھا اس کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم سے کسی مشاورت کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ اپنے اس اجتہاد کی بنیاد (Base) اور دلائل آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں تھے جس پر آپ رضی اللہ عنہ کو مکمل وثوق اور اعتماد تھا اور وہ دلائل غالباً درج ذیل ہوں گے:

i۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾[۲۰۸]

''خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

ii۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بھی بایں الفاظ مروی ہے:

''من ظلم معاهدا او كلّفه فوق طاقته فانا خصمه يوم القيامة''.[۲۰۹]

''جس نے معاہد (وہ کافر جس سے امن وامان وغیرہ کا کوئی بھی معاہدہ ہو چکا ہو) پر ظلم کیا یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اسے کسی کام کا ذمہ دار بنایا (مثلاً جزیہ وغیرہ) تو میں قیامت کے دن اس کی جانب سے اس کے مقدمہ کی وکالت کروں گا۔''

یہ دلائل آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے زندگی کے آخری ایام میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو ذمیوں سے حسنِ سلوک کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان پر ان کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالنا۔[۲۱۰]

4۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہوا جس کے نتیجہ میں آپ رضی اللہ عنہ شدید زخمی ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی حالت دیکھ کر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اب آپ رضی اللہ عنہ کے جانبر ہونے کی کوئی صورت نہ ہو گی، تو انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ سے اپنا جانشین نامزد کرنے کا مطالبہ کیا کیونکہ انہیں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اگر آپ رضی اللہ عنہ اپنا جانشین نامزد کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے تو کہیں امت کسی فتنہ کا شکار نہ ہو جائے اور ان کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے مگر آپ رضی اللہ عنہ نے کسی کو اپنا جانشین نامزد

کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ''میں اس بوجھ کو نہ تو زندگی میں اور نہ ہی مرنے کے بعد اٹھانے کی سکت رکھتا ہوں''۔[۲۱۱]

لیکن کافی سوچ بچار کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا: ''یہ رہی صحابہ رضی اللہ عنہم کی وہ جماعت، جن سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوتے وقت راضی تھے''۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے وضاحت کے ساتھ چند نام بھی لیے جو حسب ذیل تھے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ''۔ مزید آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ محض مشاورت کے لیے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو بھی شامل کر لینا مگر حکومت و خلافت کے عہدہ کے لیے انہیں کوئی حق نہیں۔[۲۱۲]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا چھ افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دینا ایسا اقدام تھا جس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ یہ دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذاتی شخصی و انفرادی اجتہاد تھا جس کا منشیٰ و بنیاد یہ تھی کہ ان چھ افراد کو خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے زندگی میں ہی جنت کی بشارت مل چکی تھی[۲۱۳]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا اور بجا تھا کہ یہ حضرات یقیناً کوئی بہتر فیصلہ ہی کریں گے جو ساری امت کے حق میں بہتر ہوگا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور انفرادی اجتہاد:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کبوتر بازی کی وبا نوجوانوں میں عام ہوگئی جس کے نتیجہ میں کئی طرح کے مفاسد سامنے آرہے تھے مثلاً وقت کا ضیاع، کبوتروں کو اڑانے کی غرض سے مکانات کی چھتوں پر چڑھنے سے لوگوں کے گھروں کے پردے (privacy) کا متاثر ہونا وغیرہ۔[۲۱۴] چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے بارے سخت کارروائی کا فیصلہ کرتے ہوئے کبوتروں کو ہی ذبح کرنے کا حکم دے دیا[۲۱۵] کیونکہ ان کی حیثیت آلہ جرم کی سی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام درحقیقت سد ذریعہ کے طور پر تھا اور یہ آپ رضی اللہ عنہ کا انفرادی و شخصی اجتہاد تھا جس کے لیے کسی مشاورت کی نوبت نہیں آئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور انفرادی اجتہاد:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیادہ تر اجتہادات کا تعلق گزشتہ تین خلفاء کے ادوار سے ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ چونکہ پہلے تینوں خلفاء کی مجلسِ مشاورت کے ایک اہم رکن تھے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کے

بیسیوں اجتہادات آپ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے سے قبل کے ہیں۔ ذیل میں آپ رضی اللہ عنہ کے چند انفرادی و شخصی اجتہادات ذکر کیے جاتے ہیں جنہیں سابقہ خلفاء نے بھی تسلیم کرلیا تھا۔

1۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چور کا چوری کرنے پر ایک ہاتھ کاٹ دیا۔ دوسری مرتبہ چوری کرنے پر ایک پاؤں کاٹ دیا۔ تیسری مرتبہ اس نے پھر چوری کرلی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اب اس کا دوسرا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا اور وجہ یہ بتائی کہ ایسا کرنے سے وہ کھانا وغیرہ کیوں کر کھا سکے گا اور اگر پاؤں کاٹتے ہیں تو وہ چل پھر نہ سکے گا لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا تو اسے کوئی تعزیری سزا دیں یا قید میں ڈال دیں چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے علوی رائے کے مطابق اسے قید میں ڈال دیا۔[۲۱۶]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنے عہد حکومت میں بھی تیسری بار چوری کرنے والے شخص کے بارے یہی طرز عمل رہا چنانچہ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں ایک ہاتھ اور ایک پاؤں قطع کرنے کے بعد پھر اس کا دوسرا ہاتھ یا پاؤں قطع کروں بلکہ میں اس کے لیے ایک ہاتھ رہنے دوں گا تا کہ وہ ضرورت کے وقت اس سے کام لے سکے اور ایک پاؤں چھوڑ دوں گا تا کہ وہ چل سکے البتہ سزا کے طور پر اسے قید خانے میں ڈال دوں گا''۔[۲۱۷]

مذکورہ بالا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انفرادی و شخصی اجتہاد تھا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحت پر مبنی ہونے کی وجہ سے قبول بھی کرلیا۔

خلفاء راشدین کا مشاورتی واجتماعی اجتہاد:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کا حکم دیا تھا[۲۱۸] لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کثرت سے مشورہ کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے جن میں سے بعض کا تذکرہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد'' کے عنوان کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص خلفاء راشدین نے بھی اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کئی مواقع پر مشاورتی اجتہاد کیا۔ خلفاء راشدین کے مشاورتی اجتہادات کی امثلہ ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ ان کے یہاں مشاورت کی کس قدر اہمیت تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے نام خط میں مشورہ کی تلقین بایں الفاظ کی:

''ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاورنا فی الحرب

فعليك به "[۲۱۹]

''بلاشبہ رسول اللہ ﷺ جنگی معاملات میں ہم سے مشاورت کیا کرتے تھے لہٰذا تم بھی اس (مشاورت) کو لازماً اختیار کرو۔''

اسی طرح جب ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی درخواست پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں کمک بھیجی تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے خصوصاً صلاح و مشورہ کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے خط میں لکھا:

''میں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لکھا ہے کہ تمہاری مدد کے لیے روانہ ہو جائیں، جب وہ آئیں تو ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا اور رعونت نہ دکھانا۔ اگر چہ سپہ سالار اعلیٰ تم ہی رہو گے مگر ان سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرنا بلکہ سب لوگوں سے صلاح و مشورہ کرنا اور ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھانا''۔[۲۲۰]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کے نام خط میں مشورہ کی ضرورت واہمیت کو یوں اجاگر کیا۔

''جب تمہیں کوئی مسئلہ پیش آئے تو کتاب اللہ میں غور وفکر کر کے فیصلہ کرو۔ اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ مل سکے تو فیصلہ نبوی کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر فیصلہ نبوی بھی اس بارے نہ مل سکے تو ائمہ صالحین کی رائے کے مطابق فیصلہ کرو، بصورتِ دیگر تمہیں اختیار ہے کہ اجتہاد کرتے ہوئے کوئی اپنی رائے قائم کرلو۔اور اگر تم چاہو تو مجھ سے مشورہ کرلو اور تمہارا میرے ساتھ مشورہ کر لینا یقیناً تمہارے لیے خیر کا باعث ہوگا''۔[۲۲۱]

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا:

"لا خلافة الا عن مشورة".[۲۲۲]

''وہ طرزِ حکومت خلافتِ (اسلامی) نہیں کہلا سکتا جس میں مشورہ کے اصول کو اختیار نہ کیا گیا ہو۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے یہاں مشاورت کی کس قدر اہمیت تھی اس کا اندازہ ان کے حسبِ ذیل خط سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر گورنروں کے نام لکھا۔ آپ رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

''آپ رضی اللہ عنہ کا طرز عمل ویسا ہی رہنا چاہیے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی سیرت میں برائیاں نہ آنی چائیں۔ جن معاملات کا تصفیہ کرنے میں آپ رضی اللہ عنہ کو وقت پیش آئے وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے ہم اس بارے میں قوم سے مشورہ کر کے آپ رضی اللہ عنہ کو صحیح طریق کار سے مطلع کر دیں گے''۔[۲۲۳]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاورتی انداز میں اجتہاد کرنے کی تلقین کی تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ جب کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کے بارے (قرآن و حدیث میں) امرونہی وارد نہ ہوئی ہو تو اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

''شاوروا فيه الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه برای خاصة۔''[۲۲۴]

''اس مسئلہ بارے عبادت گزار فقہاء سے مشاورت کرو اور کسی خاص (انفرادی) رائے پر عمل نہ کرو۔''

اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ جس فیصلہ پر شوریٰ کا اتفاق ہو جائے اس میں اللہ کی رضا ہے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں لکھا:

''جن لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی انہی لوگوں نے میری بیعت کر لی ہے لہٰذا اب کسی حاضر و غائب کو اس کی مخالفت کا حق نہیں پہنچتا۔ شوریٰ (اس وقت) مہاجرین و انصار کا حق ہے۔ اور جس شخص کو یہ (اہل شوریٰ) متفقہ طور پر امام بنالیں گے اللہ کی رضا بھی اسی میں ہے''۔[۲۲۵]

خلفاء راشدین کے یہاں مشاورت کی اہمیت و افادیت کے ذکر کے بعد ذیل میں خلفاء راشدین کی مجالس شوریٰ پر قدرے تفصیل سے بحث کی جاتی ہے اور ان کے شورائی اجتہاد کی امثلہ بھی ذکر کی جاتی ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طریق اجتہاد بارے امام ابن سعد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس میں اہل رائے واہل فقہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشاورت مقصود ہوتی تو آپ رضی اللہ عنہ مہاجرین و

انصار کو بلا بھیجتے اور (بالخصوص) حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، عبد الرحمان بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت (رضی اللہ عنھم اجمعین) کو بھی بلاتے"[۲۲۶]

امام ابن سعد کی اس مذکورہ بالا روایت سے جہاں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بوقتِ ضرورت مشاورتی اجتہاد کرنے کے بارے آگاہی حاصل ہوتی ہے وہاں ہمیں اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی شوریٰ کے ممبران (Members) کون حضرات تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس قدر مشاورت کا اہتمام کرتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ امام شعبی رحمہ اللہ (م ۱۱۰ھ) جو مشہور فقہاء تابعین میں سے ہیں، کہا کرتے تھے کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تلاش کیا کرو کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ محض ذاتی اجتہاد نہ ہوتا تھا بلکہ آپ رضی اللہ عنہ اکثر اوقات مشاورت کے بعد ہی ایک رائے قائم کیا کرتے تھے۔[۲۲۷]

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ء) لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی مشرق و مغرب میں مقبولیت کا ایک اہم سبب ہی یہ ہے کہ وہ مشاورتِ صحابہ رضی اللہ عنھم کے بعد طے پائے تھے چنانچہ آپ رحمہ اللہ اس بارے بایں الفاظ خامہ فرسائی کرتے ہیں:

" کان من سيرة عمر انه كان يشاور الصحابة و يناظرهم حتى تنكشف الغمّة و ياتيه الثلج فصار غالب قضاياه و فتاواه متّبعة في مشارق الارض و مغاربها".[۲۲۸]

''حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا طریقہ یہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے مشاورت اور بحث مباحثہ کیا کرتے تھے جس کے نتیجے میں حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی۔ اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کے اکثر و بیشتر اجتہادی فیصلوں اور فتوؤں کو مشرق و مغرب میں قبولیت حاصل ہوئی۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ کے ارکان بھی وہی تھے جو عہد صدیقی میں تھے یعنی مہاجرین و انصار بالعموم اور بالخصوص حضرت عثمان، علی، عبد الرحمٰن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، اور زید بن ثابت رضی اللہ عنھم۔[۲۲۹]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاورت کے لیے عہد فاروقی میں ایک مجلسِ خاص تھی جو مذکورہ بالا اصحابہ کرام رضی اللہ عنھم پر مشتمل تھی اور ایک مجلسِ عام تھی جو جمیع مہاجرین و انصار پر مشتمل تھی جو کسی

نہایت ہی اہم مسئلہ بارے بلائی جاتی تھی تا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی دو معتبر جماعتوں کو شریکِ مجلس کر کے کسی متفقہ رائے تک پہنچا جا سکے۔[۲۳۰] اسی طرح مہاجرین پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ ایسی بھی تھی جن کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ روزانہ مشاورتی اجلاس منعقد کرتے تھے چنانچہ مورخ بلاذری (م ۲۷۹ھ) لکھتے ہیں:

"کان للمھاجرین مجلس فی المسجد فکان عمر یجلس معھم فیه و یحدّثھم عما ینتھی الیه من امر الافاق.[۲۳۱]

"مسجد نبوی میں مہاجرین کی مجلس منعقد ہوتی جس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بیٹھتے اور وہ اہم معاملات جو مختلف اطراف و جوانب سے آپ تک پہنچے ہوتے، ان بارے آپ رضی اللہ عنہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم سے (مشاورتی) گفتگو فرماتے۔"

مجلس شوریٰ کے ارکان کو جمع کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک منادی "الصلوة جامعة" (نماز کے لیے جمع ہو جاؤ۔) کے الفاظ بلند آواز سے پکارتا اور ارکانِ شوریٰ فوراً مسجد نبوی میں جمع ہو جاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دو رکعت ادا کرنے کے بعد ممبر پر تشریف فرما ہوتے اور پیش آمدہ مسئلہ پیش کرتے۔[۲۳۲]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شورائی اجتہاد کی امثلہ:

1۔ عہدِ صدیقی میں ایک شخص کے عملِ لواطت میں آلودہ و ملوث ہونے کا واقعہ سامنے آیا اور اس واقعہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہایت حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اس گناہ سے ابھی تک محفوظ رہے تھے[۲۳۳] جب اس واقعہ کی خبر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور ان کی اس بارے رائے معلوم کی۔ بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے سے سب نے اتفاق کیا تو اسی کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرما دیا۔[۲۳۴]

2۔ مرتدین کے خلاف جنگ میں ذاتی شرکت کے لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ فرما لیا تھا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر نہ جانے کا مشورہ دیا کہ اگر آپ رضی اللہ عنہ کو خدانخواستہ جنگ میں کوئی تکلیف پہنچی تو خدشہ ہے کہ اسلام کا شیرازہ بکھر جائے گا۔[۲۳۵]

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ مشورہ اس پس منظر میں تھا کہ اگر فوج کو کوئی نقصان ہو تو خلیفة المسلمین ان کی امداد کے لیے کمک بھیج سکتا ہے لیکن خلیفہ کی خود شرکتِ جنگ کی صورت میں اگر شکست

ہوتی ہے تو اسے پوری ریاست کی شکست سمجھا جائے گا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمنانِ اسلام نوزائیدہ اسلامی ریاست پر چڑھ دوڑیں گے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے علوی مشورہ کو قبول کرتے ہوئے خود جانے کا ارادہ تبدیل کر دیا۔[۲۳۶]

3۔ ''خلفاء راشدین کا انفرادی و شخصی اجتہاد'' کے ضمن میں بالتفصیل لکھا جا چکا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اپنی زندگی میں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنا اپنے پہلے مرحلہ میں تو انفرادی اجتہاد تھا مگر دوسرے مرحلہ میں یہ شورائی اجتہاد پر مبنی تھا ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشاورتی اجتہاد کی امثلہ:

i۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشاورتی اجتہاد کے نتیجہ میں ہی سن ہجری کے استعمال کا آغاز ہوا۔ چنانچہ اس کے آغاز کا پس منظر کچھ اس طرح سے بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس میں اس پریشانی کا اظہار کیا کہ خلیفہ کی طرف سے موصول ہونے والے خطوط پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی لہٰذا اس کا کوئی حل نکالا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کی۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اور بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے تاریخ کا آغاز کرنے کا مشورہ دیا[۲۳۷] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت یا ہجرت سے آغاز کے مشورہ سے قبل بعض نے رومیوں اور ایرانیوں کے سن کو ہی اختیار کرنے کا حکم دیا مگر اس رائے پر اتفاق نہ ہو سکا۔[۲۳۸] بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے اسلامی سن کا آغاز کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق رائے ہو گیا۔[۲۳۹]

اس اتفاق کے بعد پھر یہ سوال اٹھا کہ کس مہینے سے سال کا آغاز کیا جائے؟ چنانچہ بعض نے رمضان کہا اور بعض نے محرم کہا چونکہ عموماً حجاج کرام محرم میں اپنے گھروں کو لوٹتے تھے لہٰذا ماہِ محرم کی حرمت و تقدس کے پیش نظر اس سے ہی سال کے آغاز کرنے پر اتفاق ہو گیا۔[۲۴۰] اور غالباً یہ سولہ ہجری کی بات ہے۔[۲۴۱]

ii۔ عہدِ فاروقی میں شام کے کچھ مسلمان نوجوانوں نے شراب پی اور جب ان سے اس بارے پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ شراب ہمارے لیے حلال ہے اور بطور دلیل آیتِ قرآنی ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا﴾ (المائدہ 93:5) (جو لوگ ایمان لائے اور

نیک کام کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔) پیش کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے گورنر شام یزید بن ابی سفیان کو حکم دیا کہ انہیں پکڑ کر فوراً مدینہ منورہ بھیج دیا جائے۔ یہ لوگ مدینہ آئے تو ان کے بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''امیر المومنین، انہوں نے اللہ کے ذمہ جھوٹی بات لگائی ہے اور اللہ کے دین میں ایسی بات جاری کر دی ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے اس لیے ان کی گردنیں اڑانے کا حکم دیجئے''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابھی تک خاموش بیٹھے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بھی اظہارِ رائے کا کہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے توبہ کرنے کا کہیں۔ اگر وہ توبہ کرلیں تو حد خمر کے طور پر اسی کوڑے لگائیے۔ اور اگر توبہ کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو پھر ان کی گردنیں اڑا دیجئے کیونکہ انہوں نے اللہ کے ذمہ جھوٹی بات لگائی ہے اور اپنے دین میں ایسی بات کا رواج دیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی ہے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علوی رائے کو قبول کرتے ہوئے ان لوگوں سے توبہ کا مطالبہ کیا۔ ان حضرات نے توبہ کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں حد خمر کے طور پر اسی کوڑے لگائے۔[۲۴۲]

iii۔ عہدِ فاروقی میں ایک قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ قصاصاً اسے قتل کر دیں چنانچہ انہوں نے قاتل کے جسم میں تلوار اتار دی اور یہ سمجھ کر کہ وہ مر گیا ہے چھوڑ دیا جبکہ اس میں زندگی کی رمق ابھی باقی تھی لہٰذا اس کے گھر والے اسے اٹھا کر لے گئے اور اس کا علاج کروایا تو چند ایام کے بعد وہ صحت مند ہو گیا۔ مقتول کے ورثاء نے دوبارہ مقدمہ کیا کہ وہ قاتل تو بچ نکلا ہے۔ یہ مقدمہ اس علاقے کے گورنر حضرت یعلی رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے فیصلہ یہ کیا کہ اگر مقتول کے ورثاء اسے دوبارہ قتل ہی کرنا چاہتے ہیں تو پھر جو زخم (قتل کرنے کے لیے) پہلے اسے لگائے گئے ان کی دیت ادا کریں اور پھر قتل کر دیں۔ مگر مقتول کے ورثاء اس فیصلے پر راضی نہ ہوئے اور یہ مقدمہ (Case) براہِ راست عدالتِ فاروقی میں پہنچ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت یعلی رحمہ اللہ کو فوری طور پر مدینہ منورہ پہنچنے کا حکم دیا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت یعلی کے فیصلہ کی توثیق و تحسین کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس رائے سے متفق ہو گئے اور آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت یعلی کے فیصلہ کو ہی برقرار رکھا۔[۲۴۳]

iv۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یہ قضیہ پہنچا کہ ایک لونڈی زنا کی مرتکب ہوئی ہے اور وہ اپنے اس فعل قبیح کا علی الاعلان ذکر بھی کرتی پھر رہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس مشاورت میں اس کا

معاملہ پیش کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ دونوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس پر حد زنا جاری کر دی جائے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس فعل قبیح کی حرمت کا علم ہی نہیں ورنہ وہ علانیہ اس کا اظہار نہ کرتی جبکہ حد کا نفاذ صرف اسی پر ہوتا ہے جسے حرمت کا علم ہو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق ہو گئے اور اس لونڈی کی تعزیراً مار پٹائی کر کے اسے چھوڑ دیا گیا۔[۲۴۴]

v۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد تک دیت اونٹوں کی صورت میں ادا کی جاتی رہی[۲۴۵] مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیت کی ادائیگی کرنے والوں کی سہولت کے پیش نظر سو اونٹوں کی قیمت کے برابر گائے بکری، حلے (سوٹ، لباس) اور دیگر اشیاء دیت میں وصول کیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اقدام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کے بعد کیا۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ (م ۱۰۱ھ) نے ایک دفعہ اپنے ایک خط میں اس بات کو وضاحت سے لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کے بعد یہ طے کیا تھا کہ اونٹ والوں پر سو اونٹ دیت ہوگی، گایوں والوں پر دو سو گائیں اور بکری والوں پر ایک ہزار بکریاں جبکہ یمن کے کپڑے بننے والوں پر پانچ سو حلے یا ان کی قیمت واجب الادا ہوگی اور اگر قاتل اعرابی (دیہاتی، عرب کا بدو) ہے تو سو اونٹ دیت ادا کرے اور اسے چاندی یا سونے کی صورت میں ادائیگی کا پابند نہ بنایا جائے گا۔ اور اگر مقتول اعرابی ہو تو سو اونٹ دیت میں دیئے جائیں یا اس کی قیمت کے مساوی دو ہزار بکریاں دی جائیں۔[۲۴۶]

vii۔ قرآنِ مجید میں اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔[۲۴۷] اور اہلِ کتاب سے مراد عموماً یہود و نصاریٰ کو سمجھا جاتا ہے اسی لیے مجوس سے جزیہ لینے یا نہ لینے کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ متامل و متردد تھے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے مہاجرین کی خاص مجلس شوریٰ میں یہ معاملہ پیش کیا۔[۲۴۸]

خوش قسمتی سے اس مجلسِ مشاورت میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے انہوں نے بتایا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرو[۲۴۹] نیز بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے جزیہ وصول کیا تھا۔[۲۵۰] لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی فارس کے مجوس سے جزیہ وصول کرنے کا حکم دیا۔[۲۵۱]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشاورتی اجتہاد کی امثلہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے جو عام طور پر معروف ہے کہ ان کے دور میں مشاورتی اجتہاد

اس لیے نہیں ہوا کہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دعوت و تبلیغ یا اور کئی دیگر مقاصد کے پیش نظر دور دراز علاقوں میں منتشر ہو گئے تھے، اس کی حقیقت بارے قدرے تفصیل سے ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہادی منہج'' کی بحث میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ فی الوقت اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بھی بوقتِ ضرورت مشاورتی اجتہاد کیا ہے جس کی چند امثلہ درج ذیل ہیں۔

i۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلے جس قضیہ کا فیصلہ آپ رضی اللہ عنہ کو کرنا پڑا اس کے لیے ہی آپ رضی اللہ عنہ کو مجلس شوریٰ منعقد کرنا پڑی تھی چنانچہ اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زخمی ہونے کے بعد ان کے بیٹے عبید اللہ نے جذباتی ہو کر بے خودی کے عالم میں ان دو تین افراد کو قتل کر دیا جن پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کا الزام تھا جبکہ ابھی تک ان کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ و قتل میں ملوث ہونا پایہ ثبوت کو نہ پہنچا تھا۔ لہٰذا عبید اللہ بن عمر کا شرعاً یہ جرم تھا۔ یہی باعث ہے کہ مجلس شوریٰ میں شریک بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عبید اللہ بن عمر کو قصاصاً قتل کر دینے کا مشورہ دیا مگر بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ابھی کل ہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا ہے تو کیا آج ان کے بیٹے کو بھی قتل کر دیا جائے؟ چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہلِ مجلس سے پوچھا کہ یہ بتاؤ ''ہرمزان'' کا ولی کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کے ولی تو آپ ہی ہیں (کیونکہ مقتولین ہرمزان اور ابولولوۃ کی بیٹی کا کوئی بھی ولی نہ تھا اور ایسی صورت میں پھر حاکم ولی ہوتا ہے)۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب میں ولی ہوں تو میں عبید اللہ بن عمر کو معاف کرتا ہوں۔[۲۵۲]

ii۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہل بربر سے بھی جزیہ وصول کیا[۲۵۳] حالانکہ وہ اہلِ کتاب نہ تھے جبکہ قرآن مجید میں محض اہل کتاب (یہود نصاریٰ) سے جزیہ کی وصولی کا ذکر کیا گیا تھا[۲۵۴] اور سیرتِ نبوی سے مجوس سے جزیہ لینے کا بھی ثبوت ملتا ہے[۲۵۵] اہل بربر شمالی افریقہ سے تعلق رکھتے تھے اور یہ علاقہ عہد عثمانی میں فتح ہوا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے جزیہ لینے بارے شورائی اجتہاد کیا اور اس میں بہ اتفاق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ طے پایا کہ جزیہ نہ صرف اہلِ کتاب سے لیا جائے بلکہ تمام غیر مسلم اقوام سے لیا جائے چاہے وہ آگ کے پجاری ہوں یا درخت یا پتھر کے پجاری اور اس بارے دلیل یہ تھی کہ قرآنی احکام توضیحی (illustrative) ہیں نہ کہ تحدیدی (Limitative)۔[۲۵۶]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشاورتی اجتہاد کی امثلہ:

گزشتہ اوراق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک خط بنام امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زیبِ قرطاس کیا جا چکا

ہے جس میں آپ رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا کہ ''شوریٰ (اس وقت) مہاجرین و انصار کا حق ہے۔''اس جملہ سے یہ مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے تک جو مہاجرین و انصار صحابہ بقیدِ حیات تھے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ کے رکن قرار پائے تھے تاہم جب آپ رضی اللہ عنہ کوفہ تشریف لے گئے تو یقیناً مہاجرین و انصار سے مشاورت کے مواقع سے محروم ہو گئے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا دور بعض وجوہات کی بنا پر اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی کی کیفیت سے دوچار رہا اور آپ رضی اللہ عنہ اپنے عہدِ خلافت میں کافی عرصہ تک ایسی سازشوں کے فرو کرنے میں ہی مصروف رہے لہٰذا مشاورتی اجتہاد کے زیادہ مواقع ہی نہ مل سکے تاہم آپ رضی اللہ عنہ سے شورائی طرز کا اجتہاد ثابت ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ عہد علوی میں کچھ لوگ ایسے بھی پائے گئے جو بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے، بیت المال سے دیگر مسلمانوں کی طرح مراعات (Facilities) بھی وصول کر رہے تھے مگر خفیہ طور پر بتوں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ ان لوگوں کو پکڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روبرو پیش کیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مسجد میں لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا ''لوگو! اس قوم کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو بیت المال سے نقد و جنس بھی وصول کرتے ہیں اور بتوں کی پرستش بھی کرتے ہیں؟ لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا، مگر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں ان لوگوں کے ساتھ وہی کچھ کروں گا جو ہمارے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا تھا۔'' اور پھر آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں آگ میں جلا دیا۔ [۲۵۷]

اس مجلس میں شاید حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جلانے کے اقدام کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا: ''اگر میں (علی رضی اللہ عنہ کی جگہ پر) ہوتا تو ان لوگوں کو نہ جلاتا بلکہ قتل کرتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''من بدل دینه فاقتلوه''

''جس نے (اسلام لانے کے بعد) اپنا دین تبدیل کیا تو اسے قتل کر دو۔''

نیز اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''لاتعذبوا بعذاب الله''.

''اللہ کی سزاؤں جیسی سزا نہ دو۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ (م ۲۷۹ھ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا گفتگو نقل کرنے کے بعد بہ سند لکھتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا ''ابن عباس رضی اللہ عنہ

نے درست ہی کہا ہے''۔[۲۵۸]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشاورتی اجتہاد کی اگر چہ ان کے عہد میں کوئی زیادہ مثالیں نہیں ملتی مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ سابقہ تینوں خلفاء کے مشاورتی اجتہاد کا ایک اہم ستون تھے۔ چنانچہ خلفاء راشدین کی فقہی آراء کو انسائیکلوپیڈیائی طرز پر جمع و ترتیب دینے والے ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی لکھتے ہیں ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہے اور بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی اہم معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیے بغیر فیصلہ کرتے ہوں''۔[۲۵۹] لہٰذا یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گزشتہ خلفاء کے ادوار میں ہی شورائی اجتہاد کے فوائد و اہمیت کو جان لیا تھا مگر آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے عہد میں اس کے زیادہ موقع میسر نہ آسکے۔

خلفاء راشدین کے شورائی اجتہاد کی خصوصیات:

خلفاء راشدین کے شورائی اجتہاد کی درج ذیل خصوصیات ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں:

i۔ اس شورائی اجتہاد میں ہر عمر کے صاحبِ علم کو اظہار رائے کی آزادی ہوتی تھی خواہ وہ تھوڑی عمر کا لڑکا اور نوجوان ہو یا بوڑھا ہو یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی مجلس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی ضرور شریک کرتے تھے [۲۶۰] حالانکہ وہ دیگر کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں کم سن تھے گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس طرز عمل سے یہ سبق دیا کہ ''بزرگی بعقل است نہ بسال''۔ اسی طرح اگر زیر بحث معاملات خواتین سے متعلقہ ہوتے تھے تو ان سے بھی مشاورت کی گئی جس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں مشورہ کیا تھا کہ ایک عورت کتنا عرصہ خاوند کے بغیر رہ سکتی ہے۔[۲۶۱]

ii۔ خلفاء راشدین کے شورائی اجتہاد کی دوسری اہم خصوصیت اپنی رائے کے اظہار کی آزادی تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ منکرینِ زکوٰۃ سے قتال کا معاملہ ہو[۲۶۲] یا عہدِ صدیقی و عثمانی میں جمع قرآن کا مسئلہ[۲۶۳] خلیفہ اور شوریٰ کے اراکین کے درمیان بحث و مباحثہ اور تکرار و مناقشہ ہوتا ہے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچا جاتا ہے۔

iii۔ خلفاء راشدین نے مشاورت کے وقت اپنی رائے ایک عام رکن شوریٰ کے طور پر پیش کی ہے نہ کہ خلیفہ و حاکم کی حیثیت سے کہ جس سے باقی ارکان دباؤ میں آکر خلیفہ کی رائے کے سامنے

سر تسلیم خم کر دیں۔ بالفاظِ دیگر خلیفہ نے اپنی رائے کو باقی ارکان شوریٰ پر ٹھونسا نہیں ہے جس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اراضی عراق کی تقسیم نہ کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو ارکان شوریٰ کو مخاطب کر کے کہا:

''میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ لوگوں نے میرے کندھے پر ڈالا ہے، اس میں میرے شریک بنیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی ہے۔ ہر شخص کو اپنی رائے پیش کرنے کا پورا اختیار ہے''۔[۲۶۴]

اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا:

''میں یہ ہر گز نہیں چاہتا کہ آپ لوگ میری رائے کی اتباع کریں اور حق بات کو ترک کر دیں، میں تو حق بات ہی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جس طرح میرے پاس اللہ کی کتاب ہے ویسے ہی آپ کے پاس بھی ہے جو ناطق بالحق ہے اس کو سامنے رکھ کر مجھے جواب دیجئے''۔[۲۶۵]

iv۔ شورائی طرز کا یہ اجتہاد نئے پیش آمدہ مسائل بارے ہی ہوتا تھا لہٰذا نہ تو قطعی طور پر منصوص مسائل اور نہ ہی فرضی مسائل زیر بحث آتے تھے۔ اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ (م ۲۵۶ھ) لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ (خلفاء راشدین) مباح امور میں قابلِ اعتماد اہلِ علم سے مشورہ کیا کرتے تھے تا کہ زیادہ سہل راستہ اختیار کر سکیں، مگر جب کتاب و سنت کا واضح حکم سامنے آجاتا تو پھر اس سے سر مو انحراف نہ کرتے کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ رضی اللہ عنہ ان پر فوج کشی کیوں کر کر سکتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو الاالٰه الاالله فاذا قالوا لاالٰه الاالله عصموا منی دماء هم و اموالهم الا بحقّها و حسابهم علی الله".

''مجھے لوگوں سے اس وقت تک قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ نہیں کہہ لیتے اور جب وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ لیں تو ان کے جان و مال ماسوائے اس کے جو ان میں شریعت کا حق ہے، محفوظ و مامون ہو جائیں گے

اگر چہ ان کا (اصل) حساب اللہ لیں گے۔"

اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "بخدا میں ان لوگوں سے جہاد کروں گا جو ان چیزوں میں تفریق پیدا کریں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کیا تھا۔ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان کے ہم نوا ہو گئے۔ یہاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کی چنداں پرواہ نہیں کی ہے کیونکہ ان کے پاس نماز اور زکوٰۃ کے مابین تفریق کے قائلین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود تھا"۔[۲۶۶]

v۔ خلفاء راشدین کے مشاورتی اجتہاد میں ہمیں ایک دوسرے کی رائے کے احترام کا وصف بھی نمایاں نظر آتا ہے اور اگر اس مجلس شوریٰ کے کسی رکن نے اپنی رائے کا لوہا منوایا ہے تو قرآن و حدیث کے دلائل کی بنیاد پر نہ کہ محض تحکم و جبر سے۔[۲۶۷]

vi۔ یہ مشاورت عمومی طور پر کسی انتہائی اہم اور اجتماعی مسئلہ بارے ہوتی تھی اور ایسے نئے مسائل جن میں مشورہ و اجتہاد کی ضرورت پیش آتی تھی، انہیں "صوافی الامر" کہا جاتا تھا۔[۲۶۸]

"صوافی الامر" کی وضاحت میں مولانا محمد تقی امینی لکھتے ہیں: "صوافی اس زمین کو کہتے ہیں جس کو بادشاہ صرف خواص کے لیے مخصوص کر لیتا تھا، یہ مسائل چونکہ خلافت کی قائم کردہ مجلس سے متعلقہ ہوتے تھے اور عام لوگوں کو دخل دینے کا اختیار نہ ہوتا تھا، اس بنا پر گویا خلافت کے لیے مخصوص تھے"۔[۲۶۹]

vii۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مشاورتی اجتہاد میں خوفِ خدا کا عنصر مجلس شوریٰ پر حاوی و غالب رہتا تھا، اس لیے کہ اس شورائی اجتہاد کے انعقاد کی ایک اہم وجہ اور محرک ہی خوفِ خدا ہوتا تھا، اس لیے کہ کوئی بھی شخص تنہا اپنے سر اس اہم کام کی ذمہ داری لینا پسند نہ کرتا تھا۔[۲۷۰] جیسا کہ ڈاکٹر نادیہ شریف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے لکھتی ہیں:

"کان یستثیر اذن فی الامور الخطیرۃ التی لایستطیع ان یتحمل وحدہ مسئولیۃ الانفراد برای فیھا."[۲۷۱]

"آپ رضی اللہ عنہ ان اہم معاملات بارے مشاورت کیا کرتے تھے جن کے بارے محض اپنی رائے کی مسئولیت کے آپ متحمل نہ تھے۔"

خلفاء راشدین کے شورائی اجتہاد کے نتائج و اثرات:

1۔ شورائی اجتہاد خلفاء راشدین کی کسر نفسی اور عاجزی و انکساری کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ

اس میں اپنی کم علمی و بے مائیگی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسروں کے علم سے استفادہ کیا جاتا ہے گویا اس بات کا عملی اظہار ہوتا ہے کہ

﴿فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾۔[۲۷۲]

''اور ہر علم والے سے دوسرا علم والا بڑھ کر ہے۔''

2۔ خلفاء راشدین کے اس مشاورتی اجتہاد کی برکت سے ہی کئی غیر معروف احادیث اصحابِ پیغمبر کے سینوں سے ان کی زبانوں پر آ گئیں اور پھر رہتی دنیا تک کے لیے ان احادیث سے استفادہ ممکن ہو سکا۔

3۔ خلفاء راشدین کے شورائی اجتہاد کی برکت سے ہی امت کو ''اجماع'' ایسے اہم اصول شریعت کی طرف عملاً رہنمائی حاصل ہوئی۔ اس لیے کہ مشاورت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اکثر و بیشتر کسی رائے پر متفق ہو جاتے تھے اور اس اصول ''اجماع'' کو بنیادی طور پر امت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے متعارف کرایا ہے اور یہ ان کا ساری امت پر بہت بڑا احسان ہے فجزاہ اللہ خیر الجزاء عن جمیع المسلمین''۔

یاد رہے کہ خلفاء راشدین کے دور میں اس طرز کا اجماع نہیں ہوا جس کا تصور عام طور پر اصولیوں نے پیش کیا ہے کیونکہ خلفاء کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے چہار جانب سے مجتہدین کو کسی جگہ جمع ہونے کا حکم دیا ہو بلکہ وہ ممکن حد تک حاضر و موجود علماء سے مشاورت کیا کرتے تھے۔ بالفرض اگر تمام مجتہدین کو جمع کرنے کے نکتہ نظر کو ملحوظ رکھا جاتا تو کئی مصالح اتنی دیر تک ضائع ہو جاتیں کیونکہ کئی سوالات فوری حل طلب ہوتے ہیں لہٰذا خلفاء راشدین کا طریقہ یہی ہوتا تھا کہ جس قدر علماء و فقہاء صحابہ کا اجماع ممکن ہوتا، ان کے رُوبرو مسئلہ پیش کیا جاتا، بعض اپنی رائے کا اظہار کرتے اور بعض اس پر خاموشی اختیار کرتے اور ان کی خاموشی گویا رضامندی کی علامت ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ خلفاء راشدین کے دور میں زیادہ تر ''اجماع'' سکوتی طرز کا ہی ہوا ہے۔[۲۷۳]

خلفاء راشدین کے دور کے چند اجماعات کا تذکرہ:

ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی لکھتے ہیں کہ عہد صدیقی میں درج ذیل اجماعات منعقد ہوئے:۔

1۔ مسلمانوں کے لیے کسی کو خلیفہ بنانا واجب ہے۔

2۔ ابتداء میں کچھ اختلاف کے بعد مرتدین کے خلاف قتال پر ان کا اجماع ہو گیا تھا۔

3۔ مرتدین کو قیدی نہ بنایا جائے۔

4۔ جمع قرآن اور کتابتِ قرآن وغیرہ پر اجماع منعقد ہوا۔[۲۷۴]

5- حضرت عمر رضی اللہ عنہ امت کو تفرقہ و انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے اختلاف کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ کوشش یہی ہوتی تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کوئی اتفاقی رائے اختیار کریں اسی لیے جب ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف ہوا کہ مرد پر عورت سے جماع کرنے مگر انزال نہ ہونے کی صورت میں غسل لازم ہوگا یا نہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر کہا تھا ''آپ سب اصحابِ بدر ہیں اگر آپ کے درمیان اختلاف ہے تو بعد کے لوگوں میں تو اور بھی زیادہ اختلاف ہوگا۔'' بالآخر مشاورت کے بعد یہ طے پایا کہ اس بارے ازواج مطہرات سے استفسار کیا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی نقطہ نظر کی تائید کی کہ جب مرد اور عورت کی شرمگاہیں مل جائیں تو غسل واجب ہوگا خواہ انزال ہو یا نہ ہو[۲۷۵] اور پھر اسی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع واقع ہوگیا۔[۲۷۶]

6- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تکبیراتِ جنازہ بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور ان سے اس بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پوچھا۔ بعض نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ تکبیریں کہیں تھیں بعض نے کہا کہ چھ اور بعض نے چار بتائیں[۲۷۷] بالآخر یہ طے پایا کہ اس بات کا کھوج (Research) لگایا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل کیا تھا؟ چنانچہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری دفعہ نماز جنازہ پڑھائی اس میں چار تکبیرات کہی تھیں۔ لہٰذا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی پر اجماع منعقد کرا دیا۔[۲۷۸]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اجماعی طرز کے اجتہادات اور فیصلوں کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاضی شریح کے نام خط کے درج ذیل جملہ سے ہوسکتا ہے۔ آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''فان اتاک مالیس فی کتاب اللہ ولم یسن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقض بما اجمع علیہ الناس''[۲۷۹]

''اگر تمھارے پاس کوئی ایسا معاملہ آئے جس بارے کتاب وسنت سے رہنمائی نہ مل سکے تو لوگوں (مراد علماء امت) کے اجماعی فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرو۔''

محققین علماء کرام اکثر طور پر اجماع کے انعقاد کا تعلق شیخین (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وحضرت

عمر رضی اللہ عنہ) کے عہد سے جوڑتے ہیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے آخر دور سے کچھ قبل تک اہل علم اور کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ میں ہی رہ رہے تھے لہٰذا اس وقت تک تو اجماع کا انعقاد ممکن و میسر تھا جیسا کہ استاذ زرقاء لکھتے ہیں:

"كان الاجماع في العصر الاول سهل الحصول لان عمر في خلافته منع الصحابة ان يخرجوا من المدينة لتمكنه مشاورتهم فيما يحدث من امور العلم او السياسة".[۲۸۰]

"(خلفاء راشدین کے) شروع زمانے میں اجماع کا حصول بہت آسان تھا کیونکہ (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں (کبار) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینۃ الرسول سے باہر چلے جانے سے منع کر رکھا تھا تاکہ آپ رضی اللہ عنہ ان سے نئے علمی وسیاسی امور بارے مشاورت کر سکیں۔"

مگر اپنے آخری دورِ حکومت میں خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کئی ایک اہلِ علم صحابہ رضی اللہ عنہم کو اسلامی سلطنت کے مختلف اطراف میں تعلیم دین کے لیے بھیج دیا تھا مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت کو اہل کوفہ کی طرف اور حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو بصرہ بھیجا، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور ابو درداء رضی اللہ عنہ کو اہلِ شام کی طرف بھیجا تھا۔[۲۸۱]

انفرادی رائے اور سوچ کے مقابلہ میں اجتماعی رائے، جو بحث و تمحیص کے بعد تشکیل پائی ہو زیادہ وزنی اور اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ خلفاء راشدین کے مشاورتی اجتہادات کو بھی اسی لیے شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہے اور ہر دور کے علماء و فقہاء نے ان کے اجتہادات سے ہمہ جہتی استفادہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا قول گزشتہ صفحات کی زینت بن چکا ہے جس میں انہوں نے خلفاء راشدین میں سے بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی شہرت کا سبب ان کی کثرتِ مشاورت کو بتایا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کم ہونے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کے زیادہ ہونے کی وجوہات:

بعض محققین علماء کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہادات اور فقہی آراء

حضرت عمر رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کی نسبت کم ہیں [۲۸۲] جس طرح کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی مجتہدین و فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درجہ بندی کرتے ہوئے ''مکثرین'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کا سرفہرست ذکر کیا ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کا ''متوسطین'' میں ذکر کیا ہے [۲۸۳] ذیل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کم ہونے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیادہ ہونے کی وجوہات ذکر کی جاتی ہیں۔

1۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت تقریباً سوا دو سال بنتی ہے گویا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی اجتہادی صلاحیت کے اظہار کا قدرتِ الٰہی کی طرف سے زیادہ موقع ہی نہ مل سکا تھا۔[۲۸۴] لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عہد صدیقی کے آغاز میں آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی خداداد فہم و فراست کے ساتھ جو فیصلے کیے وہ تاریخِ اسلام کا ایک زریں باب ہے۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ نے وہ فیصلے نہ کیے ہوتے تو شاید آج اسلام کی تاریخ جو ہمارے سامنے ہے اس سے مختلف ہوتی جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کل مدتِ خلافت دس برس چھ ماہ اور چار دن بنتی ہے [۲۸۵] لہٰذا انہیں اجتہاد کرنے کی مہلتِ عمر بھی زیادہ ملی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کا زیادہ تر تعلق پہلے خلفاء ثلاثہ کے ادوار سے ہے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ ان کی مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن تھے جبکہ آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے عہد حکومت میں تو زیادہ تر جنگوں میں ہی مصروف رہنا پڑا تھا۔

2۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی بعض دیگر کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح خوفِ خدا اور للّٰہیت کی وجہ سے غیر منصوص مسائل میں اظہار رائے سے ڈرتے تھے، مبادا خلاف شریعت کوئی رائے قائم کر بیٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''کون سی زمین میرا بار اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اگر میں کتاب اللہ یا غیر منصوص مسائل میں خواہ مخواہ رائے زنی کروں۔[۲۸۶]

3۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قبل عہد فاروقی میں بعض وجوہات کی بنا پر نئے مسائل کثرت سے پیش آئے لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کے مواقع بھی تقدیر الٰہی کے تحت زیادہ ملے مگر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو خلافت کی انتظامی بنیادیں بڑی حد تک مستحکم ہو چکی تھیں لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی گویا اپنی اجتہادی صلاحیت کے اظہار کے زیادہ مواقع ہی میسر نہ آسکے چنانچہ ڈاکٹر طہٰ جابر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ''متوسطین'' صحابہ رضی اللہ عنہم میں

سے ہونے کی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لان معظم القضايا التى عرضت له كان للشيخين قبله فيها فقه فقد اٰثر ان ياخذ به."[۲۸۷]

"اکثر و بیشتر مسائل جو آپ رضی اللہ عنہ کو پیش آئے وہ آپ سے قبل شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کو بھی پیش آ چکے تھے لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے ان (شیخین) کی رائے کو ہی ترجیحاً اختیار کیا۔"

4۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ و اجتہادات کے حاملین و ناقلین کی تعداد زیادہ نہ تھی جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد میسر آئی لہٰذا ان کے فتاویٰ و اجتہادات کے ناقلین زیادہ تھے اس لیے شہرتِ دوام حاصل کر گئے۔[۲۸۸] جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ المیہ (Tragedy) یہ پیش آیا کہ ان کے علم کے حاملین و ناقلین اکثر شیعہ تھے جنھوں نے علوی اجتہادات میں کمی و بیشی بھی بہت کی اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اجتہادی و فقہی آراء وہی قبول کی جاتی ہیں جو اہل بیت یا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ جیسے عبیدہ السلمانی، شریح اور ابووائل وغیرہ کی سند سے مروی ہوں۔[۲۸۹]

5۔ ایک وجہ فطری صلاحیتوں میں تفاوت بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ اللہ رب العلمین فرماتے ہیں

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾۔[۲۹۰]

"اور ہم نے ایک دوسرے پر درجے بلند کیے۔"

خلفاء اربعہ کی اجتہادی صلاحیت و بصیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد رواس لکھتے ہیں:

> "جہاں تک فقیہانہ استعداد اور بصیرت کا تعلق ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمام خلفاء راشدین کو اس سے بہرہ وافر عطا کر رکھا تھا مگر ان میں سے بعض کو جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ کو اس کے بھرپور اظہار کے مواقع ہی نہ مل سکے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی فقہی آراء اور فیصلوں کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اس سے ان کی فقیہانہ بصیرت اور بیدار مغزی کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ اگر ان دونوں حضرات کو اپنی اس استعداد کے اظہار کا پورا موقع ملا ہوتا، تو ان کی فقہی آراء اور فیصلوں کی شکل میں آج ہمارے پاس ایک عظیم علمی

سرمایہ ہوتا۔''[۲۹۱]

6۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات سب سے زیادہ ہیں اور اس کی ایک اہم وجہ ذہنی و فکری آسودگی ہوسکتی ہے جبکہ دیگر خلفاء کو یہ اس قدر میسر نہ آسکی جتنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو میسر آئی۔ اس لیے کہ اجتہاد انتہائی گہرے فہم اور سوچ بچار کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ یہ ایک انتہائی ذمہ دارانہ کام ہے۔ چونکہ یہ تمام مواقع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کچھ زیادہ ہی میسر آئے تھے لہٰذا ان کے اجتہادات بھی نسبتاً زیادہ ہیں۔

فصل چهارم:

خلفاء راشدین کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کے فقہ اسلامی پر اثرات

خلفاء راشدین کے فقہ اسلامی پر اثرات:

خلفاء راشدین کی جلالتِ علمی، طویل صحبتِ رسول کا شرف اور نبی کریم ﷺ کی خصوصیت سے "سنة الخلفاء" کو قبول کرنے کی تلقین وغیرہ یہی وہ اسباب تھے جن کی بدولت خلفاء راشدین کے اجتہادات اور ان کے دین کے فہم کے انداز (اجتہادی منہج) کو امت میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ ہر دور کے علماء، فقہاء اور مجتہدین ان کے اجتہادات سے استفادہ کرتے ہوئے نئے پیش آمدہ مسائل کا حل اور امت کی رہنمائی کا سامان کرتے رہے چنانچہ ڈاکٹر ار۔کے۔نور محمد لکھتے ہیں:

> "وقد اخذ المسلمون بفتاوی الخلفاء الراشدین و اقضیتهم، ونقلوها فیکتبهم محتجین بها فی المسائل الی لم یرد فیها شئی فی الکتاب و السنةولا شک ان ارا ء هم ا ولی بالأخذ من اراء من تاخر عنهم من اهل العلم". [۲۹۲]

> "واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے خلفاء راشدین کے فتوؤں اور فیصلوں کو قبول کیا اور (اپنی کتب میں) نقل کر کے ان سے استدلال کیا خصوصاً ان مسائل کے حل میں جن کے بارے کتاب و سنت میں (صراحتاً) کچھ وارد نہیں ہوا، استفادہ کیا۔ بلاشبہ ان (خلفاء کرام) کی آرا کو بہر صورت بعد کے اہل علم کی آرا کے مقابلے میں قبول کرنا اولیٰ وانسب ہے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ (م ۱۰۱ھ) سے ایک شخص نے پوچھا کہ اس کی بیوی نے مسجد حرام میں تین دن اعتکاف (نفلی) کی نیت کی تھی تو کیا حالت اعتکاف میں اس کے لیے روزہ رکھنا لازم ہوگا یا نہیں؟ آپ کے قریب امام زھری رحمہ اللہ بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے کہا کہ اس پر روزہ رکھنا

لازمی ہوگا کیونکہ اعتکاف روزہ کے بغیر معتبر نہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پوچھا کہ یہ بات آپ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بیان کر رہے ہیں؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے پھر پوچھا کہ اس کو آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں؟ اس پر بھی انہوں نے نفی میں جواب دیا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''پھر میں نہیں سمجھتا کہ اس پر روزہ رکھنا ضروری ہو''۔[۲۹۳]

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر دور کے علماء وفقہاء کا رجحان یہ رہا کہ جب کسی مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مختلف آراء سامنے آتیں تو خلفاء راشدین کی رائے کو ترجیح دی جاتی گویا خلفاء راشدین کے موقف کو ''وجہ ترجیح'' کی حیثیت حاصل رہی۔ چنانچہ حضرت ایوب السختیانی رحمہ اللہ کا یہ قول مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے اختلاف منقول ہو (مختلف احادیث وارد ہوئی ہوں) تو جس طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوں اس رائے سے اپنے ہاتھ مضبوط کرو''۔[۲۹۴] بلکہ حضرت خالد الحذاء رحمہ اللہ تو کہتے ہیں'' ہمارے خیال میں رسول اللہ ﷺ سے منقول دو احادیث میں وہ ناسخ ہوگی جس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کا عمل ہوگا''۔[۲۹۵] اس فصل میں خصوصیت کے ساتھ اسی چیز کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ خلفاء راشدین کے اجتہادات اور ان کے اجتہادی منہج کے فقہ اسلامی پر اثرات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فقہ اسلامی پر اثرات:

ذیل میں چند امثلہ ذکر کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ فقہاء کرام نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کو قبول کرتے ہوئے ان سے استفادہ کیا ہے۔

1۔ اگر لوگ اقرار ایمان کے باوجود بخل کرتے ہوئے ادائیگی زکوٰۃ نہ کریں تو خلیفہ وقت ان کے خلاف اعلان قتال کرے گا جیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف قتال کیا تھا۔ چنانچہ قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'' و ان منعوها بعد اعترافهم بخلا قاتلهم الامام كما قاتلهم الصديق لما منعوا الزكوة ''.[۲۹۶]

''اگر لوگ اعتراف اسلام کے بعد از راہِ بخل زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیں تو حاکم وقت ان کے خلاف قتال کر سکتا ہے جس طرح کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف قتال کیا تھا''

2۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف یہ ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کے نہ اصول ہوں اور نہ فروع ہوں یعنی جس کا نہ باپ دادا ہو اور نہ ہی اولاد و احفاد ہوں۔ جمہور علماء کرام کا بھی یہی موقف ہے۔[۲۹۷]

3۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہم جنس پرستی کے مرتکب کو جلانے کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اسی طرح ہمارے اصحاب (حنابلہ) کا بھی کہنا ہے کہ اگر امامِ وقت (خلیفہ) بدفعلی کرنے والے کو جلانے کی ضرورت محسوس کرے تو جلا سکتا ہے۔[۲۹۸]

4۔ ایک شخص نے امام زہری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اگر باپ بیٹے کا مشترکہ کاروبار ہو اور باپ بیٹے کو اس مشترک کاروبار سے سو دینار ہبہ (تحفہ) کردے تو کیا ہبہ درست ہے؟ امام زہری رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے یہ فیصلہ دیا ہے کہ ایسا ہبہ اس وقت تک درست نہ ہوگا جب تک بیٹا مشترک مال سے اسے الگ نہیں کرلیتا۔[۲۹۹]

5۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دادا کو باپ پر قیاس کرتے ہوئے اسے باپ ہی قرار دیا ہے اور وراثت سے حصہ دلوایا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔[۳۰۰]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فقہ اسلامی پر انمٹ اور ناقابلِ فراموش اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ہی بحیثیت خلیفہ پہلی دفعہ مصادر شریعت سے بالترتیب استفادہ عملی طور پر کیا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادی منہج کے ضمن میں لکھا جاچکا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کسی مسئلہ میں سب سے پہلے قرآن مجید سے رہنمائی لینے کی کوشش کرتے۔ اگر قرآن مجید سے رہنمائی حاصل نہ ہو پاتی تو سنت کی طرف رجوع کرتے۔ بصورت دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتماع میں اس بارے استفسار کرتے اور کسی اتفاقی رائے کو اختیار کرلیتے۔

چنانچہ جب ایک دفعہ جدہ (دادی یا نانی) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آکر اپنا حق وراثت طلب کرنے لگی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا'' تمہارے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں بھی تمہارے حصے کے بارے مجھ تک کوئی روایت نہیں پہنچی ہے۔ تاہم میں لوگوں سے پوچھ کر تمہیں جواب دوں گا۔[۳۰۱]

اس طرح کے واقعات اور آپ رضی اللہ عنہ کے مشاورتی طرز پر اجتہادات کی روشنی میں کئی ایک محققین نے کہا ہے کہ عہد صدیقی میں مصادر شریعت بالترتیب حسب ذیل تھے

۱۔ قرآن مجید ۲۔ حدیث وسنت ۳۔ قیاس ۴۔ اجماع[۳۰۲]

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مشاورتی اور شورائی طرز کے اجتہاد کی بنیاد حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ہی رکھی[۳۰۳] اور اس طرز کے اجتہاد کی بدولت امت کا شیرازہ ایک مدت تک بکھرنے سے محفوظ رہا۔ لیکن جب سے امت اس اجتماعی طرز کے اجتہاد سے محروم ہوئی ہے اسی وقت سے اتفاق واتحاد کی لڑی ٹوٹ چکی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فقہ اسلامی پر اثرات:

خلفاء راشدین میں بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فقہ اسلامی پر ہمہ جہتی اثرات ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات اور اجتہادی منہج سے تمام علماء وفقہاء نے استفادہ کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کی کل تعداد متعین کرنا تو نہایت مشکل ہے تاہم آپ رضی اللہ عنہ سے منقول تقریباً ایک ہزار مسائل ایسے ہیں جن میں ائمہ اربعہ نے بھی آپ رضی اللہ عنہ کے ہی موقف کو اختیار کیا ہے۔[۳۰۴] ڈاکٹر رویعی بن راجح الرحیلی اجتہاداتِ عمر رضی اللہ عنہ کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "فقہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ" تک رسائی حقیقت میں ائمہ اربعہ کی فقہ تک رسائی ہے کیونکہ وہ تمام حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول فقہی آراء کو قبول کرتے تھے اور ان سے دلیل لیتے تھے[۳۰۵] آپ رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں:

"ان كثيرا من فروع الفقه الاسلامي يو جد لها شاهد من فقهه رضى الله عنه"[۳۰۶]

"فقہ اسلامی کی اکثر وبیشتر فروعات کے لیے فقہ عمر (رضی اللہ عنہ) میں شواہد ونظائر موجود ہیں۔"

ذیل میں فاروقی اجتہادات سے فقہاء کرام کے استفادہ کی چند امثلہ ذکر کی جاتی ہیں:

i۔ مفقود الخبر کی بیوی بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہادی فیصلہ یہ ہے کہ وہ چار سال تک انتظار کرے اور پھر عدت گزارنے کے بعد آگے نکاح کر سکتی ہے۔ مالکی فقہاء کا فتویٰ بھی اسی کے مطابق ہے۔[۳۰۷]

ii۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کرتے ہوئے عنین (نامرد) کے بارے فتویٰ دیا تھا کہ ایسے شخص کو ایک سال تک علاج کا موقع دیا جائے۔ اگر وہ صحت یاب ہو جائے تو فبہا وگرنہ اس کی بیوی کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو اس کے ساتھ عفت وپاکدامنی کے ساتھ رہے اور چاہے تو ان کے درمیان جدائی کر دی جائے۔[۳۰۸] مذاہب اربعہ میں اسی فتویٰ پر عمل ہے۔[۳۰۹]

iii۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قحط سالی کے حالات میں چوری کرنے والوں پر حد نہیں لگائی کیونکہ انہوں نے بھوک و افلاس سے مجبور ہو کر چوری کی تھی۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کا فتویٰ بھی اسی کے مطابق ہے۔[۳۱۰]

iv۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ اراضی کو مصلحت عامہ کے پیش نظر فاتح فوج میں تقسیم نہیں کیا بلکہ اسے اس کے اصل مالکوں کے پاس رہنے دیا کہ وہ اس کو کاشت کریں اور اس کا خراج اسلامی حکومت کو دیں۔ البتہ اس اراضی پر اصل قبضہ اسلامی حکومت کا ہوگا۔ فقہ مالکی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کے مطابق ہی فتویٰ ہے۔[۳۱۱]

v۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے قتل میں شریک جماعت کے قصاصاً قتل کا فیصلہ مشاورتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد دیا تھا۔ مشہور چاروں فقہی مذاہب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی اجتہادی فیصلہ کے مطابق فتویٰ ہے۔[۳۱۲]

vi۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اجیر مشترک (دھوبی رنگ ساز وغیرہ جو تمام لوگوں کے اجرت پر کام کرتے ہیں) سے نقصان ہونے پر اسے ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور اس پر تاوان ڈالتے تھے[۳۱۳] مذاہب اربعہ میں بھی اسی کے مطابق فتویٰ ہے۔[۳۱۴]

vii۔ جس علاقے میں کفار سے جنگ لڑی جارہی ہو وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مسلمان پر حد لگانے کو اسلامی سرزمین میں پہنچنے تک ملتوی کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ مبادا کہ وہ محدود شخص کفار سے جا ملے[۳۱۵] فقہ حنفی اور فقہ حنبلی میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی اجتہادی فیصلہ کے مطابق عمل ہے۔[۳۱۶]

viii۔ عدت کی حالت میں عورت کا نکاح کرنا شرعاً ناجائز ہے لیکن اگر کوئی عورت عدت میں نکاح کرے اور خاوند اس سے دخول بھی کر لے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تادیباً دونوں میں حرمت ابدی کا فیصلہ کیا۔[۳۱۷]

ڈاکٹر عبدالعظیم لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کے مطابق امام مالک رحمۃ اللہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ اور امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ نے بھی فتویٰ دیا ہے۔[۳۱۸]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات اور اجتہادی منہج نے فقہ اسلامی پر کیا اثرات مرتب کیے، اس بارے مولانا محمد تقی امینی کا درج ذیل تبصرہ کا ذکر نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حالات و زمانہ کی رعایت، موقع و محل کی تعیین، تقدیم و

تاخیر، تخصیص و تعیم اور مطلق و مقید وغیرہ امور کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جن کی مدد سے بعد میں فقہ کی تدوین کا عظیم الشان کام انجام پایا"۔[۳۱۹]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فقہ اسلامی پر کس قدر اثرات ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ (م۱۳۳۲ھ) کا دعوی یہ ہے کہ فقہ اسلامی کے تمام مذاہب و مکاتب فکر کا اصل مرجع حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ کیونکہ تاریخ اسلام میں جن مقامات کو مراکز فقہ کی حیثیت حاصل رہی وہ مکہ معظّمہ، مدنہ منورہ، کوفہ اور بصرہ ہیں۔ ان مقامات کو مراکز فقہ کی حیثیت اس لیے حاصل ہوئی کہ تمام مکاتب فکر کے بڑے بڑے شیوخ اور بانیان انہی شہروں میں اقامت گزیں رہے تھے مثلاً مکہ معظّمہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، مدینہ منورہ میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ و عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ تھے۔ اور یہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خوشہ چیں تھے اور انہوں نے صحبتِ عمر رضی اللہ عنہ سے بہت عرصہ تک فیض پایا تھا۔[۳۲۰]

جبکہ تاریخی طور پر معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے استفادہ کرنے والوں سے مستثنی قرار دینا درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب دو افراد ایک عرصہ تک اکٹھے رہیں تو باہم تبادلہ خیالات کے نتیجہ میں لازماً ایک دوسرے کے افکار و نظریات سے متاثر ہوتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے سے قبل تمام خلفاء کے ادوار میں قاضی اور جج کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشاورتی کمیٹی کے ایک اہم رکن بھی تھے۔ لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات اور اجتہادی منہج ہو اور انہوں نے اس سے کچھ سیکھا نہ ہو۔ باہم اخذ و استفادہ کی گنجائش زندگی کے ہر دور میں ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گو علمی و فقہی اعتبار سے اپنا ایک انفرادی مقام رکھتے تھے مگر ان کے اجتہادات اور اجتہادی منہج پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھی اثرات تھے بلکہ ڈاکٹر طہٰ جابر کی تحقیق تو یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منہج سے سب سے زیادہ مشابہت و مطابقت رکھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔[۳۲۱]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک مختصر جماعت اور بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ عاقلانہ مزاج رکھتے تھے[۳۲۲] لہٰذا وہ احکامِ شریعت کی علتوں اور پس منظر پر غور کیا کرتے تھے اور انہوں نے اپنے طرزِ فکر سے یہ نقطہ امت کو سمجھایا کہ شریعت کے احکام معقول المعنی اور مصالح پر مبنی ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مزاج کا اظہار اتنی کثرت سے کیا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کے نزدیک "علم

اسرار الدین'' کے آپ رضی اللہ عنہ بانی مبانی ہیں۔[۳۲۳]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب احکام کی مصالح سمجھ آگئیں تو پھر ان مصالح کی روشنی میں اجتہاد کرتے رہے لہٰذا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ استصلاحی نوعیت کے اجتہاد کا بھی باقاعدہ بھرپور آغاز آپ ہی نے کیا۔[۳۲۴] مصلحت کی بنیاد پر آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی کئی ایک امثلہ کا ذکر آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادی منہج کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔

جب احکامِ شریعت کے اسرار (علل و وجوہ) سمجھ میں آجائیں تو پھر ان کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنا بھی چنداں مشکل نہیں رہتا، اسی کو اصطلاح فقہاء میں ''قیاس'' کہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی عقلی مزاج کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں قیاس کی بھی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی تحقیق تو یہ ہے کہ امت میں قیاس کی بنیاد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ڈالی ہے۔[۳۲۵] اگرچہ یہ بات اپنی جگہ بجا ہے کہ قیاس کی موجودہ اکثر تفصیلات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد، ائمہ و فقہاء کرام کے گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہیں[۳۲۶] مگر یہ آپ رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہوں نے پہلی دفعہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ جو چیز تم کو قرآن و سنت میں نہ ملے اور وہ تمہارے سینہ میں خلجان کا باعث ہو تو اس پر غور و فکر کرو اور خوب کرو نیز اس کے ہم صورت اور ہم شکل واقعات کو تلاش کرو اور پھر ان پر قیاس کرو[۳۲۷] یاد رہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ وہ تاریخی خط ہے جس سے علماء نے بیسیوں مسائل اخذ کیے ہیں[۳۲۸] اور یہی وہ خط ہے جو اصولِ فقہ کی پہلی بنیادی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔یہی باعث ہے کہ اس خط کے ہمارے اصولِ فقہ پر بھی نہایت گہرے اثرات ہیں۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنے اسی عقلی مزاج کی وجہ سے ''اہل الرائے''[۳۲۹] کے سرخیل کہا جا سکتا ہے چنانچہ استاذ زرقاء لکھتے ہیں:

" ان طريقة عمر الفقهية كانت حجة خالدة لمدرسة " اهل الراى"في العراق ....فقد تاثر هو لاء بفقه ابن مسعود فى الكوفة و كان هو يسير على طريقةعمر."[۳۳۰]

''(حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کا فقہی منہج عراق میں ''اہل الرائے'' کے لیے ہمیشہ حجت و اسوہ بنا رہا........ یہ لوگ دراصل (حضرت) ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقاہت سے متاثر ہوئے اور وہ (ابن مسعود رضی اللہ عنہ) (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کے فقہی منہج و طریقہ پر چلتے تھے۔''

اسی لیے علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حالات و

ظروف کے نئے تقاضوں کی وجہ سے بہت سے نئے قواعد وضع کیے جن کا فقہ حنفی میں بکثرت استعمال موجود ہے [۳۳۱] مزید براں آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے استنباط احکام اور تفریع مسائل کے اور بہت سے قاعدے مقرر کیے جو آج ہمارے علم اصول فقہ کی بنیاد ہیں''۔ [۳۳۲] معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے محض قیاس اصول کی طرف ہی رہنمائی نہیں کی بلکہ اور بھی کئی اصول وضوابط وضع کیے۔ چنانچہ علامہ محمد الخضری کا کہنا ہے کہ خلفاء راشدین اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد کے ادوار میں قیاس اور استحسان سے کام لینے والوں کے سامنے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسوہ موجود تھا۔ [۳۳۳]

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہی مشاورتی طرز کے اجتہاد کی طرح ڈالی تھی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا بکثرت استعمال کر کے اور جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مدینہ سے باہر جانے پر پابندی لگا کر اجماع کے ادارے کو نہ صرف منظم شکل دی بلکہ بعد کے مجتہدین کی اس کی عملی صورت کی طرف رہنمائی کی۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ھ) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس کارنامہ کو یوں دادِ تحسین دیتے ہیں:

> ''اجماع کثیر الوقوع اتفاق اہل حل وعقد ست از مفتیان امصار این معنی در مسائل مصرحہ فاروق اعظم یافتہ می شود کہ اہل حل وعقد براں اتفاق کردہ اند''۔ [۳۳۴]
>
> اجماع کثیر الوقوع ان اہل حل وعقد کے اتفاق کا نام ہے جو شہروں کے مفتی ہیں (اجماع کے) یہ معنی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے تصریح کردہ ان مسائل میں پائے جاتے ہیں کہ جن میں صاحبان حل وعقد نے اتفاق کیا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کے اصولِ فقہ پر اثرات کس قدر زیادہ ہیں اس کا اندازہ مولانا محمد تقی امینی کے ذیل کے تبصرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے فتووں، فیصلوں اور ہدایتوں کے ذریعے قیاس واستنباط کی راہیں نکالیں جن کی مدد سے بعد میں اصولِ فقہ کا عظیم الشان فن ترتیب دیا گیا''۔ [۳۳۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کے فقہ اسلامی پر اثرات کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

i۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کے تمام مکاتب فِقہ پر اثرات ہیں۔

ii۔ امت میں علم اسرار دین کے بانی آپ رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔

iii۔ اجتہاد اصطلاحی آپ رضی اللہ عنہ نے ہی امت میں پہلی بار بکثرت کیا۔

iv۔ اصولِ قیاس کے بانی ہونے کی حیثیت بھی آپ ہی کو امت میں حاصل ہے۔

v۔ اصول استحسان کے حوالے سے بھی آپ ہی نے امت میں اسوہ چھوڑا۔

vi۔ آپ کے خط بنام حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو ہی اصولِ فقہ کی پہلی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

vii۔ آپ رضی اللہ عنہ کو آپ کے خاص فقہی ذوق کی بنا پر ''اہل الرائے'' مکتبہ فکر کا سرخیل قرار دیا جا سکتا ہے۔

viii۔ اجماع کے ادارے کو آپ ہی نے منظم شکل دی۔

ix۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کے فقہ واصولِ فقہ دونوں پر ہمہ جہتی اثرات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے علم وفقاہت سے جس قدر زمانہ ماضی میں استفادہ کیا گیا اور آج تک کیا جارہا ہے، کسی غیر نبی کے علم وفہم سے اس قدر استفادہ کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چشمۂ فیض سے ایک دنیا سیراب ہوگی۔[۳۳۶]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فقہ اسلامی پر اثرات:

i۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا علمی وفقہی پایہ دیگر مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم سے کوئی کم نہ تھا آپ رضی اللہ عنہ کی فقہی آراء بالخصوص آپ رضی اللہ عنہ کے چند ''فقہی تفردات'' [۳۳۷] اہل علم میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔آپ کی فقہی آراء واجتہادات سے جلیل القدر ائمہ وفقہاء نے استفادہ کیا ہے چنانچہ ڈاکٹر تبسم منہاس لکھتے ہیں ''اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ہر رائے ٹھوس اور وزنی دلائل پر مبنی ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیان کردہ مسائل سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سمیت تمام ائمہ کرام نے استفادہ کیا ہے اور ان کا مخصوص اندازِ فکر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین کے مابین بھی ہمیشہ مقبول رہا ہے''۔[۳۳۸]

خلفاء راشدین کے اجتہادات سے استفادہ علماء وفقہاء کے علاوہ حکمرانوں اور قاضیوں نے بھی کیا ہے چنانچہ ایک دفعہ وراثت کے ایک مسئلہ بارے حجاج بن یوسف ثقفی نے امام عامر بن شراحیل الشعبی رحمہ اللہ (م۱۱۰ھ) سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اس مسئلہ میں پانچ جلیل القدر صحابہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اختلاف ہے۔ حجاج نے پانچوں صحابہ کی آراء امام عامر کی زبانی سنیں اور بالآخر اس نے کہا: "قاضی کو حکم دے دو کہ وہ (اس مسئلہ میں) امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے مطابق عمل کرے"۔[۳۳۹]

ii۔ امام زہری رحمۃ اللہ سے استفسار کیا گیا کہ غیر اہل کتاب سے جزیہ وصول کیا جائے گا یا نہیں؟ امام صاحب نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بحرین سے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سواد عراق میں رہنے والوں سے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہل بربر سے جزیہ وصول کیا۔[۳۴۰]

iii۔ امام زہری رحمۃ اللہ سے ہی ایک دفعہ پوچھا گیا کہ ایک شخص کچھ لوگوں کے احاطہ میں مقتول پایا گیا ہے اور وہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ شخص رات کی تاریکی میں ان کے یہاں چوری کی غرض سے آیا تھا جبکہ مقتول کے ورثاء کا موقف یہ ہے کہ ان لوگوں نے خود اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور پھر خود ہی قتل کر دیا۔

امام زہری رحمۃ اللہ نے اس کے جواب میں کہا کہ مقتول کے ورثاء میں سے پچاس افراد اپنے دعوی پر قسم کھائیں کہ وہ چوری کی غرض سے نہیں گیا تھا۔ اگر وہ یہ حلف اٹھالیں تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا اور اگر وہ حلف نہیں اٹھاتے تو پھر قاتل کے گروہ کے پچاس افراد حلف اٹھا کر کہیں کہ وہ شخص چوری کرنے ہی آیا تھا اور اگر وہ حلف نہیں اٹھاتے تو انہیں خون بہا ادا کرنا ہوگا یہ فیصلہ سنا کر آپ رحمۃ اللہ نے فرمایا: "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی ابن باقرہ تغلبی کے معاملے میں یہی فیصلہ دیا تھا، جب اس کی قوم نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا تو آپ نے ان پر دیت عاید کر دی تھی۔"[۳۴۱]

iv۔ ایک شخص "ابن عقاب" کو ایک دوسرے شخص نے پکڑا اور اس کے پیٹ پر چڑھ کر اسے اس قدر روندا کہ اس کا پاخانہ خطا ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے اس بارے حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ سے استفسار کیا تو آپ نے جواب دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسے مقدمہ میں چالیس دینار یا دیت کے چالیس حصوں کی ادائیگی کا حکم دیا تھا۔[۳۴۲]

v۔ منی میں نماز قصر کر کے پڑھنا اعمال حج میں سے ہے یا سفر کی وجہ سے یہ رخصت ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے سفر کی وجہ سے رخصت قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہ نے منی میں نماز مکمل چار رکعات پڑھیں، اور کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: "لوگو! جب سے میں مکہ مکرمہ میں آیا ہوں اس وقت سے میں

نے اقامت کی نیت کر لی ہے اور میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ جس شخص نے کسی شہر میں اقامت کی نیت کر لی ہو وہ مقیم کی طرح نماز (مکمل) پڑھے۔[۳۴۳] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اسی اجتہاد کے پیش نظر فقہ حنفی میں بھی اگر کوئی حاجی مکہ میں چودہ دن یا اس سے زائد ایام کے لیے اقامت کی نیت کر لے تو وہ مقیم ہوگا اور اسے منیٰ میں نماز مکمل ادا کرنی ہوگی۔[۳۴۴]

vi- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تین درہم، جو ایک چوتھائی دینار کے برابر ہے، کی مالیت کے برابر چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا کرتے تھے[۳۴۵] امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہی مقدار مقرر ہے۔[۳۴۶]

vii- اگر خاوند اپنی بیماری کے ایام میں بیوی کو طلاق دے اور پھر عورت کی عدت ختم ہونے سے قبل ہی وفات پا جائے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معتدہ عورت کو اپنے خاوند کی وراثت سے حصہ دلوایا ہے[۳۴۷] ڈاکٹر تبسم منہاس لکھتے ہیں کہ احناف اور شوافع کے یہاں اسی پر عمل ہے۔[۳۴۸]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہادات سے استفادہ بارے ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

> ''سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ جن کو کم و بیش بارہ سال خلافت کے فرائض انجام دینے کا موقع ملا، وہ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کم و بیش پچیس سال تک حیات رہے اور اس پورے عرصہ میں بڑی تعداد میں تابعین نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے اجتہادات اور فتاویٰ بڑی تعداد میں صغار صحابہ اور (پھر) ان کے ذریعے تابعین تک پہنچے۔[۳۴۹]

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فقہ اسلامی پر اثرات:

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کے فقہ اسلامی پر بالعموم اور فقہ حنفی پر بالخصوص گہرے اثرات ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے چونکہ عراق کے شہر کوفہ کو دار الخلافہ قرار دے دیا تھا لہٰذا وہاں تشریف لے گئے اور علم کی شمع کو خوب روشن کیا حتیٰ کہ کوفہ ''دار العلوم'' بن گیا۔[۳۵۰] کوفہ شہر ہی وہ شہر ہے جہاں سے فقہ حنفی پروان چڑھی اور پھلی پھولی۔ فقہ حنفی پر سب سے زیادہ اثرات تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہیں کیونکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اساتذہ کا سلسلہ بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد فقہ حنفی پر اگر کسی کے سب سے زیادہ اثرات ہیں تو وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔[۳۵۱] اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کو ''فقیہ عراق'' بھی کہا جاتا ہے۔[۳۵۲]

لیکن اس مذکورہ بالا بحث کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ دیگر مذاہب و مکاتب کے علماء وفقہاء نے آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادات سے استفادہ نہ کیا ہو بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چشمۂ فیض سے بھی ہر دور کے علماء وفقہاء نے استفادہ کیا ہے۔ اس حوالے سے چند امثلہ ذکر کی جاتی ہیں۔

i۔ مفقود الخبر کی بیوی بارے حضرت علیؓ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کا انتظار ہی کرے گی اور آگے شادی نہیں کر سکتی۔ احناف اور شوافع کا بھی یہی فتویٰ رہا۔[۳۵۳] اگرچہ اب ایک عرصہ سے احناف کا مفتیٰ بہ قول فاروقی اجتہاد کے مطابق ہے۔[۳۵۴]

ii۔ ایک شخص نے ماہِ رمضان میں شراب نوشی کی جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے حدِ خمر کے طور پر لگائے۔ اگلے دن آپ نے بیس کوڑے مزید لگوائے اور فرمایا کہ یہ اس لیے ہے کہ تو نے ماہِ رمضان کی حرمت کو پامال کیا۔[۳۵۵]

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے یہاں حد اور تعزیر کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ار۔ کے۔ نورِ محمد لکھتے ہیں کہ یہی قول حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا ہے۔[۳۵۶]

iii۔ مقروض مفلس کو قید نہ کیا جائے گا بلکہ اس سے اس بات کا حلف لیا جائے گا کہ وہ واقعتاً اس قدر مفلس ہو چکا ہے کہ فی الحال ادائیگی قرض کی پوزیشن میں نہیں۔ اگر وہ اس بات کا اقرار حلفاً کرے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا اور وہ خوشحالی و آسانی حاصل ہونے پر قرض کی ادائیگی کرے گا لیکن وہ مقروض جو مال ہونے کے باوجود قرض کی ادائیگی میں قصداً ٹال مٹول سے کام لیتا ہے تو حاکم اسے قید کر سکتا ہے۔

مقروض بارے چاروں خلفاء راشدین کے اجتہادی فیصلوں کی روشنی میں مذکورہ بالا نتائج اخذ کرنے کے بعد ڈاکٹر ار۔ کے۔ نورِ محمد لکھتے ہیں کہ حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ چاروں مکاتب فکر کا یہی موقف ہے۔[۳۵۷]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے لکھا جا چکا ہے کہ محققین نے آپ رضی اللہ عنہ کو امت میں ''علم اسرار دین'' کا بانی قرار دیا ہے مگر علم اسرار دین کا ایک اہم اصول جس کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علماء وفقہاء کی توجہ مبذول کرائی ہے یہ ہے کہ احکام شریعت میں حکم و مصالح کے ساتھ خود شارع بھی ایک موثر اعظم کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا جب وہ خود احکام کی علت بن جاتا ہے تو دوسرے علل و اسباب بیکار ہو جاتے ہیں بالفاظ دیگر احکام شریعت کا دارومدار کلی طور پر عقلی اسباب و علل پر نہیں ہے بلکہ خود شارع اس کے اصل عمود کی حیثیت رکھتا ہے۔[۳۵۸] اسی نکتہ کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بایں الفاظ اشارہ کیا ہے:

"لو كان الدين بالرای لكان اسفل الخف اولی بالمسح من اعلاه و قد رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم يمسح على ظاهر خفيه.[۳۵۹]

"اگر دین (محض) عقل اور ذاتی رائے کا نام ہوتا تو پھر مسح کرنے کے لیے پاؤں کا نچلا حصہ بالائی حصہ کی نسبت زیادہ موزوں تھا مگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو موزوں کے بالائی حصہ پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ ضروری نہیں کہ ہر حکم شریعت کی علت ہماری سمجھ میں بھی آسکے اور اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت کا ہر حکم مقیس علیہ نہیں بن سکتا۔

گزشتہ اوراق میں خلفاء راشدین کے فقہ اسلامی پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں کہا جا سکتا ہے کہ

i۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کے فقہ اسلامی کے تمام مکاتب فکر پر انتہائی حد تک اثرات ہیں۔

ii۔ فقہ اسلامی کے علاوہ اصول فقہ کا علم بھی بنیادی طور پر انہی کا مرہون منت ہے۔

iii۔ ہر دور کے علماء وفقہاء اور قضاۃ وولاۃ (حکمران طبقہ) نے خلفاء راشدین کے اجتہادات کو ترجیحی طور پر اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۔ چونکہ خلفاء راشدین کو امت میں اجتہاد کے حوالے سے تقدم واسبقیت کا درجہ حاصل ہے اور وہ فقہاء امت کے لیے اسوہ ونمونہ (Ideal) کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ان کے اجتہادات اور اجتہادی منہج سے استفادہ کی ضرورت واہمیت ہر دور میں محسوس کی جائے گی۔

حواشی وحوالہ جات

[۱] محمد بن اسماعیل، بخاری، امام: صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث: ۴۹۸۶

[۲] احمد بن حسین، بیہقی، امام، السنن الکبریٰ (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ۹:۴۲

[۳] شبلی نعمانی، علامہ: الفاروق (مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن) ص ۲۴۲

[۴] ایضاً

[۵] ایضاً، ص ۲۴۶۔۲۵۶

[۶] محمد بن جریر، طبری، امام: تاریخ الامم والملوک (دار سویدان بیروت، س۔ن) ۴:۲۵۸۔۲۵۹

[۷] عبداللہ بن احمد، ابن قدامہ، امام: المغنی (مکتبہ الریاض الحدیثہ، ریاض، ۱۹۸۱م) ۷:۳۰۱

[۸] عبد الکریم، زیدان، ڈاکٹر: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۰م) ص ۹۹۔

[۹] شبلی نعمانی: الفاروق ص ۱۸۱

[۱۰] ساجد الرحمٰن، صدیقی، ڈاکٹر: اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل (ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۷م) ص ۱۹۹

[۱۱] مصطفیٰ احمد زرقاء، ڈاکٹر: المدخل الفقہی العام (دار الفکر، دمشق، ۱۹۶۸م) ۱:۱۵۶۔۱۵۷

[۱۲] عبد الوہاب النجار: الخلفاء الراشدون (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، س۔ن) ص ۲۴۵

[۱۳] از کیا ہاشمی، سید: اجتماعی اجتہاد مناہج واسالیب، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷م، ص ۶۶

[۱۴] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۳۰

[۱۵] محمد بن حسن الشیبانی، امام: کتاب الآثار (ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی، ۱۴۰۷ھ) ص ۸۹

[۱۶] امام، بیہقی، احمد بن حسین: السنن الکبری ۶:۱۴۷

[۱۷] عبد الرزاق بن ہمام، امام: المصنف (المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۷۲م) ۴:۳۵

[۱۸] فاروقی دور میں یہ خوشحالی دراصل تمام مالدار مسلمانوں کی ادائیگی زکوٰۃ کے نتیجہ میں حاصل ہوئی تھی ۔ اس بارے مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا عبدالروٴف ، جھنڈانگری : ایمان وعمل (مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۲۰۰۴م) ص ۲۷۸

[۱۹] التغابن، ۶۴: ۱۵

[۲۰] محمد بن عیسی ، ترمذی ، امام : جامع ترمذی ، ابواب صفۃ القیامۃ ، باب حدیث علی فی ذکر مصعب بن عمیر، حدیث: ۲۴۷۶

[۲۱] نووی، محی الدین، امام: شرح النووی لصحیح مسلم (قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۵۶م) ۲: ۷۲

[۲۲] غالب، عبدالکافی ، القرشی : اولیات الفاروق السیاسیۃ (المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۸۳م) ص ۱۳۳

[۲۳] علی المتقی ، امام: کنز العمال (موسسۃ الرسالۃ ، بیروت، ۱۹۷۹م) ۵: ۲۲۲

[۲۴] ابراہیم بن موسی ، شاطبی ، امام: الاعتصام (دارالمعرفۃ ، بیروت، س۔ن) ۲: ۱۱۲۹

[۲۵] عبدالکریم ، زیدان: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ ص ۱۰۴

[۲۶] امام عبدالرزاق: المصنف ۷: ۳۴۴، ۳۴۶

[۲۷] ساجدالرحمٰن، صدیقی: اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل، ص ۲۰۰

[۲۸] عبدالکریم ، زیدان: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ ص ۹۹

[۲۹] کاسانی ، ابوبکر بن مسعود ، امام : بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (دار الکتب العلمیہ ، بیروت ، ۱۹۸۶م) ۲: ۷

[۳۰] سلیمان بن عبداللہ، ڈاکٹر: مقدمہ فی الفقہ (دارالعاصمہ، ریاض، ۱۹۹۷م) ص ۸۱

[۳۱] امام طبری: تاریخ الامم والملوک ۴: ۵۷۔۵۸

[۳۲] امام عبدالرزاق: المصنف، ۱۰: ۲۴۲۔۲۴۳

[۳۳] امام بیہقی: السنن الکبری، ۹: ۲۹۰، امام ابن حزم، حافظ: المحلی، ۷: ۳۸۵

[۳۴] قاسم بن سلام، امام: کتاب الاموال، (ناشر وتاریخ ندارد) ص ۶۸

[۳۵] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۴۲

[۳۶] ابوالحسن علی ، ندوی، مولانا: المرتضی کرم اللہ وجہہ (مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۹۱م) ص ۴۴۰

[۳۷] امام بخاری: صحیح بخاری ، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ ، حدیث: ۷۲۸۴۔۷۲۸۵

[۳۸] عبداللہ محفوظ: السنۃ والبدعۃ (دارالقلم، دمشق، ۱۹۹۹م) ص ۱۲۲۔۱۲۳

[۳۹] مالک بن انس، امام: الموطا، کتاب الحج، باب العمل فی الاھلال (دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵م) ۱:۳۳۱
[۴۰] عبداللہ محفوظ: السنۃ والبدعۃ، ص ۱۳۰
[۴۱] احمد بن حنبل، امام: المسند (المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۶۹م) ۱:۲۲۴
[۴۲] ایضاً ۱:۲۱
[۴۳] عبداللہ محفوظ: السنۃ والبدعۃ، ص ۱۳۰
[۴۴] ایضاً
[۴۵] ابن قدامۃ، امام: المغنی (مکتبہ الریاض الحدیثیہ، الریاض، ۱۹۸۱م) ۳:۲۹۰
[۴۶] امام بیہقی: السنن الکبری، ۵:۴۴
[۴۷] محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (مترجم: ساجد الرحمٰن صدیقی) (ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۲۰۰۲م) ص ۳۰۲
[۴۸] شاہ ولی اللہ، امام: ازالۃ الخفاء (مترجم: مولانا اشتیاق احمد دیو بندی) قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن، ۳:۵۳۰
[۴۹] محمد بن اسمٰعیل، صنعانی، امام: سبل السلام شرح بلوغ المرام (جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی، ۱۹۹۷م) ۲:۲۷۷
[۵۰] علی بن احمد، ابن حزم، امام: المحلی (ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر، ۱۳۴۹ھ) ۷:۷۲ وامام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الحج، باب ذات عرق لاھل العراق، حدیث: ۱۵۳۱
[۵۱] سلیمٰن بن اشعث، ابوداود، امام: سنن ابی داود، کتاب المناسک، باب فی المواقیت، حدیث: ۱۷۳۹
[۵۲] عبدالسلام بن تیمیہ، امام: المنتقیٰ من اخبار المصطفیٰ ﷺ (الرئاسۃ العامۃ لادارات البحوث العلمیہ، ریاض، ۱۹۸۳م) ۱:۲۱۹ وامام شافعی: الام (مکتبہ الکلیات الازھریہ، مصر، ۱۹۶۱م)، ۲:۱۳۸
[۵۳] امام ابن قدامۃ: المغنی، ۳:۲۷۸
[۵۴] امام بیہقی: السنن الکبری، ۵:۲۱
[۵۵] ایضاً، ۵:۲۱
[۵۶] ایضاً، ۵:۲۱
[۵۷] محمد رواس قلعہ جی: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ص ۳۱۹ ونووی، محی الدین، امام: المجموع شرح المھذب (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ۷:۱۵۱
[۵۸] سورۃ البقرۃ، ۲:۱۹۶

[۵۹] اسماعیل بن کثیر، امام: تفسیر القرآن العظیم (دار السلام، ریاض، ۱۹۹۴م) ۱:۳۱۲

[۶۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الحج، باب التمتع والقران والافراد، حدیث: ۱۵۶۳

[۶۱] ابن حزم: المحلی، ۷: ۱۰۷

[۶۲] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب صلاۃ التراویح، باب فضل من قام رمضان، حدیث: ۲۰۱۲

[۶۳] ایضاً، حدیث: ۲۰۱۰

[۶۴] عبداللہ محفوظ: السنۃ والبدعۃ، ص ۱۲۴

[۶۵] ایضاً، ص ۱۲۵ و مسلم بن عید الھلالی: البدعۃ واثرھا السیئ فی الامۃ (ناشر ندارد، ۱۴۲۰ھ) ص ۶۵۔۶۸

[۶۶] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب صلاۃ التراویح، باب فضل من قام رمضان، حدیث: ۲۰۱۲

[۶۷] ایضاً، کتاب الصلوۃ، باب فی کم تصلی المرأۃ من الثیاب، حدیث: ۳۷۲

[۶۸] ابن حجر، احمد بن علی، حافظ: فتح الباری (المطبعۃ السلفیہ، قاھرۃ، ۱۳۸۰ھ) ۴: ۲۵۳

[۶۹] امام نووی: المجموع شرح المھذب ۴: ۳۴ نیز ایک روایت کے مطابق حضرت عرفجہ ثقفی کو بھی عورتوں کا امام بنایا (ایضاً)۔

[۷۰] عبداللہ محفوظ: السنۃ والبدعۃ، ص ۱۲۵

[۷۱] کاسانی، ابوبکر بن مسعود، امام: بدائع الصنائع ۲: ۷

[۷۲] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب اللقطہ، باب التعریف باللقطہ، حدیث؛ ۱۷۱۰

[۷۳] قاسم بن سلام: کتاب الاموال ص ۲۴۰۔۲۴۱

[۷۴] صلاح الدین یوسف، حافظ: زکوٰۃ، عشر اور صدقۃ الفطر (دار السلام، لاہور، ۲۰۰۲م) ص ۸۸

[۷۵] ابو یوسف، قاضی: کتاب الخراج (دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن) ص ۲۳۔۲۵ و ابن رجب حنبلی: الاستخراج لأحکام الخراج (دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن) ص ۹

[۷۶] سورۃ الانفال، ۸: ۴۱

[۷۷] قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۲۶

[۷۸] ایضاً، ص ۲۵

[۷۹] از کیا ہاشمی، سید: اجتماعی اجتہاد مناہج واسالیب، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۶۶

[۸۰] المرجع السابق، ص ۲۵

[۸۱] ایضاً

[۸۲] ابن رجب حنبلی: الاستخراج لاحکام الخراج، ص ۹

[۸۳] ایضاً،ص ۱۱او یحیٰی بن ادم القرشی، امام: کتاب الخراج (دار المعرفہ، بیروت، س۔ن) ص ۴۴ وامام بیہقی: السنن الکبریٰ، ۹:۱۳۸

[۸۴] قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ص ۵۹

[۸۵] سورۃ الحشر، ۵۹:۱۰

[۸۶] محمد خضری بک: تاریخ التشریع الاسلامی (دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۷۰م) ص ۹۴۔۹۵

[۸۷] قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۲۷

[۸۸] قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ص ۶۸ وامام بیہقی: السنن الکبری، ۹:۱۳۶ اوامام ابن قدامۃ: المغنی، ۸:۵۲۱

[۸۹] امام عبد الرزاق بن ہمام: المصنف، ۶:۹۷

[۹۰] ایضاً، ۶:۹۸

[۹۱] ابن قدامۃ: المغنی، ۸:۵۲۲

[۹۲] امام بیہقی: السنن الکبری، ۹:۲۱۰

[۹۳] بلاذری، احمد بن یحیٰی، امام: النقود، ص ا بحوالہ محمد رواس قلعہ، ڈاکٹر: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ص ۷۹۰ وامام مقریزی: کتاب النقود الاسلامیۃ ص ۴،۵ بحوالہ شبلی نعمانی: الفاروق ص ۲۷۹

[۹۴] بلاذری: النقود، ص ۱۸ بحوالہ محمد رواس قلعہ: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ص ۷۹۰

[۹۵] ابن ابی شیبۃ، امام: المصنف، ۱:۲۰۷ بحوالہ محمد رواس قلعہ: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ص ۷۹۰

[۹۶] عبد الوہاب النجار: الخلفاء الراشدون، ص ۴۸۱

[۹۷] یحیٰی بن ادم، القرشی، امام: کتاب الخراج، ص ۱۰۶۔۱۰۷

[۹۸] محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (دار النفائس، بیروت، ۱۹۸۳م) ص ۸

[۹۹] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، حدیث: ۲۲۷۶

[۱۰۰] محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: فقہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (مترجم: مولانا عبد القیوم) (ادارہ معارف اسلامی، لاہور ۱۹۸۹م) ص ۱۲۴

[۱۰۱] امام بیہقی: السنن الکبری، ۸:۵

[۱۰۲] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث الجد مع الاب والاخوۃ، ترجمۃ الباب وحدیث: ۶۷۳

[۱۰۳] سورۃ المائدۃ، ۵:۵

[۱۰۴] سورۃ البقرۃ، ۲:۲۳۷

[۱۰۵] امام ابن ابی شیبۃ: المصنف (دار الکتب، بیروت، ۱۹۹۴م) ۳:۳۵۱

[۱۰۶] مسلم بن حجاج، امام: صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب الطلاق الثلاث، حدیث: ۳۶۷۳

[۱۰۷] امام ابن ابی شیبۃ: المصنف ۴: ۱۱

[۱۰۸] غالب عبد الکافی، القرشی: اولیات الفاروق السیاسیۃ، ص ۱۳۳

[۱۰۹] امام مسلم: صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب الطلاق الثلاث، حدیث: ۳۶۷۳

[۱۱۰] امام ابن ابی شیبۃ: المصنف، ۴: ۱۲

[۱۱۱] ابن قیم، الجوزیۃ، امام: اعلام الموقعین (دار الجیل بیروت، ۱۹۷۳ء) ۳: ۳۶

[۱۱۲] عبد الرحمٰن کیلانی، مولانا: خلفاء راشدین کی شرعی تبدیلیاں، سہ ماہی منہاج، لاہور، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۰ و مابعد کا حاشیہ

[۱۱۳] المرجع السابق

[۱۱۴] سورۃ البقرۃ ۲: ۱۷۳

[۱۱۵] سورۃ النحل ۱۶: ۱۰۶

[۱۱۶] حافظ ابن حزم: المحلی، ۸: ۳۳۲

[۱۱۷] امام ابن قدامۃ: المغنی، ۸: ۱۸۷ و امام بیہقی: السنن الکبری، ۸: ۲۳۶

[۱۱۸] سورۃ الطلاق، ۶۵: ۴

[۱۱۹] سورۃ البقرۃ ۲: ۲۳۴

[۱۲۰] شافعی، محمد بن ادریس، امام: الام، ۷: ۱۷۳

[۱۲۱] عبد العظیم شرف الدین، ڈاکٹر: تاریخ التشریع الاسلامی (منشورات جامعہ قاد یونس بنغازی، ۱۹۹۳ء) ص ۸۲

[۱۲۲] امام عبد الرزاق: المصنف، ۶: ۴۷۲

[۱۲۳] محمد خضری بک: تاریخ التشریع الاسلامی، ص ۹۱

[۱۲۴] طالب الہاشمی: سیرۃ خلیفۃ الرسول (حسنات اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء) ص ۴۹۷

[۱۲۵] رؤفہ اقبال، ڈاکٹر: عہد نبوی کے غزوات و سرایا (اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء) ص ۵۶، ۶۱

[۱۲۶] عبد الملک، ابن ھشام، امام: السیرۃ النبویۃ (دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۵ء) ۲: ۲۳۲

[۱۲۷] علی بن برھان الدین حلبی، امام: السیرۃ الحلبیہ (دار احیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن) ۲: ۲۱۸۔۲۱۹

[۱۲۸] محمد بن سعد، امام: الطبقات الکبری (دار صادر، بیروت، ۱۹۵۷ء) ۲: ۶۸

[۱۲۹] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب الجہاد، باب ماجاء فی الرخصۃ فی الکذب والخدیعۃ فی الحرب، حدیث: ۱۶۷۵

[۱۳۰] سورۃ الانبیاء، ۲۱: ۸۰

[۱۳۱] سورۃ النحل، ۱۶: ۸۱

[۱۳۲] خود رسول اللہ ﷺ نے بھی کئی مواقع پر زرہ اور خود پہنی ہے۔ (امام ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ۱: ۴۸۷) اور (امام بخاری: صحیح بخاری، حدیث: ۳۰۴۴)

[۱۳۳] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۳: ۸۲، ۸۴

[۱۳۴] بلاذری، احمد بن یحیٰ، امام: فتوح البلدان (المطبعہ المصریہ، الازہر، ۱۹۳۲م) ۱۱۶۔۱۱۷

[۱۳۵] طالب الہاشمی: سیرۃ خلیفۃ الرسول، ص ۴۹۸ و امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ الرایۃ یوم الفتح؟ حدیث: ۴۲۸۰

[۱۳۶] بلاذری: فتوح البلدان، ص ۱۱۷

[۱۳۷] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۴: ۹۰۔۹۱

[۱۳۸] محمد حمید اللہ، ڈاکٹر: خطبات بہاولپور (ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۲م) ص ۸۱

[۱۳۹] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۲۵۱

[۱۴۰] امام ابن قدامۃ: المغنی، ۱: ۲۵۳، ۶: ۴۲۵، ۸: ۵۳۲

[۱۴۱] ڈاکٹر محمد حمید اللہ: خطبات بہاولپور، ص ۸۰۔۸۱

[۱۴۲] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۳: ۴۸۹

[۱۴۳] ایضاً، ۲: ۵۴۲

[۱۴۴] ایضاً ۴: ۳۵

[۱۴۵] ابو یوسف، قاضی، امام: کتاب الخراج، ص ۸۰ بحوالہ شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۲۵۹

[۱۴۶] المرجع السابق، ۳: ۴۷۶

[۱۴۷] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۲۵۹

[۱۴۸] ایضاً، ص ۲۵۷

[۱۴۹] طالب الہاشمی: سیرۃ خلیفۃ الرسول، ص ۴۹۹ شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۲۵۷۔۲۵۸

[۱۵۰] امام بیہقی: السنن الکبریٰ، ۹: ۴۲

[۱۵۱] ایضاً، ۸: ۳۲۳

[۱۵۲] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۴: ۲۵۸۔۲۵۹

[۱۵۳] امام عبد الرزاق: المصنف، ۵: ۲۸۴

[۱۵۴] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۱: ۲۵۴ بحوالہ ڈاکٹر محمد نواز: اسلامی بحریہ (دار الاندلس، لاہور، س۔ن) ص ۱۱۸

[۱۵۵] عبدالسلام ندوی، مولنا: سیر الصحابۃ (ادارہ اسلامیات، لاہور، س۔ن) ۹: ۱۷۴

[۱۵۶] شاہ معین الدین احمد، ندوی: خلفاء راشدین (نعمانی کتب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳م) ص ۲۰۷

[۱۵۷] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۴: ۵۲

[۱۵۸] محمد رواس قلعہ جی: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص ۱۲۶

[۱۵۹] امام بیہقی: السنن الکبریٰ، ۶: ۱۴۷

[۱۶۰] بلاذری: فتوح البلدان، ص ۱۵۷۔۱۵۸

[۱۶۱] علی بن محمد، ابن اثیر، امام: اسد الغابۃ (دار الشعب، شہر ندارد، ۱۹۷۰م) ۱: ۳۵۳

[۱۶۲] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۴: ۲۶۰

[۱۶۳] حسن المحاضرۃ ۲: ۲۹۹ بحوالہ عبدالسلام ندوی: سیر الصحابہ، جلد ۵، جزء ۹، ص ۱۷۵

[۱۶۴] احمد بن داود، الدینوری: الاخبار الطوال (دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹۶۰م) ص ۲۱۲

[۱۶۵] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۵: ۱۳۸

[۱۶۶] شاہ معین الدین احمد، ندوی: تاریخ اسلام (مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن) ص ۳۲۰

[۱۶۷] ابن منظور، محمد بن مکرم، الافریقی، امام: لسان العرب (دار صادر، بیروت، ۱۹۵۶م) ۶: ۱۰۷۔۱۰۸

[۱۶۸] امام ابن حنبل: المسند، ۲: ۲۹۷

[۱۶۹] امام ابن سعد، امام: الطبقات الکبریٰ ۶: ۱۲۹

[۱۷۰] غالب عبدالکافی القرشی: اولیات الفاروق السیاسیۃ، ص ۴۷۔۴۹

[۱۷۱] ابن نجیم امام: البحر الرائق شرح کنز الدقائق (المکتبہ الماجدیہ، کوئٹہ، س۔ن) ۵: حاشیہ ص ۷۰

[۱۷۲] ابن قیم، امام: الطرق الحکمیۃ (دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، س۔ن) ص ۱۳

[۱۷۳] غالب عبدالکافی القرشی: اولیات الفاروق السیاسیۃ، ص ۵۱

[۱۷۴] امام ابن قیم: الطرق الحکمیۃ ص ۱۴

[۱۷۵] ابن فرحون، ابراہیم بن محمد، امام: تبصرۃ الحکام (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، س۔ن) ۲: ۱۰۴

[۱۷۶] غالب عبدالکافی: اولیات الفاروق السیاسیۃ، ص ۵۲

[۱۷۷] امام ابن قیم: الطرق الحکمیۃ، ص ۱۵

[۱۷۸] ایضاً ص ۱۳ و ابن تیمیہ، احمد بن عبدالحلیم، امام: السیاسۃ الشرعیۃ (وزارۃ الشوون الاسلامیہ، الریاض، ۱۴۱۹ھ) ص ۱۱۲

[۱۷۹] امام قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ص ۹۶

[۱۸۰] امام ابن قیم: الطرق الحکمیۃ، ص۱۶ و ابن حزم: المحلی، ۹: ۳۷۰

[۱۸۱] شمس الدین، ذھبی، امام: تذکرۃ الحفاظ (دار احیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن) ۱: ۶

[۱۸۲] امام ابن قیم: الطرق الحکمیۃ، ص۱۵۔۱۶

[۱۸۳] ایضاً، ص۱۳، ۱۸

[۱۸۴] ایضاً، ص۱۹

[۱۸۵] امام ابن ابی شیبہ: المصنف ۵: ۴۷

[۱۸۶] قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ص۹۶

[۱۸۷] امام شافعی: الام، ۷: ۱۷۳

[۱۸۸] دارمی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن، امام: سنن الدارمی (قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن) ۱: ۲۷

[۱۸۹] عبدالعظیم شرف الدین: تاریخ التشریع الاسلامی، ص۷۶

[۱۹۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ، حدیث: ۷۲۸۴۔۷۲۸۵

[۱۹۱] امام ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ۳: ۱۹۹

[۱۹۲] ایضاً، ۶۸

[۱۹۳] عبدالرحمٰن بن علی، ابن الجوزی، امام: تاریخ عمر بن الخطاب (دار احیاء علوم الدین، دمشق، س۔ن) ص۶۹،۱۹۹۔

[۱۹۴] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص۶۹

[۱۹۵] عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر (مرتب): علم اصول فقہ (شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۶م) ۳: ۱۱۰۔۱۱۱

[۱۹۶] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۴: ۳۰ و قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ص۵۹

[۱۹۷] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل القران، باب جمع القران، حدیث: ۴۹۸۶

[۱۹۸] محمد حسین ھیکل: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (مترجم: محمد اسحاق بھٹی) (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۸ام) ص۵۲۹

[۱۹۹] المرجع السابق

[۲۰۰] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث: ۴۹۸۶

[۲۰۱] سورۃ التوبۃ، ۹: ۲۹

[۲۰۲] امام بیہقی: السنن الکبریٰ، ۹: ۱۹۳

[۲۰۳] غالب عبدالکافی القرشی: اولیات الفاروق السیاسیۃ، ص۲۳۴
[۲۰۴] قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص۷۹
[۲۰۵] قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ص۴۰
[۲۰۶] ایضاً ص۴۶
[۲۰۷] قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص۱۳۶
[۲۰۸] سورۃ البقرۃ، ۲:۲۸۶
[۲۰۹] علی متقی، امام: کنز العمال ۵:۷۶
[۲۱۰] عبدالوہاب النجار: الخلفاء الراشدون، ص۲۷۸
[۲۱۱] ایضا، ص۲۵۲
[۲۱۲] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قصۃ البیعۃ والاتفاق علی عثمان رضی اللہ عنہ، حدیث: ۳۷۰۰
[۲۱۳] ایضاً
[۲۱۴] محمد راوس قلعہ جی: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص۱۲۶
[۲۱۵] ابن حزم: المحلی، ۷: ۴۰۰، امام علی متقی: کنز العمال ۱۵:۱۰۱
[۲۱۶] عبدالرزاق: المصنف، ۱۰:۱۸۶
[۲۱۷] ایضاً
[۲۱۸] سورۃ ال عمران، ۳:۱۵۹
[۲۱۹] امام علی متقی: کنز العمال، ۳:۷۸۹
[۲۲۰] ایضاً، ۵:۶۲۱
[۲۲۱] امام ابن قیم: اعلام الموقعین ۱:۸۴
[۲۲۲] امام علی متقی، امام: کنز العمال، ۵:۶۴۸
[۲۲۳] امام طبری: تاریخ الامم والملوک، ۴:۲۶۱
[۲۲۴] علی بن ابی بکر، ھیثمی، امام: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (مکتبہ القدسی، قاھرۃ، ۱۳۵۲ھ) ۱:۱۷۸
[۲۲۵] شریف رضی، علامہ (مرتب): نہج البلاغہ (مترجم: مفتی جعفر حسین) امامیہ پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن) ص۶۵۶
[۲۲۶] امام ابن سعد: الطبقات کبری، ۲: ۳۵۰ و ابراہیم بن علی، شیرازی، امام: المھذب (مطبع عیسی البابی، مصر، س۔ن) ۲:۲۹۷

[۲۲۷] امام بیہقی: السنن الکبریٰ، ص،۱۰۔۱۰۹

[۲۲۸] شاہ ولی اللہ، امام: حجۃ اللہ البالغۃ (المکتبۃ، السّلفیہ، لاہور، س۔ن)۱:۱۳۲

[۲۲۹] امام ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ص۲:۳۵۰

[۲۳۰] شبلی نعمانی: الفاروق، ص۱۸۹۔۱۹۰

[۲۳۱] بلاذری: فتوح البلدان، ص۲۶۶

[۲۳۲] امام طبری: تاریخ الامم والملوک،۳:۴۸۰، ۴:۱۲۳

[۲۳۳] محمد رواس قلعہ جی: فقہ حضرت ابوبکر ﷺ ص ۲۴۵

[۲۳۴] امام ابن قیم: الطرق الحکمیۃ، ص۱۵ وامام بیہقی: السنن الکبریٰ، ۸:۲۳۲

[۲۳۵] اسماعیل ابن کثیر، حافظ: البدایۃ والنہایۃ (مطبع السعادۃ، مصر، ۱۹۳۲م)۶:۳۱۴۔۳۱۵

[۲۳۶] ایضاً

[۲۳۷] امام طبری: تاریخ الامم والملوک ۲:۳۸۸

[۲۳۸] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۷۵

[۲۳۹] علی بن محمد، ابن الاثیر، امام: الکامل فی التاریخ (دار صادر بیروت، ۱۹۶۵م)۱:۱۱ وامام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص۷۶

[۲۴۰] امام ابن الاثیر: الکامل، ۱:۱۱

[۲۴۱] حافظ ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ، ۷:۷۳۔ جبکہ امام طبری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ سن ہجری کے مقرر کرنے کے واقعہ کا تعلق سترہ یا اٹھارہ ہجری سے ہے۔ (امام طبری: تاریخ الامم والملوک ۲:۳۹۱)

[۲۴۲] امام ابن قدامہ: المغنی، ۸:۳۰۴

[۲۴۳] امام عبدالرزاق: المصنف، ۹:۴۳۱۔۴۳۲

[۲۴۴] ایضاً، ۷:۴۰۵

[۲۴۵] امام ابن حزم: المحلی، ۱۰:۴۱۸

[۲۴۶] المرجع السابق ۹:۲۹۶

[۲۴۷] سورۃ التوبۃ، ۹:۲۹

[۲۴۸] امام بلاذری: فتوح البدان، ص۲۶۶۔۲۶۷

[۲۴۹] امام عبدالرزاق: المصنف، ۶:۶۹

[۲۵۰] امام بیہقی: السنن الکبری، ۹:۱۸۹

[۲۵۱] امام قاسم بن سلام: کتاب الاموال، ۳۲

[۲۵۲] امام بیہقی: السنن الکبری، ۸: ۶۲

[۲۵۳] احمد بن علی، رازی، بصاص، امام: احکام القرآن (دارالکتاب العربی، بیروت) ۳: ۹۲

[۲۵۴] سورۃ التوبۃ، ۹: ۲۹

[۲۵۵] امام عبدالرزاق: المصنف، ۶: ۶۸-۶۹

[۲۵۶] ڈاکٹر محمد حمید اللہ: خطبات بہاولپور، ص ۸۳

[۲۵۷] امام ابن ابی شیبہ: المصنف، ۶: ۵۸۶

[۲۵۸] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب الحدود، باب ماجاء فی المرتد، حدیث: ۱۴۵۸

[۲۵۹] محمد رواس قلعہ جی: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ص ۸۶-۸۷

[۲۶۰] امام ابن سعد: الطبقات الکبری، ۲: ۳۶۵-۳۶۶

[۲۶۱] امام ابن الجوزی: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۱۰۱

[۲۶۲] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: ۷۲۸۴-۷۲۸۵

[۲۶۳] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن حدیث: ۴۹۸۶-۴۹۸۷

[۲۶۴] قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج (ناشر ندارد) ص ۲۷

[۲۶۵] ایضاً

[۲۶۶] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول اللہ تعالیٰ: وامرھم شوری بینھم، ترجمۃ الباب۔

[۲۶۷] جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق وشام کی زمینوں کو تقسیم نہ کرنے بارے سورۃ حشر کی آیات سے استدلال پیش کیا جسے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے قبول فرمایا۔ (قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۲۷)

[۲۶۸] امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱: ۸۴

[۲۶۹] محمد تقی امینی، مولانا: اجتہاد (قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن) ص ۴۶

[۲۷۰] جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مجلس شوریٰ سے مخاطب ہو کر کہا تھا ''میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ جس بار امانت کو آپ لوگوں نے میرے کندھوں پر ڈالا ہے اس میں میرے شریک بنیں'' (قاضی ابو یوسف: کتاب الاخراج، ص ۲۷)

[۲۷۱] نادیہ شریف، العمری، ڈاکٹر: اجتہاد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (موسسہ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۷م) ص ۲۹۷-۲۹۸

[۲۷۲] سورۃ یوسف،۱۲: ۷٦

[۲۷۳] نادیہ شریف: اجتہاد الرسول اللہ ﷺ، ص۳۰۳۔۳۰۴

[۲۷۴] طہٰ جابر العلوانی، ڈاکٹر: اصول الفقہ الاسلامی (المعہد العالمی، امریکہ، ۱۹۹۵م) ص ۲۵

[۲۷۵] امام ابن ابی شیبہ: المصنف ۱:۱۱۰۔۱۱۱ و محمد الزرقانی، امام: شرح الزرقانی علی موطا امام مالک (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ص ۱: ۹۵

[۲۷٦] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۴۳

[۲۷۷] امام بیہقی: السنن الکبری، ۴: ۳۷

[۲۷۸] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۴۳

[۲۷۹] حافظ ابن قیم، امام: اعلام الموقعین، ۱: ٦۲

[۲۸۰] مصطفیٰ احمد، زرقاء: المدخل الفقہی العام، ۱: ٦۵۔٦٦

[۲۸۱] شاہ ولی اللہ، امام: ازالۃ الخفاء، ۳: ۲۱

[۲۸۲] محمد رواس قلعہ جی: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص ۷

[۲۸۳] امام ابن قیم: اعلام الوقعین، ۱: ۱۲

[۲۸۴] المرجع السابق ص ۷

[۲۸۵] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۱۷۷

[۲۸٦] محمد بن جریر، طبری، امام: جامع البیان (شرکۃ مکتبہ ومطبعہ مصطفیٰ البابی، ۱۹۵۴م) ۱: ۳۵

[۲۸۷] طہ جابر العلوانی: اصول الفقہ الاسلامی، ص ۲۸

[۲۸۸] امام ابن قیم: اعلام الوقعین، ۱: ۲۰

[۲۸۹] ایضاً، ۱: ۲۱

[۲۹۰] سورۃ الزخرف، ۴۳: ۳۲

[۲۹۱] محمد رواس قلعہ جی: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص ۷

[۲۹۲] ار۔کے۔نور محمد، ڈاکٹر: اقضیۃ الخلفاء الراشدین (دار السلام، ریاض، ۲۰۰۳م) ۱: ۴۰

[۲۹۳] امام دارمی: سنن الدارمی، ۱: ۷۰

[۲۹۴] خطیب بغدادی، احمد بن علی، امام: الفقیہ والمتفقہ (دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۰م) ۱: ۱۷۴

[۲۹۵] ایضاً

[۲۹٦] ابو یعلی محمد بن حسین، قاضی، امام: الاحکام السلطانیہ (ناشر ندارد) ص ۳۷

[۲۹۷]	احمد بن علی، ابن حجر، حافظ: فتح الباری (المطبعہ السّلفیہ، قاہرہ، ۱۳۸۰ھ) ۸: ۲۶۸

[۲۹۸]	امام ابن قیم: الطرق الحکمیۃ، ص ۱۵

[۲۹۹]	حافظ ابن حزم: المحلی، ۹: ۱۵۲

[۳۰۰]	ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، امام: الاستذکار (دار قتیبہ، دمشق، ۱۹۹۳م) ۱۵: ۴۳۴

[۳۰۱]	مالک بن انس، امام: الموطا، ۲: ۵۱۳

[۳۰۲]	محمد خضری بک: تاریخ التشریع الاسلامی (دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۷۰م) ص ۸۹

[۳۰۳]	عبد السلام ندوی، مولنا: سیر الصحابۃ، جلد ۵ حصہ ۹، ص ۲۵۵

[۳۰۴]	شاہ ولی اللہ، امام: ازالۃ الخلفاء، ۳: ۳۰۴

[۳۰۵]	رویعی بن راجح الرحیلی، ڈاکٹر: فقہ عمر بن الخطاب (دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ) ص ۱۴

[۳۰۶]	ایضاً، ص ۱۵

[۳۰۷]	امام ابن عبد البر: الاستذکار، ۱۷: ۳۰۳۔۳۰۹

[۳۰۸]	امام ابن ابی شیبہ: المصنف، ۴: ۱۲۴

[۳۰۹]	امام ابن عبد البر: الاستذکار، ۱۸: ۱۳۰

[۳۱۰]	حافظ ابن قیم: اعلام الموقعین، ص ۱۱

[۳۱۱]	محمد بن احمد، ابن رشد، امام: بدایۃ المجتہد (فاران اکیڈمی، لاہور، س۔ن) ۱: ۲۹۳

[۳۱۲]	امام ابن عبد البر: الاستذکار، ۲۵: ۲۳۴ امام شاطبی: الاعتصام (دار الباز، مکۃ المکرمۃ، بیروت، س۔ن) ۲: ۱۲۵

[۳۱۳]	امام عبد الرزاق: المصنف، ۸: ۲۱۷

[۳۱۴]	یوسف بن عبد اللہ، قرطبی، امام: کتاب الکافی فی فقہ اہل المدینۃ (الریاض الحدیثہ، الریاض، ۱۹۷۸م) ۲: ۷۵۷

[۳۱۵]	ابو یوسف، قاضی، امام: الرد علی سیر الاوزاعی ص ۸۱ بحوالہ ڈاکٹر عبد العظیم شرف الدین: تاریخ التشریع الاسلامی، ص ۱۰۰

[۳۱۶]	ڈاکٹر ار۔کے۔نور محمد: اقضیۃ الخلفاء الراشدین، ۲: ۱۰۱۲

[۳۱۷]	امام عبد الرزاق: المصنف، ۶: ۲۱۰

[۳۱۸]	خضری بک: تاریخ التشریع الاسلامی، ص ۹۰ و عبد العظیم شرف الدین: تاریخ التشریع الاسلامی، ص ۸۵

[۳۱۹]	محمد تقی امینی، مولنا: احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، س۔ن) ص ۳۰۲

[۳۲۰]	شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۲۸

[۳۲۱] طٰہٰ جابر العلوانی، ڈاکٹر: اصول الفقہ الاسلامی، ص ۲۸

[۳۲۲] عبدالسلام ندوی: سیر الصحابۃ، ج ۵ حصہ ۹، ص ۲۶۱۔۲۶۹

[۳۲۳] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۲۵

[۳۲۴] محمد ارشد: اسلامی ریاست میں قانون سازی اور اجتہاد، سہ ماہی فکر و نظر، (جلد ۴۴ شمارہ ۳، جنوری۔ مارچ ۲۰۰۷م) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۵۱

[۳۲۵] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۴۷

[۳۲۶] شہزاد اقبال شام: اسلامی قانون کے مآخذ، ماخذ چہارم، القیاس (شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۴م) ص ۸

[۳۲۷] علی بن عمر، دارقطنی، امام: سنن الدارقطنی (نشر السنہ، ملتان، س۔ن) ۴:۲۰۶

[۳۲۸] اس کے لیے دیکھیے: امام ابن قیم: اعلام الموقعین، ۱:۸۶

[۳۲۹] اہل الرائے سے مراد علماء و فقہاء کا وہ طبقہ ہے جن کا رجحان احادیث و آثار کے مقابلہ میں ذاتی قیاس و رائے کی طرف زیادہ تھا۔ اہل الحدیث اور اہل الرائے میں تفصیلی فرق کے لیے ملاحظہ ہو: شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغۃ، ۱:۱۴۷

[۳۳۰] مصطفیٰ احمد زرقا: المدخل الفقہی العام، ۱:۱۶۴۔۱۶۵

[۳۳۱] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۴۶

[۳۳۲] ایضاً، ص ۳۴۹

[۳۳۳] محمد خضری بک: تاریخ التشریع الاسلامی، ص ۱۴۸

[۳۳۴] شاہ ولی اللہ: ازالۃ الخفاء، ۳:۳۰۶

[۳۳۵] محمد تقی امینی، مولانا: احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت، ص ۳۰۲

[۳۳۶] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب، حدیث: ۳۶۸۱۔۳۶۸۲

[۳۳۷] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے "فقہی تفردات" کے لیے ملاحظہ ہو: تبسم منہاس، ڈاکٹر: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فقہی اجتہادات اور تفردات، ششماہی منہاج، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ص ۲۴۱۔۲۶۰

[۳۳۸] ایضاً، ص ۲۵۰

[۳۳۹] حافظ ابن حزم: المحلی، ۹:۲۸۹

[۳۴۰] امام عبدالرزاق: المصنف، ۶:۶۹ و امام جصاص: احکام القرآن، ۳:۹۲

[۳۴۱] حافظ ابن حزم: المحلی، ۱۱:۶۶
[۳۴۲] امام عبدالرزاق: المصنف، ۱۰:۲۴
[۳۴۳] امام ابن حنبل: المسند، ۱:۴۵۲
[۳۴۴] ڈاکٹر تبسم منہاس: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فقہی اجتہادات اور تفردات، ص ۲۵۴
[۳۴۵] امام عبدالرزاق: المصنف، ۱۰:۲۳۷
[۳۴۶] محی الدین، نووی، امام: المجموع شرح المھذب (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ۲۰:۸۱
[۳۴۷] امام بیہقی: السنن الکبری، ۷:۳۶۲ حافظ ابن حزم: المحلی، ۱۰:۲۱۸۔۲۱۹
[۳۴۸] ڈاکٹر تبسم منہاس: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فقہی اجتہادات اور تفردات، ص ۲۵۸
[۳۴۹] محمود احمد، غازی، ڈاکٹر: محاضرات فقہ (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۵م) ص ۲۲۵
[۳۵۰] رئیس احمد جعفری: سیرت ائمہ اربعہ (شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور۔ ۱۹۵۵م) ص ۱۶۷
[۳۵۱] شاہ معین الدین احمد، ندوی: خلفاء راشدین، ص ۲۸۴
[۳۵۲] محمود احمد ظفر، حکیم: امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (کتب خانہ مجیدیہ، ملتان، س۔ن) ص ۴۸۶
[۳۵۳] امام شافعی: الام، ۵:۲۳۹۔۲۴۱ وامام ابن عبدالبر: الاستذکار، ۱۷:۳۰۴، ۳۰۹
[۳۵۴] اشرف علی، تھانوی، حکیم الامت، مولنا: الحیلۃ الناجزۃ للحیلۃ العاجزۃ بحوالہ محمد طاہر منصوری (مرتب): اجتماعی اجتہاد، ص ۵۵
[۳۵۵] امام عبدالرزاق: المصنف، ۷:۳۸۲
[۳۵۶] ڈاکٹر ار۔ کے۔ نور محمد: اقضیۃ الخلفاء الراشدین، ۲:۹۹۸۔۹۹۹
[۳۵۷] ایضاً، ۱:۵۰۳
[۳۵۸] عبدالسلام، ندوی: سیر الصحابۃ، ج ۵، حصہ ۹، ص ۲۶۹
[۳۵۹] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب الطہارۃ، باب کیف المسح، حدیث: ۱۶۲

باب چہارم:

عصر حاضر میں خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج و نوعیت سے استفادہ

فصل اول:

عصری مسائل کی نوعیت اور خلفاء راشدین کے مسائل کی نوعیت سے استفادہ

عصری مسائل پیدا ہونے کی وجوہات:

عصرِ حاضر میں جن مسائل نے جنم لیا ہے ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ان مسائل کے منصۂ شہود پر آنے کے اسباب بارے تفصیلاً بحث کی جاتی ہے۔

1۔جدید آلات و ذرائع اور ترقیات:

یہ ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ گزشتہ صدی ڈیڑھ صدی میں سائنس نے جس قدر ترقی کی ہے اس کے مقابلہ میں گزشتہ تمام ادوار کی ترقیات ہیچ نظر آتی ہیں۔سائنس کی اس قدر ترقی کے نتیجہ میں کئی طرح کے جدید آلات و وسائل منظر عام پر آئے جن میں ٹی وی، انٹرنیٹ، کمپیوٹر، دوربین، گھڑی، ہوائی جہاز وغیرہ شامل ہیں۔ان جدید آلاتِ نقل و حمل سے فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں اور دنیا ایک Village کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔لمحہ بھر میں ہزاروں میل مسافت کے حالات سے باخبر ہوا جا سکتا ہے۔

جدید سائنسی ترقی کے نتیجہ میں حربی آلات و اسلحہ جات میں بھی جدت پیدا ہوئی اور اب وہ وقت آیا کہ دنیا میں ایٹمی اسلحہ تیار کیا جا رہا ہے جو انسانیت کے لیے انتہائی مہلک اور تباہ کن بھی ہے۔

میڈیکل سائنس کی ترقی نے تو دنیا میں تہلکہ ہی مچا کر رکھ دیا ہے اور وہ بیماریاں جنہیں کبھی لا علاج سمجھا جاتا تھا اب قابلِ علاج تصور کی جانے لگی ہیں۔ اور ابھی مزید نہایت حیرت انگیز انکشافات و ایجادات میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے:

﴿ وَ یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾[۱]

''اور وہ (اور چیزیں بھی) پیدا کرتا ہے جن کی تم کو خبر نہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ و پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوتی نظر آ رہی ہے کہ

﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ﴾[۲]

''ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے۔''

ان جدید ترقیات سے عصرِ حاضر میں کیا انقلاب برپا ہوا ہے، اس بارے پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ (م ۲۰۰۹ء) لکھتے ہیں:

''عصر حاضر میں سائنسی انکشافات، تکنیکی ایجادات، طبی مشاہدات، مہندسانہ اختراعات اور مشینی مصنوعات نے صرف ایک جہانِ نو کی تعمیر نہیں کی بلکہ انسان، معاشرے اور ریاست کے مزاج کو بھی تبدیل کر دیا ہے۔ سماجیات، بشریات اور عمرانیات میں نئے نئے تصورات پیدا ہو گئے ہیں''۔[۳]

ان جدید ترقیات کے نتیجہ میں انسان کو جو سہولیات (Facilities) حاصل ہوئیں سو ہوئیں مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان جدید ترقیات کے نتیجہ میں انسان کی بے چینی و بے سکونی میں پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوا ہے اور دنیا ہمہ وقت ایک طرح کے خوف و ہیبت میں مبتلا ہے۔ ان مسائل و پریشانیوں کے ساتھ ساتھ سینکڑوں مسائل فقہاءِ امت سے اپنے حل کے خواہاں ہیں۔ جدید ترقیات کے نتیجہ میں جن جدید فقہی مسائل نے سر اٹھایا ہے اس کی ایک مختصر فہرست یہاں ذکر کی جاتی ہے۔

i۔ ہوائی جہاز میں نماز کا مسئلہ

ii۔ مریض تنفس کا حالت روزہ میں پمپ کا استعمال

iii۔ گردہ کے مریض کا حالت روزہ میں خون تبدیل کرانا

iv۔ حج کے موقع پر مانع حیض Tablets کا استعمال

v۔ ٹیلی فونک نکاح

vi۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا استعمال

vii۔ انتقال خون

viii۔ اعضاء کی پیوند کاری

ix۔ ضبط تولید (Family Planning)

x۔ رؤیت ہلال بذریعہ آلات جدیدہ

xi۔ ایٹمی اسلحہ بنانا اور اس کا استعمال

xii۔ ماء مستعمل (Used Water) کا فلٹر کرنے کے بعد استعمال

xiii۔ تصویر کی شرعی حیثیت

xiv۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیات کو فلمانہ

xv۔ مرد یا عورت کا جنس تبدیل کرانا وغیرہ

ان تمام مذکورہ مسائل کا شریعت کی روشنی میں حل پیش کرنا اور ان کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرنا فقہاء امت کے لیے عصرِ حاضر کا ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

2۔ مغرب کے نئے تنظیمی ادارے:

عصرِ حاضر میں مغرب کی طرف سے بعض ایسے ادارے وجود میں آئے ہیں جن کی افادیت سے انکار کی گنجائش قطعاً نہیں ہے اگرچہ ان اداروں میں کچھ غیر شرعی امور موجود ہیں مثلاً عصرِ حاضر میں بنک ایک مالیاتی ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملکی نظام کو کنٹرول میں رکھنے اور اس کا نظم و نسق چلانے کے لیے مغربی جمہوریت ایک ادارے کے طور پر سامنے آئی ہے۔ اسی طرح انشورنس کمپنیاں عصرِ حاضر میں کفالت کے اداروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان مغربی اداروں کے لیے اسلام میں کس قدر گنجائش ہے اس کا جواب یقیناً قابلِ اجتہاد امور سے تعلق رکھتا ہے۔

3۔ انتظامی نوعیت کے بعض جدید مسائل:

شرعی طور پر ایام تشریق (۱۱،۱۲،۱۳ ذوالحجہ) میں رمی جمرات زوال آفتاب کے بعد کی جانی چاہیے مگر آج جب کہ تیس لاکھ کے لگ بھگ حجاج کرام حج کے لیے میدانِ عرفات میں جمع ہوتے ہیں

تو اس جم غفیر کا بیک وقت رمی کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور اس کے نتیجہ میں کبھی بھگدڑ مچ جائے تو سینکڑوں حجاج کرام شہید بھی ہو جاتے ہیں لہٰذا یہ ایک مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ کیا حجاج کرام کو زوال سے قبل رمی جمرات کی اجازت دے دی جائے۔ اسی طرح اس رش کو کنٹرول کرنے کے لیے جمرات کو مزید لمبا کر کے ایک پل میں سے گزار دیا جائے تا کہ لوگ اس پل کے اوپر سے بھی رمی کر لیں تو اس کی شرعی حیثیت آج ایک فقہی مسئلہ ہے۔

اسی طرح اتنی کثیر تعداد کا بیک وقت منیٰ میں قربانی کرنا اور پھر اس کے گوشت کو تقسیم کرنا ،سنبھالنا بھی ایک مسئلہ ہے تو کیا یہ کام حکومت سعودی عرب اپنے ذمہ لے سکتی ہے؟ یہ مسائل دراصل انتظامی وعبت کے ہیں۔

4۔جدید طرق تجارت:

عصرِ حاضر میں تمدنی ترقی کے ایک طویل سفر کے بعد کاروبار اور تجارت کے بھی نئے نئے انداز اور طریقے سامنے آئے ہیں نیز بعض غیر مرئی اشیاء کی تجارت بھی ہو رہی ہے مثلاً

i۔ انٹرنیٹ اور جدید ذرائع مواصلات وغیرہ کے ذریعے عقود و معاملات۔

ii۔ سٹاک ایکسچینج اور اس میں شیئرز کی خرید و فروخت۔

iii۔ حقِ طباعت و اشاعت نیز کمپیوٹر پروگراموں وغیرہ کے حقوق ایجاد کی شرعی حیثیت۔

iv۔ کریڈٹ کارڈز کے ساتھ خرید و فروخت۔

v۔ عصرِ حاضر میں اشیاء کی پیکنگ کے ساتھ خرید و فروخت اور "بیع قبل القبض" (اپنے قبضہ میں لینے سے قبل کسی چیز کی فروخت) کا صحیح مفہوم وغیرہ۔

یہ وہ مسائل ہیں جو آج مجتہدینِ امت کو دعوتِ اجتہاد دے رہے ہیں جن میں اجتہاد کر کے اگر لوگوں کی صحیح شرعی رہنمائی نہ کی گئی تو لوگ اباحت پسندی کا شکار ہو کر ہر نئے طریقے اور ہر نئی چیز کو اختیار کرتے چلے جائیں گے اور نتیجۃً ان کا شریعت سے تعلق کمزور ہوتا چلا جائے گا۔

5۔عرف ورواج کے بدلنے سے نئے مسائل:

عرف ورواج کی تبدیلی ہر دور میں نت نئے مسائل کے جنم لینے کا باعث بنتی ہے مثلاً جب لوگ قبائلی طرز پر زندگی گزارتے تھے تو قرآنِ مجید میں زوجین میں اختلاف ہونے پر ان کے خاندان سے ہی حَکَمین (Judges) مقرر کرنے کا حکم دیا گیا تھا[۴] مگر آج خاندانی نظام (Family System)

کے بندھن ٹوٹتے چلے جارہے ہیں یا پھر کمزور ہوچکے ہیں تو کیا عصرِ حاضر میں اس کا متبادل پنچائیت، ناظم یا علاقہ کے کونسلر وغیرہ بن سکتے ہیں یا نہیں؟

عصرِ حاضر میں شخصی غلامی کا تقریباً خاتمہ ہوچکا ہے اور عالمی قانون کے تحت اب کسی مرد یا عورت کو غلام، لونڈی بنانا جرم ہے[۵] لہٰذا عصر حاضر میں مصارفِ زکوٰۃ میں سے ''فی الرقاب'' [۶] کے کیا اطلاقات ہوسکتے ہیں؟ وغیرہ۔ اسی طرح بلادِ مشرق اور بلاد مغرب کے عرف ورواج کے مختلف ہونے سے احکام شرعیہ متاثر ہوں گے۔

6۔ضرورت ومجبوری:

عصرِ حاضر میں کئی ایک ایسے مسائل نے جنم لیا ہے جن میں شاید ضرورت ومجبوری اثر انداز ہوسکے ان میں سے چند اہم مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

i۔ ہندوستان کے خصوصی حالات کے پیش نظر انشورنس کا حکم۔

ii۔ غیر مسلم ممالک میں تعلیم یا تجارت کی غرض سے رہائش اختیار کرنے والوں کو عارضی طور پر نکاح کی اجازت یا عدم اجازت۔ اسے ''نکاح مسفار'' کا نام دیا جاتا ہے۔

iii۔ غیر مسلم ممالک کے مسلمان شہریوں کا فوج میں بھرتی ہونا اور پھر مسلم ممالک پر حملے میں شرکت کرنا۔

iv۔ غیر مسلم قاضی کی طرف سے تفریق نکاح اور اس کے شرعی اثرات۔

v۔ غیر مسلموں کے قبرستان میں مسلمانوں کی تدفین۔

vi۔ غیر مسلم ممالک میں مجبوراً ایسے ہوٹلوں پر ایک مسلمان کی ملازمت کرنا جہاں شراب اور خنزیر کا گوشت بھی فروخت ہوتے ہوں۔

یہ عصرِ حاضر کے انتہائی اہم اور حساس اجتہادی مسائل ہیں جن میں ضرورت ومجبوری کی حدود وقیود کو متعین کرنے کی نوبت آئے گی۔

7۔تہذیبی تصادم:

بعض نام نہاد دانشوروں نے دنیا میں تہذیبی تصادم کا ہوّا کھڑا کر رکھا ہے اور مغرب کو اسلام اور مسلمانوں کے بالمقابل لا کھڑا کیا ہے حالانکہ مسلمان اور غیر مسلم کا اصل تعلق داعی اور مدعو کا ہے اور داعی مدعو کا خیر خواہ ہوتا ہے نہ کہ خواہ مخواہ مدعو کو اپنا دشمن سمجھ لینے والا۔ اس تہذیبی تصادم میں نائن الیون

کے واقعہ کے بعد شدت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔[۷] اور اس شدت کے بڑھنے سے مسلمانوں کے لیے غیر مسلم ممالک میں بحیثیت اقلیت مسائل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی لیے عصر حاضر میں ''فقہ الاقلیات'' کے نام سے فقہ اسلامی کا ایک نیا در کھلا ہے۔

8۔ تمدنی ترقی:

عصر حاضر میں فقہاء امت کو درپیش مسائل میں سے کئی مسائل دراصل تمدنی ترقی کی وجہ سے ہیں۔ انسان چونکہ آرام پسند اور سہولیات کا خوگر واقع ہوا ہے لہٰذا وہ ہمیشہ اس حوالے سے سوچ و فکر کو مہمیز دیتا رہتا ہے۔ نتیجۃً تمدن کی ترقی تیز رفتاری سے اپنا سفر کرتی رہتی ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمدن کی ترقی کو روکنے کی کوشش نہ صرف مشکل بلکہ غیر فطری اور نا معقول اقدام ہے۔ موجودہ تمدنی ترقی بڑی حد تک انگلستان کے صنعتی انقلاب کا نتیجہ ہے اس صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں انسانی تمدن میں کیا تغیرات اور تبدیلیاں واقع ہوئیں، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ لکھتے ہیں ''(صنعتی انقلاب کے بعد) انسانی تمدن میں جس برق رفتاری سے تغیرات اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں، انھوں نے علوم وفنون، معاشرت، معیشت، ریاست اور سیاست کے ڈھانچے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ مقبوضہ ممالکِ اسلامیہ کے مسلمان ان تبدیلیوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے''۔[۸]

9۔ بین الاقوامی معاہدات:

اس وقت فقہاء امت کو درپیش فقہی مسائل پیش آنے کا ایک اہم سبب وہ معاہدات بھی ہیں جو بین الاقوامی نوعیت کے ہیں جن میں سے ایک اہم ترین ''حقوق انسانی کا عالمی منشور'' ہے جس پر تمام دنیا کے اسلامی و غیر اسلامی ممالک دستخط کر چکے ہیں اس میں انسانوں کی غلامی کے خاتمہ کا اعلان بھی ہے جبکہ قرآن وحدیث میں غلامی کو پسند نہ کرنے کے باوجود بہر صورت اس بارے احکام موجود ہیں۔ اسی طرح اس معاہدہ میں انسان کی عزتِ نفس پر بڑا زور دیا گیا ہے لہٰذا اس معاہدہ کی رو سے کسی مجرم کو کھلے عام پھانسی (Open Hanging) نہیں دی جا سکتی حالانکہ قرآنِ مجید میں زانی مرد و عورت کو سزا دیتے ہوئے لوگوں کی ایک جماعت کی موجودگی کو یقینی بنانے کا حکم ہے[۹] تاکہ وہ مجرم دیدۂ بینا کے لیے نشانِ عبرت بن جائے۔

ان مذکورہ بالا اسباب کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد حسب ذیل فہرستِ اسباب مرتب ہوتی ہے۔

i۔ جدید آلات و ذرائع اور ترقیات

ii۔ مغرب کے نئے تنظیمی ادارے

iii۔ انتظامی نوعیت کے بعض جدید مسائل

iv۔ جدید طرقِ تجارت

v۔ عرف ورواج کے بدلنے سے نئے مسائل

vi۔ ضرورت و مجبوری

vii۔ تہذیبی تصادم

viii۔ تمدنی ترقی

ix۔ بین الاقوامی معاہدات

عصر حاضر کے جدید فقہی مسائل کی نوعیت:

گزشتہ اوراق میں عصرِ حاضر میں جدید فقہی مسائل کے جنم لینے کی وجوہات واسباب کے ضمن میں جدید فقہی مسائل کی ایک فہرست کا بطور امثلہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ اگر ان مسائل پر ایک نظر پھر سے ڈال لی جائے تو ان مسائل کی نوعیت متعین کرنا بھی کوئی مشکل نہیں رہتا۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے یہ مسائلِ فقہیہ درج ذیل اقسام (Categories/ Kinds) سے متعلقہ ہیں۔

i۔ عبادات سے متعلقہ جدید مسائل

ii۔ مسائل اقتصادیات

iii۔ مسائل مناکحات

iv۔ حربی وعسکری مسائل

v۔ طبی مسائل

vi۔ مسائل سیاسیات

آئندہ آنے والے صفحات میں ان عصری مسائل کو قدرے تفصیل سے تحریر کیا جاتا ہے کیونکہ صورتِ مسئلہ کا صحیح فہم حاصل ہو جانا ہی کسی درست اجتہاد کی طرف لے جا سکتا ہے۔ صورتِ مسئلہ کے فہم کی اسی اہمیت کے پیش نظر اہل علم کے یہاں یہ جملہ معروف ہے:

"ان تصویر المسئلة نصف العلم".

"بلاشبہ صورتِ مسئلہ (سمجھ لینا) نصف علم ہے۔"

عبادات سے متعلقہ جدید مسائل:

عبادات سے مراد وہ اموراور اعمال ہیں جن کے ذریعہ اللہ کی بندگی کی جاتی ہے اور اس کا قرب حاصل کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں دین کے بنیادی پانچ ارکان اور اس کے لوازمات آتے ہیں۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ امور بندگی شارع نے خود ہی متعین کردیے ہیں لہٰذا عبادات کے ضمن میں کسی بھی دور میں اجتہاد کی ضرورت پیش نہ آسکے گی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بات اس لحاظ سے تو یقیناً درست ہے کہ کوئی بھی مجتہد عبادات پر اجتہاد کی قینچی چلا کر ان میں کمی بیشی کا مجاز نہیں ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عصر حاضر میں عبادات سے متعلقہ چند جدید مسائل ضرور سامنے آئے ہیں جنہیں شریعت کی روشنی میں حل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ چند مسائل حسب ذیل ہیں۔

گندے اور مستعمل پانی کا فلٹر کرنے کے بعد استعمال:

اللہ رب العزت نے اپنی عبادت اور بندگی کے لیے بندوں کو نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور ہمارے نبی محترم حضرت محمد ﷺ نے ہمیں نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا ہے۔[۱۰] ادائیگی نماز کے لیے باوضو ہونا شرط ہے[۱۱] اور وضو طاہر ومطہر پانی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ فقہاء کرام کے یہاں ایسا پانی جو عبادت کی نیت سے ایک دفعہ زیر استعمال آجائے ''ماء مستعمل'' کہلاتا ہے اور بعض فقہاء کے یہاں ایسے مستعمل پانی سے وضو وغسل یعنی طہارت حاصل نہیں کرسکتے۔[۱۲]

عصرِ حاضر میں سائنس اس حد تک ترقی کرچکی ہے کہ کسی بھی استعمال شدہ پانی خواہ اس میں کتنی ہی گندگی ونجاست کیوں نہ گری ہو اسے فلٹر کرکے خالص پانی کی طرح صاف شفاف کیا جاسکتا ہے اور کئی ترقی یافتہ ممالک میں پانی کی قلت کی وجہ سے ایسا کیا بھی جارہا ہے اور لوگ اس صاف شفاف پانی کو اپنی ہر ضرورت کے لیے استعمال کررہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پانی کی اس ماہیت کے بدل جانے سے کیا حکم بھی بدل جائے گا اور اب اسے غیر مستعمل پانی کی حیثیت دے کر طہارت وغیرہ کے لیے اس کے استعمال کی شرعی طور پر اجازت ہوگی یا نہیں؟

قطبین وغیرہ پر نماز و روزہ کے اوقات کا مسئلہ:

ادائیگی صلوۃ کے لیے شرع مبین میں اوقات صلوۃ کی تعیین بھی کردی گئی ہے، ان کے مطابق صبح صادق کی پو پھوٹنے سے لے کر غروب آفتاب تک چار نمازیں (فجر، ظہر، عصر اور مغرب)

ہیں جبکہ نماز عشاء کا وقت مغرب کے تقریباً پون گھنٹہ، گھنٹہ کے بعد شروع ہو جاتا ہے[۱۳] اس سلسلہ میں نمازوں کے درمیانی وقفوں میں اگرچہ موسم گرما، سرما میں فرق ہوتا ہے مگر اوقاتِ صلوٰۃ کی علامات ہر موسم میں یکساں ہی ہیں۔ احادیث میں موجود علامات کا تعلق ان علاقوں سے ہی ہو سکتا ہے جہاں روزانہ چوبیس گھنٹے میں سورج کا طلوع، زوال اور غروب کا سلسلہ چلتا رہتا ہے لیکن آج دنیا میں کچھ ایسے خطے بھی دریافت ہوئے ہیں جن میں چھ ماہ تک دن کی کیفیت ہے اور چھ ماہ تک رات کی کیفیت ہے۔ اسی طرح کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں سردیوں میں رات تیئس گھنٹے کی ہے تو دن صرف گھنٹہ بھر کا جبکہ گرمیوں میں اس کے برعکس صورت حال ہے تو ایسے علاقوں میں نمازوں اور روزوں کے اوقات کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ شریعت کی اس بارے عام معروف نصوص کو ہی اختیار کیا جائے تو کبھی ایسا ہوگا کہ تیئس گھنٹے کا روزہ رکھنا ہوگا اور کبھی صرف ایک گھنٹے کا روزہ۔ اسی طرح کبھی پانچ نمازوں کی ادائیگی گھنٹہ بھر میں اور کبھی تیئس گھنٹوں میں ممکن ہو سکے گی۔[۱۴]

سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے جب نمازوں کے اوقات اور ان کی خاص علامات بتائیں، اس وقت یہ علاقے ابھی دریافت نہ ہوئے تھے اور نہ ہی قطب شمالی و قطب جنوبی (Polar Regions) کے ان علاقوں تک ابھی اسلام کی آواز پہنچی تھی لہٰذا نبی کریم ﷺ کو ان علاقوں کے بارے کچھ ہدایت دینے کی نوبت نہیں آئی کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ لہٰذا عصرِ حاضر کے قابلِ اجتہاد مسائل میں سے یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے جو یقیناً عبادات سے متعلقہ ہے۔

ہوائی جہاز میں فرض نماز کی ادائیگی کا مسئلہ:

سابقہ امم کو محض اپنے معابد میں ہی عبادت الٰہی کی اجازت تھی لیکن رحمت دو عالم ﷺ کی آمد کی برکت سے اس امت کو روئے زمین کے کسی بھی پاک خطے پر نماز و عبادت کی اجازت دے دی گئی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جعلت لی الارض مسجدا و طھورا"[۱۵]

''تمام روئے زمین کو میرے لیے جائے سجدہ اور طہارت و پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔''

قدیم زمانہ میں انسان روئے زمین پر یا سمندر کے پانیوں میں سفر کرتا تھا لہٰذا شریعت میں

ان دونوں سے متعلقہ نماز وغیرہ کے احکام موجود ہیں لیکن اب ایک عرصہ سے انسان فضاؤں کو بھی چیرتا ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ بذریعہ ہوائی جہاز گھنٹوں اور دنوں کا سفر لمحوں میں کر رہا ہے۔ شریعت میں روئے زمین پر چلنے والی سواری یا سمندر کے پانی پر چلنے والی کشتی میں نماز کی تفصیلی ہدایات موجود ہیں لیکن فضائی سفر میں ہوائی جہاز میں فرضی نماز ایک اجتہادی مسئلہ ہے[١٦] جبکہ یہ ہوائی سفر کبھی مسلسل پندرہ بیس گھنٹوں پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔

سانس کے مریض کا روزہ کی حالت میں پمپ کا استعمال:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے روزہ کی فرضیت بارے فرمایا ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾[١٧]

''تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم پرہیز گار بنو۔''

اور مریض و مسافر کو یہ رخصت دی ہے کہ وہ اگر ماہِ رمضان میں کسی بیماری یا سفر کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں تو ماہِ رمضان کے بعد اس کی جگہ روزہ رکھیں [١٨] غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماریاں بھی دو طرح کی ہیں۔ کچھ تو دائمی نوعیت کی ہوتی ہیں اور کچھ عارضی نوعیت کی۔ دائمی نوعیت کی بیماریوں میں سے ایک سانس کی بیماری ہے۔ اس بیماری میں مبتلا مریض کو کبھی سانس کی گھٹن اور تنگی محسوس ہوتی ہے اور اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ایسے شخص کو اگر سانس کا مسئلہ نہ ہو تو اس کے لیے روزہ نبھانا چنداں مشکل نہیں ہوگا۔

عصرِ حاضر میں جدید میڈیکل سائنس کی ترقی کی بدولت یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایسا مریض ایک خاص قسم کے آلہ (پمپ) کا استعمال کرے تو سانس کی گھٹن فوری طور پر دور ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا مریض روزہ رکھ کر حالت روزہ میں اس آلہ کا استعمال کر سکتا ہے؟[١٩] فقہاء امت کو اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ اس آلہ کے ذریعے محض اس کے پھیپھڑوں کو کھولا جاتا ہے تا کہ اس کی سانس لینے میں دشواری ختم ہو سکے۔ اس آلہ کے معدہ پر کوئی اثرات نہیں ہوتے۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ سانس کی نالی کے راستے سے جانے والی یہ ہوا کیا ماکولات و مشروبات کے ضمن میں آتی ہے کہ جس سے اس کا روزہ متاثر ہوتا ہے یا نہیں؟

روزہ کی حالت میں نیما کرنا:

روزہ کی حالت میں کسی ماکول ومشروب شے کا پیٹ یا معدہ میں جانا روزہ کے ٹوٹنے کا باعث بنتا ہے اسی لیے نبی کریم ﷺ نے روزہ کی حالت میں وضو کرتے ہوئے بھی احتیاط کا حکم دیا ہے کہ ناک میں پانی چڑھاتے ہوئے مبالغہ سے کام نہ لیا جائے جبکہ عام حالات میں تو ناک میں پانی چڑھاتے ہوئے ذرا مبالغے سے کام لینے کا حکمِ نبوی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" بالغ فی الاستنشاق الا ان تکون صائما" . [۲۰]

''روزے کی حالت کے سوا ناک میں (دورانِ وضو) پانی چڑھاتے ہوئے ذرا مبالغہ سے کام لو۔''

عصرِ حاضر میں ایسا مریض جسے پاخانے کی بندش (قبض) ہوجائے اسے دبر کے راستے دوائی دی جاتی ہے جو ظاہر ہے معدہ تک فطری طریقہ سے نہیں پہنچتی اور پھر وہ دوائی چند لمحوں میں پاخانہ کے ساتھ ہی خارج بھی ہوجاتی ہے اسے اصطلاحاً ''نیما'' کرنا یا کرانا کہتے ہیں۔ اس طرح سے دوائی کے استعمال میں تو شریعت کی طرف سے کوئی قدغن نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایسا مریض حالت روزہ میں اس طرح سے دوائی کا استعمال کرسکتا ہے اور اس کا اس کے روزے پر کچھ اثر پڑے گا یا نہیں؟[۲۱]

حصص (shares) پر زکوٰۃ:

سٹاک ایکسچینج عصرِ حاضر کا ایک ایسا جدید ادارہ ہے جس میں مختلف کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت کے معاملات طے پاتے ہیں۔ یہ حصص خریدنے کی بنیادی طور پر دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔

i۔ مضاربت کے انداز میں نفع ونقصان کی بنیاد پر کمپنی کے ساتھ حصہ داری۔

ii۔ شیئرز کی بطورِ مال تجارت خرید وفروخت کرنا۔[۲۲]

ظاہر ہے جو کاروبار بھی انفرادی واجتماعی سطح پر ہو اور جائز طریقے سے ہو تو اس میں شرائط زکوٰۃ پوری ہونے پر زکوٰۃ لازم آئے گی۔ ان شیئرز کی زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے درج ذیل امور کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے:

i۔ ہر وہ کمپنی جو سودی کاروبار کرے اس میں شرکت ہی جائز نہیں لیکن اگر بھولے سے شرکت کرلی اور بعد میں پتہ چلا تو راس المال کی زکوٰۃ دینا ہوگی، سودی مال کی زکوٰۃ نہ دی جائے

گی کیونکہ حرام مال زکوٰۃ سے پاک نہیں ہوتا اور اس کمپنی سے علیحدگی اختیار کرنا ہوگی۔

ii۔ مضاربت کے انداز پر کمپنی میں شرکت سے چونکہ Shares Holder کمپنی کے تمام اثاثوں میں شرکت کرے گا لہٰذا ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنی کی بلڈنگ، مشینری و آلاتِ پیداوار کو شرعاً کل مال سے مستثنیٰ کیا جانا چاہیے کیوں کہ آلاتِ پیداوار پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔

iii۔ مضاربت کے انداز میں کمپنی میں شرکت کی صورت میں کمپنی مالِ مخلوط (Combined) کی زکوٰۃ ادا کرے گی لیکن اگر کسی وقت کمپنیاں خود ادائیگی زکوٰۃ کا اہتمام نہ کریں تو شیئر ہولڈر اپنی کل مالیت کے ساتھ شیئرز کو شامل کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا۔

iv۔ شیئرز کی بطورِ مالِ تجارت خرید و فروخت کی صورت میں حولانِ حول (ایک سال) ہونے پر شیئر کی کل مالیت کو دیگر اموال کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ دی جانی چاہیے۔

v۔ شیئرز کی موجودہ مارکیٹ ویلیو کے مطابق زکوٰۃ نکالی جائے گی نہ کے ابتدا میں لگائے ہوئے سرمایہ کے حساب سے۔[۲۳]

وفی الرقاب کے مفہوم کا تعین:

جس دور میں نبی کریم ﷺ پر مصارفِ زکوٰۃ کی آیت:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾[۲۴]

''صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنانِ صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے) میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے۔''

نازل ہوئی اس وقت انسانوں کی خرید و فروخت اور جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا عام رواج تھا چونکہ اسلام انسانوں کی غلامی کو بنیادی طور پر پسند نہیں کرتا لہٰذا مختلف طریقوں سے انسانوں کو آزاد کرنے کی شریعت میں ترغیب دی گئی بلکہ مصارفِ زکوٰۃ میں سے ایک مصرف ہی اسے ٹھہرایا گیا۔ عصرِ حاضر میں انسانوں کی خرید و فروخت اور غلامی کا رواج ختم ہوگیا ہے لہٰذا عصرِ حاضر میں ''وفی الرقاب'' کے مفہوم کا تعین کرنا فقہاءِ امت کے لیے ایک اجتہادی مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یاد رہے بعض علماء نے عصرِ حاضر میں اس کے مفہوم کا تعین کچھ یوں کیا ہے

i۔ کفار کی قید میں موجود مسلمانوں کو، مال زکوٰۃ کی رقم بطور فدیہ دے کر چھڑایا جا سکتا ہے۔
ii۔ مسلم ممالک کی جیلوں میں گرفتار بے گناہ قیدیوں کو بھی اس طرح چھڑایا جا سکتا ہے۔
iii۔ کسی جائز ضرورت کے تحت قرض لے کر دیوالیہ ہو جانے والے مقروض حضرات کو ادائیگی قرض کے سلسلہ میں رقم دینا بھی اس کے مفہوم میں آ سکتا ہے۔[۲۵]

خدام حجاج کا منیٰ سے باہر راتیں گزارنا:

ایام تشریق کی راتیں حجاج کرام کو منیٰ میں گزارنے کا حکم ہے مگر آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کو مکہ میں یہ راتیں گزارنے کی اجازت دے دی تھی کیونکہ وہ حجاج کرام کی خدمت پر مامور تھے بالخصوص انہیں دیگر حجاج کرام کے لیے پانی کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔[۲۶]

عصرِ حاضر میں حجاج کرام کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے کئی طرح کے مسائل پیش آجاتے ہیں لہٰذا فی الوقت خدمت کے شعبہ میں بھی حجاج کی ایک بڑی تعداد کو لگانا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نبی ﷺ نے محض حجاج کے لیے پانی کا انتظام کرنے والوں کو اجازت دی تھی اور اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ عصرِ حاضر میں ضرورتوں اور تقاضوں میں اضافہ ہو گیا تو کیا ان حالات میں حجاج کی خدمت پر مامور ڈاکٹرز وغیرہ کو بھی منیٰ سے باہر مکہ وغیرہ میں ایام تشریق کی راتیں گزارنے کی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

رمی جمار کے وقت کا مسئلہ:

فی الوقت حجاج کرام کی تعداد تیس لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے اور یہ دعاء ابراہیمی کے خلوص کا نتیجہ ہے، جب انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو کر کہا تھا:

﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ﴾۔[۲۷]

"لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف جھکے رہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعا کو شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے فرمایا تھا:

﴿يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾[۲۸]

"تمھاری طرف پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر جو دور (دراز) رستوں سے چلے آتے ہوں (سوار ہو کر) چلے آئیں۔"

حجاج کرام کی اس کثرتِ تعداد کی وجہ سے پیش آمدہ مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ کیا

رمی جمار کے عمل کو اس کے مخصوص اوقات کے علاوہ اوقات میں بھی انجام دیا جاسکتا ہے جبکہ یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ حج نہ صرف عبادتِ الٰہی کا ایک طریقہ ہے بلکہ یہ تو ''جامع العبادات'' ہے اور رمی مناسک حج میں سے ہے۔ عبادات کے اوقات متعین ہیں جیسے نماز روزہ کے اوقات کا تعین شارع نے کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کثرتِ ازدحام کے عذر اور مجبوری کے تحت حجاج کرام کو رمی کے مخصوص اوقات کے علاوہ اوقات میں رمی کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رہے کہ نبی کریم ﷺ نے عذر اور مجبوری کا لحاظ رکھتے ہوئے ہی ۱۰ ذی الحجہ کو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو فجر سے قبل ہی مزدلفہ سے روانگی کی اجازت دے دی تھی جبکہ عام حکم طلوع شمس کے بعد روانہ ہونے کا ہے۔[۲۹]

حج میں عورت کا مانع حیض ادویہ کا استعمال:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ماہواری کے ایام آنا ہر بالغہ عورت کی فطرت کا حصہ ہے۔[۳۰] اسی لیے شریعت نے ان ایام میں عورت کو عبادات کے سلسلہ میں کئی طرح کی رخصتیں اور سہولیات دی ہیں۔ اگر کوئی عورت حالتِ احرام میں اس میں مبتلا ہو جائے تو اسے ''طوافِ قدوم'' جو مکہ پہنچتے ہی کیا جاتا ہے، کرنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے کہ طواف بیت اللہ کا کرنا ہے جو دراصل مسجد ہے اور مسجد میں ایسی عورت کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔[۳۱] البتہ ایسی عورت دیگر امورِ حج بجالائے گی۔[۳۲]

عصرِ حاضر میں ایسی ادویات ایجاد ہو چکی ہیں جن کے استعمال سے عورت کے ایام حیض موخر ہو جاتے ہیں اور وہ بہ سہولت امورِ حج و عمرہ ادا کرسکتی ہے اس بارے ملحوظ رہے کہ کیا یہ انسانی فطرت کو بدلنا یا اس کے خلاف جنگ کرنا تو نہیں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹرز حضرات اس کے طبی طور پر مضر اثرات کو تسلیم کرتے ہیں نیز اس کے جواز کا فتویٰ دے کر گویا اللہ کی دی ہوئی رخصت کو قبول نہ کرنے کا ایک عملی اظہار تو نہیں؟

حج میں قربانی اور اس کے گوشت کی تقسیم:

کثرت ازدحام کی وجہ سے مسائلِ حج میں سے ایک مسئلہ قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے اور پھر ان کے گوشت کو حرم مکی سے باہر تقسیم کرنے کا ہے۔ آج اس پریشانی کے حل کے طور پر قربانی کے پیسے سعودی حکومت کو جمع کرا دیے جاتے ہیں۔ ان کے ملازمین خود ہی ذبح کر کے گوشت کو محفوظ کرتے ہیں اور پھر اسے غریب ممالک کے عوام میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ اتنا زیادہ گوشت ضائع بھی نہ ہو۔

جدید فقہی اقتصادی مسائل:

عصرِ حاضر کا انسان کس قدر مادیت پرست (Materialistic) ہو چکا ہے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ۔ ہر شخص دنیا پرستی میں مبتلا مادہ پرستوں کے ساتھ ایک دوڑ میں شریک ہے اور اس وقت دنیا پر سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت حکومت کر رہا ہے جس کے نتیجہ میں انسان نمایاں طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو چکے ہیں یعنی ایک طبقہ امراء کا ہے تو دوسرا طبقہ غربت کے مارے انسانوں کا جو حالات سے تنگ آ کر خودکشیاں اور خود سوزیاں کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں ۔

سرمایہ دارانہ سوچ ہی کا نتیجہ ہے کہ انسان نے دولتِ دنیا کے انبار لگانے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں جو انتہائی پیچیدہ اور عام آدمی کے لیے تو کسی حد تک ناقابل فہم بھی ہیں ۔ جہاں نئے طرقِ تجارت منصہء شہود پر آئے ہیں وہاں کئی مالیاتی ادارے بھی منظر عام پر آئے ہیں ۔ مغرب سے درآمد یہ ادارے اکثر و بیشتر سود اور قمار (جوا) کی غلاظت سے بھی آلودہ ہیں ۔ ایسی صورتِ حال میں دسیوں بیسیوں فقہی اقتصادی مسائل مجتہدین امت کے لیے ایک چیلنج ہیں ۔ جدید نظامِ معیشت نے کس قدر مسائل پیدا کیے ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''جدید نظام معیشت نے بیع و شرا کے پیمانے تبدیل کر دیے ہیں ۔ زرِ خالص کی بجائے زرِ اعتباری نے اپنا رسوخ حاصل کر لیا ہے بلکہ بڑے بڑے تجارتی سودے انٹرنیٹ کے ذریعے طے ہو رہے ہیں جس کے باعث (Cyber Crimes) کے رجحانات سر اٹھا رہے ہیں ۔ معاشیات کی دنیا میں غیر سودی بینکاری مسلم دنیا کے لیے سب سے بڑا چیلنج بنی ہوئی ہے ۔ انشورنس اور اجتماعی تکافل ایک فلاحی معاشرے اور معیشت کا ناگزیر تقاضا بن چکے ہیں ۔ اشیاء کی بجائے حصص کی تجارت ہو رہی ہے ۔ قرضوں کی اشاریہ بندی مسلم معیشت کے لیے نئے سوالات کو جنم دے رہی ہے ۔ جیب میں بھاری رقوم لیے پھرنے کی بجائے زندگی کریڈٹ کارڈ کی خوگر ہو رہی ہے ۔ نقد اور ادھار کی مارکیٹ نے ایک نئی کتاب البیوع مرتب کر دی ہے ۔'' [۳۴]

اس اقتباس کی روشنی میں عصری اقتصادی مسائل کی گونا گونی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ جدید فقہی اقتصادی مسائل میں سے چند مسائل پر بحث کی جاتی ہے ۔

مالیاتی ادارہ بنک اور اسلامی بینکاری:

بنک ایک مالیاتی ادارہ ہے جس کا کام لوگوں کی قیمتی امانتوں، زائد اور بھاری سرمایہ کو محفوظ کرنا ہے اور پھر اسے کسی کاروبار میں لگانا ہے، اس طرح بنک اپنے لیے سرمایہ جمع کرتا ہے۔ اسی طرح بنک عوام کو بھی بعض ضمانتوں کے ساتھ قرض کے طور پر سرمایہ فراہم کرتا ہے چونکہ بنک کا ادارہ بنیادی طور پر مغرب کے سرمایہ دارانہ ذہن اور سوچ کا نتیجہ ہے لہٰذا اس میں سود کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔

بنک اپنی تمام تر سودی خرابیوں کے باوجود بعض اعتبارات سے ایک مفید ادارہ ہے اس لیے اسے محض مغرب سے درآمد شدہ ہونے کی وجہ سے غلط قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ اس کی خرابیاں دور کی جانی چاہئیں۔ اگرچہ بعض محققین کا یہ دعویٰ ہے کہ بنکاری نظام کی جڑیں چونکہ سودی سرمایہ دارانہ نظام کی زمین میں پیوست ہیں لہٰذا جب تک جڑ سے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ نہ کر دیا جائے اس وقت تک غیر سودی بینکاری محض ایک خواب ہے جس کی تعبیر شاید کبھی بھی حقیقت کا روپ نہ دھار سکے گی۔ [۳۴]

حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر کا انسان اور بینک لازم ملزوم ہو چکے ہیں اور مفتیوں کے فتاویٰ انہیں بنک سے دور نہیں کر سکتے لہٰذا فقہاء ملتِ اسلامیہ کو اس بینکاری نظام کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کرنا ہے اور اس کی افادیت کے پیشِ نظر اس کا سودی غلاظت سے تطہیر و تزکیہ کرنا ہے۔ خدا لگتی بات یہ ہے کہ ہمارے اسلامی ماہرین معیشت نے بفضل اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں بہت محنت کی ہے اور سود سے پاک ممکنہ اور قابل عمل اسلامی بینکاری کا تصور بھی پیش کیا ہے مگر نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علماء کرام کے پاس تنفیذی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے مشورے اور آرا محض فائلوں کی زینت ہی بنے رہ جاتے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔

سٹاک ایکسچینج:

سٹاک ایکسچینج ایک ایسا ادارہ ہے جہاں مختلف کاروباری کمپنیوں کے حصص (Shares) کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اس ادارہ کی عصرِ حاضر میں ضرورت و اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس ادارہ کے وجود میں آنے کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں جب بڑے کارخانے اور فیکٹریاں لگانے کے لیے وافر سرمائے کی ضرورت پیش آئی تو اس کا حل یہ سوچا گیا کہ اتنا زیادہ وافر سرمایہ حاصل کرنے کے لیے کچھ دوسرے لوگوں کو بھی

شریک کرلیا جائے۔ چنانچہ اس طرح سے ''جوائنٹ سٹاک کمپنیاں'' وجود میں آئیں۔[۳۵]

ان کمپنیوں میں شریک افراد اگر اپنا سرمایہ کسی وقت نکالنا چاہتے تو اس کا حل یہ تجویز کیا گیا کہ وہ اپنا حصہ کسی دوسرے کو بیچ دیں۔ آہستہ آہستہ اپنے حصے (Shares) فروخت کرنے کے لیے الگ سے ایک مارکیٹ وجود میں آ گئی اسی مارکیٹ کا نام ''سٹاک ایکسچینج'' ہے۔[۳۶] گویا اپنی بنیاد کے اعتبار سے یہ مارکیٹ عوام الناس بالخصوص کمپنی میں شریک افراد کے لیے اس اعتبار سے مفید ہے کہ وہ جب چاہیں کمپنی سے اپنا سرمایہ نکلوا سکتے ہیں اور دوسرے افراد ان کی جگہ شریک ہو سکتے ہیں۔ سٹاک ایکسچینج میں دو بنیادوں پر شیئرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔

i۔ مضاربت کی طرح نفع و نقصان کی بنیاد پر کمپنی میں شرکت

ii۔ شیئرز کی بطور مال تجارت خرید و فروخت [۳۷]

سٹاک ایکسچینج میں اس وقت سود اور جوا پر مبنی انداز میں شیئرز کی خرید و فروخت کا معاملہ بہت زیادہ ہوتا ہے مثلاً سٹاک مارکیٹ کے ممبران دلالی کرتے ہوئے دوسروں کے لیے بھی کمیشن پر شیئرز خریدتے ہیں اور کبھی دلال ایسے شیئرز کا آگے سودا کر دیتا ہے جو درحقیقت اس کی ملکیت میں نہیں ہوتے گویا یہ ''بیع غیر مملوک'' کے مشابہ صورت ہے جو حرام ہے۔[۳۸] اسی طرح کبھی شیئرز کی خرید و فروخت محض فرضی ہوتی ہے یعنی لینے دینے کی اصل نیت ہی نہیں ہوتی البتہ شیئرز کے قبضہ کی تاریخ مقررہ پر اگر شیئرز کی قیمت بڑھ جائے تو وہ اضافی رقم خریدار کو دی جاتی ہے اور اگر قیمت گر جائے تو خریدار سے بائع الٹا وصول کر لیتا ہے گویا یہ قسمت لڑانے کا کھیل ہے جو سراسر جوا ہے۔[۳۹] ترجیحی حصص[۴۰] خریدنے والے کو محض نفع کی بنیاد پر شریک کمپنی کیا جاتا ہے خواہ کمپنی کو نقصان بھی ہو اور یہ خالص سود ہے۔ اسی طرح اکثر کمپنیاں کبھی تو بنکوں سے بھی سود پر قرض لیتی ہیں اور کبھی اس کے عکس بنکوں میں سرمایہ جمع کرا کر سود وصول کرتی ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کمپنی کی پشت پر کسی قسم کے اثاثہ جات ہی نہ ہوں تو ان کی خرید و فروخت بھی ''جوا'' ہے۔[۴۱]

سٹاک ایکسچینج میں جوا اور سود کس قدر غالب ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا پیراگراف سے ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ بعض ماہرین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ ادارہ سراسر سرمایہ دارانہ ذہن کی سوچ ہے اور یہ اسی سودی نظام معشیت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ہے۔ چنانچہ ماہنامہ ''ساحل'' کے مدیر لکھتے ہیں:

''اسلامی بینکاری اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک سرمایہ دارانہ معیشت کے تمام اداروں، سرمایہ داری کے اصولوں، سرمایہ دارانہ ذہنیت کو کلیتاً رد نہ کر

دیا جائے۔ اسٹاک ایکسچینج، منی مارکیٹ، کیپٹل مارکیٹ اور مارکیٹ کے سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر و آثار کو تہس نہس نہ کیا جائے، اس کے بغیر بلا سود بینکاری دراصل چھاچھ میں سے مکھن نکالنے کی کوشش ہے''۔[۴۲]

فقہاء امت کو دیکھنا یہ ہے کہ اگر سٹاک ایکسچینج کی مذکورہ بالا خرابیاں (جوا اور سود) دور کر دی جائیں تو پھر اس کی ایک ادارہ کی حیثیت سے شرعاً حیثیت کیا ہوگی جبکہ قرآن وسنت کی روشنی میں فقہاء کے یہاں یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ تمام معاملات مباح ہیں جب تک حرمت کی کوئی دلیل نہ مل جائے[۴۳] لیکن اس کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے تناظر میں بھی علماء کرام اور مجتہدین کو اپنی اجتہادی رائے کا اظہار کرنا ہوگا کہ فی الوقت ان خرابیوں کو دور کرنے کی سرکاری وغیر سرکاری سطح پر کوئی صورت نہیں ہے تو کیا ایسے حالات میں سدِ ذریعہ کے طور پر مسلمانوں کو اس ادارے کے ذریعے شیئرز خریدنے سے روک دیا جائے یا اس کی مضاربت سے ملتی جلتی شکل ہونے کی وجہ سے اجازت دی جائے البتہ اس کا غلط استعمال کرنے والوں کو اپنی جگہ گنہگار قرار دیا جائے۔

کریڈٹ کارڈز کا استعمال:

عرصہ دراز تک انسان زرِ مبادلہ کے طور پر سونے اور چاندی کے سکّے (درھم و دینار) استعمال کرتا رہا لیکن جب انھیں خصوصاً سفر وغیرہ میں اٹھانا دشوار گزرا تو انسان نے کاغذی نوٹ ایجاد کیے، اس طرح وزنی سکّوں کے بوجھ سے اسے آزادی ملی اور اب وہ وقت آیا ہے کہ انسان کاغذی نوٹ اٹھانے سے بھی خود کو بوجھل سمجھتا ہے نیز عصرِ حاضر کی بدامنی، چوری اور ڈکیتی کے بڑھتے ہوئے واقعات نے بھی انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ زیادہ رقم اپنے پاس نہ رکھے اور اس کے متبادل کے طور پر ''کریڈٹ کارڈ'' کا استعمال کرے۔

اگر تو کسی شخص کا بینک بیلنس پہلے سے موجود ہو تو بنک کی طرف سے اس کے لیے جاری کیا جانے والا کارڈ ''Debit Card'' کہلاتا ہے لیکن اگر بینک میں بیلنس نہ ہو اور پھر بھی بینک کارڈ جاری کر دے تو اسے ''Credit Card'' کہتے ہیں۔[۴۴]

کارڈ ہولڈر اس کارڈ کے ذریعے کسی ایسی دکان سے اشیاء کی خریداری کر سکتا ہے جس کا اسی بینک سے معاہدہ طے پا چکا ہوتا ہے۔ تاجر کارڈ ہولڈر سے کارڈ لے کر ایک خاص مشین میں گزار کر کارڈ کی تمام معلومات حاصل کر لیتا ہے اور پھر ایک رسید پر کارڈ کی معلومات اور حامل کارڈ کے دستخط لے لیتا ہے۔ تاجر بینک سے رابطہ کرتا ہے اور کارڈ ہولڈر کے بل کی ادائیگی بینک کل رقم سے کچھ کٹوتی کر

کے کرتا ہے۔[۴۵]

کریڈٹ کارڈ کے استعمال کی صورت میں بینک کارڈ ہولڈر کو یہ سہولت دیتا ہے کہ وہ اپنا قرض ایک مخصوص مدت تک ادا کردے۔ بینک کی طرف سے قرض کی فراہمی یقیناً ایک سہولت ہے مگر یہ سہولت دینے میں بینک اس قدر ''خیرخواہی'' کیوں کر رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بینک یہ سہولت بڑی حد تک ذاتی مفاد کے لیے ہی دیتا ہے کیونکہ موجودہ بینکاری نظام سود کی اساس پر چل رہا ہے اور اس کی پشت پر سرمایہ دارانہ سوچ ہی کارفرما ہے لہٰذا بنک کا یہ قرض فراہم کرنا بھی سرمایہ دارانہ سوچ پر ہی مبنی ہے۔ یہی باعث ہے کہ تمام بینک کریڈٹ کارڈ دیتے وقت یہ شرط لگاتے ہیں کہ کارڈ ہولڈر نے اگر ایک وقت مقررہ (جو بینک طے کردیتا ہے) تک قرض ادا نہ کیا تو پھر اس سے تاخیر پر جرمانہ بالفاظ دیگر سود بھی ادا کرنا ہوگا۔ بینک کی اس ''خیرخواہی'' کے نتیجہ میں ہزاروں لوگ بینک کے سودی شکنجے میں جکڑے جاچکے ہیں۔[۴۶] کریڈٹ کارڈ کا استعمال ایک جدید فقہی مسئلہ ہے لہٰذا عصرِ حاضر کے فقہاء کرام کو اس کے مالہ و ماعلیہ کے بارے اچھی طرح جان سمجھ کر، اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کو پرکھ کر اس کے جواز یا عدمِ جواز کا فیصلہ دینا ہوگا۔

پروفیسر منظور احمد الازہری کریڈٹ کارڈ کے درج ذیل منفی پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

i۔ ان کی وجہ سے اخراجات میں زیادتی اور بچتوں میں کمی ہو جاتی ہے جو بالآخر سرمایہ داری میں کمی کا باعث بنتی ہے۔

ii۔ کارڈز سے مصنوعی قوتِ خرید میں اضافہ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اشیاء کی طلب (Demand) بڑھ جاتی ہے۔

iii۔ اشیاء کی ڈیمانڈ بڑھنے سے مہنگائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

iv۔ اس کے نتیجہ میں بینکوں کی فراہمی سرمایہ میں اجارہ داری قائم ہوتی ہے جو بہرصورت سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرتی ہے۔

v۔ کارڈز سے چونکہ کمانے اور خرچ کرنے میں عدمِ توازن پیدا ہوتا ہے لہٰذا اس کے قومی معیشت پر بھی منفی اثرات پڑتے ہیں۔

vi۔ سب سے بڑا منفی پہلو یہ ہے کہ لوگ قرض مع سود کے شکنجہ میں زندگی بھر کے لئے پھنس جاتے ہیں اور پھر اس کے نتیجہ میں کئی معاشرتی مسائل (جرائم کی شرح میں اضافہ، عدمِ ادائیگی پر جیل جانا، طالب علموں کا کم سنی میں مقروض ہونا وغیرہ شامل ہیں) جنم لے رہے ہیں۔[۴۷]

اور اگر اس کے مثبت پہلوؤں پر نظر دوڑائیں تو محض قرض کی آسان فراہمی کی سہولت، منڈی کی حرکت میں تیزی، اقتصادی جمود میں کمی آنا اور ہر وقت جیب میں پیسے اٹھانے سے نجات ہیں۔[۴۸]

کریڈٹ کارڈ کے مذکورہ بالا مثبت و منفی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس بات کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ ابھی تک اس کے نقصانات ہی زیادہ سامنے آئے ہیں اور قرآن نے ﴿ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾[۴۹] (ان کے نقصان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔) کے اصول کے تحت شراب اور جوا کو حرام قرار دیا ہے۔ لہذا فقہاء کرام کو کریڈٹ کارڈ کے جواز و عدمِ جواز بارے غور و فکر کرتے ہوئے اس قرآنی اصول کو مدنظر رکھ کر اجتہادی فیصلہ کرنا ہوگا۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ فی الوقت کئی ایک اسلامی بینکوں نے کریڈٹ کارڈز کے حاملین کے تاخیر سے قرض کی ادائیگی پر سود ادا کرنے کی شرط ختم کر دی ہے[۵۰] لہٰذا فقہاء عصر کو اس پہلو سے بھی دیکھنا ہوگا کہ اگر سود کی شرط ختم کر دی جائے تو پھر اس کے عدم جواز کی کیا وجہ رہتی ہے جبکہ مسلمہ فقہی قاعدہ ہے" الاصل فی الاشیاء الاباحة "۔ (بنیادی طور پر تمام اشیاء مباح و حلال ہیں۔) لیکن سود کی شرط ختم ہونے کے باوجود یہ سوال بھی باقی رہے گا کہ کریڈٹ کارڈز کے دیگر منفی اثرات کو کیسے کنٹرول کیا جا سکے گا جن کا تفصیلاً پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

"بیع قبل القبض" کے مفہوم کا تعین:

رسول اللہ ﷺ نے کسی چیز کو خریدنے کے بعد اپنے قبضہ میں لینے سے قبل ہی اس کی فروخت سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ وہ مختلف اقسام کی بیع (خرید و فروخت) کرتے رہتے ہیں لہٰذا آپ ﷺ اس بارے رہنمائی فرمائیں کہ ان میں سے کون سی بیع جائز ہے اور کون سی ناجائز؟ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"یاابن اخی لا تبیعنّ شیئا حتی تقبضه".[۵۱]

"اے میرے بھتیجے! کسی چیز کو قبضہ میں لینے سے پہلے فروخت نہ کرو۔"

قبضہ میں کرنے سے قبل مبیع کی فروخت "بیع قبل القبض" کہلاتی ہے جو شرعاً حرام ہے۔ قدیم زمانہ میں ذرائع نقل و حمل زیادہ تیز رفتار نہ تھے اور نہ ہی ٹیلیفون، فیکس اور انٹرنیٹ وغیرہ کی سہولیات تھیں لہٰذا اس حدیث کے سادہ مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے بعض فقہاء کے یہاں اشیاء منقولہ

کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی اور غیر منقولہ (جائیداد) سے تخلیہ (خالی کر دینا) کو قبضہ تصور کیا گیا[۵۲] مگر آج عصرِ حاضر میں جدید ذرائع نقل وحمل اور کمیونیکیشن کی بدولت ہزاروں میلوں کے فاصلے پر اشیاء کی خریداری ہو رہی ہے اور وہیں سے آگے اشیاء کی فروخت بھی ہو رہی ہے لہٰذا عصرِ حاضر کے فقہاء کرام کو اس حدیث پر از سرِ نو غور وفکر کر کے اس کا مفہوم عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے متعین کرنا ہوگا۔ کیونکہ اگر حدیث کے قدیم مفہوم کے پیش نظر موجودہ فاصلاتی لین دین کو حرام و ناجائز قرار دیا جائے تو یقیناً ایسا فتویٰ واجتہاد ضررِ عظیم کا باعث ہوگا جبکہ شریعت تو دفعہ مضرت کی حامی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بعض ائمہ وفقہاء کرام نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ قبضہ کا اعتبار عرف کے مطابق ہوگا یعنی عرف میں لوگ جسے قبضہ قرار دیں اسے قبضہ تصور کیا جائے گا[۵۳]۔

کمپیوٹر پروگراموں وغیرہ کے حقوقِ ایجاد اور کتب کے حقوقِ طباعت کی خرید وفروخت کا مسئلہ:

ایک شخص جب ایک نئی چیز کو ایجاد کرتا ہے تو پر اس پر اس کی محنت، سرمایہ اور وقت وغیرہ صرف ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر کے ایک ایک پروگرام کو تیار کرنے پر بسا اوقات ہزاروں ڈالر خرچہ آتا ہے۔ اسی طرح ایک مصنف کتاب تصنیف کرتا ہے تو اس تصنیف پر اس نے شدید محنت، وقت اور سرمایہ خرچ کیا ہوتا ہے لہٰذا بعض حضرات کا خیال ہے کہ ایسے مصنفین اور موجدین کو طباعت و ایجاد کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔[۵۴]

عصرِ حاضر میں دنیا بھر کا عرف یہی بن چکا ہے کہ کسی کتاب کی طباعت واشاعت کا حق جس کے نام محفوظ ہو اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص کتاب کا کوئی صفحہ فوٹو کاپی بھی نہیں کروا سکتا اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کے خلاف عدالتی کارروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کمپیوٹر پروگراموں کی بھی رجسٹریشن ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر کے فقہاء کرام کو اس بارے عالمی عرف کو سامنے رکھتے ہوئے اور روحِ شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجتہادی فیصلہ پیش کر کے امت کی رہنمائی کرنا ہوگی۔ اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے میں لوگوں کے عرف بدلتے رہتے ہیں اور اسی عرف کے بدلنے سے اشیاء کی قیمت وحیثیت میں بھی فرق آتا رہتا ہے۔ کاغذی نوٹ حقیقت میں تو کاغذ ہیں مگر اب

عرف میں ان کی حیثیت زرمبادلہ کی ہے اور وہ سونے چاندی کے سکوں کی جگہ مستعمل ہیں، اسی طرح دورِ حاضر میں حقوقِ مجردہ کو بھی عملاً ''مال متقوم'' (قیمتی مال) کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور مذکورہ بالا فقہی واجتہادی مسئلہ کا تعلق بھی حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت سے ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل کا حل عصری تقاضوں کی روشنی میں انتہائی غور وفکر کے بعد کیا جائے۔

عصر حاضر کے جدید مسائل مناکحات:

نکاح سے متعلقہ چند جدید اجتہادی مسائل حسب ذیل ہیں:۔

ٹیلی فونک نکاح:

نکاح رسولِ کائنات ﷺ کی سنت وروش ہے اور اس سے بلا وجہ وعذر اعراض کرنا پیغمبری طرزِ عمل کو ٹھکرانا ہے جو انسان کے گناہ گار ہونے کا باعث ہے۔رسولِ کائنات ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے:

" ألنكاح من سنتي فمن لم يعمل بسنتي فليس مني ".[۵۵]

''نکاح میری روش اور طرز عمل ہے سو جس نے میری روش کو اختیار نہ کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

عصر حاضر میں پیغام رسانی اور نقل وحمل کے ذرائع آج کے انسان کی زندگی کا لازمی جزو بن چکے ہیں۔ ٹیلی فون، موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعے کئی طرح کے عقود ومعاملات نبٹائے جاتے ہیں۔ ان عقود ومعاملات میں کبھی ہزاروں میل کے فاصلے پر عقدِ نکاح کی ضرورت بھی پیش آرہی ہے۔اس وقت ایسے ٹیلیفون بھی استعمال کیے جارہے ہیں جن کے ساتھ بات کرنے والے کی تصویر بھی دوسری طرف دکھائی دیتی ہے۔عصرِ حاضر کے سلگتے فقہی مسائل میں سے یہ ایک مسئلہ ہے کہ ایسے ''ٹیلی فونک نکاح'' کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

یادرہے سادہ ٹیلی فون (جس میں تصویر ساتھ دکھائی نہ دے) میں اس بات کا بڑی حد تک خطرہ موجود ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کی آواز نقل کر کے خود کو کوئی دوسرے شخص کے طور پر Show کرے جس سے کئی معاشرتی مسائل بھی جنم لے سکتے ہیں۔اگرچہ آج (C L I) وغیرہ کی صورت میں اعتماد کی فضا ہونے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

نکاحِ مسفار:

عصرِ حاضر میں غیر مسلم ممالک کی طرف سفر کا رجحان بہت پیدا ہو چکا ہے۔ تعلیم کی سہولیات اپنے اسلامی ممالک میں ہونے کے باوجود محض غیر مسلم ممالک کی ڈگری کی اہمیت کے پیش نظر اور دنیا کمانے کے نقطۂ نظر سے یہ رجحان امت مسلمہ کی اگلی نسلوں کے لیے تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی لیے بعض عرب علماء نے غیر مسلم ممالک کی طرف بلا عذر شرعی سفر اور رہائش اختیار کرنے کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہے۔[۵۶]

غیر مسلم ممالک کی طرف سفر اور طویل عرصہ تک رہائش رکھنے سے جو مسائل پیش آئے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ ''نکاح مسفار'' کا ہے۔ ''نکاح مسفار'' سے مراد ''سفری نکاح'' ہے۔ چونکہ ان غیر مسلم ممالک میں شرم وحیاء نام کی چیز تقریباً ختم ہے اور فحاشی وعریانی عام ہے لہٰذا ایسے ماحول میں ایک مسلم نوجوان کے زنا کاری وبدکاری میں ملوث ہوجانے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے سوال یہ ہے کہ ایسے ماحول میں عفت و پاکدامنی کے حصول کے لیے کیا عارضی مدت کا نکاح کیا جاسکتا ہے، جس میں نکاح کرنے والے کی نیت ہی یہ ہو کہ جب تک اس ملک میں وہ رہے گا نکاح برقرار رہے گا اور جب اس ملک کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے ملک واپس جائے گا تو اس وقت طلاق دے کر واپس چلا جائے گا۔ اس نکاح مسفار کی ضرورت اگر مسلمان مرد کو پیش آسکتی ہے تو مغربی معاشرے میں حصولِ تعلیم وغیرہ کے لیے گئی ہوئی مسلمان عورت کو بھی یقیناً پیش آسکتی ہے۔

ہماری شریعت میں نکاحِ موقت (جس میں مدت کی تعیین کر دی جائے) کی اجازت ابتدائے اسلام میں تھی مگر بعد میں یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔ اس نکاح موقت کو'' متعہ'' کہا جاتا ہے[۵۷] جو شیعہ مسلک میں اب بھی جائز ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس کی اجازت کے پسِ منظر میں کیا مصالح کارفرما تھیں اور اب اس کی تنسیخ اور حرمت ابدی ہے یا اس اجازت و حرمت کا تعلق مختلف حالات وظروف کے ساتھ ہے۔

جو علماء'' حلالہ'' کو حرام سمجھتے ہیں غالباً وہ تو اس نکاح موقت کی اجازت کے لیے تیار نہ ہوں گے کیونکہ دونوں قسم کے نکاحوں میں قدرِ مشترک وقت کی تعیین موجود ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک قدر مختلف بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ حلالہ اور نکاح مسفار کے مقاصد مختلف ہیں۔ حلالہ میں عارضی نوعیت کا نکاح ہوتا ہے اور پھر طلاق دی جاتی ہے تاکہ وہ عورت سابقہ خاوند کے لیے حلال ہو جائے گویا اس نکاح کا مقصد اس عورت کو پہلے خاوند کے لیے حلال و جائز کرنا ہوتا ہے جبکہ'' نکاح

مسفار'' میں عورت کو کسی کے لیے حلال و جائز کرنے والی بات نہیں ہے بلکہ خود کو زنا کاری و بدکاری اور بے راہ روی سے بچانا مقصود ہے۔ البتہ اس بارے اجتہاد کرتے ہوئے یہ بھی پیش نظر رہے کہ نکاح کرنے والا جب طلاق دے کر گھر واپس آئے گا تو اس کے بعد اس کے بیوی بچوں کے لیے یقیناً کئی طرح کے مسائل بھی پیدا ہوں گے۔

نکاح میسار یا مسیار:

اسلام میں مرد و عورت کی فطری بناوٹ و ساخت اور نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے محنت و مشقت کرنے اور روزی کمانے کی ذمہ داری مرد پر ہے نہ کے عورت پر۔ اسی طرح نان و نفقہ کے ساتھ ساتھ سکنیٰ (رہائش) فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی عورت کے کمزور کندھوں پر نہیں بلکہ مرد کے مضبوط اعصاب پر ڈالی گئی ہے۔ عورت کی ذمہ داریوں کو کسی حد تک گھر کے دائرہ میں محدود کر دیا گیا ہے۔[۵۸]

اسلامی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ ''مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہیں''۔[۵۹] ظاہر ہے کہ اس حدیث کا اطلاق ان تمام شرائط پر ہوگا جو شرعاً جائز ہوں۔ عصرِ حاضر میں بعض ممالک میں ایک نیا اجتہادی مسئلہ یہ پیش آیا ہے کہ اگر ایک عورت مرد کے ساتھ نکاح کے وقت یہ اقرار کر لے کہ وہ اپنے تمام حقوق سے سوائے ازدواجی تعلقات کے، دستبردار ہوتی ہے یا مرد عورت سے اس دستبرداری کی شرط طے کرے اور عورت اسے تسلیم کرے تو ایسے مشروط نکاح کی شرائط کی حیثیت کیا ہو گی؟ کیا اس طرح مرد اس ذمہ داری سے خلاصی و چھٹکارہ پا سکے گا؟ مذکورہ بالا نوعیت کے نکاح کو ''نکاح مسیار'' یا ''نکاح میسار'' کہا جاتا ہے ''میسار'' کلمہ کا مادہ (س ی ر) ہے جس کا لغوی طور پر معنی ہے چلنا۔[۶۰] اردو میں اسی سے ''سیر و سیاحت'' کہتے ہیں۔ چونکہ اس میں مرد اس عورت کے گھر جاتا ہے جو اپنے حقوق (نفقہ و سکنیٰ) سے دستبردار ہو جاتی ہے اس لیے اسے ''نکاح مسیار'' کہتے ہیں نیز چونکہ اس میں مرد کے لیے ایک طرف سے یُسر و سہولت ہے لہٰذا اسے ''نکاح میسار'' بھی کہتے ہیں۔[۶۱]

نکاح ''مسیار'' کے اصطلاحی مفہوم کو حافظ طاہر اسلام یوں واضح کرتے ہیں:

> ''نکاح مسیار میں نکاحِ معروف کے تمام ارکان و شرائط موجود ہوتے ہیں مثلاً ایجاب و قبول، ولی، گواہان، حق مہر اور ہمیشہ بسانے کی نیت وغیرہ۔ اس اعتبار سے یہ نکاح کی معروف صورت سے مشابہت رکھتا ہے تاہم اس کا عرفی (معروف) نکاح سے فرق یہ ہے کہ اس میں عورت اپنے نفقہ و سکنیٰ کے حق

سے دستبردار ہو جاتی ہے۔یعنی نہ تو وہ مرد سے رہائش کا مطالبہ کرتی ہے اور نہ
ہی اخراجات وغیرہ کا۔مزید یہ کہ اگر اس مرد کی پہلے سے ایک یا زیادہ بیویاں
موجود ہوں تو وہ اس کو مساوی حقوق دینے کا پابند بھی نہیں ہوتا بلکہ جب چاہے
اس کے پاس آسکتا ہے''۔[۶۲]

اجتہاد کرتے ہوئے ایک مجتہد کے لیے نہ صرف صورتِ مسئلہ کو انتہائی حد تک سمجھنا ضروری ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ کے پیش آنے کی وجوہات واسباب پر بھی گہری نظر رکھے نیز اپنے اجتہادی فتویٰ کے مآل وانجام اور اس کے معاشرے پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی نگاہِ دوربین سے بھانپنا چاہیے۔ذیل میں ''نکاح مسیار'' تک لے جانے والے اسباب وعوامل کو بھی تحریر کیا جاتا ہے تاکہ صورتِ مسئلہ کے فہم میں کوئی ابہام نہ رہے۔

i۔ موجودہ زمانے میں کتنی ہی نوجوان لڑکیاں ایسی ہیں جن کی شادی بعض معاشرتی و گھریلو اسباب کی بنا پر بروقت نہیں ہوسکی نتیجۃً وہ شادی کی اصل عمر سے تجاوز کر چکی ہیں۔ Over age ہونے کی وجہ سے ایسی عورتیں ''نکاح مسیار'' کی طرف مجبور ہوئی ہیں۔

ii۔ اسی طرح ہمارے یہاں مطلّقہ (Divorced) اور متوفی عنھا (بیوہ) عورتوں سے شادی کرنے کو بھی ایک عیب سمجھا جاتا ہے لہٰذا وہ بھی اس ''نکاح مسیار'' کو مجبوراً ترجیح دیتی ہیں تاکہ زندگی میں ان کا کوئی سہارا بنے اور انہیں خواہشِ نفس کی فطرتی تسکین بھی حاصل ہو نیز وہ پاکدامن رہ کر زندگی گزار سکیں۔

iii۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت مجموعی طور پر لڑکیوں کی تعداد ویسے ہی مردوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے اور ہمارے یہاں مرد ایک سے زائد شادیوں کے اور شادی کے بعد کے اخراجات بھی برداشت نہیں کرسکتے دوسری طرف پہلی بیوی بھی کسی دوسری یا تیسری بیوی کو گھر لانے کو برداشت نہیں کرتی جبکہ مرد بیوی کی کبرسنی یا بچوں کے ساتھ اس کی مصروفیت کی وجہ سے چوری چھپے بھی ''نکاح مسیار'' پر مجبور ہوئے ہیں۔[۶۳]

اس مسئلہ پر غور وفکر کرتے ہوئے اس پہلو کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ مرد اگر غریب ہو اور بیوی امیر ہو تو وہ شرعاً خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے[۶۴] نیز امیر خاوند شادی کے بعد بھی تو کسی وجہ سے غریب ہوسکتا ہے اور عین ممکن ہے وہ عورت یا اس عورت کے والدین اور بھائی اس کے اخراجات کو برداشت کرنے کی حامی بھر لیں۔

اسی طرح اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بیوی کے حقوق میں سے نان ونفقہ، سکنیٰ اور

وظیفہ زوجیت ہیں ۔ نبی کریم ﷺ کی بیوی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے جب محسوس کیا کہ آپ ﷺ انہیں طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے اپنے حق وظیفہ زوجیت سے از خود دستبرداری کا اظہار کیا جسے آپ ﷺ نے منظور فرمایا اور انہیں طلاق نہ دی ۔[۶۵] لہٰذا جب عورت شادی کے بعد اپنے کسی حق سے دستبردار ہو سکتی ہے تو شادی سے پہلے ہی وہ اگر اپنے بعض حقوق سے دستبرداری کا اقرار کرلے تو اس کی گنجائش ہونی چاہیے۔

اس نکاح کے جہاں یہ فوائد ہوں گے کہ کئی کنواری مگر عمر رسیدہ، بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی عصمت محفوظ ہوگی اور مرد بھی اپنے جذبہ جنس کی تسکین حاصل کرسکیں گے اور معاشرہ بھی جنسی بے راہ روی کے برے اثرات سے محفوظ ہوگا وہاں اس کے نقصانات بھی سامنے رہنے چاہیں کہ اس صورت میں عورت خود کو مرد کی قوامیت سے آزاد سمجھنے لگ سکتی ہے نیز اس طرح اولاد پر والد کے خوف اور رعب کے اثرات نہ ہونے سے اولاد کی تربیت بھی متاثر ہوگی۔

بہر صورت مجتہدین امت کو اس مسئلہ کے مصالح و مفاسد، اسباب و عوامل اور عواقب و نتائج پر انتہائی گہرے غور و فکر کے بعد کسی حتمی اور اجتماعی رائے تک پہنچنا ہوگا تاکہ مسلم معاشروں کے معاشرتی مسائل میں کمی آئے وگرنہ مستقبل قریب میں اسلامی معاشروں میں زنا کاری و بدکاری کے انتہائی حد تک بڑھنے کا خدشہ منڈلاتا نظر آرہا ہے۔

تحکیم بین الزوجین:

عرب معاشرے میں قبائلی نظام تھا اور ہر شخص کی مدد و اعانت کے لیے اس کا پورا قبیلہ مشکل وقت میں اس کی پشت پر کھڑا ہوتا تھا۔ یہی باعث ہے کہ رسولِ کائنات ﷺ کا قبیلہ باوجود مسلمان نہ ہونے کے آپ ﷺ کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور ہوا۔ ایسے ہی حالات میں اللہ رب العلمین نے زوجین میں جھگڑا ہو جانے اور باہم از خود صلح کی کوئی صورت نہ بن جانے پر یہ حکم دیا کہ زوجین کے خاندان و قبائل سے ایک ایک (سمجھدار اور دانا) شخص آگے آئیں اور دونوں میں صلح صفائی اور افہام و تفہیم کی کوشش کریں ۔[۶۶] یہ حکم یقیناً قبائلی زندگی میں موثر اور قابل عمل تھا۔ مگر اس سلسلہ میں ملحوظ رہے کہ اگر قبائلی دور میں بھی زوجین کے خاندانوں سے افراد صلح کی غرض سے آگے نہ آئیں تو یقیناً شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت اور حرج نہ ہوگا اگر کسی تیسرے یا چوتھے خاندان کے دو یا زائد افراد آکر صلح کرا دیں۔ اس لیے کہ شریعت کا اصل مقصود زوجین میں صلح کروانا ہے۔ غالباً زوجین کے خاندانوں کو ترجیحاً صلح کروانے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ زوجین سے قرابت کی بنا پر ان کا حق زیادہ بنتا

ہے نیز ان کی کوشش کے موثر ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔

مگر نہایت افسوس سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ عصرِ حاضر میں بعض معاشروں میں تو خاندانی نظام تقریباً ٹوٹ چکا ہے اور بعض معاشروں میں شاید ٹوٹنے کے قریب ہی ہے کیونکہ ان میں بھی خاندانی بندھن کم از کم کمزور ضرور پڑ چکے ہیں لہٰذا ایسے حالات میں اگر صلح کروانے کی ذمہ داری گلی محلے کی مصالحتی کمیٹی، کوئی ویلفیئر تنظیم، کونسلر، ناظم یا پنچائیت وغیرہ سرانجام دے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ لیکن اس سے یہ بات یقیناً کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآنِ مجید اور احادیث کی نصوص کے اطلاق میں بدلتے حالات وظروف کا اعتبار انتہائی لازمی ہے وگرنہ اس کے بغیر نصوص کے تقاضے کما حقہ ادا نہ ہوسکیں گے۔

کتابی مرد کی بیوی کے قبولِ اسلام کے بعد نکاح کی حیثیت:

غیر مسلم ممالک میں رہائش پزیر مسلمانوں اور نومسلموں کو عصرِ حاضر میں گوناگوں مسائل کا سامنا ہے۔ ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ اس نومسلم عورت کا ہے جو شادی شدہ بھی ہو۔ اسلام میں مسلمان مردوں کو اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ شادی کی محض اجازت ہے نہ کہ حکم اور ترغیب۔[۶۷] مسلمان عورتوں کو غیر مسلم مردوں کے ساتھ خواہ وہ اہل کتاب بھی ہوں، شادی کی اجازت نہیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ عورت مرد کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے کمزور واقع ہوئی ہے لہٰذا وہ کسی غیر مسلم کے عقدِ نکاح میں آنے کے بعد اپنے کافر خاوند کی محبت، رعب داب سے یا عقائد سے متاثر ہو کر مرتد نہ ہو جائے کیونکہ عورت میں انفعالی جذبات زیادہ ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مسلمان عورت کو اپنی طرف سے ابتدا کرتے ہوئے کتابی مرد کے ساتھ نکاح کی اجازت نہیں لیکن اگر کوئی عورت کسی کتابی مرد کے نکاح میں ہو اور پھر مسلمان ہو جائے تو کیا اس کتابی مرد کے ساتھ اس کا نکاح برقرار رہے گا یا اس عورت کو اس سے علیحدگی اختیار کرنا ہوگی؟ قرآنِ مجید میں تو اللہ تعالیٰ نے مومنات کے بارے فرمایا ہے:

﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾۔[۶۸]

''نہ یہ ان کو حلال ہیں اور نہ وہ ان کو جائز۔''

اس آیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ ایسی نومسلم عورت کو اس کتابی مرد سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے کیونکہ جس خدشہ کے پیش نظر اسے شروعات کے طور پر نکاح کی ممانعت تھی وہ خدشہ اب بھی

موجود ہے یعنی خاوند کی محبت، رعب داب وغیرہ سے متاثر ہو کر مرتد ہو جانا۔

مغرب میں اس وقت فی الواقع جو صورتِ حال ہے وہ یہ ہے کہ عورتوں میں قبولِ اسلام کا رجحان مردوں کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے لیکن ایسی نومسلم عورتیں اگر اپنے غیر مسلم خاوندوں سے علیحدگی اختیار کرتی ہیں تو فوری طور پر کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہوتا نیز بسا اوقات وہ اپنے چھوٹے بچوں سے بھی محروم ہوں گی جس سے ان کی فطرت میں موجود مامتا کا جذبہ بھی متاثر ہوگا۔ نیز ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ جب ان عورتوں کو قبولِ اسلام کے بعد خاوند سے علیحدگی کا بتایا جائے تو وہ اسلام لانے سے ہی باز رہتی ہیں۔[۶۹] لہٰذا عصرِ حاضر کے ان تقاضوں کے پیشِ نظر دیکھنا یہ ہے کہ آیت ﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾ کا اطلاق اضطراری حالات کے نتیجہ میں کیا ہوگا اور کیا شرعاً اس بارے کسی لچک کی گنجائش موجود ہے یا نہیں؟ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ اگر نومسلم عورت کو کتابی مرد کے ساتھ حسبِ سابق رہنے کی اجازت دی جائے تو کیا ایسی عورت غیر کتابی کافر مرد کے ساتھ بھی رہ سکے گی یا نہیں؟

اس وقت اس طرح کے واقعات میں بھی اب شدت کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے کہ مسلمان لڑکیاں اپنی طرف سے ابتدا کرتے ہوئے غیر مسلم نوجوانوں سے شادیاں کر رہی ہیں۔ لہٰذا اگر نومسلم عورت کو کتابی مرد کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی جاتی ہے تو ایسی مذکورہ بالا لڑکیاں اس اجازت کو ہی سندِ جواز بنالیں گی اور ایسے واقعات مزید بڑھتے چلے جانے کے امکان کو کون روک سکے گا۔

جدید حربی و عسکری مسائل:

عصرِ حاضر میں سائنسی علوم کے نتیجہ میں اسلحہ سازی میں انسان نے اس قدر پیش رفت کر لی ہے کہ اب لمحوں اور سیکنڈوں میں کسی علاقے کی عمارات، سبزہ و شادابی اور انسانوں کی آبادی کو تاخت و تاراج کیا جا سکتا ہے۔ اتنے زہریلے اور مہلک ہتھیاروں کا صرف ایک صدی قبل تک سوچا بھی نہ جا سکتا تھا مگر آج تو یوں لگتا ہے جیسے انسان نے اپنی تباہی و بربادی کا سامان خود ہی کر لیا ہے۔ قیامتِ صغریٰ کا عالم عراق اور افغانستان میں دنیا نے صرف ابھی نہیں دیکھا بلکہ اس سے بھی قبل ہیروشیما اور ناگاساکی میں دیکھ چکی ہے۔ حربی سائنس میں اس ترقی سے معاصر فقہ اسلامی میں کئی ایک سوالات نے سر اٹھایا ہے جو حل طلب ہیں۔

ایٹمی اسلحہ بنانا اور اس کا استعمال:

مسلمان جب تک سائنسی علوم کی خدمت میں مگن رہے اس وقت تک یہ علوم انسانیت کے لیے نافع بنے رہے مگر جب یہ علوم یورپ کے سیکولر اور بے دین لوگوں کے قبضے میں چلے گئے تو یہی علوم انسانیت کی تباہی و بربادی کا باعث بنتے چلے گئے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مسلمان ان علوم کو اپنے رب کے نام سے پڑھتے تھے جیسا کہ انہیں خود ان کے رب نے حکم دیا تھا کہ

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴾[۷۰]

''(اے محمد ﷺ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو۔ جس نے (عالم کو) پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔''

مگر جب ان علوم کو منبع علوم خالقِ حقیقی کے نام کے بغیر پڑھا گیا تو ان میں سے رحمت و برکت نام کی چیز اٹھ گئی اور پھر وہی علوم انسانیت کے لیے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بن گئے۔

عصرِ حاضر کے جدید اسلحہ میں ایٹمی اور کیمیائی اسلحہ بھی کئی ایک ترقی یافتہ ممالک نے تیار کر لیا ہے بلکہ امریکہ نے تو اس کا استعمال کر کے پوری دنیا پر خوف اور ہیبت کی فضا بھی قائم کی ہے۔ اب یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ایسے نیوکلیائی اور کیمیائی اسلحہ و ہتھیاروں کے استعمال کے کس قدر شدید قسم کے زہریلے اور دیرپا نقصانات ہیں۔ اس اسلحہ کے استعمال کے نتیجہ میں بے گناہ بچے بوڑھے، عورتیں، املاک، حیوانات اور نباتات تک تمام اس کے اثرات کا شکار ہوتے ہیں بلکہ اگلی نسلوں تک اس کے اثرات کا مشاہدہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں کیا جا رہا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں دورانِ جنگ بھی املاک کو جلانا، بچے، بوڑھے اور عورتیں جو جنگ میں شرکت نہیں کر رہے انہیں تہ تیغ کرنا ممنوع ہے لہٰذا سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا نقصانات کا حامل اسلحہ عصرِ حاضر کے مسلمانوں کو تیار کرنا چاہیے یا نہیں؟

اس اجتہادی مسئلہ پر غور و فکر کرتے ہوئے درج ذیل امور کو ملحوظِ خاطر رکھنا بھی نہایت ضروری ہوگا۔

i۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ﴿خُذُوْا حِذْرَکُمْ﴾ [۷۱] ''(جہاد کے لیے) ہتھیار لے لیا کرو'' کے الفاظ میں مسلمانوں کو تحفظ اور بچاؤ کا سامان کرنے کا حکم دیا ہے اور مختلف ادوار میں تحفظ و بچاؤ کے آلات و اسلحہ مختلف ہو سکتے ہیں۔

ii۔ نیز اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ

تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمۡ ﴾ [۷۲] (اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت سے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمھارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے، ہیبت بیٹھی رہے گی۔) میں ''ما'' اور ''قوۃ'' کے الفاظ میں عموم ہے جو قیامت تک کے ہر اس اسلحہ کو شامل ہے جو دشمن پر خوف اور رعب داب طاری رکھنے کا ذریعہ بن سکے۔[۷۳]

iii۔ رسولِ کائنات ﷺ کا فرمانِ گرامی مذکورہ بالا آیت میں موجود لفظ ''قوۃ'' کی تشریح میں ہے:

" الا ان القوۃ الرمی ،الا ان القوۃالرمی ،الا ان القوۃالرمی".[۷۴]

''آگاہ رہو اور یقین کر لو کہ قوت و طاقت (تیر) پھینکنے میں ہے، آگاہ رہو طاقت کا راز (تیر) پھینکنے میں ہے، خبردار جان لو قوت کا حصول پھینکنے میں مضمر ہے۔''

اس حدیث کی بلاغت کو واضح کرتے ہوئے حافظ سعد اللہ لکھتے ہیں:

''اس حدیث میں بلاغتِ نبوی ملاحظہ ہو کہ قوت کی تفسیر میں تیر اور کمان یا اس دور کے کسی مروجہ ہتھیار کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ ''الرمی'' کا عام لفظ استعمال فرمایا تا کہ دور سے نشانہ پر پھینکے جانے والے تمام ہتھیار جو اس وقت موجود تھے یا قیامت تک ایجاد ہونے والے تھے مثلاً میزائل، راکٹ، بم وغیرہ جن کو آپ ﷺ اپنے نورِ نبوت سے دیکھ رہے تھے، سب کو شامل کیا''۔[۷۵]

iv۔ خود رسولِ کائنات ﷺ نے طائف کا محاصرہ فرمایا[۷۶] تو منجنیق نصب کروائی[۷۷] اور ظاہر ہے اس منجنیق کے ذریعے جو پتھر پھینکے گئے وہ ہو سکتا ہے محاربین یا غیر محاربین دونوں پر گرے ہوں۔

v۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بنو نضیر کے کھجور کے کچھ درختوں کو آگ لگوا دی اور کچھ کو کٹوا دیا اور کچھ چھوڑ دیے[۷۸] جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا قَطَعۡتُمۡ مِّنۡ لِّيۡنَةٍ اَوۡ تَرَكۡتُمُوۡهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوۡلِهَا فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ وَلِيُخۡزِىَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴾۔[۷۹]

''مومنو! کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، سو خدا کے حکم سے تھا اور مقصود یہ تھا کہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔''

مذکورہ بالا تمام نکات کے نتیجہ میں کہا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں چونکہ دشمنانِ اسلام ایٹمی اور کیمیائی اسلحہ تیار کر رہے ہیں اور کبھی استعمال بھی کیا ہے لہٰذا لامحالہ مسلمانوں کو بھی اس سلسلہ میں غافل نہ ہونا چاہیے بلکہ ان کا مقابلہ کرتے ہوئے ایسے اسلحہ کو ضرور تیار کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''ترھبون به عدو الله و عدوکم'' کا یہی تقاضا ہے۔

رہی بات اس اسلحہ کے مقابلۃً اور بوقتِ ضرورت استعمال کی تو ظاہر ہے جس اسلحہ کا مجبوراً بنانا جائز ہے تو اس کا مجبوراً استعمال بھی جائز ہونا چاہیے [۸۰] یا کم از کم کفار کو اس کے چلا دینے کی دھمکی تو دی جائے تاکہ ''ارھاب'' کے تقاضے کسی حد تک پورے ہوں لیکن اگر دنیا بھر کے کفار ایسے ایٹمی و کیمیائی اسلحہ کو ضائع کر دیں اور آئندہ ایسا اسلحہ تیار نہ کرنے کا عالمی معاہدہ ہو جائے تو یقیناً اسلام اس حد تک خطرناک ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی کو ہی ترجیح دے گا۔ غالباً اسی خیال سے ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

> '' اس بارہ میں دو رائے نہیں ہونی چاہیے کہ عام تباہی مچانے والے ہتھیار جو محارب اور غیر محارب میں تمیز نہیں کر سکتے ہوں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن کے تباہ کن اثرات موجودہ نسل کے بعد بھی کئی نسلوں تک اور جس علاقہ میں ان کو استعمال کیا جائے اس سے دور دور تک کے علاقوں تک پھیل جاتے ہیں، ایسے ہتھیاروں کا استعمال فساد فی الارض میں داخل ہے (اور) فساد فی الارض کو دور کرنا مقاصد شریعت میں سے ہے''۔[۸۱]

غیر مسلموں سے عسکری معاہدے اور انہیں اسلحہ و ایٹمی مواد وغیرہ فروخت کرنا:

جن کفار کے ساتھ مسلمان برسرِ پیکار ہوں یا جو ان محاربین کی پشت پناہی اور مدد کرنے والے ہوں انہیں اسلحہ اور جنگی ساز و سامان فروخت کرنا بالاتفاق حرام ہے۔[۸۲]

مگر غیر محارب کفار کے ساتھ عسکری معاہدے کرنا، جنگی مشقیں کرنا اور انہیں بالخصوص ایٹمی مواد فروخت کرنا عصر حاضر کے فقہاء کے لیے انتہائی قابلِ غور مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں فقہاء امت کو درج ذیل امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنا ہے۔

i۔ کفار کے ساتھ اصلاً کسی بھی چیز کی خرید و فروخت کا معاملہ شرعاً جائز ہے جب تک کسی چیز

کی بیع کی حرمت کی دلیل موجود نہ ہو۔

ii۔ اگر اس بات کا علم یقین کی حد تک ہو کہ وہ کفار اس اسلحہ کو مسلمانوں کے خلاف نہ استعمال کریں گے بلکہ کفار کے ہی مقابلہ میں استعمال کریں گے جس سے کفار کا ہی زور ٹوٹے گا تو یقیناً اس کے عدم جواز کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

iii۔ جب اس بات کا علم ہو کہ اس اسلحہ کے حصول کے بعد وہ مسلمانوں کے خلاف ہی اس کا استعمال کریں گے اور مسلمانوں کو ہی مرعوب کرنے کی کوشش کریں گے تو پھر یقیناً ''لا ضـــرر ولا ضــــرار '' [۸۳] (کسی کو ضرر نہ پہنچاؤ اور نہ ہی انتقاماً (حد سے زیادہ) ضرر پہنچاؤ۔) اور ﴿وَ لَا تَعَـاوَنُوا عَـلَـى الْإِثْمِ وَ الْعُدْوَان﴾[۸۴] (اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔) کا اصول سامنے رکھتے ہوئے اس کی فروخت سے اجتناب ہی کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہم مسلمانوں کو ان کی طاقت وشوکت توڑنے اور ختم کرنے کا حکم ہے[۸۵] نہ کہ مسلمانوں کے ہی خلاف ان کی پیٹھ ٹھونکنے کا۔

iv۔ عصرِ حاضر میں جنگی دفاع کے جنون کے تحت بعض ممالک خود کو جنگی طور پر تیار کرتے ہیں اگرچہ بظاہر ان کی نہ مسلمانوں کے ساتھ اور نہ ہی غیر مسلموں کے ساتھ جنگ ہے تو ایسے ممالک کو غیر ایٹمی اسلحہ فروخت کرنے میں بھی شرعاً کوئی حرج نظر نہیں آتا۔

v۔ اگر مسلمانوں کو کسی اسلحہ کے فروخت پر مجبور کر دیا جائے مثلاً ان کے قیدیوں کی آزادی کے لیے اسے شرط قرار دے دیا جائے یا معاشی بائیکاٹ کر کے ناطقہ بند کر دیا جائے تو پھر یہاں مفسدہ برداشت کرنے پر مفاد و مصلحت کو ترجیح دی جائے گی۔[۸۶] یاد رہے اس وقت دنیا گلوبل ویلج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور کوئی ملک اکیلا و تنہا زندہ نہیں رہ سکتا لہٰذا اس پہلو کو بھی نظر انداز نہ کیا جانا چاہیے۔

vi۔ مسلم اور کافر فوج کا باہم مل کر جنگی مشقیں کرنا دراصل جنگی و حربی استفادہ ہے جس کا تعلق تعلیم و تعلّم سے ہے۔ یہاں بھی دراصل مذکورہ بالا نکات کو سامنے رکھنا ہوگا کہ اگر مسلم فوج کافر فوج کو جنگی تدابیر اور حکمت عملی سکھاتی ہے تو کہیں اس کا استعمال بعد میں مسلمانوں کے خلاف تو نہ ہوگا۔

vii۔ ایٹمی اسلحہ بنانے اور اس کے استعمال کرنے کی فقہاء و علماء کرام نے مشروط اجازت دی ہے کہ اگر دشمن اسے اس بات پر مجبور کر دے تو پھر گنجائش ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر مہلک ایٹمی مواد یا اسلحہ کفار کو فروخت کرنا محل نظر ہے کیونکہ نا معلوم وہ اس اسلحہ کا

بے محل استعمال کریں یا مستقبل میں مسلمانوں کے خلاف ہی استعمال کر لیں لہٰذا غیر مسلموں کو ایٹمی اسلحہ یا ایسے مواد کی فروخت کی کوئی وجہ جواز نظر نہیں آتی۔

مسلمان تو یقیناً کفار سے یہ تمام فوائد (خواہ خرید) کر حاصل کر سکتا ہے کیونکہ "الکلمة الحکمة ضالة المومن حیثما وجدها فهو احق بها" [۸۷] (حکمت و دانائی کی بات مومن کی گمشدہ دولت ہے وہ اسے جہاں سے بھی ملے وہی اس کا زیادہ حق رکھتا ہے۔) کے اصول کا تقاضا یہی ہے تاہم سوال یہ ہے کہ کیا یہ فوائد مسلمان غیر مسلم ممالک کو فروخت کر سکتے ہیں یا بطور تحفہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

غیر مسلم ممالک میں خودکش و فدائی حملے اور بم دھماکے۔

میدانِ جنگ میں یقیناً ہر مسلمان مجاہد جان ہتھیلی پر رکھ کر کفار سے برسرِ پیکار ہوتا ہے اور یہ ایک طرح کی فدائی کوشش ہے لیکن اس وقت سوال یہ ہے کہ کفار کے ممالک میں گھس کر اس طرح کی استشہادی انداز کی کاروائیاں کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے، جبکہ ایسی کاروائیوں کے نتیجہ میں جہاں املاک کو نقصان پہنچتا ہے وہاں بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی اس کا شکار ہوتی ہیں۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ عصرِ حاضر میں مسلمان کفار کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں کہیں تو جسمانی تشدد ہے اور کہیں قرض وغیرہ کے شکنجوں میں جکڑ کر ذہنی و نفسیاتی مسائل میں افرادِ امتِ محمدیہ کو مبتلا کر دیا گیا ہے۔ مظلوم ظلم کو آخر کس حد تک برداشت کرے گا۔ آخر تنگ آ کر مظلوم، ظالم کے ظلم سے نجات کے لیے فدایانہ کاروائیاں نہ کرے تو اور کیا کرے۔ لہٰذا فقہاء امت کو اس بارے امت مسلمہ کی قرآن و سنت کی روشنی میں رہنمائی کرنا ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت یا ملک براہِ راست کفار سے حالتِ جنگ میں ہے تو کیا ان کی فوجی چوکیوں اور اسلحہ کے ڈپوؤں میں وہ مظلوم مسلمان فدایانہ کارروائی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ نیز عوامی مقامات پر جہاں بے گناہ بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی ایسی کاروائیوں کا شکار ہو جاتے ہیں، اگر مجبوری کی صورت میں اس کے جواز کا فتویٰ فلسطینی یا کشمیری مجاہدین کو دیا جائے تو اس ضرورت و مجبوری کی حدود و قیود کا تعین بھی ضروری ہے۔

اس بارے غور و فکر کرتے ہوئے مجتہدین کو نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مکی دور کی زندگی کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں کے پاس جنگی و دفاعی ساز و سامان اور دیگر اسباب و وسائل نہ تھے تو وہ یک طرفہ طور پر ظلم سہتے ہی رہے اور کوئی ایسی کارروائی

انہوں نہ کی لیکن مدینہ میں براہ راست جنگیں لڑیں۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور ابھی تک کئی مسلمان مکہ میں کفار کے رحم و کرم پر تھے۔ کفارِ مکہ ان مظلوم مسلمانوں پر ظلم و ستم کرتے تھے مگر آپ ﷺ نے کیا کبھی مدینہ سے اس طرح کی کارروائی کے لیے مکہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھیجا؟

نیز اس بات پر بھی غور و فکر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابھی تک غیر محارب ممالک میں کی گئی ایسی کارروائیوں کے مجموعی طور پر اثرات و نتائج کیا ہیں؟ کیا اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی فائدہ بھی حاصل ہوا ہے یا دہشت گردی اور تشدد پسندی کا لیبل ہی مسلمان اپنے اوپر لگوا سکے ہیں اور دوسری طرف ''دہشت گرد اسلام'' کی آوازیں دنیا بھر میں سنائی دے رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک کی صورتحال تو یہی ہے کہ ایسی کارروائیوں سے کفار کے ظلم و ستم میں مزید شدت اور مسلمانوں سے نفرت میں ہی اضافہ ہوا ہے۔ اگر مسلمانوں کی ایسی کارروائیوں سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اسلام قبول کرنے سے گریزاں ہوں تو اس ذمہ داری کا بوجھ قیامت کے دن کون اپنے سر لے گا؟

عصر حاضر میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا مسئلہ:

جس دور میں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اس وقت جنگی قیدیوں کو نہ صرف غلام بنالیا جاتا تھا بلکہ ان کے ساتھ نہایت ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ رسولِ کائنات ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کفار مکہ وغیرہ سے جنگی معرکے ہوئے جن میں کئی کافر قیدی ان کے ہاتھ لگے، بالخصوص حنین کے موقع پر تو ایک بہت بڑی تعداد بچوں اور عورتوں کی بھی قیدی بنی۔ رسولِ کائنات ﷺ نے یقیناً اللہ کے حکم سے ہی اس ''غلامی'' کا مکمل خاتمہ نہیں کیا اور شاید اس سلسلہ میں اس دور کے حالات و ظروف کا خیال رکھا گیا ہے مگر آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں درج ذیل چند انقلابی اقدامات کیے۔

i۔ فدیہ ادا کر کے جنگی قیدیوں کو آزاد ہونے کی Option پیش کی۔[۸۸]

ii۔ اگر غلام یا لونڈیاں بنائے بھی تو ان کے ساتھ انتہائی اچھا سلوک کرنے کی امت کو تلقین کی حتیٰ کہ آپ ﷺ نے زندگی کے آخری لمحات میں امت کو جو وصیتیں کیں ان میں سے ایک وصیت ''الصلوۃ وما ملکت ایمانکم'' (نماز اور اپنے غلاموں و لونڈیوں کا خیال رکھنا۔) تھی۔[۸۹]

iii۔ قرآن و حدیث میں کئی جرائم اور غلطیوں کے ارتکاب پر تاریخ انسانی میں پہلی دفعہ سزا کے طور پر غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔[۹۰]

iv۔ اس کے علاوہ بھی آپ ﷺ نے ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ غلام کو آزاد کرنے کے نتیجہ میں آزاد کرنے والے کا ایک ایک عضو جہنم کی آگ سے محفوظ ہو جائے گا۔[۹۱]

v۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روحِ شریعت کی روشنی میں ایک دفعہ اپنے ایک گورنر سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

"متی تعبد تم الناس و قد ولد تھم امھاتھم احرارا". [۹۲]

"تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد جنم دیا تھا۔"

ان مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں مجموعی طور پر غلامی کو پسند نہیں کیا گیا بلکہ اسلام میں ایسے انقلابی اقدامات اٹھائے گئے کہ جس کے نتیجہ میں بتدریج غلامی کی شرح میں کمی آتی گئی۔ اسلامی تعلیمات کے ان اثرات نے دنیا بھر کی اقوام کو متاثر کیا اور پھر وہ وقت آیا کہ اقوام عالم نے ایک مشترکہ لائحہ عمل "حقوق انسانی کے عالمی چارٹر" کے نام سے تشکیل دیا جس کی دفعہ نمبر ۴ میں ہے "کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو ممنوع قرار دی جائے گی"۔[۹۳]

دنیا بھر کے اسلامی و غیر اسلامی ممالک اس چارٹر کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر مہر دستخط ثبت کر چکے ہیں لہٰذا فقہاء امت اور معاصر مجتہدین سے یہ سوال، جواب کا متقاضی ہے کہ عصر حاضر میں جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے یا نہ بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟۔ اس سلسلہ میں درج ذیل امور کو ملحوظ رکھا جانا نہایت مناسب ہوگا۔

i۔ اسلام کا مزاج انسانوں کو انسانوں کا غلام بنانا نہیں بلکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ رب العلمین کا غلام بنانا ہے۔

ii۔ جنگی اصول وضوابط پر مبنی کوئی بین الاقوامی معاہدہ ہو جائے تو یقیناً اسلام کا مسلمانوں سے مطالبہ اس معاہدہ کی پاسداری کرنا ہوگا بشرطیکہ وہ معاہدہ نصوص اور روح شریعت کے منافی و متصادم نہ ہو۔[۹۴]

iii۔ جب تک کفار معاہدہ کی پاسداری کریں گے اس وقت تک مسلمان بھی اس معاہدہ کی پاسداری کریں گے اور جب وہ عہد شکنی کریں تو یقیناً اس کا مطلب معاہدہ کے خاتمہ کا اعلان ہوگا لہٰذا ایسی صورت میں مسلمان بھی وہی کچھ کریں گے جو وہ کریں گے۔[۹۵]

iv۔ ایک اصولی بات یاد رہے کہ اگر شریعت میں غلاموں سے متعلقہ باقاعدہ تعلیمات و ہدایات

موجود ہیں تو اس کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص حکمت کے تحت اسے منسوخ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی فقیہہ امت اس کو منسوخ کر سکتا ہے بلکہ یقیناً اس حکم کا تعلق قیامت کے برپا ہونے تک ہے۔ لہٰذا بوقتِ ضرورت اس کا استعمال بھی ہو سکتا ہے۔

۷۔ صلح حدیبیہ سے قبل نبی ﷺ کے جاسوس نے آپ ﷺ کو آ کر خبر دی کہ اہل مکہ اور ان کے وہ حلیف جو مکہ کے ارد گرد رہتے ہیں، نے پختہ عزم کر لیا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بیت اللہ کی زیارت سے روکیں گے۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر اہل مکہ کے حلیفوں کے گھروں پر حملہ آور ہونے اور گھروں میں موجود بچوں عورتوں کو قیدی بنا لینے کے ارادہ کا اظہار فرمایا تا کہ ان کے مرد اہل مکہ کو چھوڑ کر گھروں میں واپس اپنے بچوں اور عورتوں کو چھڑانے کے لیے آ جائیں۔[۹۶]

اس واقعہ کی روشنی میں بعض معاصر علماء کا خیال ہے کہ اسلام کے غلامی کے تصور کو کفار کی ترہیب کے لیے بھی بوقتِ ضرورت استعمال کیا جانا چاہیے۔[۹۷]

عصر حاضر کے جدید طبی مسائل، تولید کے جدید مصنوعی طریقے:

عصر حاضر میں جدید میڈیکل سائنس نہایت ترقی یافتہ ہو چکی ہے۔ مختلف قسم کے امراض کے حل کے لیے مصنوعی اور غیر فطری قسم کے مگر مفید آلات و ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح جدید میڈیکل سائنس جہاں انسانیت کی خدمت کر رہی ہے وہاں اس کی بدولت کئی طرح کے دینی و اخلاقی اور معاشرتی مسائل نے بھی جنم لیا ہے۔ اسلام سائنسی ترقی اور جدید ایجادات کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کرتا البتہ ان ترقیات کے صحیح استعمال پر ضرور زور دیتا ہے۔

اولاد دینے والی ذات ایک اللہ رب العلمین کی ہے وہ جسے چاہے نواز دے اور جسے چاہے محروم رکھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے اس وصف کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ﴾[۹۸]

”(تمام) بادشاہت خدا ہی کی ہے آسمانوں کی بھی اور زمین کی بھی وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے بخشتا ہے یا ان کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں عنایت فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے

اولاد رکھتا ہے وہ تو جاننے والا (اور) قدرت والا ہے۔"

مردوزن میں بانجھ پن کے مختلف قسم کے اسباب ہوتے ہیں بعض اسباب کو دور کرنا آج جدید میڈیکل سائنس میں ممکن ہو گیا ہے اور ایسے شادی شدہ جوڑوں کے لیے بعض مصنوعی طریقوں سے اولاد کی نعمت سے مالا مال ہونا کافی حد تک ممکن ہو گیا ہے۔ فی الوقت مصنوعی طرق ہائے تولید میں سے دو کا ذکر مقصود ہے۔

ایک طریقہ "مصنوعی تخم ریزی یا پچکاری مار طریقہ" ہے جس میں مرد کا نطفہ کسی طرح سے حاصل کیا جاتا ہے اور انجکشن کی مدد سے عورت کے پیٹ کے نچلے حصہ (Pelvic Cavity) میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں سے وہ قاذفین (عورت کے مادہ کے گزرنے کی نالی) میں پہنچ کر فطری انداز میں عمل تولید کا آغاز کر دیتا ہے۔ یاد رہے اس طریقہ کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کسی مرد کا مادہ منویہ فطری طریقہ پر رحم میں نہ پہنچ پاتا ہو۔[۹۹]

دوسرا طریقہ "ٹیسٹ ٹیوب بے بی یا نلکی بار آوری" کا ہے جسے طبی اصطلاح میں Invitro Fertilization یا Test Tube کہا جاتا ہے کیونکہ اس طریقہ میں شیشے کی ایک ٹیوب (نلکی) میں مردوزن کے نطفوں کا اختلاط کرایا جاتا ہے۔ اس اختلاط کے نتیجہ میں بیضہ انثیٰ بار آور ہو جائے تو اسے کچھ عرصہ کے بعد عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور پھر فطری طریق پر عمل تولید کے مراحل سے وہ گزرتا رہتا ہے۔ اس طریقہ کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب مردوزن کے نطفوں کا اختلاط و امتزاج فطری طور پر نہیں ہو پاتا جبکہ مصنوعی طور پر اس اختلاط کے ہو جانے کے امکانات کافی حد تک ہو گئے ہیں۔[۱۰۰]

مذکورہ بالا مصنوعی طرق تولید سے بانجھ پن کے شکار بعض مردوزن نعمتِ اولاد سے مالا مال ہو گئے ہیں۔ ان طریقوں کی شرعی حیثیت بارے غور و فکر کرتے ہوئے درج ذیل امور کو بھی ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے۔

i۔ ایک مسلمان کو راضی بہ رضا الٰہی و تقدیر ہونے کا حکم ہے۔ کیا یہ "ایمان بالقدر" کے منافی تو نہیں مگر دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کی دوا و علاج بھی روئے زمین پر اتار دی ہے[۱۰۱] اور بانجھ پن بھی بہر صورت ایک بیماری ہے۔

ii۔ مذکورہ بالا دونوں طریقے اپنی ابتدائی حالت میں تو مصنوعی ہیں مگر انجامِ کار فطری طریقہ کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اس طرح کے مصنوعی طریقے طب کی دنیا میں دیگر امراض میں

اس سے قبل بھی استعمال کیے جا رہے ہیں۔

iii۔ عورت کے نطفہ کے حصول اور پھر واپسی کے تمام مراحل لیڈی ڈاکٹر کے ذریعے ہونے میں تو یقیناً کوئی قباحت نہیں مگر بوقتِ ضرورت و مجبوری مرد ڈاکٹر کو بھی اجازت ہوگی یا نہیں؟

iv۔ ان طریقوں میں ہسپتال میں محفوظ کیے گئے مختلف مرد وزن کے نطفوں کے اختلاط ہو جانے میں غلطی کے امکان کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

v۔ زمانہ جاہلیت اور موجودہ یورپ کی طرح عورتوں کو طلبِ اولاد کے لیے غیر مردوں سے بھی یہ خدمات حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ کیسے ڈالی جائے گی؟ اور اگر مسلمان مرد عورتیں قصداً اور ارادۃً ایسا کریں تو کیا ان پر زنا کاری کا حکم لگے گا اور وہ حد زنا کے مستحق ہوں گے بشرطیکہ ثبوتِ زنا کی شرائط پوری ہوں۔

vi۔ اس بات کا خدشہ وخطرہ بھی ہمیشہ رہے گا کہ بعض عورتیں خود حمل کے بوجھ اور ولادت کی تکلیف سے بچنے کے لیے کسی دوسری عورت کے رحم کو اجرت و کرایہ پر لیں جس سے مزید کئی فقہی و معاشرتی مسائل جنم لیں گے مثلاً اختلاطِ نسب اور مسائلِ وراثت وغیرہ۔

مسئلہ انتقالِ خون:

خون کو اللہ تعالیٰ نے قوامِ حیات کی حیثیت کے ساتھ ہر انسان کے جسم میں رکھا ہے اور جدید طبی ریسرچ کے مطابق ہر صحت مند شخص میں تقریباً آدھا لیٹر اللہ نے کمال حکمت سے اضافی طور پر (Reserve) کیا ہوا ہے[۱۰۲] تاکہ حادثہ وغیرہ کی صورت میں فوری طور پر خون کی کمی کا قدرے مداوا ہو سکے۔ قدیم زمانہ میں یہ ممکن نہ تھا کہ ایک شخص کا خون کسی دوسرے انسان میں منتقل کر دیا جائے مگر آج انتقالِ خون کے ذریعے خون کی کمی کے شکار مریضوں کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ انتقالِ خون کا مسئلہ عصرِ حاضر کا نیا فقہی مسئلہ ہے جس کی نظیر و مثال قرآن و سنت اور قدیم فقہی ذخیرہ سے نہیں ملتی لہٰذا عصری علماء و فقہاء کو روحِ شریعت کی روشنی میں اس بارے اجتہادی رائے دے کر امت کی رہنمائی کرنا ہوگی۔ تاہم اس بارے درج ذیل امور بھی ملحوظِ خاطر رہیں۔

i۔ خون بذاتِ خود حرام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ﴾[۱۰۳]

''اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو حرام کر دیا ہے۔''

اور حرام چیز کی شرعاً خرید و فروخت بھی نہیں ہو سکتی[۱۰۴] لہٰذا اس کی روشنی میں خون دینے کی اجرت لینے کی حیثیت بھی واضح ہونی چاہیے۔

ii۔ مذکورہ بالا آیت میں اور اس مضمون کی دیگر آیات میں حرمتِ خون کے ساتھ ساتھ بصورت مجبوری اس کے استعمال کی چند حدود و قیود کے ساتھ اللہ حکیم و خبیر نے اجازت بایں الفاظ دی ہے:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[۱۰۵]

''ہاں جو ناچار ہوئے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک خدا بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔''

iii۔ اس مفہوم کی آیات سے ہی فقہاء نے ''الضرورات تبیح المحظورات''[۱۰۶] (ضرورت و مجبوری حرام و ممنوع کے جائز ہونے کا باعث بن جاتی ہے۔) فقہی قاعدہ تشکیل دیا ہے، اسے بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

iv۔ انسانی جسم کے بعض اعضاء و اجزاء ایسے ہیں جن کو ایک دفعہ جسم سے الگ کر دیا جائے تو ان کی جگہ دوبارہ وہ اعضاء پیدا نہیں ہوتے مثلاً آنکھیں، گردے وغیرہ مگر کچھ اعضاء و اجزاء بدن ایسے ہیں جو دوبارہ پیدا ہو جاتے ہیں انہی میں سے ایک خون بھی ہے گویا ایسا نہیں ہے کہ ایک طرف ایک انسان کی جان بچائی جا رہی ہو اور دوسری طرف خون دینے والا انسان خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہو۔

v۔ خون دینے سے اصل مقصود کسی کی جان کو بچانا ہے اور جان بچانا اللہ تعالیٰ کو کس قدر محبوب ہے اس کے لیے اس فرمانِ الٰہی پر غور کیا جا سکتا ہے:

﴿مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾[۱۰۷]

''اور جو اس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا موجب ہوا۔''

vi۔ انتقالِ خون کے مسئلہ میں غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے حوالے سے بھی غور و فکر کرنا ہوگا کہ غیر مسلم کا خون یا فاجر و فاسق شخص کا خون مسلمان لگوا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں ملحوظ رہے کہ عین ممکن ہے کہ اس کافر یا فاجر و فاسق مسلمان کا رزق حلال کا نہ ہو یا اس کا جسم شراب اور دیگر محرمات کے ساتھ پلا ہو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے خون کے روحانی طور پر برے اثرات بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ نیز قرآن و حدیث میں تو رزقِ حرام سے پلے ہوئے جسم سے ادا کی گئی عبادت بھی قبول نہ ہونے کی وعید ہے۔[۱۰۸]

انسانی اعضاء کی پیوند کاری:

عصرِ حاضر میں جدید میڈیکل سائنس اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ انسان کے ضائع و بیکار ہو جانے والے اعضاء کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اور اس تبدیلی اعضاء کے تین ذرائع ہیں۔

i۔ مصنوعی اعضاء سے پیوند کاری

ii۔ حیوانی اعضاء سے پیوند کاری

iii۔ انسانی اعضاء سے پیوند کاری[۱۰۹]

مجتہدین کو اس بارے غور و فکر کرتے ہوئے درج ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:۔

i۔ مصنوعی اعضاء کے استعمال کی مثال عہد صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین میں بھی ملتی ہے۔[۱۱۰]

ii۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾[۱۱۱] (وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمھارے لیے پیدا کیں۔) کے اصول کے تحت حیوانات کے اعضاء سے پیوند کاری میں بھی یقیناً کوئی حرج نہیں البتہ اس سلسلہ میں ماکول اللحم اور غیر ماکول اللحم (حلال و حرام جانور) پاک و نجس کے درمیان فرق کی شرط کا اعتبار قابل غور ہے۔

iii۔ حرام و نجس جانوروں کے حوالے سے بھی ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾[۱۱۲] (ہاں جو ناچار ہوئے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اس پر کچھ گناہ نہیں۔) اصول پیش نظر رہنا چاہیے کیونکہ یہاں مستثنیٰ منہ میں خنزیر بھی شامل ہے۔

iv۔ پیوند کاری کی تیسری قسم جس میں انسانی عضو کو لے کر کسی انسان میں ہی منتقل کیا جاتا ہے انتہائی قابلِ غور و فکر ہے۔ کیونکہ کسی انسان کے عضو کو حاصل کرنے کے لیے چیر پھاڑ کی نوبت ضرور آئے گی جبکہ آیت ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾[۱۱۳] (اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔) وغیرہ کا تقاضا ہے کہ یہ چیر پھاڑ نہ ہو خواہ زندہ انسان ہو یا مردہ۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احترام انسانیت کے تحت ہی جنگ میں بھی کفار کا مثلہ کرنے سے روکا ہے۔[۱۱۴]

v۔ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ بوقتِ ضرورت اس سے قبل علماء و فقہاء مرد یا عورت کے مختلف قسم کے آپریشن کی اجازت دے چکے ہیں مثلاً عورت کے پیٹ میں مردہ بچہ یا مردہ عورت کے پیٹ سے زندہ بچہ کو نکالنا بغیر آپریشن ممکن نہیں اور یہاں مقصد حفظِ جان ہے۔

vi- فقہاء کرام کو اس حوالہ سے بھی سوچنا ہے کہ اعضاء انسانی کیا انسان کی ملکیت ہیں کہ وہ ان میں جیسے چاہے تصرف کرے یا اس کے پاس محض امانتِ الٰہی ہیں جن کے صحیح و غیر صحیح استعمال بارے اس سے سوال بھی ہونا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾-[۱۱۵]

''کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہوگی۔''

vii- بصورتِ جواز زندہ شخص کی بقائمی ہوش وحواس اجازت اور مردہ کی قبل از وفات تحریری وصیت سے ہی معاشرہ لڑائی جھگڑوں سے محفوظ رہ سکے گا۔

viii- قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے مردار کے کھانے کو حرام قرار دیا ہے اور ساتھ ہی اضطراری حالت میں بقدرِ ضرورت اجازت بھی دی ہے۔[۱۱۶] اس مردار میں یقیناً انسان کی Dead Body بھی آئے گی۔ لہٰذا انسانی میت سے بھی بقدرِ ضرورت مجبور شخص گوشت کھا سکتا ہے۔ ایک انسان کا عضو دوسرے شخص کو لگنا یہ بھی گویا اس سے ملتی جلتی صورت ہے۔ لہٰذا کیا اس دوسری صورت کو پہلی صورت پر قیاس کر سکتے ہیں؟

ix- اپنے اعضاء دینے والا کیا اپنے ہر قسم کے اعضاء دے سکتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کچھ اعضاء اور اجزاءِ بدن دوبارہ قدرتی طور پر بن جاتے ہیں جبکہ بعض اعضاء دے دینے کے بعد دوبارہ نہ بن سکیں گے۔

x- کیا کسی کی جان بچانے کے لیے اپنا عضو دے کر خود کو ہلاکت میں ڈالنا ﴿وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾[۱۱۷] (اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔) اور ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾[۱۱۸] (اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔) کے زمرہ میں نہیں آتا۔

xi- پیوند کاری کی تیسری قسم (یعنی انسانی اعضاء سے انسانوں کی پیوند کاری) کی کھلی اجازت دینے سے انسانی لاشوں کی خرید و فروخت، غریب طبقہ کے غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے اعضاء کی فروخت کا خطرہ معاشرے کے سر پر منڈلاتا رہے گا۔ نیز اس غرض سے انسانوں کے اغوا کے واقعات بھی پیش آسکتے ہیں اور ہسپتالوں میں پڑے مریضوں یا لاوارث قسم کے مریضوں کے دھوکہ سے اعضاء نکالے جانے اور پھر بیچے جانے کے خطرہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

xii- پیوند کاری کے سلسلہ میں ملحوظ رہے کہ عصرِ حاضر میں سر کے گنجا پن سے نجات کے لیے بالوں کی پیوند کاری بھی کی جا رہی ہے اور نئے لگائے گئے بالوں اور فطری اگے ہوئے

بالوں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں کیونکہ ان پیوند شدہ بالوں کی بھی نمو ہوتی ہے جنہیں کٹوانے اور تراشنے کی نوبت بھی آتی ہے۔

مگر دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے وِگ کی طرح جعلی بال لگانے اور لگوانے والی عورت پر اللہ کی لعنت ہونے کی بھی بددعا کی ہے[۱۱۹] کیونکہ اس میں دھوکہ ہے یہ دھوکہ مرد کریں تو ان کے لیے بھی ایسا کرنا حرام ہی ہوگا لہٰذا وِگ کی طرح اصلی بالوں میں نقلی اور جعلی بال شامل کرنا مرد و عورت دونوں کے لیے حرام ہوا لیکن اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو وِگ لگانے اور پیوند کاری سے بال لگوانے دونوں میں کافی حد تک فرق محسوس ہوتا ہے لہٰذا فقہاء عصر کو اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے بالوں کی پیوند کاری کے جواز یا عدمِ جواز کا اجتہادی فتویٰ دینا ہوگا۔

عصرِ حاضر کے مسائل سیاسیات:

اس مقالہ میں ''سیاسیات'' سے مراد سیاسیاتِ شرعیہ ہے نہ کہ سیاست بمعنی (Politics)۔ کیونکہ انگریزی کلمہ پالیٹکس زیادہ جامع نہیں ہے۔ اس کے مفہوم میں زیادہ سے زیادہ ریاست پر حکومت کرنے کے علم وفن کا تصور ہے جبکہ عربی کا لفظ ''سیاسیات'' اصلاحِ نفس، خاندانی سیاست، تعزیری سیاست اور مطلق اصلاحی کام سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔[۱۲۰]

سیاستِ شرعیہ کا قیام درج ذیل اصولوں کی بنیاد پر ہے: مصالح مرسلہ، استحسان، سدّ ذریعہ، نفی الضرر (ضرر دور کرنا) عرف، رفع حرج، دفع مضرت وفساد اور عدالت و مساوات[۱۲۱] اور اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو ان سب کی اصل بنیاد ''مصلحت عامہ'' ہی ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ سیاسیاتِ شرعیہ کی بنیاد پر کیے گئے اجتہادات سے مراد وہ اجتہادات ہوتے ہیں جن میں امت کی مصلحت کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ مصلحت کا لحاظ رکھتے ہوئے اجتہاد کرنے میں مجتہدین کو انتہائی حزم و احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس بات کا شدید خطرہ اس میدان میں ہوتا ہے کہ مصلحت کی بنیاد پر انسان خلافِ شریعت فیصلہ کر بیٹھے، اسی لیے امام ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس باب میں اکثر اوقات قدم پھسل جاتے ہیں[۱۲۲] اور لوگ افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں چنانچہ امام ابن فرحون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''تفریط کا مسلک ان لوگوں کا ہے جنہوں نے چند استثناء کو چھوڑ کر بالعموم اس باب سے قطع نظر کر لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سیاستِ شرعیہ سے کام لینا قواعدِ شرعیہ کے منافی ہے یہ لوگ حق کا واضح راستہ چھوڑ کر عناد کے رسوا کن راستہ کی

طرف مائل ہو گئے کیونکہ سیاستِ شرعیہ اور نصوصِ شرعیہ کے انکار میں خلفاء راشدین کی بھی تغلیط ہے۔ افراط کا مسلک ان لوگوں کا ہے جو قانونِ شریعت اور حدود سے تجاوز کر کے ظلم و بدعت اور سیاست (محض) کی طرف آ گئے ہیں۔ انہیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ سیاستِ شرعیہ خلقِ خدا کے معاملات نبٹانے سے قاصر ہے حالانکہ یہ ان کی جہالت اور فحش غلطی ہے"۔[۱۲۳]

امام شاطبی رحمہ اللہ جنہوں نے مقاصد شریعت اور مصالحہ مرسلہ کے حوالے سے بے نظیر کتاب "الموافقات" لکھی ہے، آپ رحمہ اللہ نے مصالح کی بنیاد پر کیے گئے اجتہادات کے لیے درج ذیل تین شرائط کو لازمی قرار دیا ہے۔

i۔ مصالح کے پیشِ نظر جو قانون بنایا جائے وہ مقاصد شریعت کے مطابق ہو نہ کہ ان کے منافی۔

ii۔ مصلحت کی بنیاد پر کیا گیا اجتہاد و رائے کو جب لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو عام عقلیں اسے قبول کریں۔

iii۔ ایسی رائے و اجتہاد سے کوئی حقیقی ضرورت پوری ہوتی ہو۔[۱۲۴]

عصرِ حاضر کے مسائل بارے اگر غور کیا جائے تو کئی ایک مسائل کا شرعی حل تلاش کرتے ہوئے سیاستِ شرعیہ بالفاظ دیگر مصلحت کا لحاظ رکھنا از بس ضروری ہے۔ فقہاء عصر نے درج ذیل مسائل میں مصلحت ہی کا لحاظ رکھتے ہوئے اجتہادی فیصلے کیے ہیں۔

i۔ غیر مسلموں کے ہاتھوں بنی ہوئی اشیاء جن میں ٹیلیفون، موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ادویہ، اسلحہ وغیرہ شامل ہیں، ان کی افادیت کے پیشِ نظر عصری فقہاء نے ان کے مثبت استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔

ii۔ کاغذی کرنسی کا رواج ہوا تو نئے عرف کے پیشِ نظر علماء نے اس کو درہم و دینار کا متبادل قرار دیتے ہوئے اس پر وہ تمام احکام لگائے جو درہم و دینار پر لگتے تھے۔[۱۲۵]

iii۔ حج میں رش کی وجہ سے ہر سال رمی کے موقع پر عموماً بھگدڑ مچ جانے کے نتیجہ میں سعودی علماء نے رمی کے مقررہ ٹائم سے قبل بھی رمی کی اجازت دے دی۔[۱۲۶]

iv۔ انتقالِ خون کو حنفی علماء نے استحساناً جائز قرار دیا ہے۔[۱۲۷]

v۔ نئے طرقِ تجارت، مالیاتی ادارہ بنک، تکافل عامہ کا نیا ادارہ "بیمہ کمپنی" نیز کریڈٹ کارڈ وغیرہ کو علماء نے اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ ان میں سے سود اور جوا کا عنصر نکال

دیا جائے کیونکہ ان کی افادیت مسلّمہ ہے۔ گویا ان اداروں اور نئے طرقِ تجارت کو محض نئے ہونے کی بنا پر ناجائز اور حرام قرار نہیں دیا۔[۱۲۸]

vi۔ سعودی علماء نے دورانِ حج مانع حیض ادویہ کے استعمال کی اجازت محض مصلحت کی بنیاد پر دی ہے[۱۲۹] کیونکہ بسا اوقات عورت کی اپنے ملک روانگی کی تاریخ آجاتی تھی اور اس نے حیض کی وجہ سے ابھی تک طوافِ افاضہ ہی نہ کیا ہوتا تھا جبکہ وہ حج کا رکن ہے۔

vii۔ بعض عرب علماء نے دیگر ممالک میں عارضی رہائش اختیار کرنے والوں کو عارضی مدت کا نکاح ''نکاح مسفار'' کی اجازت اس مصلحت کی بنا پر دی تا کہ وہ زنا کاری و بدکاری میں ملوث نہ ہوں۔ گویا یہاں مقصود ''دفع مضرت'' اور ''جلب منفعت'' ہے۔[۱۳۰]

viii۔ ایٹمی اسلحہ کی تمام تر خرابیوں کے باوجود جن علماء نے اس کے تیار کرنے کی حمایت کی ہے وہ اس مصلحت کے تحت ہی کی ہے کہ آج کسی قوم کے تحفظ و بقا کے لیے یہ ضروری ہو چکے ہیں۔[۱۳۱]

ix۔ ''ٹیسٹ ٹیوب'' عصرِ حاضر میں مصنوعی طریقہ تولید ہے جس کے نتیجہ میں اولاد سے محروم لوگ نعمت اولاد سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں اس مصنوعی طریقہ تولید کی اس منفعت کی بنا پر علماء عصر نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے۔[۱۳۲]

x۔ جدید میڈیکل سائنس کی ترقی کے نتیجہ میں انسان کے ضائع شدہ اعضاء کی جگہ پر مصنوعی، حیوانی اور انسانی (زندہ و مردہ) اعضاء کی پیوندکاری ہو رہی ہے جس میں یقیناً انسانیت کا نفع اور بھلا ہے لہٰذا اسی منفعت کی بنا پر اکثر فقہاء عصر نے انسانی اعضاء کی پیوندکاری کی اجازت دے دی ہے۔[۱۳۳]

اگر ان مذکورہ بالا اجتہادات کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ ان تمام اجتہادات کے پس منظر میں مصلحتِ عامہ (جلبِ منفعت اور دفع مضرت) کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور مصلحتِ عامہ کا لحاظ شرعاً مطلوب اور محمود ہے گویا یہ تمام اجتہادات ''سیاستِ شرعیہ'' سے متعلقہ ہیں۔

عصرِ حاضر کے فقہی مسائل اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے فقہی مسائل میں ایک موازنہ و جائزہ

اس مقالہ کے تیسرے باب میں لکھا جا چکا ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ کے وہ فقہی مسائل جن

کا خلفاء راشدین نے اجتہاد کرتے ہوئے حل پیش کیا درج ذیل نوعیتوں (Categories) کے تھے۔

i۔ عبادات سے متعلقہ فقہی واجتہادی مسائل

ii۔ اقتصادی ومعاشی مسائل

iii۔ مسائلِ مناکحات

iv۔ مسائل فنون حرب

v۔ حربی مسائل

vi۔ مسائل سیاسیات

vii۔ حدود سے متعلقہ مسائل

viii۔ ذمیوں وغیر مسلموں سے متعلقہ مسائل

عصرِ حاضر کے فقہاء ومجتہدین کرام کو جن جدید فقہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ بھی درج ذیل نوعیتوں کے ہیں۔

i۔ عبادات سے متعلقہ فقہی واجتہادی مسائل

ii۔ اقتصادی ومعاشی مسائل

iii۔ مسائل مناکحات

iv۔ حربی وعسکری مسائل

v۔ طبی مسائل

vi۔ مسائل سیاسیات

عہدِ خلافت راشدہ اور عصرِ حاضر کے جدید فقہی مسائل کا اگر موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن نوعیتوں کے مسائل خلفاء راشدین کو پیش آئے تقریباً انہی نوعیتوں کے مسائل عصرِ حاضر میں بھی پیش آئے ہیں، البتہ حالات وظروف نئے ہیں۔لہٰذا جس طرح خلفاء راشدین نے اپنے عہد میں ان پیش آمدہ مسائل کا حل اجتہاد کے ساتھ پیش کیا اور اس سلسلہ میں جس منہج کو ملحوظ رکھا، عصرِ حاضر کے فقہاء ومجتہدین کو بھی ان مسائل کا حل خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کرتے ہوئے پیش کرنا ہے کیونکہ ان کا اجتہادی منہج رہتی دنیا تک کے فقہاء ومجتہدین کے لیے ایک اسوہ ونمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جدید دور ٹیکنالوجی کا دور ہے لہٰذا عصرِ حاضر میں خصوصاً طبی مسائل بالکل نئی نوعیت کے

ہیں ۔خلافتِ راشدہ میں مسلمان غالب تھے اور کفار مغلوب لہٰذا ذمیوں اور غیر مسلموں سے متعلقہ کچھ نئے مسائل نے سر اٹھایا تھا مگر آج حالات اس حوالے سے بھی کافی حد تک بدل گئے ہیں ۔آج مجموعی طور پر کفار کو غلبہ حاصل ہے اور مسلمان مغلوب وشکست خوردہ ہیں ۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر ہے جہاں انہیں اقلیت کی حیثیت حاصل ہے ۔ غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو دسیوں بیسیوں مسائل کا سامنا ہے ۔ عہدِ خلافت راشدہ کے مقابلہ میں یہ مسائل بھی کسی حد تک نئے ہیں ۔اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان ممالک میں موجود مسلمانوں کے لیے یہ مسائل انتہائی سنگینی اختیار کرتے جا رہے ہیں ۔ان مسائل میں سے چند ایک مسائل کی تصویر کشی گزشتہ صفحات میں کی گئی ہے ۔ ان مسائل میں سے بیشتر کا تعلق وہاں موجود مسلمانوں کی مجبوری سے ہے لہٰذا اسی مجبوری کی بنا پر علماء نے ان کے لیے کئی مسائل بارے جواز کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ بظاہر وہ فتاویٰ نصوص سے متصادم نظر آتے ہیں مثلاً انڈین مسلمانوں کے لیے انشورنس کی اجازت ، کسی ہندو درندے کا شکار مسلمان عورت کو اسقاطِ حمل کی اجازت ، مغرب میں غیر مسلم قاضی کے فیصلہ طلاق کی تنفیذ وغیرہ ۔ غیر مسلم ممالک میں موجود مسلمانوں کے لیے عصرِ حاضر کے فقہاء کے جو فتاویٰ واجتہادات منظرِ عام پر آرہے ہیں انہیں ''فقہ الاقلیات'' کا نام دیا گیا ہے ۔[۱۳۴]

عصرِ حاضر کے بعض علماء ''فقہ الاقلیات'' کی نئے شعبہ فقہ کے طور پر اس کی تدوین کے سخت مخالف ہیں ۔ان کے نزدیک ''فقہ الاقلیات'' کی اکثر وبیشتر بنیاد فقہی قواعد کلیہ ''الضرورات تبیح المحظورات'' (ضرورت ومجبوری حرام کے جائز اور مباح ہوجانے کا باعث بن جاتی ہے ۔) اور '' المشقة تجلب التیسیر'' (مشقت سہولت پیدا کرنے کا تقاضا کرتی ہے ۔) وغیرہ پر ہے یا بالفاظ دیگر مصلحت وضرورت پر ہے اور یہ قواعد امت مسلمہ کے کسی بھی مخصوص گروہ اور جماعت کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ یہ قواعد اپنی عمومی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا حسبِ ضرورت وتقاضا ان قواعد کا استعمال بغیر کسی خطہ وعلاقہ کی تمیز کے کیا جا سکتا ہے ۔

ان علماء کے نزدیک ''فقہ الاقلیات'' کی الگ سے تدوین کی مخالفت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے نتیجہ کے طور پر ''یورپی اسلام'' ''امریکی اسلام'' جیسی اصطلاحات منظر عام پر آرہی ہیں جو اس بات کی عکاسی کر رہی ہیں کہ ان مخصوص علاقوں میں مخصوص اسلامی احکام ہی قابل عمل ہیں لہٰذا اس کے نتیجہ میں اسلام کی عالمگیریت پر فرق آرہا ہے ۔[۱۳۵]

حقیقت یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے بعض علماء نے ''فقہ الاقلیات'' کی آڑ میں مسلم اقلیتوں کے لیے ضرورت سے زیادہ ہی رخصتیں اور آسانیاں دے کر مغربی تہذیب وقوانین کے مقابلہ میں پسپائی کا

راستہ اختیار کیا ہے۔ موجودہ اسلامی انحطاط کے دور میں عزیمت کی راہ کو اختیار کرنے کے فوائد سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اسی پس منظر میں محمد فہیم اختر ندوی لکھتے ہیں۔

''فقہ الاقلیات سے مراد یہ نہیں ہے کہ غیر مسلم معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے شریعت کی (محض) رخصتیں اور آسانیاں اکٹھی کر دی جائیں اور فقہ اسلامی میں ایک نیا جزوی قسم کا اضافہ کیا جائے۔ اس رجحان کے ساتھ فقہ الاقلیات کوئی مفید چیز نہ ہوگی، بلکہ اس کا نقصان یہ ہوگا کہ اس سے ایسا ذہن تیار ہوگا جس میں مسلمان شریعت کے کچھ احکام پر عمل کر کے مطمئن ہوگا، مگر پوری شریعت سے محروم رہے گا۔ فقہ الاقلیات سے یہاں مراد یہ ہے کہ عالمی سطح پر جو حالات، بین الاقوامی تعلقات، ممالک کی نوعیت اور معاشرتی احوال ہیں، انہیں پیشِ نظر رکھتے ہوئے قرآن وسنت کی اصولی ہدایات اور مقاصدِ شرع کی روشنی میں احکام طے کیے جائیں۔ یہ رخصت کی فقہ نہیں بلکہ عزیمت کی فقہ ہوگی''۔[۱۳۶]

مسلم اقلیتوں نے بعض مسائل میں راہِ عزیمت اختیار کی ہے اور اس کے انتہائی مثبت اثرات سامنے آئے ہیں۔ ان کا اس راہ عزیمت کو اختیار کرنا تبلیغِ اسلام کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے ریسرچ سکالر تنویر احمد لکھتے ہیں

''آج عالمی سطح پر ''حلال کھانا''، ''اسلامی بینکاری'' اور ان جیسی دیگر اصلاحات اور شعبے اس لیے وجود میں آئے ہیں کہ مسلمانوں نے ضعیف اور شاذ اقوال پر عمل کرنے اور مصلحتاً ان کی حلت کا جواز تلاش کرنے کے بجائے ان شعبوں میں رائج غیر اسلامی طریقِ کار کے خلاف آوازیں اٹھائیں۔ یقیناً اس سلسلے میں انہیں مالی نقصانات برداشت کرنا پڑے، ذہنی کوفت سے گزرنا پڑا اور دقیانوسی ہونے کے طعنوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن یہ ثابت قدمی (ہی) ان شعبوں میں اسلامی تعلیمات متعارف کرنے کا سبب بنی''۔[۱۳۷]

یاد رہے عزیمت کی بات کرنے والے بیشتر علماء وفقہاء وہ ہیں جو یورپی ومغربی معاشرے سے باہر قیام پذیر ہیں اور رخصتیں دینے والے علماء وفقہاء وہ ہیں جو ان غیر مسلم معاشروں کے اندر موجود ہیں اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کی سنگینی کا براہِ راست مشاہدہ کر رہے ہیں لہٰذا ''صاحب البیت ادری بما فیہ'' (اپنے گھر کے حالات کا گھر والوں کو ہی زیادہ بہتر پتہ ہوتا ہے۔) کی روشنی

میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو مغربی معاشرے سے باہر بیٹھے ہیں وہ اس معاشرہ میں موجود مسلمانوں کے مسائل کو نہ تو کما حقہ صحیح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان مسائل بارے سو فیصد کوئی درست رائے قائم کر سکتے ہیں، لہٰذا یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ غیر مسلم معاشروں میں موجود علماء وفقہاء اور مسلم عوام کو افراط و تفریط کی راہ سے بچتے ہوئے راہِ اعتدال اختیار کرنی چاہیے لہٰذا جہاں عزیمت کے اختیار کرنے سے مفاسد ونقصانات سامنے آتے ہوں وہاں یقیناً رخصت کی سہولت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مگر ہمیشہ ہی رخصتوں کو اختیار کرنا اور راہِ عزیمت کو اختیار نہ کرنا بھی یقیناً شرعی طور پر مستحسن نہیں ہے۔

عصرِ حاضر کے جدید فقہی مسائل خواہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلم معاشروں میں رہائش پذیر مسلمانوں کے یا دونوں کے مشترکہ فقہی مسائل ہوں سب کے حل کے لیے معاصر مجتہدین کو خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کرنا ہوگا کیونکہ وہ ہر دور کے فقہاء و مجتہدین پر اجتہاد کے میدان میں اسبقیت کا درجہ رکھتے ہیں نیز ان کے اجتہادی منہج کو دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید حاصل ہے اور یہ وہ امتیاز ہے جو دیگر فقہاء و مجتہدین کو حاصل نہیں ہے۔

فصل دوم:

عصری مسائل کے حل کے لیے خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ

عصرِ حاضر میں خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی صحیح صورت کے ذکر سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی ضرورت و اہمیت:

رسول اللہ ﷺ نے "سنة الخلفاء الراشدين" کو لازماً اختیار کرنے کا امت اور فقہاء امت کو درس دیا تھا۔ اور "سنة الخلفاء" کی وضاحت بارے دوسرے باب میں تفصیلاً تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد ان کا اجتہادی منہج ہے لہٰذا بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجتہدینِ امت کو خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے مستفید ہونے کا حکم دیا ہے۔

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے مستفید ہونے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ خلفاء کرام براہِ راست رسول اللہ ﷺ کے شاگرد ہیں۔ جنہوں نے آپ ﷺ سے قرآن، اس کی تشریح و تفسیر، حالات و مسائل پر آیات کی تنفیذ و تطبیق وغیرہ کو عملی انداز میں سیکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی رفاقت و معیت کے نتیجہ میں وہ دراصل آپ ﷺ کے رنگ میں رنگے گئے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے اجتہادی معاملات میں اجتہاد کرنے کی بنفسِ نفیس ان کی ٹریننگ فرمائی تھی لہٰذا خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کو اختیار کرنا مجتہدین کے لیے ازبس ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی کئی مواقع پر اجتہاد کیا مگر آپ ﷺ کے اجتہاد کی توثیق یا عدمِ توثیق اللہ رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی ہو جاتی تھی اور یوں نبی ﷺ کا اجتہاد محض اجتہاد نہیں رہتا تھا بلکہ وہ شریعت کا جزو اور حصہ بن جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کا مقام و مرتبہ ہے کیونکہ یہ خلفاء کرام ہی تھے جنہیں جمیع امت کے تمام

فقہاء کے مقابلے میں پہلی بار نئے حالات و مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن کا انھوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں حل پیش کیا۔ گویا خلفاء راشدین ہر دور کے فقہاء و مجتہدین کے لیے اسوہ وقدوہ (Ideal) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہر مجتہد کا فتویٰ واجتہاد مرادِ الٰہی کو پالینے والا یا نہ پانے والا ہو سکتا ہے بالفاظ دیگر صواب و خطا کا احتمال رکھتا ہے اور اس قاعدہ کلیہ سے کسی بھی مجتہد کو حتیٰ کہ خلفاء راشدین کو بھی استثناء حاصل نہیں ہے لیکن خلفاء راشدین نے جس منہجِ اجتہاد پر چلتے ہوئے نئے پیش آمدہ مسائل کا حل کیا اور جس انداز پر قرآن وسنت کے احکام کی تطبیق کی، اس منہج کو ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید حاصل تھی جن کی فضیلت وعظمت بارے اللہ تعالیٰ نے بیسیوں آیات نازل کی ہیں۔ جمیع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے متفق وراضی ہونا خلفاء کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی ضرورت واہمیت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی اسی ضرورت واہمیت کا ہر عہد کے فقہاء و مجتہدین نے ادراک کیا ہے جس طرح کہ اس بارے تفصیلاً باب سوم کی آخری فصل میں لکھا جا چکا ہے۔ خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی ضرورت واہمیت کا ادراک اگر زمانہ ماضی میں کیا گیا تو عصرِ حاضر میں اور یقیناً مستقبل میں بھی اس سے استفادہ کی ضرورت واہمیت کا احساس پہلے سے زیادہ کیا جائے گا۔ یہی باعث ہے کہ مولانا محمد تقی امینی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرتدین کے خلاف مختلف اقدامات، جو دراصل آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کا نتیجہ ہیں، ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ملت کے افراد (فقہاء ومجتہدین) میں یہ نظر وواقفیت جب بھی پیدا ہوگی انہیں بزرگوں (خلفاء راشدین) کو رہنما بنانے اور انہی کے قدم پر چلنے سے پیدا ہوگی"۔[۱۳۸]

عصرِ حاضر میں کئی ایک محققین علماء نے خلفاء اربعۃ بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات پر اسی خیال سے تحقیقی کام کیا ہے تاکہ ان کا اجتہادی منہج عصرِ حاضر کے فقہاء ومجتہدین کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر رویعی الرحیلی فقہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر اپنے تحقیقی کام کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"كي يكون نبراسا يستضئي به فقهاء العصر كما استفاد به السلف الصالح" [۱۳۹]

"تاکہ یہ (فقہ عمر رضی اللہ عنہ) فقہاء عصر کے لیے روشنی کے حصول کا چراغ ثابت ہو جس طرح کہ سلف صالحین نے بھی فقہ عمر رضی اللہ عنہ سے استفادہ کیا۔"

اسی طرح عصرِ حاضر کے جلیل القدر فقیہہ استاذ مصطفیٰ احمد زرقاء، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی ضرورت واہمیت کو بایں الفاظ اجاگر کرتے ہیں:

"تصلح ان تکون دستورا لمنهاج الفقه الواقعی" [۱۴۰]

''یہ (منہج فاروقی) اس قابل ہے کہ اسے عصر حاضر کے فقہی واقعاتی مسائل کے حل کے لیے دستوری منہج قرار دیا جائے۔''

خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج اور روشن خیال اہل علم کا استفادہ:

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ (لوگوں کے لیے ہدایت۔) قرار دیا ہے [۱۴۱] مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کتاب کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾[۱۴۲]

''اس سے (خدا) بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے۔''

اسی عظیم کتاب کی بدولت کچھ لوگ ترقی وعروج کی بلندیوں کو چھوتے ہیں اور اسی کتاب کی بدولت کچھ گمراہیوں اور ضلالتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ان الله یرفع بهذا الکتاب اقواماً ویضع به اخرین'' [۱۴۳]

''بلاشبہ اللہ اس کتاب کی بدولت کچھ لوگوں کو رفعت عطا کرتا ہے اور بعض دوسروں کو اسی کی بدولت ذلت وپستی میں ڈال دیتا ہے۔''

معلوم ہوا قرآنِ مجید جو سراسر خیر و برکت کا باعث ہے کبھی لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ خلفاء کرام کے اجتہادی منہج کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح سے ہے کہ ان کا یہ منہج یقیناً ''خیر'' ہے مگر یہی منہج خلفاء بعض اہلِ علم مگر روشن خیال حضرات کے لیے فتنہ وآزمائش کا باعث بن گیا ہے۔

خلفاء راشدین اور بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض اجتہادی فیصلے بظاہر نصوص سے متصادم ہیں یا کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے احکام کی تطبیق بعض مواقع پر نہیں کی مثلاً اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا تو ''مؤلفۃ القلوب'' کی مد میں مالِ زکوٰۃ صرف نہیں کیا، قحط کے سال مجبوراً چوری کرنے والوں پر حد سرقہ نہیں لگائی، اسی طرح جب مسلمان عورتوں کے بے نکاحی رہ جانے کا خدشہ پیدا ہوا تو کتابی عورتوں سے نکاح کو ناپسند جانا وغیرہ۔ اس طرح کے واقعات کی روشنی میں بعض اہلِ علم تک کو یہ غلطی لگی کہ خلفاء راشدین نے بعض منصوص مسائل تک کو حالات وظروف کے تقاضوں کے

تحت بدل ڈالا یا انھوں نے بعض نصوص کے احکام کو ساقط و معطل کر دیا چنانچہ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری خلفاء راشدین کے چند اجتہادی فیصلوں کو ''شرعی تبدیلیوں کی مثالیں'' کا عنوان دے کر لکھنے کے بعد ان ''شرعی ترمیمات'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مختصر یہ ہے کہ عبادات سے لے کر معاملات تک میں بیسیوں شرعی ترمیمات محض اس لیے ہوتی رہی ہیں کہ تمدن کی وسعت کا زمان و مکان کے اختلاف کا اور بدلے ہوئے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ بعض قانون میں ایسا حک اور اضافہ کیا جائے کہ اس کی شکل و صورت تو مختلف ہو جائے لیکن اس کی روح اور مقصد اسی طرح باقی رہے۔ یہ ساری شرعی ترمیمات بھی داخل شریعت ہی تھیں۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ ترمیمات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لینا بھی ویسی ہی غلطی ہے جیسی ان قوانین کو قبل از ترمیم نا قابل تبدیل سمجھنا۔ یہ حک و اضافہ ہر دور میں ہو سکتا ہے جبکہ حالات اس کے متقاضی ہوں'' [۱۴۴]

مولانا پھلواری کے اسی نقطہ نظر کا نتیجہ ہے کہ آپ نے نہ صرف ہوائی جہاز کے پائلٹ سے نماز ساقط ہو جانے کا فتویٰ دیا ہے بلکہ نماز کے طریقہ نبوی کو بھی غیر مقصود قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

''سچ پوچھیے تو ہمارا موجودہ طریقہ نماز بھی اصل مقصود نہیں چنانچہ ایسے طیارے کا پائلٹ نہ ہماری طرح تحریمہ باندھے گا، نہ ہماری طرح قیام، رکوع، قومہ، سجدہ، قعود اور تسلیم کو ادا کرے گا۔ اس کی نماز ہماری موجودہ حرکات و کلمات کی بھی پابند نہ ہوگی۔ وہ قیاماً قعوداً وعلی جنوبھم جالساً ہی اپنی نماز ادا کرے گا۔ اس کا پوری حاضر دماغی کے ساتھ پرواز کرتے رہنا بھی نماز ہی میں داخل ہوگا''۔ [۱۴۵]

اسی طرح ڈاکٹر صبحی محمصانی کا بھی خیال ہے کہ بالخصوص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کبھی پوری نص یا نص کے بعض حکم کو تبدیل کیا ہے چنانچہ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعض احکام بتقاضائے ضروریات و حسب رواج تبدیل کرنے پڑے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس معاملے میں اس قدر مستعد اور اتنے اولوالعزم انسان تھے کہ سیاستِ ملکی اور رفاہیتِ عامہ کے پیشِ نظر مخالفتِ نصوص سے بھی دریغ نہ

کرتے تھے''۔[۱۴۶]

اس کے بعد ڈاکٹر صبحی محمصانی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ''تبدیلی احکام'' کی چند مثالیں بھی ذکر کی ہیں مثلاً آپ کے بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''المؤلفة قلوبهم'' کا حصہ موقوف کردیا، قحط کے سال حد سرقہ کو موقوف کردیا وغیرہ۔[۱۴۷]

حقیقت یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے ان اجتہادات کے پیش نظر یہ کہنا کہ انھوں نے احکامِ شرعیہ کو بدل ڈالا یا نصوص کی مخالفت کی، دراصل فکر اور تعبیر کی غلطی ہے اور اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہے کہ خلفاء کرام کے ان اجتہادات کی آڑ میں یہ کہا جائے کہ ہر دور میں منصوص احکام (بالخصوص معاملات سے متعلقہ) کو مجتہدین بدل سکتے ہیں جیسا کہ مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ نے بٹائی وغیرہ سے متعلقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو معاملات میں شمار کر کے شرعی حیثیت دینے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر بٹائی وغیرہ سے متعلق بعض ہدایات دی ہیں تو اس سے اس بات پر استدلال کرنا کہ اسلام کے نزدیک اصل چیز ملکیت ہی ہے قطعاً غلط اور غیر حکیمانہ استدلال ہے۔ خود غور فرمایئے کہ اسلام کو اس سے آخر کیا دلچسپی ہوسکتی ہے کہ معاشرہ انسانی نے وقت کی سیاسی واقتصادی مجبوریوں کی بنا پر ملکیت کا کیا تصور قائم کیا ہے اور کن شرائط کے تحت جائز ٹھہرایا ہے''۔[۱۴۸]

مولانا ندوی رحمہ اللہ کے اس اقتباس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ چونکہ اسلام کو انسان کے تصورِ ملکیتِ زمین سے کوئی دلچسپی نہیں لہٰذا انسانی معاشرہ اس بارے خود کوئی قانون اور ضابطہ بنا سکتا ہے حالانکہ قرآنِ مجید اور احادیث میں زمین کی ملکیت کا واضح تصور دیا گیا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے زمین کی پیداوار سے اپنا حق ادا کرنے کا حکم بایں الفاظ دیا:

﴿اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾[۱۴۹]

''جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں، ان میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾[۱۵۰]

''جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔''

اسی طرح قرآن وحدیث میں مسئلہ وراثت کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں تو ان پر عمل ذاتی ملکیت کے بغیر کیوں کر ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے چند اجتہادات کی آڑ میں یہ کہنا کہ خلفاء کرام نے نصوص کو بدل ڈالا یا شرعی احکام کو موقوف ومنسوخ یا معطل کر دیا، بہت بڑی جسارت ہے جبکہ بات صرف اتنی ہے کہ ان خلفاء راشدین نے اپنے اجتہادات سے ان احکام کی تطبیق کا موقع ومحل متعین کیا ہے یا بالفاظ دیگر بعض مواقع پر انھوں نے نصوص کا اطلاق نہیں کیا اور ایسا انھوں نے محض آزاد خیالی یا اتباعِ نفس کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ روحِ شریعت کے تقاضوں کے پیشِ نظر ہی ایسا کیا یہی باعث ہے کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اگر (**نعوذ باللہ من ذالک**) خلفاء راشدینؓ نے بعض نصوص کو بدلا ہوتا یا بعض احکامِ شرعیہ کو منسوخ ومعطل کیا ہوتا تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر چپ سادھ لیں اور خلفاء راشدین پر کسی قسم کا اعتراض نہ کریں جبکہ تاریخ ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حق واضح کرنے اور باطل کو روکنے پر بڑے جری واقع ہوئے تھے۔

خلیفہ وقت کے تشریعی اختیارات:

خلفاء راشدین کے اجتہادات اور جتہادی منہج سے استفادہ کرتے ہوئے بعض حضرات کو ایک دوسرے اعتبار سے غلطی لگی ہے۔ چونکہ خلفاء راشدین مجتہد ہونے کے ساتھ ساتھ خلیفہ وقت بھی تھے لہٰذا ان حضرات کے نزدیک اسلامی ریاست کا خلیفہ وحکمران اور اب جمہوری نظامِ حکومت میں ارباب حل وعقد قران وسنت کے منصوص احکام میں بذریعہ اجتہاد تبدیلی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں خلفاء راشدین نے بھی اپنے خلافتی وحکومتی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایسا کیا جیسا کہ ڈاکٹر صبحی محمصانی لکھتے ہیں ”خلفاء راشدین سیاستِ شرعیہ اور مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر قرآن وحدیث کے بعض احکام تبدیل کرنے میں بھی پس وپیش نہ کرتے تھے“۔ [۱۵۱] مزید برآں شہزاد اقبال شام لکھتے ہیں ”بعض اصحاب نے تو محض واقعاتی شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اجتہاد کے عمل کے ذریعے جدید دور میں ہر طرح کی قانون سازی کرنے کا اور ضرورت پڑنے پر شرعی احکام میں تبدیلیاں لانے کا (حکمران طبقہ کو) یہ اختیار مطلق اور بے تحدید (حاصل) ہے۔“ [۱۵۲]

یہی وہ عظیم غلطی ہے جو مسٹر غلام احمد پرویز سے بھی ہوئی۔ انھوں نے بھی بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض مخصوص اجتہادات کی بنا پر ہی یہ رائے قائم کی کہ خلیفہ وقت وقتی تقاضوں کے پیشِ نظر منصوص احکام میں بھی تبدیلی کر سکتا ہے نیز یہ کہ سنتِ رسول ایک متبدل چیز ہے جس میں ہر دور میں

تبدیلی کی جا سکتی ہے۔[۱۵۳]

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی رائے قائم کرنا دراصل ان حضرات کی کج فہمی کا نتیجہ ہے جس کے مبنی بر غلط ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ درحقیقت یہ دین میں تبدیلی کرنا تھا ہی نہیں اگر (نعوذبالله من ذلک) خلفاء نے منصوص احکام کو بدلا ہوتا تو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش نہ بیٹھ سکتے تھے۔ اور نہ ہی عہدِ خلافتِ راشدہ میں کوئی ایسا جبر وظلم کا ماحول تھا کہ آزادی رائے پر پابندی لگا دی گئی ہو اور مجبوراً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خاموش رہنا پڑا ہو۔ خلفاء راشدین کے ان اجتہادات بارے صحیح فکر اور رائے کیا ہونی چاہیے اس بارے میں گزشتہ چند صفحات میں وضاحت سے لکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ خلفاء کرام کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ سنتِ رسول ایک متبدل چیز ہے دراصل دعویٰ بلا دلیل ہے جس کی تردید کے لیے باب دوم میں خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کے ضمن میں خلفاء کرام اور حدیثِ رسول کی ابحاث ایک شافی ثبوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

درحقیقت اگر حاکمِ وقت احکامِ شرعیہ سے بالکل ہی نابلد ہو یا عالم تو ہو مگر مجتہد نہ ہو تو وہ شرائطِ اجتہاد کا حامل نہ ہونے کی وجہ سے قطعاً اجتہاد کا مجاز ہی نہیں اور اگر حاکمِ وقت درجہ اجتہاد پر فائز بھی ہو تو بھی اس کے اجتہادات کو محض اس کے حاکمِ وقت ہونے کی حیثیت سے قبول نہ کر لیا جائے گا بلکہ اگر اس کے اجتہادات قرآن وسنت اور روحِ شریعت کے موافق ہوئے تو ہی قابلِ قبول ہوں گے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے درج ذیل فرامینِ گرامی سے رہنمائی ملتی ہے۔

i۔ "انما الطاعة فی المعروف" [۱۵۴]

"یقیناً (امراء کی) اطاعت نیکی کے کاموں میں ہی کی جائے گی۔"

ii۔ "السمع والطاعة فی حق مالم یؤمر بمعصية فاذا اُمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة" [۱۵۵]

"سمع وطاعت حق پر مبنی بات پر ہی ہوگی نہ کہ معصیت پر، جب معصیت کا حکم دیا گیا تو پھر سمع وطاعت نہ ہو سکے گی۔"

iii۔ "لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق" [۱۵٦]

"مخلوق میں سے کسی کی بھی اس وقت اطاعت نہ کی جائے گی جب خالق کی نافرمانی لازم آئے۔"

امام ابو العباس قرافی مالکی رحمہ اللہ (۶۸۴ھ) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ حاکم کے ہر اس فیصلہ کو کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے جو اجماع، قواعدِ شرعیہ، نصوص اور قیاس جلی کے مخالف ہو اور حاکم کے اس

فیصلہ کو ان امور کے مقابلہ میں کوئی وجہ ترجیح بھی حاصل نہ ہو۔لیکن اگر اس کے فیصلہ کو کوئی وجہ ترجیح حاصل ہو (جس کی شریعت سے ہی تائید بھی ہوتی ہو) تو پھر حاکم کے اس فیصلہ کو کالعدم قرار نہیں دیا جائے گا۔[۱۵۷]

اس بحث کو اس نکتہ پر ختم کیا جاتا ہے کہ اگر خلفاء راشدین کو دین میں تغیر و تبدل ہی کرنا تھا تو پھر انھیں مشاورتی اور شورائی طرز کے اجتہاد کی قطعاً ضرورت نہ تھی بلکہ از خود جو چاہتے تبدیلی کر دیتے۔ان کا شورائی طرز کا اجتہاد اس بات کا بین و کافی ثبوت ہے کہ خلفاء راشدین نے منصوص احکام میں قطعاً کسی تبدیلی کی جسارت نہیں کی ہے اور ان کی طرف دین میں تغیر و تبدیلی کی نسبت کرنا ایک بہت بڑا اور کھلا اتہام ہے۔اور ایسی اتہام بازی سے اللہ ہر کسی کو محفوظ و سلامت رکھے۔

تبدیلی فتویٰ نہ کہ تبدیلی نص:

خلفاء راشدین کے وہ اجتہادات جنہیں بعض حضرات نے ''شرعی ترمیمات'' کے عنوان سے یاد کیا ہے، اس بارے میں گزشتہ چند صفحات میں لکھا جا چکا ہے کہ دراصل خلفاء راشدین نے ان نصوص کے احکام کی تطبیق کا موقع و محل متعین کیا ہے اور امت کو (بالخصوص فقہاء و مجتہدینِ امت) کو بتلایا ہے کہ کن حالات و مواقع پر ان نصوص کا اطلاق نہ کیا جائے گا۔خلفاء کے ایسے اجتہادات بارے ایک اور تعبیر بھی اختیار کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دراصل حالات و ظروف کے تقاضوں کے پیشِ نظر کبھی کسی مجتہد کا فتویٰ بدلتا ہے نہ کہ شریعت بدلتی ہے۔شرعی احکام بدستور اپنی جگہ پر قائم و دائم اور ناقابلِ تنسیخ ہیں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مجتہد کو کوئی ایسا فتویٰ دینا پڑتا ہے جو بظاہر کسی ایک نص کے مخالف و متصادم ہوتا ہے مگر درحقیقت دیگر نصوص یا بالفاظِ دیگر روحِ شریعت اس کی تائید کر رہی ہوتی ہے اور حالات کا تقاضا بھی اس وقت اسی اجتہاد کے اختیار کرنے کا ہوتا ہے وگرنہ اس مخصوص نص پر اڑے رہنا کبھی حرج کا باعث بن سکتا ہے۔تبدیلی نص کی بات کرنے اور تبدیلی فتویٰ کی بات کرنے میں بالکل واضح فرق ہے۔اس فرق کو درج ذیل چند مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

أ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں چونکہ اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے ان کفار کو جن کے اسلام لانے کی امید ہو یا نومسلموں کو تالیفِ قلبی کے طور پر زکوٰۃ کا مال نہ دیا کیونکہ اب اس کی ضرورت نہ رہی تھی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہاں فتویٰ واجتہاد بدلا ہے نہ کہ نصِ قرآنی۔قرآنی حکم اپنی جگہ بدستور قائم و دائم ہے۔یہی باعث ہے کہ جب بھی کسی دور میں اسلام اور مسلمان مغلوبیت کے دور سے گزر رہے ہوں تو ان حالات میں قرآنی حکم کے مطابق تالیفِ قلبی کے

طور پر نو مسلموں کو یا ان کفار کو جن کے اسلام لانے کی امید ہو، مالِ زکوۃ دینے کا مجتہد فتوی دے گا گویا قرآنی حکم قیامت تک کے لیے باقی ہے۔[۱۵۸]

عصر حاضر میں تو ''مؤلفة القلوب'' کی مد میں زکوۃ خرچ کرنے کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ عیسائی مشنریاں مالی طور پر پسماندہ مسلمانوں کی مالی امداد کر کے انھیں عیسائی بنا رہی ہیں جبکہ مسلمان اس فتنہ ارتداد سے غفلت اختیار کیے ہوئے ہیں۔اسی لیے عصر حاضر کے معروف مفسر قرآن حافظ صلاح الدین یوسف امتِ مسلمہ اور مسلم حکمرانوں کو جھنجوڑتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''انسانی ہمدردی کے عنوان سے یہ عیسائیت کے پرچارک ان (غریب و پسماندہ مسلمانوں) کے قلوب میں اپنی جگہ بناتے ہیں اور پھر انہیں عیسائیت کے فتراک کا نخچیر بنا لیتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اسلامی حکومتیں ارتداد کی اس مہم سے بالکل بے خبر اور اسلامی تبلیغ کے فریضے سے یکسر غافل ہیں ایسے حالات میں ''مؤلفة القلوب'' کی مد سے ایسے لوگوں کی امداد کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے جو ان مشنری اداروں کی کوششوں کی وجہ سے عیسائیت کے قریب آچکے ہوں، ان کی مالی امداد کر کے عیسائیت کی محبت ان کے دلوں سے نکالی جائے تاکہ وہ ارتداد کا راستہ اختیار نہ کریں۔اسی طرح ایسے غریب عیسائیوں کی امداد بھی اس مد سے کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے جو کہ مختلف مصائب و آلام میں گھرے ہوئے ہوں اور ان کی مالی امداد سے ان کے قلوب، اسلام کی طرف مائل ہونے کی امید ہو''۔[۱۵۹]

ii۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں ''طلاق ثلاثہ'' کو تادیباً نافذ کرنے کا اعلان کیا تھا۔اور اس تادیب کے فوائد حاصل کرنے کے لیے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے دونوں کو تعزیری طور پر رجم کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد فاروقی اعلان کے پہلے حصے کو تو لیا گیا مگر دوسرے کی پروا نہ کی گئی تو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جو یقیناً مجتہد و مجدّد تھے، آپ رحمہ اللہ نے طلاقِ ثلاثہ بارے اسی موقف کو اختیار کیا جس پر عہدِ نبوی و صدیقی میں عمل ہوتا رہا تھا۔ چنانچہ آپ رحمہ اللہ کے شاگرد رشید امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے شیخ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے کے برخلاف رائے اختیار کرنے کی وجہ پوچھی تو آپ رحمہ اللہ نے جواباً ارشاد فرمایا:

> ''آج اکثر لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ یہ (اکٹھی تین طلاقیں دینا) حرام

ہے اور پھر امام شافعی رحمہ اللہ تو طلاقِ ثلاثہ کو ایک ہی شمار کرنے کو جائز بھی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ شخص جو اکٹھی تین طلاقیں دینے کی حرمت سے جاہل و نابلد ہے اسے کیوں کر (طلاقِ ثلاثہ کی تنفیذ کی) سزا دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگر طلاقِ ثلاثہ کو نافذ کیا تھا تو لوگوں پر حلالہ کا دروازہ بھی بند کیا تھا مگر آج کے علماء طلاقِ ثلاثہ کو بھی نافذ کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر نے لوگوں کے لیے حلالہ کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے"۔[۱۶۰]

آپ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

"اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ ہوتا کہ لوگ حلالہ کے راستہ کو ہی اختیار کرتے جائیں گے تو آپ رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہی اولیٰ وانسب ہوتا کہ لوگوں کو اس مسئلہ میں اسی قانون وضابطہ پر برقرار رکھیں جس پر وہ عہدِ نبوی، عہد صدیقی اور خود آپ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آغاز میں تھے۔[۱۶۱]

معلوم ہوا حالات کے بدلنے سے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا فتویٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فتویٰ و اجتہاد کے مقابلہ میں تبدیل ہوگیا اور اس مسئلہ میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ محدثین کی اکثریت کا موقف بھی یہی ہے اور احناف میں سے کئی ایک جید علماء نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے جن میں مولانا علامہ عبدالحی فرنگی محلی اور ماضی قریب میں پیر محمد کرم شاہ الازہری (م۱۹۹۸ء) وغیرہ شامل ہیں۔[۱۶۲]

iii۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت کی عسرت وتنگی اور بدحالی کی بنا پر قربانی کا گوشت تین ایام سے زیادہ رکھنے سے منع کر دیا تھا مگر جب غزوات کے نتیجہ میں غنائم حاصل ہوئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خوشحال ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دنوں سے زائد ایام کے لیے بھی قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے کی اجازت دے دی۔[۱۶۳]

محدثین کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حکم منسوخ ہو چکا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت کے آغاز میں کچھ اس طرح کے حالات پیدا ہوئے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تین ایام سے زیادہ قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے منع کر دیا۔[۱۶۴]

یہاں یہ تعبیر کرنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکمِ شرعی کو تبدیل کر دیا دراصل تعبیر کی یا پھر فکری غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں حالات وظروف کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا محض فتویٰ بدلا ہے جبکہ نص اپنی جگہ برقرار ہے۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد جب حالات درست ہوئے تو پھر وہی سابقہ

حکم اپنی جگہ لوٹ آیا اور اگر آئندہ بھی عسرت و بدحالی کے ایام ہوں تو مجتہد خلیفہ وقت (یا حاکم) یا مجتہد علماء کرام عوام کو تین دن سے زیادہ تک قربانی کا گوشت سٹور کرنے سے منع کر سکتے ہیں اور یہ فتویٰ کی تبدیلی ہوگی نہ کہ نص کی تبدیلی۔

ان مذکورہ بالا تین مثالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خلفاء راشدین کے وہ اجتہادات جو بظاہر نصوص کے مخالف و متصادم ہیں (اگرچہ روحِ شریعت کے منافی نہیں) اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان خلفاء کرام نے نصوص کو بدل ڈالا یا احکام شرعی کو منسوخ و معطل کر دیا بلکہ دراصل محض ان کا فتویٰ بدلا ہے اور حالات و ظروف کے تحت فتویٰ کی تبدیلی شرعاً جائز ہے۔

عصرِ حاضر میں خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی صحیح صورت:

عصرِ حاضر کے جدید فقہی مسائل میں خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ بڑی حد تک اجتہادی غلطی سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ خلفاء کرام کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی صحیح صورت حسبِ ذیل ہے۔

قرآن وسنت سے براہ راست استدلال واستنباط:

جدید مسائل کے حل کے لیے خلفاء راشدین کی طرح براہِ راست قرآن وحدیث سے استفادہ کیا جانا چاہیے اور یہ اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور کے مجتہدین کے لیے قرآن وسنت میں رہنمائی کا سامان کر دیا ہے۔ قرآن وحدیث کی نصوص کے نہ صرف الفاظ ملحوظ رکھے جائیں بلکہ الفاظ میں موجود ان کی روح کا لحاظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔

ماضی قریب میں ایک عرصہ تک فقہاء و مجتہدین کرام جدید مسائل کے حل کے لیے قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے کی بجائے کسی مخصوص مکتبِ فکر کی کتبِ فقہ کا سہارا لیتے تھے جیسا کہ عصرِ حاضر کے نامور فقیہہ سید سابق رحمہ اللہ (م ۲۰۰۰ء) لکھتے ہیں:

> ''تقلید اور اپنے اپنے فقہی مذہب و مسلک سے تعصب کی بنا پر امت کتاب وسنت سے (براہ راست) رہنمائی لینے سے محروم ہوگئی، باب اجتہاد کے بند ہونے کی آواز اٹھی اور پھر شریعت، اقوال فقہاء بن کے رہ گئی اور اقوال فقہاء شریعت بن کے رہ گئے''۔[۱۶۵]

آپ رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں:

''اس موقع پر شریعت جامد ہو کے رہ گئی اور علماء کرام کتبِ فقہ کے متون کے علاوہ کچھ یاد نہ رکھتے تھے ان کی اگر رسائی تھی تو محض کتبِ فقہ کے حواشی، ان پر وارد اعتراضات، جوابات، فقہی پہلوؤں اور ان کتب پر لکھی گئی تقریرات پر تھی اور بس''۔[۱۶۶]

مگر آج پھر خلفاء راشدین کی اس روش کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ کتاب وسنت سے براہِ راست استفادہ کرتے ہوئے جدید فقہی مسائل بارے اجتہاد کیا جائے۔

قیاس کے لیے قرآن وحدیث سے نظائر وامثال کی تلاش:

خلفاء راشدین نے جدید پیش آمدہ مسائل کو قرآن وسنت میں موجود ان سے ملتی جلتی نظائر وامثال پر قیاس کر کے ان کا حکم شرعی پانے کی کوشش کی ہے اور فقہاء امت کو یہ درس دیا ہے کہ قیاس بھی ایک ایسا اہم مأخذ شریعت ہے جس سے نئے مسائل کے حل کرنے میں بڑی حد تک آسانی ہو جاتی ہے۔

قیاس کے سلسلہ میں خلفاء راشدین کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ قرآن وحدیث سے نظائر وامثال تلاش کر کے انہیں مقیس علیہ (جس پر قیاس کیا جائے) ٹھہراتے تھے اس لیے کہ امت کے لیے اصل حجت قرآن وحدیث ہی ہیں اور انہی سے رہنمائی لینے کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾[۱۶۷]

''یہ قرآن وہ رستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے امت کو متنبہ کیا ہے کہ

''اوتیت القرآن ومثله معه'' [۱۶۸]

''مجھے قرآن اور اس کی مثل ایک اور چیز (حدیث) بھی دی گئی ہے۔''

ظاہر ہے قرآن کی مثل حدیث آپ ﷺ کو عطا کی گئی تھی اور حدیث وسنت کو اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ بنایا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم ان دو کو تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور وہ دو ہیں:

کتاب اللہ اور اس کے رسول (محمد ﷺ) کی سنت''۔[۱۶۹]

خلفاء راشدین کے مذکورہ بالا طرزِ عمل کے برعکس ائمہ اربعہ کے بعد جب بابِ اجتہاد بند کرنے کو مبنی بر مصلحت سمجھا گیا تو اس وقت چونکہ ائمہ اربعہ کے اجتہادات کی طرف ہی رجوع کرنے کی روش عام ہوگئی لہٰذا ان کے اجتہادات کو ہی مقیس علیہ قرار دے کر تخریجات و تفریعات کی جانے لگیں۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ء) لکھتے ہیں:

''انھوں (ائمہ اربعہ کے بعد کے علماء و فقہاء) نے تخریج کے اصول پر فقہ کو مرتب کیا اور اس کی صورت یہ تھی کہ ہر ایک اس شخص کی کتاب کو یاد رکھتا تھا جو کہ اس کے اصحاب کی زبان اور علماء کے اقوال سے زیادہ آگاہ ہوتا تھا اور (اقوالِ مختلفہ میں) ترجیح دینے میں جس کی نظر صائب تر ہوتی تھی چنانچہ وہ ہر مسئلہ میں حکم کی وجہ پر غور کرتا لہٰذا جب اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جاتا یا کسی مسئلہ میں اسے ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے اصحاب کی تصریحات کو دیکھتا، اگر ان میں جواب پاتا تو فبہا ورنہ ان کے کلام کے عموم پر غور کرتا تو اس صورت پر اسے جاری کر دیتا یا کلام کے ضمن میں کوئی اشارہ معلوم کرتا تو اس حکم کا استنباط کرتا اور بسا اوقات کلام کا ایماء یا اقتضاء ہوتا اور اس سے مقصود سمجھ میں آجاتا اور بسا اوقات اس وضاحت شدہ مسئلہ کی کوئی نظیر ہوتی تو اسے اس پر محمول کر لیتا''[۱۷۰]

ضرورت اس بات کی ہے کہ عصرِ حاضر کے فقہاء کرام خلفاء راشدین کی طرح نئے مسائل کی نظائر و امثال قرآن و سنت سے تلاش کر کے انھیں مقیس علیہ قرار دے کر اجتہاد کریں لیکن اگر قدیم فقہاء کی طرح اصولِ تخریج ہی کا لحاظ رکھتے ہوئے تفریعات کی جائیں تو اس کے نقصانات کیا ہوتے ہیں؟ اس بارے میں مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ (م ۱۹۸۷ء) لکھتے ہیں ''فقہ کی شاخ در شاخ جزئیات سے یہ ہوتا ہے کہ اخلاق و روح کے تقاضے دب جاتے ہیں اور وہ مذہب جو ہمہ پہلو جذبات اپنے پہلو میں رکھتا ہے، سمٹ کر اور پھیل کر صرف ایک ضابطہ اور خشک قانون ہی رہ جاتا ہے''۔[۱۷۱]

استحسان کا بقدرِ ضرورت استعمال:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج میں سے ایک ''استحسان'' کا بھی استعمال ہے۔ استحسان سے مراد ہے قیاسِ جلی پر قیاسِ خفی کو کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر ترجیح دینا۔ استحسان یا بالفاظ دیگر قیاسِ خفی کو قیاسِ جلی پر ترجیح دینے کی ضرورت کب پیش آتی ہے اس بارے مولانا محمد تقی امینی یوں رقم طراز ہیں:

''قیاسی مسائل اگرچہ ایک ہی جنس کے اور ایک ہی مشترک بنیاد پر قائم ہوتے ہیں لیکن بسا اوقات مخصوص حالات ومواقع کی بنیاد پر نتائج اور رد عمل کے لحاظ سے وہ یکساں مفید اور مصلحت وضرورت کے حامل نہیں ہوتے ہیں نیز ان پر عمل کرنے سے کہیں دشواری پیدا ہوتی ہے اور کہیں وہ ضرر رساں اور غیر منصفانہ نظر آتے ہیں، ایسی حالت میں الٰہی حکمت کے مطابق فطری طور پر انہیں چھوڑنے کی ضرورت ہوتی ہے اور حصولِ مصلحت اور دفع مضرت کی خاطر دوسری راہ اختیار کرنی پڑتی ہے''۔[۱۷۲]

یہی دوسری راہ ''استحسان'' کہلاتی ہے۔

خلفاء راشدین کے طرزِ عمل کو اختیار کرتے ہوئے عصرِ حاضر میں استحسان کے اصول کی کیا ضرورت واہمیت ہے، اس بارے ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی لکھتے ہیں:

''جدید دور میں استحسان کا اصول انتہائی ناگزیز ہو گیا ہے۔ بے شمار مسائل ایسے ہیں جو بذریعہ قیاس حل نہیں کیے جاسکتے، انہیں استحسان ہی کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے مثلاً ضرورت مند انسان کی جان بچانے کے لیے خون منتقل کرنا یا جان بچانے یا صحت کے غالب گمان کی بنا پر آپریشن کرانا یا غیر طبعی موت کے اسباب جاننے کے لیے پوسٹ مارٹم کرانا، تاکہ مجرم کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کیے جاسکیں وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کا حل استحسان ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔''[۱۷۳]

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے فقہی مسائل کے حل کے لیے ''استحسان'' اصول کی اہمیت مسلّمہ ہے مگر استحسان اصول کے لحاظ رکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ ہر چیز کو ایک ضرورت قرار دے کر جائز ہی کرتے چلے جائیں۔ استحسان اصول کی آڑ میں ہر چیز کے جواز کا فتویٰ دراصل اباحیت پسندی کی چغلی کھاتا ہے۔

استصحاب اصول کی عصرِ حاضر میں اہمیت:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے ''استصحاب'' اصول کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے۔ استصحاب سے مراد یہ ہے کہ کوئی حکم بنیادی طور پر جیسا تھا اسے ویسا ہی سمجھا جائے جب تک کہ اس میں تبدیلی حکم کی دلیل نہ مل جائے لہٰذا اگر کوئی چیز پہلے مباح تھی تو وہ مباح ہی ہے جب تک اس کے حرام

ہونے کی دلیل نہ ملے، اسی طرح اگر وہ چیز پہلے حرام تھی تو وہ حرام ہی ہوگی جب تک اس کے مباح ہونے کی دلیل نہ ملے[۱۷۴] اسی قاعدے کے پیش نظر ''الاصل فی الاشیاء الا باحۃ'' (اشیاء میں اصل اباحت وحلت ہے۔) کا جملہ فقہاء ومجتہدین کے یہاں مشہور ومعروف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اصول بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کی بدولت جدید مسائل کے حل کے لیے بڑی سہولت و آسانی ہو جاتی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ہی کہا جا سکتا ہے کہ بنک، کریڈٹ کارڈ وغیرہ اگر چہ مغرب سے درآمد شدہ ہیں مگر اس مذکورہ بالا قاعدے کے مطابق یہ شرعاً جائز وحلال ہیں لیکن اگر ان میں حرمت کی وجوہات جیسے سود اور جوا وغیرہ موجودہ ہیں تو حرام ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''استصحاب'' اصول کی بنیاد پر اگر کسی چیز کو جائز اور درست قرار دیا جا رہا ہو تو ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس بات کی اچھی طرح سے تسلی کر لی جائے کہ کہیں اس میں کوئی وجہ حرمت تو موجود نہیں ہے۔

جدید فقہی مسائل کے حل کیلئے اصول ''استصحاب'' کو ملحوظ رکھنا ازبس ضروری ہے مگر اس کا یہ مطلب قطعاً نہ ہونا چاہیے کہ کسی چیز کو اس کے مالہ وماعلیہ کو جانے اور جانچے بغیر ہی حلال اور مباح قرار دے دیا جائے۔

مصالح مرسلہ کے تحت اجتہادِ استصلاحی کی عصرِ حاضر میں ضرورت واہمیت:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کے ضمن میں ''مصالح مرسلہ'' کے لحاظ کی بھی کئی ایک مثالیں تحریر کی گئی ہیں۔ کچھ مصالح تو وہ ہیں جن کے معتبر ہونے کا شریعت سے ثبوت ملتا ہے جیسے مقاصدِ خمسہ (دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت) ہیں لیکن وہ مصالح جن کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا صراحۃً شریعت میں ذکر نہ ہو البتہ وہ مقاصدِ شریعت سے مطابقت رکھتی ہوں تو ان مصالح کا بھی اعتبار کیا جائے گا اور انہیں ہی ''مصالح مرسلہ'' کہا جاتا ہے۔[۱۷۵] مصالح مرسلہ کا لحاظ رکھنا گویا مقاصدِ شریعت کا ہی لحاظ کرنا ہے اور یہ شرعاً مطلوب ومحمود ہے۔ ان مصالح کی بنیاد پر جو اجتہاد کیا جائے اسے ''اجتہادِ استصلاحی'' کہتے ہیں۔[۱۷۶] اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ ''مصالح مرسلہ'' کے لحاظ کی دلیل شریعت میں صراحت کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ مقاصدِ شریعت سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے انہیں قبول کیا جاتا ہے اور ان کی بنیاد پر اجتہاد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''مصالح مرسلہ'' کا لحاظ کرنا گویا روحِ شریعت کا لحاظ کرنا ہے۔

کسی نئے پیش آمدہ مسئلہ میں جواز یا عدم جواز کا فتویٰ اس بنیاد پر دینا کہ یہ روحِ شریعت کا

تقاضا ہے، انتہائی مشکل، کٹھن اور ذمہ داری کا کام ہے۔ روحِ شریعت کو ملحوظ رکھنے سے مراد تمام شرعی احکام کی فلاسفی و حکمت کو ملحوظ رکھنا ہے لہٰذا یہ روحِ شریعت قرآن و سنت سے ہی مستنبط و ماخوذ ہونہ کہ اسے غیر اسلامی نظریات سے کشید کیا گیا ہو۔ چنانچہ سید مودودی رحمہ اللہ (م ۱۹۷۹ء) لکھتے ہیں: ''لیکن اگر الفاظ قرآن و سنت سے لیے جائیں اور اسپرٹ (روحِ شریعت) کہیں اور سے لائی جائے تو یہ سخت قابلِ اعتراض چیز ہے اور ایسی اسپرٹ کو ملحوظ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم خدا اور رسول کا نام لے کر ان سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں''۔ [۱۷۷] کیونکہ روحِ شریعت کوئی منضبط چیز نہیں، یہی باعث ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد ''استصلاحی اجتہاد'' کم ہوا جبکہ قیاس کے انداز میں اجتہاد کا رجحان زیادہ ہوتا چلا گیا اور اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ قیاس کی بنیاد بہر صورت کسی اصلِ شرعی پر ہوتی ہے لہٰذا اس میں مقیس اور مقیس علیہ کی علتِ مشترکہ کے تعین کے بعد اجتہادی رائے قائم کرنے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی جبکہ استصلاحی اجتہاد کی بنیاد مصلحتِ مرسلہ پر ہے اور مصلحتِ مرسلہ کا تعین ایک مجتہد کی عقل نے شریعت کی روشنی میں کرنا ہوتا ہے اور عقل کے غلطی کرنے کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا نیز فقہی مسئلہ میں مختلف عقول کے فیصلے مختلف ہو سکتے ہیں لہٰذا عین ممکن ہے کہ کوئی مجتہد اپنی عقل سے مصلحت کا لحاظ کرتے کرتے صریح آیات و احادیث کے احکام کو ترک کر دے۔ غالباً یہی وہ وجہ تھی کہ جس کے پیشِ نظر قیاسی طرز کے اجتہاد کا رجحان بڑھتا گیا اور استصلاحی طرز کے اجتہاد کا رجحان کم ہوتا گیا۔ [۱۷۸]

عصرِ حاضر میں ''اجتہاد استصلاحی'' کی ضرورت و اہمیت کا پھر سے بہت زیادہ احساس کیا جانے لگا ہے، اس لیے کہ اس نوعیت کے اجتہاد کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آتی ہے جب کوئی مسئلہ بالکل نئی نوعیت کا ہو اور قرآن و سنت میں کوئی ایسی نظیر بھی نہ ہو جس پر اسے قیاس کیا جا سکے لہٰذا ایک مجتہد روحِ شریعت کی روشنی میں اس مسئلہ کا شرعی حکم تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ جیسا کہ محمد نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں ''کسی نہ کسی شکل میں مصالح عامہ اور مقاصدِ شریعت کے فہم کو نئے مسائل میں احکامِ شریعت کی دریافت میں ہمیشہ کلیدی حیثیت رہی ہے'' [۱۷۹] عصرِ حاضر کے جدید طبی مسائل جیسے انتقالِ خون، ٹیسٹ ٹیوب بے بی، اعضاء کی پیوند کاری وغیرہ مسائل درحقیقت بالکل نئے ہیں جن کے لیے قرآن و سنت اور قدیم فقہی ورثہ سے کوئی خاص نظیر کا ملنا مشکل ہے لہٰذا عصرِ حاضر کے مجتہدین کو ان مسائل کا حل روحِ شریعت کی روشنی میں کرنا ہوگا۔

عموماً روحِ شریعت سے مراد مقاصدِ خمسہ (دین، جان، عقل، نسل، اور مال کی حفاظت) سمجھے جاتے ہیں۔ اگر ان مقاصد خمسہ پر غور و فکر کریں تو یہ دراصل دفع مضرت کے ضمن میں آتے ہیں

اور یہ مصلحت کا محض ایک پہلو ہے حالانکہ مصلحت سے مراد جہاں دفع مضرت ہے وہاں جلبِ منفعت بھی ہے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (م ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں:

''بعض لوگ مصالح مرسلہ کو جان و مال، عزت و آبرو، عقل اور دین کے تحفظ میں محصور کر دیتے ہیں مگر ایسا کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ مصالح مرسلہ یہ ہیں کہ منافع حاصل کیے جائیں اور مضرتیں دور کی جائیں۔ مذکورہ بالا حضرات نے جو ان امور سے متعلق رفع مضرت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے وہ مصالح مرسلہ کی دو قسموں سے میں سے صرف ایک پر مشتمل ہے دوسری قسم دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی مصالح کے حاصل کرنے پر مشتمل ہے''۔[۱۸۰]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس مذکورہ بالا عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

''ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ بات اہم ہے کہ مقاصدِ شریعت کا بیان ایجابی قدروں پر بھی مشتمل ہونا چاہیے جو انسانوں کو صرف مضرتوں سے بچانے پر اکتفانہ کرتی ہوں بلکہ ان کی فلاح و بہبود میں اضافہ کو بھی مطلوب قرار دیتی ہوں۔ ان کے نزدیک مقاصدِ شریعت کی فہرست پنجگانہ یک طرفہ اور اس اعتبار سے ناقص ہے۔ ان کی یہ بات بھی وزن رکھتی ہے کہ انسانی بہبود میں صرف مادی پہلوؤں کا لحاظ رکھنا کافی نہیں جن کا تعلق مال، جسم، نسل وغیرہ سے ہو بلکہ انسانی زندگی کے روحانی اور نفسیاتی پہلوؤں کو بھی اہمیت دینی چاہیے''۔[۱۸۱]

معلوم ہوا روحِ شریعت سے مراد محض مقاصدِ خمسہ کو لینا ایک ناقص تصور ہے جو صرف دفع مضرت کے گرد گھومتا ہے حالانکہ شریعت جلبِ منفعت کا بھی نام ہے۔ عصرِ حاضر کے نئے پیش آمدہ مسائل جو تاریخِ انسانی میں بالکل نئی نوعیت کے ہیں ان کا حل پیش کرنے کیلئے استصلاحی طرز کا اجتہاد فقہاءِ امت کو کرنا ہوگا لیکن صرف دفع مضرت کے پہلو کو ہی نہ دیکھا جائے بلکہ جلبِ منفعت کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ نیز نفع دنیا و آخرت کا ملحوظ ہو تو دنیا و آخرت کے نقصان سے بچنا بھی مطلوب ہو۔

خلفاء راشدین نے جہاں مصلحت کے تحت اجتہادات کیے ہیں وہاں اس اصول کا بھی خیال رکھا ہے کہ مصلحتِ خاصہ (ایک فرد یا چند لوگوں کی مصلحت) پر مصلحت عامہ (اکثر لوگوں کی مصلحت) کو ترجیح دی جائے لہٰذا عصری مسائل میں بھی اس اصول کو مدنظر رکھا جانا چاہیے۔

قدیم وجدید فقہی ذخیرہ سے استفادہ:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور باقی تینوں خلفاء بھی اپنے زمانہ خلافت کے مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فقہی مسائل بارے مشاورت کیا کرتے تھے یہ گویا ان کا معاصر فقہی ذخیرہ سے استفادہ تھا جو ابھی تک ان مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں میں تھا اور مدون نہ ہوا تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی ایک حقیقت کے طور پر سامنے آچکی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن وحدیث سے رہنمائی حاصل نہ کر سکنے کی صورت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فیصلے کے متلاشی ہوتے تھے اور اسے ہی مناسب سمجھتے تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے تھے اور اگر کسی وجہ سے تغیر وترمیم کی ضرورت محسوس کرتے تو اپنی رائے کا نئے سرے سے بھی اظہار کرتے تھے یہی طرزِ عمل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اپنے پیش رو خلفاء شیخین کے اجتہادات بارے تھا اور یہی رویہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سابقہ خلفاء ثلاثہ کی اجتہادی آراء بارے اختیار کیا تھا۔

خلفاء راشدین امت میں شریعتِ الٰہی کے سب سے بڑے عالم تھے، اس کے باوجود انہیں معاصر فقہاء اور سابقہ خلفاء کی اجتہادی آراء سے استفادہ کی نوبت آئی لہٰذا بعد کے فقہاء اپنے معاصر فقہاء اور سابقہ فقہاء کی فقہی آراء سے استفادہ سے کیوں کر مستغنی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بالکل مبنی برحق ہے کہ ہر دور کے فقہاء کو قدیم وجدید فقہی ذخیرہ سے استفادہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ استفادہ جہاں ایک مجتہد کیلئے صورتِ مسئلہ کی وضاحت اور اس کے کئی مخفی گوشوں کو بے نقاب کرے گا وہاں ایک طرح سے مشاورت کا بھی فائدہ دے گا۔

قدیم وجدید فقہی ذخیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے ملحوظ رہے کہ فقہاء کے اجتہادات بہرصورت اجتہادات ہی ہیں نہ کہ شریعت۔ کسی مجتہد کے اجتہادات دراصل اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ اس نے دین وشریعت کو کس انداز میں سمجھا ہے لہٰذا فقہاء ومجتہدین کے اجتہادات کو شریعت کا درجہ نہ دیا جائے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو خود خلفاء راشدین نے سب سے پہلے اپنے اجتہادات بارے بیان کیا جس کا تفصیلی ذکر ''سنة الخلفاء'' کی بحث میں ہو چکا ہے۔

قدیم اور جدید فقہی ذخیرہ سے استفادہ بلا تعصبِ مسلک کیا جانا چاہیے کیونکہ تمام فقہاء کرام کی فقہی آراء پوری امت کا فقہی ورثہ ہیں جس پر کسی کی بھی اجارہ داری نہیں۔ عصرِ حاضر کے کئی جید فقہاء ومجتہدین کرام بھی اب اس ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ عصرِ حاضر کے فقہی مسائل کا حل کسی ایک فقہی مکتبِ فکر کی فقہی آراء سے استفادہ کے ساتھ ممکن ہی نہیں رہا بلکہ الگ الگ

ہر فقہی ذخیرہ کا دامن تنگ ہو رہا ہے لہٰذا دیگر فقہاء کی فقہی آرا سے استفادہ بھی از بس ضروری ہے۔
چنانچہ سید مودودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ایک صاحبِ علم آدمی کو براہِ راست کتاب وسنت سے صحیح حکم معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس تحقیق وتجسس میں علماء وسلف کی ماہرانہ آراء سے بھی مدد لینی چاہیے، نیز اختلافی مسائل میں اسے ہر تعصب سے پاک ہو کر کھلے دل سے تحقیق کرنا چاہیے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب وسنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، پھر جو چیز حق معلوم ہو، اسی کی پیروی کرنی چاہیے۔'' [۱۸۲]

اسی طرح ڈاکٹر محمود احمد غازی عصرِ حاضر کے بعض فقہاء کی فقہی خدمات بارے لکھتے ہیں

''اب تک (نئے فقہی مسائل بارے اجتہاد کی) جو پیش رفت ہوئی ہے اس میں کسی متعین فقہی مسلک کی پابندی نہیں کی گئی۔ یوں بھی موجودہ حالات میں کسی متعین فقہی مسلک کی پابندی پبلک لا کی حد تک بہت مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف فقہوں میں بعض ایسے اجتہادات پائے جاتے ہیں جو آج کے دور میں مشکل معلوم ہوتے ہیں جبکہ دوسری فقہ میں اس کا (زیادہ مناسب) حل موجود ہوتا ہے''۔ [۱۸۳]

ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقاء وغیرہ مفکرین کا تو خیال ہے کہ تمام اجتہادی مذاہب کو ایک مجموعہ اور فقہی وحدت کی حیثیت دے کر ہر انفرادی مذہب (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ) کو اس وسیع فقہی مذہب کی مختلف آراء اور اقوال کا درجہ دے کر اس سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔ [۱۸۴]

تمام مکاتبِ فکر کی فقہی آرا سے استفادہ کے نتیجہ میں جو اجتہاد کیا جائے گا اسے بعض اہل علم نے ''غیر مسلکی اجتہاد'' یا ''وسیع المسلکی اجتہاد'' کا نام دیا ہے۔ [۱۸۵] اور اس ''وسیع المسلکی اجتہاد'' کے نتیجہ میں جو نئی فقہ تشکیل پا رہی ہے اس کے بارے ڈاکٹر محمود احمد غازی یوں رقم طراز ہیں ''فقہی مسالک کی حدود مٹ رہی ہیں۔ ایک نئی فقہ وجود میں آ رہی ہے جس کو نہ فقہ حنفی کہہ سکتے ہیں نہ مالکی، نہ حنبلی، نہ جعفری بلکہ اس کو ''اسلامی فقہ'' ہی کہا جائے گا۔ میں اس کے لیے ''Cosmopolitan Fiqh'' یعنی عالمی یا ہر دیسی فقہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں''۔ [۱۸۶]

عصرِ حاضر میں ''سدّ ذریعہ'' اصول کی اہمیت:

خلفاء راشدین نے ''سد ذریعہ'' اصول کا بھی استعمال کیا ہے۔ اور ''سد الذرائع'' سے مراد

تمام وہ ذرائع اور وسائل جو شرعی احکام کے اہمال (بے وقعت و بے توقیر کر دینے) کی طرف یا ممنوعاتِ شرعیہ (محرّمات) کی طرف لے جائیں، ان کو اختیار کرنے سے روکنا ہے۔[۱۸۷]

حقیقت یہ ہے کہ ہماری شریعت میں نہ صرف برائیوں سے روکا گیا ہے بلکہ برائی تک لے جانے والے ذرائع اور راستوں سے بھی روکا گیا ہے خواہ فی نفسہ وہ ذرائع حرام نہ بھی ہوں اور اس اہم اصول کا خلفاء راشدین نے بھی استعمال کیا ہے۔

عصرِ حاضر کے نئے پیش آمدہ مسائل خصوصاً نئی ایجادات، نئے افکار و نظریات، نئی تہذیبی روایات کے عواقب و نتائج پر فقہاء عصر کو گہری نظر رکھنی چاہیے اگر ان کی زد میں براہِ راست اسلامی بنیادی عقائد و نظریات، عبادات، منصوص معاملات یا اسلامی تعلیمات کے زیرِ اثر تشکیل پانے والا اخلاقی نظام و ڈھانچہ آتا ہو تو نہ صرف ان نئی ایجادات، نئے نظریات اور نئی تہذیبی روایات کی روک تھام کرنا ضروری ہوگا بلکہ ان تک لے جانے والے ذرائع کو بھی بند کرنا ہوگا۔[۱۸۸]

لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ ''سد ذریعہ'' کے طور پر ہر نئے نظریے اور ہر نئی ایجاد سے روک دیا جائے بلکہ ان کے مثبت اور منفی اثرات کا جائزہ لیا جائے اگر مفاسد زیادہ ہوں اور ان کے دور کرنے اور اصلاح کرنے کے امکانات بھی نہ ہوں تو ﴿اِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا﴾[۱۸۹] (ان کے نقصان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔) اصول کے تحت اسے ناجائز اور حرام قرار دیا جائے اور اگر فوائد، مفاسد پر غالب ہوں تو اس کے جواز کی رائے دی جائے اور اگر نقصانات کو دور کیا جا سکتا ہو تو انہیں دور کر کے استعمال کی اجازت دی جائے لیکن جب تک وہ مفاسد دور نہ ہوں تو سد ذریعہ کے طور پر عدمِ جواز کا اجتہادی فیصلہ بھی دیا جا سکتا ہے یہی باعث ہے کہ ہمارے بعض پاکستانی علماء و فقہاء کرام نے کچھ عرصہ قبل بعض مفاسد کی بنا پر ''سد ذریعہ'' کے طور پر انسانوں کے فاسد اعضاء کی انسانی اعضاء کے ساتھ پیوند کاری کو ناجائز قرار دیا تھا۔[۱۹۰]

عصرِ حاضر میں مسلمانوں پر مغربی تہذیب کا حملہ بڑے زور و شور کے ساتھ ہے لہٰذا فقہاء کرام کو ہندووانہ رسم پتنگ بازی، مغربی معاشروں کی رسوم جیسے میراتھن دوڑ خصوصاً مرد و زن کی مخلوط دوڑ اسی طرح ویلنٹائن ڈے وغیرہ فحاشی و عریانی کو فروغ دینے والی رسوم بارے ''سد ذریعہ'' اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنا اجتہادی فیصلہ پیش کر کے امت کی رہنمائی کرنا ہے۔

اس سے بہ سہولت اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں ''سد ذریعہ'' اصول کی کیا اہمیت و افادیت ہے۔

''عرف'' کا لحاظ و اعتبار:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج میں عرف کا لحاظ رکھنا بھی ہے جو دراصل قرآن و حدیث سے ہی مستنبط ہے۔ لہٰذا عصرِ حاضر کے فقہاء کرام کو نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کیلئے عرف کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

عرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاء کرام نے بجا طور پر یہ شرط لگائی ہے کہ وہ شریعت کے منافی نہ ہو مثلاً دنیا بھر میں یہ قانون بن چکا ہے کہ کسی مجرم کو سرِ عام پھانسی نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس سے اس مجرم کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور اس کی آڑ میں اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ اب یہ عالمی عرف بن چکا ہے لہٰذا آیت کریمہ ﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾[۱۹۱] (اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت بھی موجود ہو۔) کے مطابق عمل نہ کیا جائے گا تو یہ یقیناً غلط ہو گا کیونکہ نصوص کے مقابلہ میں خاص مغربی غیر اسلامی سوچ پر مبنی عرف کی کوئی حیثیت نہ ہو گی۔

عصرِ حاضر میں جس قدر جدید طرقِ تجارت سامنے آئے ہیں ان میں اگر سود، جوا، غرر اور ظلم نہ ہو تو انہیں عرفاً جائز قرار دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح ایک چیز اگر کچھ عرصہ پہلے مال متقوم کی حیثیت نہ رکھتی تھی مگر اب عرف میں اس کو یہ حیثیت مل چکی ہے تو اس کا اعتبار کیا جانا چاہیے۔

عصرِ حاضر کے جدید فقہی مسائل، رسوم ورواج، طرقِ تجارت وغیرہ کے بارے اجتہاد کرتے ہوئے عرف کا لحاظ ضرور رکھا جائے مگر اس کا یہ مطلب نہ ہونا چاہیے کہ ہر غیر اسلامی نظریہ اور تہوار وغیرہ کو عرف کا سہارا لے کر جائز قرار دے دیا جائے۔

یاد رہے جو حکم عرف کی بنیاد پر لگایا گیا ہو، عرف کے تبدیل ہو جانے کی صورت میں وہ بدل بھی جاتا ہے اسی طرح مختلف ممالک اور مختلف علاقوں کے عرف مختلف ہونے کی وجہ سے بھی کسی ایک مسئلہ میں حکم مختلف ہو سکتا ہے۔

سابقہ شرائع کے احکام سے استفادہ:

خلفاء راشدین میں سے صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک ایسی مثال ان کے اجتہادی منہج میں دی گئی ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے غالباً اس موقع پر سابقہ شرائع کے احکام سے استفادہ کیا ہو گا باقی خلفاء کے بارے کوئی ایسی مثال نہیں مل سکی غالباً اسی لیے ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں نے لکھا ہے ''تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ انہوں نے

قرآن وسنت سے کسی مسئلہ کا حکم نہ ملنے کی صورت میں کسی سابقہ شریعت کا اتباع کر کے اس مسئلہ کا حکم دریافت کیا ہو، حالانکہ ان کے درمیان کعب الاحبار رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے شرائع سابقہ کے ثقہ عالم موجود تھے''۔[۱۹۲]

ڈاکٹر عرفان خالد کی اس تحقیق کے نتیجہ میں کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ سابقہ شرائع منسوخ ہو چکی ہیں لہٰذا خلفاء راشدین نے سابقہ شرائع کی طرف غالباً شاذ و نادر ہی رجوع کیا ہے بلکہ دیگر مصادر شریعت کی طرف مراجعت کی ہے۔ عصر حاضر کے علماء کرام کو بھی اسی شریعت کی طرف رجوع کرنا ہے جو کامل واکمل ہے جیسا کہ خود اللہ رب العلمین فرماتے ہیں:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾۔[۱۹۳]

''آج ہم نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔''

حالات وظروف کا اعتبار:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کے ضمن میں ان کے اجتہادات کی کئی ایک مثالوں کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ انہوں نے بدلتے ہوئے حالات وظروف کا بھی اعتبار کیا جس کے نتیجہ میں ان کی اجتہادی آراء میں بھی تبدیلی آئی۔

حالات وظروف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر مجتہد کا اجتہاد امت کے لیے مشقت وحرج کا باعث بن سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں سے حرج دور کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ﴾[۱۹۴]

''خدا تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنی چاہتا۔''

حقیقت یہ ہے کہ حالات وظروف مفتیوں کے فتووں اور مجتہدین کے اجتہادات پر انتہائی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لیے فقہاء کے ہاں یہ جملہ مشہور ومعروف ہے:

'' لا ینکر تغیر الا حکام بتغیر الا زمان ''. [۱۹۵]

''اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالات وظروف کے بدلنے سے احکام میں بھی (بظاہر) تبدیلی ہو جاتی ہے۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''اعلام الموقعین'' میں تو ایک فصل کا عنوان ہی یہ رکھا ہے، چنانچہ آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فصل في تغير الفتوى و اختلافها بحسب تغير الازمنه و الامكنة والاحوال والنيات و العوائد "[۱۹۶]

"فصل جو کہ اس بارے ہے کہ زمان و مکان، درپیش حالات، عرف و عادت اور نیتوں کی تبدیلی سے فتویٰ میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔"

لیکن حالات وظروف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ مجتہدین اباحیت پسندی کا شکار ہو کر حالات وظروف کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنے کی بجائے محض پسپائی کا راستہ اختیار کر لیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں حالات وظروف کو پیش نظر رکھتے ہوئے مشقت وحرج کے باعث کوئی وقتی فتویٰ دیا جائے وہاں حالات وظروف کو بھی شریعت کے زیرِ اثر لانے کی ممکنہ کوشش کی جائے اور لوگوں کی ایمانی، عملی و اخلاقی حالت کو بھی بہتر بنانے کی سعی کی جائے۔ گزشتہ فصل میں مناکحات سے متعلقہ مسائل، جدید طرقِ تجارت اور غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے فقہی واجتہادی مسائل حل کرنے کے حوالے سے حالات وظروف کے اعتبار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اخلاصِ نیت اور خوفِ خدا کے ساتھ اجتہاد کیا جائے:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے مستفید ہوتے ہوئے ہر دور کے فقہاء و مجتہدین کو بھی اخلاصِ نیت کے وصف کے ساتھ متصف ہونا چاہیے اور اجتہاد کرتے ہوئے خوفِ خدا، اللہ کے حضور پیشی اور جوابدہی کا احساس غالب ہونا چاہیے کیونکہ یہ وہ قیمتی متاعِ مومن ہے جو اسے گمراہیوں کی وادی میں داخل نہیں ہونے دیتی۔ عصرِ حاضر میں بعض نام نہاد مجتہدین نے ان دو اوصاف سے محرومی کے بعد "اجتہاد" کے نام پر دینِ اسلام کا حلیہ بگاڑنے اور تبدیل کرنے پر سارا زور لگا دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی افکار و نظریات کو اسلامی ثابت کر دکھانا ہی ان کا کام رہ گیا ہے۔ ایسے روشن خیال جدت پسند اور مغربی افکار سے مرعوب حضرات کبھی اسلام کے بہت سارے احکام کو عرب معاشرے کے ساتھ مخصوص ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کبھی محرماتِ شرعیہ کو کسی نہ کسی طرح حلال کر کے مغربی آقاؤں کو خوش کرنا چاہتے ہیں لہٰذا ان نام نہاد مجتہدین کی طرف سے کبھی حلتِ سود کا فتویٰ آتا ہے اور کبھی عورت کی امامت وخطابتِ جمعہ کے جواز کی رائے۔

عصرِ حاضر کے فقہاء کرام اگر خلفاء راشدین کو اپنے لیے اسوہ و نمونہ قرار دے لیں تو کسی بھی منفرد رائے کے اظہار سے پہلے بار ہا سوچیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے آتا ہے کہ

آپ رضی اللہ عنہ نے جد (دادا) اور کلالہ (وہ میت جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا) کے بارے میں ایک تحریر لکھی اور پھر اس کے بارے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتے رہے مگر جب آپ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس تحریر کو منگوا کر بغیر کسی کو بتائے ضائع کر دیا اور فرمایا ''میں نے جد اور کلالہ بارے ایک تحریر لکھی تھی اور اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تھا، مگر پھر میری یہی رائے ہوئی کہ میں تمہیں اسی حال پر رہنے دوں، جس پر تم تھے''۔[۱۹۷]

عصرِ حاضر کے جدید فقہی مسائل کے حل کے لیے اسی طرح کے اخلاصِ نیت اور خوفِ خدا کے حامل مجتہدین کی امت کو ضرورت ہے جو نہ تو وقت کے حکمرانوں کی کاسہ لیسی، چاپلوسی اور خوشامدیں کرتے ہوں اور نہ دنیا پرستی کی بیماری میں مبتلا ہوں۔

مآخذ شریعت سے بالترتیب استفادہ:

بنیادی طور پر مآخذ شریعت صرف دو ہیں یعنی قرآن مجید اور حدیث وسنت۔ ان دو کے علاوہ جتنے بھی مصادرِ شریعت علماء نے مقرر کیے ہیں وہ دراصل قرآن وسنت سے ہی ماخوذ ومستنبط ہیں۔ ان تمام مصادر میں سے اولین درجہ قرآن وسنت کو حاصل ہے، اور ان دو کے بعد اجماع، قیاس، استحسان کا بالترتیب درجہ ہے لہٰذا ان مصادر سے استفادہ بھی بالترتیب ہونا چاہیے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ امت میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے طریقِ اجتہاد بارے بتایا تھا کہ وہ نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے سب سے پہلے قرآن کی طرف پھر حدیث وسنت کی طرف مراجعت کریں گے اور پھر کتاب وسنت کی روشنی میں اجتہاد کریں گے، لیکن عملی طور پر سب سے پہلے بکثرت اس ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس ہستی نے اجتہادات کیے وہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور اسی طرزِ عمل کو بعد کے خلفاء کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اختیار کیا ہے۔ اس ترتیب کو ملحوظ رکھنے سے یقیناً مصادر شریعت میں قرآن وحدیث کا مقام ومرتبہ نہ صرف نمایاں ہوتا ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹنے کے حکمِ الٰہی کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں۔[۱۹۸]

عصرِ حاضر کے دسیوں مسائل ایسے ہیں جن کی نظائر قدیم کتبِ فقہ سے بھی نہیں ملتی ہیں البتہ قرآن وحدیث کے اصول وکلیات سے اس بارے رہنمائی ضرور مل سکتی ہے لہٰذا مآخذ شریعت سے بالترتیب استفادہ کی ضرورت محسوس کی جانی چاہیے۔

اجتہاد کی حیثیتِ شرعی:

معلوم یہ ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے یہ خطرہ بھانپ لیا تھا کہ کہیں ان کے اجتہادات کو شریعت کا درجہ نہ دے دیا جائے اور امت اسی خرابی میں نہ مبتلا ہو جائے جس میں بعض سابقہ امم مبتلا ہوگئی تھیں۔ سابقہ امم کی اس خرابی کو قرآن" اتخذا ارباب من دون الله "(غیر اللہ کو رب و حاکم بنالینا) کے الفاظ سے یاد کرتا ہے [۱۹۹] یعنی فقہاء و مجتہدینِ کرام کے اقوال و فقہی آراء کو شریعت کا درجہ دے کر ان فقہاء کو شارع کا درجہ دینا یا بالفاظ دیگر انہیں رب بنالینا۔[۲۰۰] اسی خطرہ کے پیشِ نظر خلفاء کرام نے امت کے سامنے واضح کیا کہ ان کے اجتہادات محض اجتہادات ہیں نہ کہ شریعت۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا:

" ان الرای انما کان من رسول الله صلى الله عليه وسلم لان الله كان يريه وانما هو منا الظن والتكلف ".[۲۰۱]

''چونکہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیتا تھا لہٰذا رائے تو رسول اللہ ﷺ کی ہی (معتبر) ہوتی تھی جبکہ ہماری رائے محض ظن و تخمین اور تکلف پر مبنی ہوتی ہے۔''

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"والله ما یدری عمران هذا هو الصواب او الخطا ولکنی لم آل عن الحق "[۲۰۲]

''اللہ کی قسم! عمر نہیں جانتا کہ یہ صحیح ہے یا غلط مگر میں نے حق تک پہنچنے کے لیے کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔''

عصرِ حاضر کے فقہاء کرام کو بھی اسی روش کو اختیار کرنا ہوگا کہ وہ اپنے اجتہادات کو محض اجتہادی آراء کا درجہ دیں اور اپنی اجتہادی آراء کو حرفِ آخر نہ سمجھیں۔ جب یہ سوچ پیدا ہوگی تو وہ یقیناً اپنی رائے میں خطا کا احتمال اور دوسروں کی رائے میں درستگی کا احتمال سمجھتے ہوئے رواداری کا مظاہرہ کریں گے۔

اجتہاد سے رجوع کو باعثِ عار نہ سمجھا جائے:

ہر انسان خطا کا پتلا ہے لہٰذا غلطی ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے البتہ قبیح اور ناپسندیدہ بات

یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی غلطی کو جانتے بوجھتے درست اور صحیح ثابت کرنے کے لیے ادھر ادھر کی تاویلیں شروع کر دے اور اس غلطی کو غلطی تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ ایک مجتہد جو شارع کا نائب بن کر اجتہادی فیصلہ امت کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کے لیے تو قطعاً یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [۲۰۳] (پروردگار نے حرام کیا ہے) اس کو بھی کہ خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمھیں کچھ علم نہیں۔) کا مصداق بنے۔

اجتہادی نتیجہ میں مجتہد کا کبھی غلطی کر جانا کوئی بعید از عقل نہیں حتیٰ کہ اس قاعدہ کلیہ سے بغیر کسی استثناء کے کسی بھی مجتہد کو بری اور محفوظ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خود خلفاء راشدین نے کئی بار بوجوہ اپنی سابقہ رائے سے رجوع کیا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے آتا ہے کہ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی سابقہ رائے و فیصلہ کے برعکس رائے کا اظہار کیا تو ایک شخص نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ فلاں موقع پر تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں یوں فیصلہ دیا تھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''وہ ہمارا اس وقت کا فیصلہ تھا اور یہ ہمارا آج کا فیصلہ ہے''۔[۲۰۴]

معاصر فقہاء و مجتہدین کرام کو خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کرتے ہوئے اس وصف کو بھی اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا کہ اگر کسی وقت اپنی اجتہادی غلطی کا احساس ہو یا حالات و ظروف کی تبدیلی فتویٰ و اجتہاد کی تبدیلی کا تقاضا کرے اور سابقہ اجتہاد سے رجوع کرنا پڑے تو اسے باعثِ عار اور توہین و بے عزتی کا سبب نہ سمجھ لیا جائے۔ مجتہدین کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح کسی رائے کے قائم کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنا چاہیے اور ہمیشہ اس مفہوم کی دعا کا اہتمام کرنا چاہیے:

> " اللھم ارنی الحق وارزقنی اتباعه وارنی الباطل وارزقنی اجتنابه"
>
> ''اے اللہ! مجھے راہِ حق دکھا اور اس پر چلنے کی بھی توفیق عطا فرما، باطل بھی دکھلا مگر باطل کو اختیار کرنے سے محفوظ فرما۔''

اختلافِ رائے کی گنجائش کو تسلیم کیا جائے:

ذہنی و عقلی سطحوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے، اسی طرح سوچنے سمجھنے کے انداز مختلف ہونے کی وجہ سے کسی ایک مسئلہ بارے آراء کا مختلف ہونا لازمی امر ہے۔ خلفاء راشدین نے کئی ایک مسائل میں باہم اختلاف کیا ہے اور بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کبھی خلفاء کرام سے اختلاف کیا ہے مگر اس اختلافِ رائے کے باوجود وہ ایک دوسرے کا ادب واحترام کرتے اور باہم دلی محبت و انس رکھتے تھے۔ اس اختلافِ رائے نے ان کے قلوب میں حسد و بغض اور کینہ و حقد پیدا نہ کیا تھا۔ باہم

ادب واحترام کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے کی رائے کا بھی احترام کرتے تھے اور خلیفہ وقت ہونے کے باوجود دوسرے فقہاء صحابہ پر اپنی رائے جبراً مسلط نہ کرتے تھے بلکہ دلیل کی بنیاد پر ہی اپنی رائے منواتے تھے۔

عصرِ حاضر کے فقہاء کرام اور مجتہدین کو بھی اسی طرزِ عمل کو اختیار کرتے ہوئے اپنی اپنی آراء پیش کرنی چاہیں اور اپنی رائے سے اختلاف کرنے کا دوسروں کو حق دینا چاہیے، اس سے یقیناً الفت ومحبت کا ماحول تشکیل پائے گا۔

آیات واحادیث کے احکام کا موقع ومحل متعین کرنا:

منصوص احکام میں اجتہاد نہیں کیا جاسکتا البتہ ان منصوص احکام کے موقع ومحل کو متعین کرنے بارے اجتہاد کی شرعاً گنجائش موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح نص کے کسی وسیع المعنی کلمہ یا جملہ کے اطلاقات کیا ہیں اور کیا نہیں، اس بارے اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو امت میں سب سے پہلی دفعہ خلفاء راشدین نے ہی فقہاء امت کو سمجھایا ہے۔

منصوص احکام کے موقع ومحل کے تعین کی ضرورت عصرِ حاضر یا آئندہ مستقبل میں بھی پیش آسکتی ہے اسی طرح کسی کلمہ کے اطلاقات کا تعین بھی ہر دور میں مختلف ہوسکتا ہے فی الوقت آیت مصارف زکوٰۃ میں سے ﴿وَفِی الرِّقَابِ﴾ اسی طرح ''بیع قبل القبض '' وغیرہ کے مفہوم اور اطلاقات کے تعین کی ضرورت ہے۔[۲۰۵]

نص کا ہمیشہ اعتبار کبھی حرج ومشقت کا باعث بن سکتا ہے:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے ہی یہ نکتہ بھی مستفاد ہوا ہے کہ کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ جب کسی ایک خاص نص کا یا بعض نصوص کا اعتبار ولحاظ کیا جانا امت کے لیے حرج ومشقت کا باعث بن جائے تو ایسی صورت میں پھر روحِ شریعت کی روشنی میں کسی مناسب فیصلے اور نتیجے پر پہنچا جانا چاہیے۔

خلفاء راشدین کے اس نکتے کو عصرِ حاضر کے فقہی مسائل میں اجتہاد کرتے ہوئے ملحوظ رکھنا یقیناً امت کے لیے خیر وبرکت کا باعث ہوگا۔ قطبین پر اور اس جیسے دیگر علاقوں میں ادائیگی صلوٰۃ اور روزوں کے اوقات کا عام نصوص سے تعین حرج اور مشقت کا باعث ہے۔ اس حرج ومشقت کو دور کرنے کے لیے چند خاص نصوص پر اصرار کی بجائے دیگر نصوص اور روحِ شریعت کی روشنی میں فقہاء کرام کو کوئی اجتہادی فیصلہ دینا ہوگا۔

امرِ مباح پر بوقتِ ضرورت پابندی:

مباح کام سے مراد وہ کام ہے جس کے کرنے کو شارع نے جائز قرار دیا ہو مگر نہ تو اس کا حکم دیا ہو اور نہ اس سے منع کیا ہو۔[۲۰۶] خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ خلیفہ وقت یا حاکمِ وقت اگر ضرورت محسوس کرے تو علماء وفقہاء سے مشاورت کے بعد کسی مباح کام کے کرنے پر پابندی لگا سکتا ہے جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بوقتِ ضرورت تین دنوں سے زیادہ تک قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔[۲۰۷]

عصرِ حاضر کے مسلمانوں کے معاشرتی مسائل میں سے ایک مسئلہ لڑکیوں کی شادی کا ہے۔ کتنی ہی لڑکیاں محض اس وجہ سے کنواری اور بے نکاحی بیٹھی ہیں کہ ان کے والدین انہیں قیمتی اور مہنگا جہیز نہیں دے سکتے حالانکہ جہیز دینا محض مباح امور میں سے ہے نہ کہ والدین کا فریضہ۔ بچیوں کی پیدائش کو آج بھی اسی لیے منحوس سمجھا جانے لگا ہے کہ کل کلاں ان کی شادی بیاہ کے اخراجات کیوں کر برداشت کیے جائیں گے۔ ادھر لڑکے والے بارات میں پانچ سات سو افراد کو ساتھ لے آتے ہیں اور یوں بچی والوں کا تو بھرکس ہی نکال دیتے ہیں۔

عصرِ حاضر کے علماء وفقہاء کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ حاکمانِ وقت کو ان معاشرتی مسائل، ان کی خرابیوں اور ان کے معاشرے پر خطرناک اثرات بارے نہ صرف آگاہ کریں بلکہ مہنگے جہیز لینے دینے پر پابندی لگا دینے کا مطالبہ کریں اور دعوتِ ولیمہ وغیرہ میں محض ون ڈش کے اہتمام کی عوام کو اجازت کی تجویز دیں تاکہ غربا بیچاروں کی بچیوں کے بھی ہاتھ مہندی کے رنگ سے رنگے جائیں اور معاشرہ زنا کاری وبدکاری اور بے راہ روی کے اثرات سے محفوظ ہو جائے۔

خلفاء راشدین کے بوقتِ ضرورت مباح امور پر پابندی لگانے کے طرزِ عمل سے خلیفہ وقت کے تشریعی اختیارات کے بارے بھی رہنمائی ملتی ہے۔

واقعاتی مسائل میں غور وخوض کیا جائے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے پیش آمدہ مسائل بارے استفسارات کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نازل شدہ وحی کی روشنی میں اس کا جواب دے دیتے بشرطیکہ اس مسئلہ بارے پہلے سے آیات نازل ہو چکی ہوتیں۔ لیکن اگر اس مسئلہ بارے آیات نازل نہ ہوئی ہوتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی کا انتظار کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی فرضی مسائل گھڑ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے

پیش نہ کیے کہ وہ اس بارے غور وفکر کریں تا کہ ان کی اجتہادی صلاحیت کو جلا ملے بلکہ ایک دفعہ آپ ﷺ سے ایک شخص نے فرضی انداز میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں مروی حدیث میں ہے کہ حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ، عاصم بن عدی انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا:

''ارایت رجلا وجد مع امراتہ وجلا ایقتلہ فتقتلونہ؟ ام کیف یفعل''

''آپ ﷺ کا اس شخص بارے کیا خیال ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی (اجنبی) کو (حالت زنا میں) دیکھے، آیا وہ اسے قتل کر دے؟ تو پھر اس (مقتول) کے ورثاء اسے قتل کر دیں گے یا پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟''

اور پھر حضرت عویمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ یہ سوال رسول اللہ ﷺ سے پوچھیں۔ انہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ سوال پوچھا تو آپ ﷺ کے بارے اسی روایت میں ہے:

''فکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم المسائل و عابہا''.[۲۰۸]

''رسول اللہ ﷺ نے (ایسے فرضی) مسائل کو ناپسند جانا اور اسے معیوب قرار دیا۔''

رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین بلکہ عہد صحابہ و تابعین تک یہی طریقہ کار رہا کہ محض پیش آمدہ مسائل بارے ہی غور وفکر کیا جاتا اور اجتہادی رائے کا اظہار کیا جاتا۔

عہدِ تابعین کے اواخر میں فقہاء کرام کا طرزِ عمل بدلا اور اب یہ رجحان پیدا ہوا کہ فرضی طور پر مسائل بنا کر ان کے حل بارے سوچا جائے۔ ابتدا میں یہ رجحان غالباً اس خیال سے پیدا ہوا کہ مسائل کا حل ان کے وقوع سے قبل ہی سوچ لیا جائے تا کہ ادھر مسئلہ پیش آئے اور ادھر اس کا حل پیشگی طور پر معلوم ہو مگر بعد میں اس طرزِ عمل بارے غلو کا راستہ اختیار کرتے ہوئے بہت زیادہ تعداد میں فرضی اور ناممکن الوقوع قسم کے مسائل بھی فرض کر کے اجتہاد نہ کیا گیا بلکہ دراصل ذہنی ریاضتیں کی گئیں جس کا نتیجہ ہے کہ کتبِ فقہ کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی دل چونک اٹھتا ہے کہ یہ ان فقہاء کے اجتہادات ہیں یا محض فقہی پہیلیاں اور موشگافیاں۔ چنانچہ سید سابق رحمہ اللہ لکھتے ہیں

''فقہ اسلامی جس کی بدولت اللہ نے ان (مسلمانوں) کی زندگی کے منتشر شیرازہ کو منظم کر دیا تھا اور ان کی دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنایا تھا، اس

قدر زوال کا شکار ہوگئی ماضی میں اس زوال کی کوئی مثال نہ ملتی تھی حتیٰ کہ تصور
کیا جانے لگا کہ فقہ اسلامی کو پڑھنا پڑھانا ایک بیکار مشغلہ ہے جس سے عقل
اور دل فساد کا شکار ہوتے ہیں وقت ضائع ہوتا ہے اور اس میں دین و دنیا کا
کوئی فائدہ نہیں'' [۲۰۹]

خلفاء راشدین کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ محض واقعاتی مسائل بارے ہی غور و فکر کرتے تھے اور ان کا اجتہادی حل پیش کرتے تھے چنانچہ ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علانیہ فرمایا:

''لایحل لا حد ان یسال عمالم یکن'' [۲۱۰]

''کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ایسی چیز کے بارے میں سوال کرے
جس کا ابھی تک وقوع نہ ہوا ہو۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ غیر واقعاتی مسائل بارے سوال کرنے والے پر لعنت بھی کی چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''لا تسألوا عمالم یکن فانی سمعت عمر یلعن من سال عما لم
یکن'' [۲۱۱]

''ایسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرو جس کا ابھی تک وقوع ہی نہ ہوا ہو کیونکہ
میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو ایسے آدمی پر لعنت کرتے ہوئے سنا ہے جو غیر واقع چیز
کے بارے سوال کرتا ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرضی سوالات کو ناپسند کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس طرح کے سوالات تراشنے کے بعد کہیں اللہ تعالیٰ ان مسائل میں بطور آزمائش مبتلا نہ کر دے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ذکر کردہ مذکورہ بالا واقعہ میں آتا ہے کہ چونکہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے وہ فرضی انداز میں سوال کیا تھا لہٰذا ان کی ایک عزیزہ کے ساتھ ہی یہ واقعہ پیش آ گیا، اسی لیے وہ خود کہتے ہیں:

''ماابتلیت بهذا الالقولی'' [۲۱۲]

''میں اس مصیبت میں (غالباً) اپنے سوال کرنے پر ہی پھنس گیا۔''

غیر مسلموں سے استفادہ اور اس کے اصول:

خلفاء راشدین بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب روم و ایران جیسی اس دور کی Super Powers اسلامی ریاست کا حصہ بنیں تو چونکہ یہ متمدن اقوام تھیں اور بڑی حد تک اس

دور کی ترقی یافتہ بھی لہٰذا ان غیر مسلموں کے انتظامی اعتبار سے اور جنگی و دفاعی اعتبار سے کئی مفید ادارے، ایجادات اور سرگرمیاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشاہدہ میں آئیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں اختیار کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے بلا جھجک ان کی ایجادات اور مفید انتظامی نوعیت کے اداروں سے استفادہ کرتے ہوئے ملکی نظم و نسق چلایا البتہ کفار سے اس استفادہ کے موقع پر آپ رضی اللہ عنہ کو جو امور خلافِ شرع نظر آئے ان میں ضروری اصلاح و ترمیم کر دی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل کا تفصیلی تذکرہ آپ رضی اللہ عنہ کے اجتہادی منہج کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ہر دور کے مجتہدین کو غیر مسلموں سے استفادہ کے درج ذیل فاروقی اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجتہاد کرنا چاہیے۔

i۔ الحکمة ضالة المومن فمن حیث وجدها فهو احق بها۔

"حکمت مومن کی گمشدہ دولت ہے وہ اسے جہاں سے بھی ملے اس پر اسی کا حق زیادہ ہے۔"

ii۔ خذما صفاو دع ما کدر۔

"میٹھا میٹھا ہڑپ کڑوا کڑوا تھو۔"

حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں طب اور اقتصادیات وغیرہ کے میدان میں اکثر ایجادات و ترقیات غیر مسلم اقوام کے ذریعے ہوئی ہیں لہٰذا محض اس وجہ سے انہیں مسترد کر دینا اور ان کے استعمال کو حرام قرار دینا کہ یہ غیر مسلموں کی مصنوعات ہیں تو شرعاً یہ کوئی درست طرزِ عمل نہ ہوگا بلکہ اس طرح کی پابندی جہاں حرج و تنگی کا باعث بنے گی وہاں مسلم عوام کی خودسری کا باعث بھی بنے گی کہ وہ علماء و فقہاء کے فتاویٰ کی پرواہ کیے بغیر اباحت پسندی پر اتر آئیں گے۔ یہ دراصل مختلف اقوام کا تہذیبی و تمدنی اختلاط کی وجہ سے باہمی استفادہ ہوتا ہے اور ایسا ہمیشہ سے اقوام میں ہوتا رہتا ہے۔ یاد رہے علوم و فنون اور ایجادات تمام دنیا کے انسانوں کی مشترکہ میراث ہے جس پر کسی کی بھی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ مغربی تہذیب کی خوبیوں، ایجادات و انکشافات اور مفید انتظامی اداروں سے استفادہ بارے ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں "سائنسی ایجادات و انکشافات کی طرح یورپ میں کچھ ادارے (Institutions) بھی پروان چڑھے ہیں اور ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ان میں جو ادارہ ہمارے اصولوں کے ساتھ مطابقت رکھنے والا ہو، اس کو اختیار کریں۔ اس لیے کہ وہ بھی ہماری مشترکہ متاع ہیں"۔[۲۱۳] اسی طرح آپ لکھتے ہیں کہ جدید مغربی تہذیب کی خوبیوں اور اچھائیوں سے استفادہ بارے علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کا بھی یہی نکتہ نظر رہا ہے چنانچہ آپ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"علامہ اقبال درحقیقت وہ شخص ہیں جنہوں نے تہذیب جدید کا تجزیہ کر کے

اس میں سے غلط چیزوں کو چھانٹ کر علیحدہ کر دیا ہے اور جو چیزیں صحیح ہیں ان کو علیحدہ کر دیا ہے۔ اگر آپ ان صحیح چیزوں کو اختیار نہیں کریں گے تو آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے اور اگر آپ غلط چیزوں کو اختیار کرتے ہیں تو پھر آپ ویسے اپنا بیڑہ غرق کرتے ہیں اور یہ طرزِ عمل آپ کی تہذیب کے منافی ہے لیکن مغربی تہذیب، مغربی فکر یا مغربی اقدار کو مکمل طور پر رد کر دینا کوئی معقول روش نہیں۔ یہ رویہ کسی معقول انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔" [۲۱۴]

حقیقت یہ ہے کہ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ (م۱۹۳۸ء) سے بھی صدیوں قبل غیر مسلموں سے استفادہ کا عملی نمونہ خلفاء راشدین بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امت اور فقہاء امت کے سامنے واضح طور پر پیش کیا ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے ہی ان کے اجتہادی منہج کے ضمن میں لکھا جا چکا ہے کہ عرصہ تک عجم کے بنائے ہوئے سکّوں کے استعمال کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے وسائل کی دستیابی پر اسلامی سکّوں کے بنانے کیلئے مسلمانوں کی ذاتی ٹکسال بنانے کا انتظام فرمایا جس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ غیر مسلموں سے استفادہ ضرور کیا جائے مگر اس استفادہ کی روشنی میں مسلمان اپنی ملی و دینی غیرت وحمیت کا ثبوت دیتے ہوئے خود بھی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا سوچیں۔ غیر مسلموں سے استفادہ کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ ان سے استفادہ کرتے کرتے اپنا قومی و ملی تشخص ہی کھو بیٹھیں اور ہمیشہ کے لیے ان کے دستِ نگر بن کے رہ جائیں۔

عصرِ حاضر اور انفرادی واجتماعی اجتہاد:

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کی بحث میں ان کے اجتہادات کی یہ خصوصیت قدرے تفصیل کے ساتھ تحریر کی جا چکی ہے کہ انہوں نے انفرادی قسم کے معاملات میں انفرادی اجتہاد بھی کیا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اہم اور اجتماعی امور میں مشاورتی یا شورائی اور اجتماعی نوعیت کا اجتہاد کرتے تھے۔ لہٰذا عصرِ حاضر کے فقہاء و مجتہدین کرام کو بھی خلفاء کرام کے اجتہادی منہج سے مستفید ہوتے ہوئے اس روش کو اختیار کرنا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے طاعون کی بیماری پھیلنے پر طاعون زدہ علاقے (شام) میں جانے یا نہ جانے بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے استفادہ کرتے ہو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں "اس حدیث سے جو فوائد مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے ایک مناظرے کی مشروعیت ہے اور یہ کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں مشاورت ہونی چاہیے"۔ [۲۱۵]

کسی ایک فرد یا چند افراد سے متعلقہ کسی مسئلہ میں انفرادی نوعیت کا اجتہاد مجتہدین کر سکتے ہیں لیکن عصرِ حاضر کے بے شمار اور بیشتر مسائل ایسے ہیں جو ہمہ پہلو ہیں۔ گزشتہ دو صدیوں سے علوم و فنون میں اس حد تک اضافے ہوئے ہیں کہ ان کی مختلف شاخیں بن چکی ہیں اور ان شاخوں کی بھی آگے مزید تقسیم ہو رہی ہے۔ علوم کی اس تقسیم در تقسیم میں لوگ تخصص حاصل کر رہے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ آج کوئی ایک شخص تمام قسم کے علوم کا جامع نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف محال و مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا ہو گیا ہے کہ اجتہاد کی تمام شرائط فردِ واحد میں بدرجہ کمال پائی جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر میں اجتماعی اجتہاد کی اہمیت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

تمام علوم کا جامع نہ ہونے کی وجہ سے مجتہد جب کسی ہمہ جہتی مسئلہ میں اجتہاد کرے گا تو اس کے غلطی میں واقع ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں اور ایسی کئی مثالیں بھی سامنے آ چکی ہیں کہ بعض مجتہدین نے جدید اقتصادی اور طبی مسائل میں انفرادی طور پر اجتہاد کیا مگر چونکہ ان کی معلومات جدید اقتصادیات اور جدید میڈیکل سائنس بارے ناقص تھیں لہذا بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوا اور رجوع کرنا پڑا۔[۲۱۶]

انفرادی اجتہاد کرنے سے ایک ہی مسئلہ میں مختلف مجتہدین کی مختلف آراء سامنے آنے کے امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا جبکہ عصرِ حاضر میں خصوصاً مسلمانوں کی دینی حالت اس اختلافِ آراء کی متحمل نہیں بالفاظ دیگر انفرادی اجتہاد کو لوگ اہمیت ہی نہ دیں گے اور وہ اس خلش کا شکار ہوں گے کہ اس مسئلہ میں تو علماء کا ہی اتفاق نہیں اور پھر وہ اپنی من مانی پہ اتر آئیں گے۔

عصرِ حاضر میں اجتماعی اجتہاد کے محرکات:

عصرِ حاضر میں ''اجتماعی اجتہاد'' کے کئی ایک محرکات و اسباب ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

i۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ [۲۱۷] (اور اپنے کاموں میں ان سے مشورت لیا کرو۔) کے الفاظ کے ساتھ نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو مشاورت کا حکم دیا ہے تو آپ ﷺ کی امت کو تو بالاولیٰ مشاورت کی ضرورت ہے۔

اسی لیے اللہ عزوجل نے امتِ مسلمہ کے بارے فرمایا:

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾[۲۱۸]

''اور وہ اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں۔''

نیز نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک سوال (جب نیا معاملہ پیش آئے تو

آپ ﷺ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟) کے جواب میں انہیں نصیحت فرمائی تھی:

"شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه براى خاص"[۲۱۹]

"عبادت گزار فقہاء سے مشاورت کرو اور کسی کی مخصوص رائے (انفرادی) کو اختیار نہ کرو۔"

یہ نصیحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے جمیع امت کو ہے لہٰذا مشاورتی اجتہاد کیا جانا چاہیے۔اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اذا رايتم الخلاف فعليكم بالسواد الاعظم"[۲۲۰]

"جب تم (کسی مسئلہ میں علما کا) اختلاف دیکھو تو اکثریتی رائے کو اختیار کرلو۔"

نیز "الشيطان مع الواحد وهو عن الاثنين ابعد"[۲۲۱]

"اکیلے آدمی کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جبکہ دو سے وہ نسبتاً دور ہوتا ہے۔"

انہی دو روایات کی بنیاد پر بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اجتماعی اجتہاد میں چونکہ کافی حد تک اتفاقی رائے قائم ہونے کا امکان ہے لہٰذا ایسی اکثریتی رائے اگرچہ حجت نہیں مگر اسے اختیار کرنا اولیٰ ضرور ہے۔[۲۲۲]

مذکورہ بالا قرآن وحدیث پر مبنی دلائل کے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ اور پھر خلفاء راشدین کے مشاورتی اجتہادات ہر دور کے فقہاء امت کو مل بیٹھ کر شورائی و اجتماعی اجتہاد کرنے کی دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

ii۔ اس وقت دنیا بڑی حد تک Global Village کی حیثیت اختیار کر چکی ہے بالفاظِ دیگر اجتماعیت کا روپ دھار چکی ہے لہٰذا پیش آمدہ مسائل بھی اجتماعی قسم کے ہیں اس لیے اجتماعی اجتہاد کیا جانا چاہیے۔

iii۔ عصرِ حاضر کے جدید مسائل کافی حد تک پیچیدہ اور ہمہ گیر ہیں دوسری طرف تمام علوم کے جامع مجتہدین کا وجود ناممکن ہو گیا ہے لہٰذا اس نقصان کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ اجتماعی اجتہاد کا کوئی ادارہ بنایا جائے جس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین کے باہم افادہ و استفادہ سے امید ہے نئے مسائل کا بہتر حل تجویز کیا جا سکے گا۔

iv۔ اجتماعی اجتہاد سے باہم مذاکرہ، مباحثہ اور مشاورت کے ماحول سے کسی مسئلہ کے تمام پہلو نکھر کر سامنے آجائیں گے اور یقیناً کسی مناسب حل تک پہنچا جا سکے گا۔

v۔ اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں کافی حد تک اتفاق رائے کے امکانات بڑھ جائیں گے کیونکہ افہام و تفہیم کے ماحول میں ایک دوسرے کو قائل کیا جا سکے گا اور آج مسلمانوں کے انحطاط

کے دور میں ممکنہ حد تک اتفاقی و اجتماعی آراء کی ہی ضرورت ہے ورنہ امت پہلے ہی بے دینی و الحاد اور خلفشار کا کافی حد تک شکار ہو چکی ہے۔

vi۔ عصرِ حاضر کے مسائل کسی ایک امام کی فقہی آراء کی روشنی میں حل کرنا بھی ناممکن تصور کیا جانے لگا ہے لہٰذا تمام مکاتبِ فکر کے علماء کے باہم اخذ و استفادہ سے دیگر مکاتبِ فکر کی آراء سے جہاں آگاہی ہوگی وہاں عصرِ حاضر کے تناظر میں کسی بہتر حل کی طرف پیش قدمی ہو سکے گی۔

vii۔ عصرِ حاضر کے بیشتر مسائل اس نوعیت کے ہیں کہ ان میں کسی مخصوص فقہی طرزِ فکر سے اوپر اٹھ کر براہِ راست قرآن وسنت اور روحِ شریعت سے استفادہ کی ضرورت ہے جس کے نتیجہ میں فقہاء کرام کو کبھی اپنے خاص فقہی مکتب فکر کی آراء کی مخالفت کرنا پڑ سکتی ہے اور کبھی اسی پس منظر میں اباحت پسندی کے طعنے بھی مل سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء و فقہاء، اجتہادی اہلیت و صلاحیت ہونے کے باوجود اجتہاد سے گریزاں ہیں لیکن اجتماعی نوعیت کے اجتہاد سے یہ تمام خدشات کافی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔

viii۔ انفرادی اجتہاد کرتے ہوئے مجتہد کبھی حکامِ وقت سے مرعوب ہو کر کتمانِ حق کا مرتکب ہو سکتا ہے اور یوں اپنی عاقبت بھی برباد کر سکتا ہے لہٰذا اجتماعی اجتہاد کی بدولت ان مفاسد سے یقیناً بچا جا سکتا ہے۔

ix۔ انفرادی آراء مختلف ہونے سے حکامِ وقت کو قانون سازی میں دشواری پیش آئے گی جبکہ کسی اجتماعی رائے کو اربابِ اختیار کے سامنے زیادہ موثر انداز میں پیش کیا جا سکے گا۔

x۔ اصولیوں نے ''اجماع'' کی جو شرائط مقرر کی ہیں اس کے نتیجہ میں اجماع تقریباً ناممکن الوقوع ہے مگر کسی حد تک اس کے متبادل کے طور پر ''اجتماعی اجتہاد'' کا آپشن موجود ہے کیونکہ اس طرح کم از کم دنیا بھر کے تمام مجتہدین کی اتفاقی رائے تو نہیں مگر اکثریتی رائے ضرور حاصل کی جا سکے گی اور جس طرح خیر و برکت اور رحمتِ الٰہی کلی اتفاق میں ہے اس طرح اکثریتی رائے میں بھی ہے (ان شاء اللہ)[۲۲۳]

xi۔ حقیقت یہ ہے کہ پیش آمدہ جدید مسائل میں اجتہاد فی نفسہ مجتہدین کو کافی حد تک لغزش سے محفوظ رکھتا ہے اور ''اجتماعی اجتہاد'' کی برکت سے اس کے امکانات میں مزید کمی واقع ہونے کی امید پیدا ہو جاتی ہے۔

xii۔ بعض روشن خیال حضرات اور نام نہاد مجتہدین انفرادی اجتہاد کی آڑ میں مغربی و غیر اسلامی

افکار و نظریات کو عین اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور امت کی گمراہی کا باعث بنے ہوئے ہیں لہٰذا ''اجتماعی اجتہاد'' کی بدولت ایسے لوگوں کی آراء معاشرے میں قبولیت حاصل نہ کر سکیں گی اور یوں امت کسی نئے فتنہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہ سکے گی۔

xiii۔ اس وقت امت مسلمہ مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور گروہی و مسلکی تعصبات کا شکار ہے اجتماعی اجتہاد جس میں تمام مکاتبِ فکر کے فقہاء و مجتہدین مشاورتی انداز میں اجتہاد کے بعد ممکن حد تک کسی متفقہ رائے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تو اس کی بدولت یقیناً مسلکی تعصّبات میں کمی آسکے گی اور امت کی وحدت مستحکم ہو سکے گی۔[۲۲۴]

حقیقت یہ ہے کہ آج جدید سہولیات اور وسائلِ تحقیق (کمپیوٹر، انٹرنیٹ، کتابوں کی مختلف قسم کی فہارس، اشاریے وغیرہ) میں خاطر خواہ اضافہ کی بدولت اجتہاد پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہو گیا ہے مگر مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اجتہادی رائے دینے میں ذمہ داری اور احتیاط کا پہلو بھی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے اور اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کیلئے آج اجتماعی اجتہاد کی شدید قسم کی ضرورت ہے۔

اجتماعی اجتہاد کی مختصر تاریخ:

اجتماعی اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کو ہر دور میں محسوس کیا گیا چنانچہ:

i۔ رسولِ کائنات ﷺ نے بذاتِ خود مشاورتی اجتہاد کی طرح ڈالی۔

ii۔ آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین نے بکثرت شورائی طرز کے اجتہادات کیے جن کا تفصیلی ذکر ان کے اجتہادی منہج میں کیا جا چکا ہے۔

iii۔ خلفاء اربعہ کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مدینہ کے فقہاء سبعہ (حضرت سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، ابو بکر بن عبد الرحمان بن حارث، سلیمان بن یسار، عبد الرحمان بن عبداللہ بن عتبہ رحمھم اللہ اجمعین) کو مشاورتی اور اجتماعی اجتہاد کی تلقین بایں الفاظ کی ''میں نے آپ حضرات کو جس کام کے لیے زحمت دی ہے، ان شاء اللہ اس میں آپ عند اللہ ماجور ہوں گے نیز حق کے معاونین میں آپ کا شمار ہو گا۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کی رائے اور مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کروں[۲۲۵]۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ قاضی اس وقت تک فیصلہ نہ کرتا تھا جب تک ان فقہاء سبعہ کے سامنے مسئلہ غور و فکر کے لیے پیش نہ کر دیا جاتا۔[۲۲۶]

iv- فقہاء سبعہ کے بعد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (م ۱۵۰ھ) نے بھی اسی روش کو زندہ و برقرار رکھتے ہوئے مختلف علوم و فنون کے ماہرین کو اپنی ''شورائی کونسل'' کا رکن بنایا اور اس اجتماعی اجتہاد کو ایک مثالی ادارے کی شکل دی۔[۲۲۷]

v- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دور میں آپ کے علاوہ دیگر مکاتبِ فکر میں بھی کسی حد تک شورائی طرز کا اجتہاد کیا جاتا تھا چنانچہ مولانا محمد زاہد اس کے تاریخی شواہد ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''دوسری صدی ہجری میں اجتماعی اور شورائی اجتہاد کی باقاعدہ منضبط شکل تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں ہی نمایاں نظر آتی ہے، لیکن مشاورتی اجتہاد کی بنیادی روح اور اس کے لوازم و عناصر اس وقت کے اہم فقہی حلقوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے''۔[۲۲۸]

vi- اندلس میں بنوامیہ کے دورِ حکومت میں بھی شورائی اجتہاد بارے تاریخِ اسلام گواہی دیتی ہے۔[۲۲۹] اندلس میں جبکہ امام یحیٰ بن یحیٰ اللیثی رحمہ اللہ (م ۲۳۴ھ) قاضی القضاۃ تھے تو ان کی مجلس شوریٰ کے سولہ ارکان تھے۔[۲۳۰] اس کے بعد بابِ اجتہاد بند کرنے کی آوازیں اٹھیں لہٰذا جہاں اجتہاد کے میدان میں خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوسکی وہاں اجتماعی اجتہاد سے بھی امت کئی صدیوں تک کے لیے محروم ہوگئی۔

vii- سترہویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر (م ۱۷۰۷ء) نے ہندوستان کے حنفی علماء کی ایک بہت بڑی تعداد کو ایک جگہ جمع کر کے حنفی مذہب کے مطابق فقہی مسائل کا ایک جامع مجموعہ تیار کرنے کا حکم دیا، جس کے نتیجہ میں ''فتاویٰ ہندیہ'' (المعروف فتاویٰ عالمگیری) منظرِ عام پر آیا۔ یہ گویا حنفی علماء کی حد تک اجتماعی اجتہاد کی ایک کوشش تھی۔

viii- انیسویں صدی میں مغربی قانون سازی کی طرز پر فقہ اسلامی کی تدوین ترکی میں کی گئی اس تدوین کیلئے خلیفہ وقت نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے ۱۸۷۶ء میں ''مجلّہ الاحکام العدلیہ'' کے نام سے اسلامی دیوانی قانون مرتب کیا۔[۲۳۱]

اجتماعی اجتہاد کی مذکورہ بالا مختصر تاریخ کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ خلافتِ راشدہ سے لیکر خلافتِ عثمانی تک ہر دور میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت و اہمیت محسوس کی گئی، اگر چہ درمیان میں کچھ صدیوں تک انقطاع بھی رہا۔ مگر آج عصر حاضر میں اس قدر پیچیدہ فقہی مسائل سامنے آئے ہیں کہ الامان والحفیظ، دوسری طرف صلاحیتیں ماند پڑ گئی ہیں، علوم و فنون کی وسعت اور تقسیم در تقسیم کے نتیجہ میں کوئی جامع العلوم مجتہد دنیا میں ڈھونڈے سے نہ مل سکے گا اور پھر بیشتر مسائل ایسے

ہیں جو بالکل جدید نوعیت کے ہیں حتیٰ کہ بسا اوقات ان کی نظائر و امثال قرآن و سنت اور عظیم فقہی ذخیرہ سے بھی نہیں ملتیں کہ جن کی روشنی میں کسی حد تک حل مسئلہ میں آسانی ہو اور کسی حتمی رائے تک پہنچا جا سکے لہٰذا ایسے حالات میں اجتماعی اجتہاد کے بغیر اب کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ یہی باعث ہے کہ اس دورِ انحطاط و زوال میں امت کا درد رکھنے والے علماء و زعماء امت کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ یہ دور ''اجتماعی اجتہاد'' کا دور ہے۔ ان زعماء و علماء میں سے علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ (م ۱۹۳۸ء) ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقاء اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ وغیرہ شامل ہیں[۲۳۲] اور اسی احساس کے نتیجہ میں مختلف ممالک میں اجتماعی و شورائی اجتہاد کے حسبِ ذیل ادارے نہ صرف وجود میں آ چکے ہیں بلکہ کئی ایک جدید فقہی مسائل میں اجتماعی اجتہاد کی طرف پیش رفت بھی کر چکے ہیں۔ (والحمد لله علی ذلک)

i۔ المجمع الفقهي الاسلامي (مکہ مکرمہ)

ii۔ هيئة كبار العلماء، سعودی عرب

iii۔ اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا

iv۔ اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

v۔ وفاقی شرعی عدالت، پاکستان

vi۔ یورپی مجلس برائے افتاء و تحقیق

vii۔ مجمع البحوث الاسلامیہ، جامعہ ازہر، مصر

viii۔ مجمع الفقه الاسلامي، جدہ

ix۔ مجمع فقہ آل البیت، ایران

x۔ مجلس شرعی مبارک پور، انڈیا

xi۔ شمالی امریکی فقہ کونسل، امریکہ[۲۳۳]

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم حکومتیں یا اہلِ ثروت حضرات ان اداروں کو ہر لحاظ سے Support کریں تاکہ ''اجتماعی اجتہاد'' کے نتیجہ میں امت کو درپیش فقہی مسائل نہ صرف بہتر طور پر حل ہوں بلکہ اس طرح سے مسلکی تعصبات میں بھی کمی واقع ہو اور امت وحدت کی لڑی میں پرو دی جائے مگر اس مقصد کے حصول کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے ان اداروں کا باہم تعلق اور ہمہ وقتی رابطہ ہو نیز اجتہادی آراء کا تبادلہ ہو۔ یہ ذمہ داری ادا کرنے کے لیے ''عالمی فقہ اکیڈمی'' (International Fiqah Academy) کی تشکیل بھی ازبس ضروری معلوم ہوتی ہے۔

والحمد لله في الاولى و الآخرة و الصلاة والسلام على سيدنا محمد و على آله و اصحابه اجمعين ۔(آمين يا رب العلمين)

حواشی وحوالہ جات

[۱] سورۃ النحل،۱۶:۸

[۲] سورۃ حم السجدۃ،۴۱:۵۳

[۳] عبدالجبار شاکر، پروفیسر: دور حاضر میں اجتہاد کے امکان و شرائط اور اقبال ، ماہنامہ دعوۃ (اقبال نمبر،نومبر/دسمبر ۲۰۰۷)دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد،ص ۱۱

[۴] سورۃ النساء،۴:۳۵

[۵] نعیم سرفراز: انسانی حقوق برائے اساتذہ و منتظمین (فضل داد ہیومن رائٹس انسٹی ٹیوٹ ،اسلام آباد ، س۔ن)ص ۶۶

[۶] سورۃ التوبہ،۹:۶۰

[۷] محمد عبداللہ، ڈاکٹر: مجمع الفقہ الاسلامی۔تعارف وتشکیل اور منہج اجتہاد، القلم (جلد ۹ شمارہ ۹، ۲۰۰۵ م) ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور، ص ۲۳۶

[۸] عبدالجبار شاکر، پروفیسر: دورِ حاضر میں اجتہاد کے امکان وشرائط اور اقبال، ص ۶

[۹] سورۃ النور،۲۴:۲

[۱۰] محمد بن اسماعیل، بخاری، امام: صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرین اذا کانو جماعۃ، حدیث:۶۳۱

[۱۱] ابوداود، سلیمان بن اشعث، امام: سنن ابی داود، کتاب الطھارۃ، باب فرض الوضوء، حدیث:۵۹، ۶۰

[۱۲] برھان الدین، مرغینانی، امام: الھدایہ (بک لینڈ، لاہور، س۔ن) ص ۳۸

[۱۳] مسلم بن حجاج، القشیری، امام: صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب اوقات الصلوت الخمس ، حدیث:۱۳۸۸۔۱۳۹۱

[۱۴] محمد نجات اللہ صدیقی: مقاصد شریعت اور معاصر اسلامی فکر، سہ ماہی فکر ونظر (جلد ۴۳، شمارہ ۲۰، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۵ م) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۱۳۔ ایسے علاقوں میں ان کے قریب ترین وہ علاقے جہاں سورج طلوع وغروب ہوتا ہے کہ مطابق نماز و روزہ کا اہتمام اندازے سے (اور آجکل گھڑیوں وغیرہ کے

ذریعے) کیا جائے گا۔(ابن باز ، شیخ :تحفہ الاخوان ، وزارۃ الشوون الاسلامیہ والاوقاف ، الریاض ،۱۴۲۳ھ ، ص۵۹)

[۱۵] امام ، بخاری: صحیح بخاری ، کتاب التیمم ، باب ، حدیث: ۳۳۵

[۱۶] ہوائی جہاز میں استطاعت کے مطابق ممکن حد تک کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر نماز پڑھی جائے گی (ابن باز ، عبدالعزیز بن عبداللہ ، شیخ : تحفہ الاخوان ص۸۴)

[۱۷] سورۃ البقرہ ،۲: ۱۸۳

[۱۸] سورۃ البقرہ ،۲: ۱۸۴

[۱۹] بعض علماء کے یہاں حالت روزہ میں پمپ کا استعمال ناجائز ہے ۔ (نور احمد شاہتاز: فقہی سین جیم ، ماہنامہ فقہ اسلامی ، دسمبر ۲۰۰۴م گلشن اقبال کراچی ، ص ۸۱)

[۲۰] محمد بن عیسیٰ ، ترمذی ، امام : جامع ترمذی ، کتاب الصوم ، باب ما جاء فی کراھیۃ مبالغۃ الاستنشاق للصائم ، حدیث: ۷۸۸

[۲۱] شیخ ابن باز رحمہ اللہ وغیرہ علماء کا موقف ہے کہ حالت روزہ میں نیا کرانے سے روزہ نہ ٹوٹے گا ۔(ابن باز ، شیخ: تحفہ الاخوان ، ص۱۸۲)

[۲۲] محمد تقی عثمانی ، مفتی : اسلام اور جدید معیشت وتجارت (مکتبہ معارف القران ، کراچی ، ۲۰۰۷م) ص۲۷

[۲۳] عبدالرحمان کیلانی ، مولانا : احکام تجارت اور لین دین کے مسائل (تحقیق وتخریج :مبشر احمد ربانی) مکتبہ السلام ، لاہور) ص۳۳۰

[۲۴] سورۃ التوبۃ ،۹: ۶۰

[۲۵] صلاح الدین یوسف ، حافظ : زکوۃ ، عشر اور صدقۃ الفطر (دار السلام ، لاہور ،۲۰۰۲م) ص۱۰۰

[۲۶] امام بخاری: صحیح بخاری ، کتاب الحج ، باب ھل یبیت اصحاب السقایۃ اوغیرھم بمکۃ لیالی منی ، حدیث: ۱۷۴۵

[۲۷] سورۃ ابراھیم ،۱۴: ۳۷

[۲۸] سورۃ الحج ،۲۲: ۲۷

[۲۹] امام بخاری: صحیح بخاری ، کتاب الحج ، باب من قدم ضعفۃ اھلہ بلیل فیقفون بالمزدلفۃ ، حدیث: ۱۶۸۰

[۳۰] ایضاً ، کتاب الحیض ، باب الامر بالنفساء اذا نفسن ، حدیث: ۲۹۴

[۳۱] ایضاً ، کتاب الحج ، باب تقضی الحائض المناسک کلھا الا الطواف بالبیت ، حدیث: ۱۶۵۰

[۳۲] امام ترمذی: جامع ترمذی ، کتاب الحج ، باب ماجاء ما تقضی الحائض من المناسک ، حدیث: ۹۴۵

[۳۳] عبدالجبار شاکر ، پروفیسر : دور حاضر میں اجتہاد کے امکان وشرائط اور اقبال ، ص۱۱-۱۲

[۳۴] ماہنامہ ساحل کراچی، جلد ا، شمارہ 12، دسمبر ۲۰۰۶م، ص ۱۵

[۳۵] مبشر حسین، حافظ: جدید فقہی مسائل (مبشر اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۸م) ص ۲۵۱

[۳۶] محمد تقی عثمانی: اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ص ۷۰

[۳۷] ایضاً، ص ۷۲

[۳۸] مبشر حسین: جدید فقہی مسائل، ص ۲۵۷

[۳۹] ایضاً، ص ۲۵۸

[۴۰] وہ شخص جو کمپنی کو بہت زیادہ سرمایہ فراہم کرے تو اسے کمپنی میں کئی اعتبار سے ترجیح حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کے نام جاری ہونے والے حصص کو "ترجیحی حصص" کہا جاتا ہے۔ (محمد تقی عثمانی: اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ص ۵۹)

[۴۱] المرجع السابق، ص ۷۶، ۷۹

[۴۲] ماہنامہ ساحل کراچی، دسمبر ۲۰۰۶م، ص ۱۵

[۴۳] محمد تقی امینی، مولانا: فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر (قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۹۱م) ص ۲۹۲

[۴۴] منظور احمد، الازہری، پروفیسر: کریڈٹ کارڈ، تصور اور اجتماعی اجتہادی آراء، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۶۳۳ـ۶۳۷

[۴۵] ایضاً، ص ۶۳۵

[۴۶] عبدالغفور: معصوم دشمن کریڈٹ کارڈز (پلاسٹک منی)، سہ ماہی نداء الجامعہ (جلد 5، شمارہ 2، اپریل-جون ۲۰۰۸م) جامعہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، لاہور، ص ۳۰ـ۳۱

[۴۷] المرجع السابق، ص ۶۳۱ـ۶۳۲

[۴۸] ایضاً

[۴۹] سورۃ البقرہ، ۲: ۲۱۹

[۵۰] منظور احمد، الازہری: کریڈٹ کارڈ، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۶۲۰

[۵۱] احمد بن حسین، بیہقی، امام: السنن الکبریٰ (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ۵: ۳۱۳ و امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع الطعام قبل ان یقبض، حدیث: ۲۱۳۵

[۵۲] نووی، محی الدین، امام: المجموع شرح المھذب (دار الفکر، بیروت، س۔ن) ۹: ۲۷۵

[۵۳] ایضاً

[۵۴] سعید الرحمان: حنفی نظریۂ استحسان اور عصری مسائل، مجلہ فقہ اسلامی، جولائی ۲۰۰۳، ص ۷۱ و عبد الواحد، مولانا،

ڈاکٹر: حقِ ایجاد اور حقِ طباعت و اشاعت کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت، سہ ماہی منہاج، لاہور، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۶م، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ص ۱۱۲

[۵۵] امام ابن ماجہ: سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ماجاء فی فضل النکاح، حدیث: ۱۸۴۶

[۵۶] محمد بن صالح العثیمین، شیخ: غیر مسلم ممالک میں سفر و سکونت کا شرعی حکم (مترجم: عبدالقوی لقمان) ماہنامہ محدث (جلد ۳۹، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۰۷م) مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور، ص ۶۴

[۵۷] المرجع السابق: باب النھی عن نکاح المتعۃ، حدیث: ۱۹۶۱

[۵۸] سورۃ الاحزاب، ۳۳:۳۳

[۵۹] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، باب اجرالسمسرۃ، ترجمۃ الباب۔

[۶۰] ابرھیم انیس، ڈاکٹر وغیرہ: المعجم الوسیط (المکتبۃ الاسلامیۃ، استنبول، س۔ن) بذیل مادہ (س ی ر) ص ۴۶۷

[۶۱] طاہر اسلام عسکری، حافظ: نکاح مسیار، ماہنامہ الاحیاء (جلد ۱، شمارہ ۱، جولائی ۲۰۰۷م) الاحیاء ریسرچ فاؤنڈیشن، لاہور، ص ۳۷

[۶۲] ایضاً

[۶۳] ایضاً، ص ۶۱۔۶۲

[۶۴] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الزوج، حدیث: ۱۴۶۶

[۶۵] ایضاً، کتاب النکاح، باب المرأۃ تھب یومھا، حدیث: ۵۲۱۲

[۶۶] سورۃ النساء، ۴:۳۵

[۶۷] سورۃ المائدۃ، 5:5

[۶۸] سورۃ الممتحنۃ، ۶۰:۱۰

[۶۹] محمد نجات اللہ صدیقی: مقاصدِ شریعت کی روشنی میں اجتہاد کی حالیہ کوشش، سہ ماہی فکر و نظر، (جلد ۴۴، شمارہ ۴، اپریل۔جون ۲۰۰۷م) ص ۶

[۷۰] سورۃ العلق، ۹۶:۱۔۲

[۷۱] سورۃ النساء، ۴:۷۱

[۷۲] سورۃ الانفال، ۸:۶۰

[۷۳] سعد اللہ، حافظ: سی ٹی بی ٹی۔ شرعی نقطہ نظر، سہ ماہی منہاج، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۶م دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور: ص ۷

[۷۴] امام مسلم: صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب فضل الرمی والحث علیہ، حدیث: ۴۹۴۶

[۷۵] المرجع السابق ص ۷

[۷۶] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف فی شوال سنۃ ثمان، حدیث: ۴۳۲۵

[۷۷] امام بیہقی: السنن الکبری ۹:۷۲

[۷۸] صلاح الدین، یوسف، حافظ: تفسیر احسن البیان (مکتبہ دار السلام، الریاض، س۔ن) ص ۱۴۷

[۷۹] سورۃ الحشر، ۵۹:۵

[۸۰] محمد خیر ھیکل، ڈاکٹر: الجہاد والقتال فی السیاسۃ الشرعیۃ (دار البیارق، بیروت ۱۹۹۶م) ۲:۱۳۵۳

[۸۱] محمد نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر: مقاصد شریعت اور مستقبل انسانیت، سہ ماہی فکر و نظر (جلد ۴۵، شمارہ ۲، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۷م) ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، ص ۱۹

[۸۲] امام نووی: المجموع شرح المھذب، ص ۹:۳۵۴

[۸۳] امام ابن ماجہ: سنن ابن ماجہ، ابواب الاحکام، باب من بنی فی حقہ ما یضر بجارہ، حدیث: ۲۳۴۰

[۸۴] سورۃ المائدہ، ۵:۲

[۸۵] سورۃ البقرۃ، ۲:۱۹۳

[۸۶] محمد بن احمد، سرخسی، امام: شرح السیر الکبیر (حرکۃ الانقلاب الاسلامیہ الافغانیہ، شہر ندارد، ۱۴۰۵ھ) ۴:۱۵۱۸

[۸۷] امام ابن ماجہ: سنن ابن ماجہ، ابواب الزھد، باب الحکمۃ، حدیث: ص ۴۱۶۹

[۸۸] سورۃ محمد ﷺ، ۴۷:۴

[۸۹] المرجع السابق، ابواب الوصایا، باب ھل أوصی رسول اللہ ﷺ، حدیث: ۲۶۹۷

[۹۰] مثلاً کفارہ قسم کیلئے دیکھیے: سورۃ المائدۃ، ۵:۸۹ اور کفارہ ظہار کیلئے دیکھئے: سورۃ المجادلۃ، ۵۸:۳

[۹۱] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب العتق، باب فی العتق وفضلہ، حدیث: ۲۵۱۷

[۹۲] محمد حسین ھیکل: الفاروق عمر (مکتبہ النھضۃ المصریۃ، قاہرہ، س۔ن) ۲:۲۱۸۔۲۱۹

[۹۳] نعیم سرفراز: انسانی حقوق برائے اساتذہ و منتظمین، ص ۶۶

[۹۴] سورۃ التوبہ، ۹:۴

[۹۵] سورۃ التوبۃ، ۹:۷

[۹۶] امام بخاری: صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ، رقم: ۴۱۷۸، ۴۱۷۹

[۹۷] محمد خیر ھیکل، ڈاکٹر: الجہاد والقتال فی السیاسۃ الشرعیۃ ۲:۱۴۲۸

[۹۸] سورۃ الشوری، ۴۲:۴۹۔۵۰

[۹۹] ابو الحسن محسن ابراہیم: جدید حیاتیاتی علوم اور اسلام (مترجم: اسرار احمد خان) (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور،

۱۹۹۱م)ص۸۴

[۱۰۰] ایضاً۔ومبشر حسین: جدید فقہی مسائل،ص۵۵

[۱۰۱] علاء الدین علی، امام: الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۱م)۱۳: ۴۲۸، حدیث: ۶۰۶۳

[۱۰۲] مبشر حسین: جدید فقہی مسائل،ص۱۰۸

[۱۰۳] سورۃ البقرۃ،۲: ۱۷۳

[۱۰۴] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع المیتۃ والاصنام، حدیث: ۲۲۳۶

[۱۰۵] سورۃ البقرۃ،۲: ۱۷۳

[۱۰۶] محمد صدقی، ڈاکٹر: الوجیز فی ایضاح قواعد الفقہ الکلیہ (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۳م)ص۱۴۳

[۱۰۷] سورۃ المائدۃ،۵: ۳۲

[۱۰۸] حافظ ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم (مکتبہ دار السلام، ریاض، ۱۹۹۴م)

[۱۰۹] مبشر حسین: جدید فقہی مسائل،ص۱۲۹

[۱۱۰] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب الخاتم، باب ماجاء فی ربط الاسنان بالذھب، حدیث: ۴۲۳۲ وامام ترمذی: جامع ترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی شد الاسنان بالذھب، حدیث: ۱۷۷۰

[۱۱۱] سورۃ البقرۃ،۲: ۲۹

[۱۱۲] سورۃ البقرۃ،۲: ۱۷۳

[۱۱۳] سورۃ الاسراء،۱۷: ۷۰

[۱۱۴] امام داری، عبداللہ بن عبدالرحمٰن: سنن الدارمی (قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن)ص۴۷۸

[۱۱۵] سورۃ الاسراء،۱۷: ۳۶

[۱۱۶] سورۃ النحل،۱۶: ۱۱۵

[۱۱۷] سورۃ البقرۃ،۲: ۱۹۵

[۱۱۸] سورۃ النساء،۴: ۲۹

[۱۱۹] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب وصل الشعر، حدیث: ۵۹۳۳

[۱۲۰] گوہر رحمٰن، مولانا: اسلامی سیاست (ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۲۰۰۲م)ص۲۴۔۲۵

[۱۲۱] غالب عبدالکافی القرشی: اولیات الفاروق السیاسیۃ (المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۸۳م)ص۵۹ کا حاشیہ

[۱۲۲] ابن قیم، امام: الطرق الحکمیۃ (دار نشر الکتب الاسلامیۃ، لاہور، س۔ن)ص۱۳

[۱۲۳] ابن فرحون، امام: تبصرة الحکام (دارالکتب العلمیة، بیروت، س۔ن) ۲:۱۰۴

[۱۲۴] شاطبی، ابراہیم بن موسیٰ، امام: الاعتصام (دارالباز، مکة المکرمہ، س۔ن) ۲:۱۲۹، ۱۳۳

[۱۲۵] الطاف حسین: المجمع الفقہی الاسلامی، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۳۸۵

[۱۲۶] محمد بن عبدالعزیز، شیخ (مرتب): فتاویٰ اسلامیہ (مترجم: مولانا محمد خالد سیف) مکتبہ دارالاسلام، لاہور، س۔ن، ۲:۳۶۹۔۳۷۰

[۱۲۷] سعیدالرحمان: حنفی نظریہ استحسان اور عصری مسائل ص ۶۱

[۱۲۸] خورشید احمد، پروفیسر: اسلامی بنکوں میں سرمایہ کاری، ماہنامہ ترجمان القرآن (جلد ۱۳۴، عدد ۳، مارچ ۲۰۰۷م) ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ص ۹۶۔۹۷

[۱۲۹] محمد بن عبدالعزیز، شیخ (مرتب): فتاوی اسلامیہ، ۱:۳۲۲

[۱۳۰] ایضاً، ۳:۲۶۳

[۱۳۱] محمد سعداللہ، حافظ: سی ٹی بی ٹی۔ شرعی نقطہ نظر، سہ ماہی منہاج، ص ۵

[۱۳۲] مبشر حسین: جدید فقہی مسائل، ص ۵۷

[۱۳۳] خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا: اعضاء کی پیوندکاری، جدید فقہی مباحث (مرتب: مولانا مجاہدالاسلام قاسمی) ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، س۔ن ۱:۲۱۶۔۲۱۷

[۱۳۴] طٰہٰ جابر، العلوانی، ڈاکٹر: فقہی سیمینار سے خطاب، جدید فقہی مباحث (مرتب: مولانا مجاہدالاسلام قاسمی) ۱:۴۷

[۱۳۵] تنویر احمد: یورپی مجلس برائے افتاء و تحقیق، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۴۵۱۔۴۵۲

[۱۳۶] محمد فہیم اختر ندوی: غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کے مسائل، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۵۵۰

[۱۳۷] المرجع السابق، ص ۴۶۱

[۱۳۸] محمد تقی امینی، مولانا: احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، س۔ن) ص ۱۷۱

[۱۳۹] رویعی بن راجح الرحیلی، ڈاکٹر: فقہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (دارالغرب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ) ص ۱۹

[۱۴۰] مصطفیٰ احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام (دارالفکر، دمشق، ۱۹۶۸م) ص ۱:۱۵۹

[۱۴۱] سورۃ الانعام، ۶:۹۱

[۱۴۲] سورۃ البقرۃ، ۲:۲۶

[۱۴۳] امام ابن ماجہ: سنن ابن ماجہ، المقدمہ، حدیث: ۲۱۸

[۱۴۴] شاہ محمد جعفر پھلواری، مولانا: اجتہادی مسائل (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۹م) ص ۱۱-۲۰-۲۱

[۱۴۵] ایضاً ص ۲۵۰-۲۵۱

[۱۴۶] صبحی محمصانی، ڈاکٹر: فلسفہ شریعت اسلام (مترجم: مولوی محمد احمد رضوی) (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۵م) ص ۲۵۰-۲۵۱

[۱۴۷] ایضاً ص ۲۵۲، ۲۵۵

[۱۴۸] محمد حنیف ندوی، مولانا: مسئلہ اجتہاد (علم وعرفان پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۶م) ص ۲۱۸

[۱۴۹] سورۃ البقرۃ، ۲: ۲۶۷

[۱۵۰] سورۃ الانعام، ۶: ۱۴۱

[۱۵۱] صبحی مصانی، ڈاکٹر: فلسفہ شریعت اسلام، ص ۲۹۰

[۱۵۲] شہزاد اقبال شام: اسلامی قانون کے مآخذ، ماخذ سوم: الاجماع (شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴م) ص ۱۴

[۱۵۳] غلام احمد پرویز: شہکار رسالت (ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۸۱م) ص ۲۷۷-۲۸۱

[۱۵۴] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب الجہاد، باب فی الطاعۃ، حدیث: ۲۶۲۵

[۱۵۵] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب السمع والطاعۃ للامام، حدیث: ۲۹۵۵

[۱۵۶] عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ، امام: المصنف (دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۴م) ۷: ۳۷۷

[۱۵۷] احمد بن ادریس قرافی، امام: الاحکام (مترجم: ڈاکٹر حافظ غلام یوسف) (شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴م) ص ۹۵

[۱۵۸] مصطفیٰ احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام، ۱: ۱۵۹

[۱۵۹] صلاح الدین یوسف: زکوٰۃ عشر اور صدقۃ الفطر، ص ۱۰۰

[۱۶۰] امام ابن قیم: الطرق الحکمیۃ، ص ۱۷

[۱۶۱] ایضاً ص ۱۷

[۱۶۲] عبدالحی، فرنگی محلی، مولانا: فتاویٰ مولانا عبدالحی، ص ۳۷۴ بحوالہ شاہ محمد جعفر پھلواری: اجتہادی مسائل (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۹م) ص ۲۳۰ محمد کرم شاہ، ازہری، پیر: دعوتِ فکر ونظر، مجموعہ مقالات علیہ (مرتب وناشر: جمیعت اہلحدیث، لاہور، ۱۹۷۹م) ص ۲۴۲-۲۴۳

[۱۶۳] نسائی، احمد بن شعیب، امام: سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور، حدیث: ۲۰۳۵

[۱۶۴] امام بیہقی: السنن الکبریٰ، ۹: ۲۹۰ وابن حزم، امام: المحلی (ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۹ھ) ص ۷: ۳۸۵

[۱۶۵] سید سابق: فقہ السنۃ (فاران اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵م) ص ۹

[۱۶۶] ایضاً، ص ۱۰

[۱۶۷] سورۃ الاسراء، ۱۷: ۹

[۱۶۸] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ، حدیث: ۴۶۰۴

[۱۶۹] مالک بن انس، امام: الموطا (داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵م) ۲: ۸۹۹

[۱۷۰] شاہ ولی اللہ، امام: حجۃ اللہ البالغۃ (المکتبۃ السلفیہ، لاہور، س۔ن) ۱: ۱۵۲

[۱۷۱] محمد حنیف ندوی: مسئلہ اجتہاد، ص ۱۷۱

[۱۷۲] محمد تقی امینی، مولانا: اجتہاد (قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن) ص ۳۳۴

[۱۷۳] محمد یوسف فاروقی، ڈاکٹر: مناہج واسالیب اجتہاد، علم اصول فقہ (مرتب: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں) شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲: ۹۳

[۱۷۴] محمد عاصم الحداد: اصول فقہ پر ایک نظر (اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۱م) ص ۱۵۲

[۱۷۵] عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر: الوجیز فی اصول الفقہ (فاران اکیڈمی، لاہور، س۔ن) ص ۲۳۶۔۲۳۷

[۱۷۶] محمد تقی امینی، مولانا: اجتہاد، ص ۱۸۹

[۱۷۷] مودودی، ابوالاعلیٰ، سید: تفہیمات (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰م) ۳: ۳۴

[۱۷۸] محمد عبیداللہ الاسعدی، مولانا: اصول الفقہ (مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن) ص ۲۴۰ کا حاشیہ

[۱۷۹] محمد نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر: مقاصد شریعت۔ ایک عصری مطالعہ، سہ ماہی فکر ونظر (جلد ۴۱، شمارہ 4، اپریل۔ جون ۲۰۰۴م) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۷

[۱۸۰] ابن تیمیہ، امام: السیاسۃ الشرعیۃ بحوالہ محمد نجات اللہ صدیقی: مقاصد شریعت۔ ایک عصری مطالعہ، ص ۱۰

[۱۸۱] المرجع السابق، ص ۱۰

[۱۸۲] سید مودودی: رسائل ومسائل (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱م) ۱: ۱۹۰

[۱۸۳] محمود احمد غازی، ڈاکٹر: محاضرات فقہ (الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ۲۰۰۵م) ص ۵۳۵

[۱۸۴] مصطفیٰ احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام، ۱: ۲۰۹۔۲۱۰

[۱۸۵] محمد عبداللہ، ڈاکٹر: مجمع الفقہ الاسلامی۔ تعارف وتشکیل اور منہج اجتہاد، ص ۲۳۴

[۱۸۶] محمود احمد غازی: محاضراتِ فقہ، ص ۵۳۴

[۱۸۷] مصطفیٰ احمد زرقاء: المدخل الفقہی العام، ۱: ۹۷

[۱۸۸] محمد یوسف فاروقی، ڈاکٹر: مناہج واسالیب اجتہاد، ۲: ۱۰۱

[۱۸۹] سورۃ البقرۃ،۲: ۲۱۹

[۱۹۰] مبشر حسین: جدید فقہی مسائل، ص۱۶۳

[۱۹۱] سورۃ النور،۲۴: ۲

[۱۹۲] عرفان خالد ڈھلوں (مرتب): علم اصول فقہ،۱: ۲۰۴

[۱۹۳] سورۃ المائدہ،۵: ۳

[۱۹۴] ایضاً،۵: ۶

[۱۹۵] محمد صدقی: الوجیز فی ایضاح قواعد الفقہیہ الکلیۃ، ص۱۸۲

[۱۹۶] ابن قیم، امام: اعلام الموقعین (دار الجیل، بیروت،۱۹۷۳م) ۳: ۳

[۱۹۷] عبد الرزاق بن ہمام، امام: المصنف (المکتب الاسلامی، بیروت،۱۹۷۲م) ۱۰: ۲۱۰

[۱۹۸] سورۃ النساء،۴: ۵۹

[۱۹۹] سورۃ التوبۃ،۹: ۳۱

[۲۰۰] جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں یہی بات ارشاد فرمائی تھی (جلال الدین، سیوطی: الدر المنثور، دار الفکر، بیروت،۱۹۹۳م،۴: ۱۷۴)

[۲۰۱] امام ابوداود: سنن ابی داود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطاء، حدیث: ۳۵۸۶

[۲۰۲] محمد بن احمد، سرخسی، امام: اصول السرخسی (دار المعرفہ، بیروت، س۔ن) ۲: ۱۰۷۔۱۰۸

[۲۰۳] سورۃ الاعراف،۷: ۳۳

[۲۰۴] امام بیہقی: السنن الکبری،۶: ۲۵۵

[۲۰۵] نور احمد شاہتاز، ڈاکٹر: چند جدید فقہی مسائل، ماہنامہ فقہ اسلامی (گلشن اقبال، کراچی، فروری ۲۰۰۳م) ص ۴۷۔۴۸

[۲۰۶] عطیہ محمد سالم وغیرہ: تسہیل الوصول الی فہم علم الاصول (فاروقی کتب خانہ، لاہور، س۔ن) ص۸

[۲۰۷] امام ابن حزم: المحلی،۷: ۳۸۵

[۲۰۸] امام بخاری: صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب اللعان ومن طلق بعد اللعان، حدیث: ۵۳۰۸

[۲۰۹] سید سابق: فقہ السنۃ، ص۱۰

[۲۱۰] ابن عبد البر، یوسف، امام: جامع بیان العلم،۲: ۱۷۴ بحوالہ پروفیسر قاضی مقبول احمد: اسلام اور اجتہاد (مکتبہ قدوسیہ، لاہور،۲۰۰۱م) ص۱۹۰

[۲۱۱] ایضاً، ص۱۹۱

[۲۱۲] امام بخاری: صحیح بخاری کتاب الطلاق، باب قول النبی ﷺ لو کنت راجما بغیر بینۃ، حدیث: ۵۳۱۰
نیز اس واقعہ کی مکمل تفصیلات کیلئے دیکھیے: ابن حجر، حافظ: فتح الباری (المطبعۃ السلفیۃ، القاہرۃ، س۔ن)
۹:۴۵۵

[۲۱۳] اسرار احمد، ڈاکٹر: عہد حاضر میں اجتہاد کا طریقہ کار، ماہنامہ میثاق (انجمن خدام القران، لاہور، اکتوبر، ۱۹۹۷م) ص ۱۸

[۲۱۴] ایضاً، ص ۲۲

[۲۱۵] حافظ ابن حجر: فتح الباری، ۱۰:۱۹۰

[۲۱۶] ازکیا ہاشمی، سید: اجتماعی اجتہاد مناہج واسالیب، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۶۱

[۲۱۷] سورۃ آل عمران، ۳:۱۵۹

[۲۱۸] سورۃ الشوریٰ، ۴۲:۳۸

[۲۱۹] علی بن ابی بکر، ھیثمی، حافظ: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (مکتبہ القدسی، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ) ۱:۱۷۸

[۲۲۰] امام ابن ماجہ: سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب السواد الاعظم، حدیث: ۳۹۵۰

[۲۲۱] امام ترمذی: جامع ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعۃ، حدیث: ۲۱۶۵

[۲۲۲] نادیہ شریف، العمری، ڈاکٹر: الاجتہاد فی الاسلام (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۵م) حاشیہ ص ۲۶۴

[۲۲۳] ازکیا ہاشمی، سید: اجتماعی اجتہاد، مناہج واسالیب ص ۵۹۔۶۲

[۲۲۴] شبیر احمد جامعی، حافظ: اجتماعی اجتہاد کے مناہج واسالیب، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۱۰۱

[۲۲۵] محمد خضری بک: تاریخ الامم الاسلامیہ (مکتبہ التجاریہ الکبریٰ، مصر، س۔ن) ۱:۲۵۲

[۲۲۶] ابن حجر، حافظ: تہذیب التھذیب (دار صادر، بیروت، ۱۳۲۵ھ) ۳:۴۲۷

[۲۲۷] محمد زاہد الکوثری، علامہ: فقہ اہل العراق وحدیثھم (مکتب المطبوعات الاسلامی، بیروت، ۱۹۷۰م) ص ۵۵۔۵۷

[۲۲۸] محمد زاہد، مولانا: اجتماعی اجتہاد کے عمومی خدوخال، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۳۸

[۲۲۹] عبدالوہاب خلاف: علم اصول الفقہ (دار القلم، کویت، ۱۹۷۸م) ص ۵۰

[۲۳۰] زکریا البری، ڈاکٹر: الاجتہاد فی الشریعہ الاسلامیہ (ادارۃ الثقافہ والنشر، جامعہ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض، ۱۹۸۱م) ص ۲۵۶

[۲۳۱] شبیر احمد جامعی، حافظ: اجتماعی اجتہاد کے مناہج واسالیب، اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ص ۱۰۲

[۲۳۲] محمد طاہر منصوری (مرتب): ابتدائیہ، اجتماعی اجتہاد، ص: ک

[۲۳۳] ان میں سے اول الذکر سات اداروں کے تفصیلی تعارف کیلئے ملاحظہ ہو کتاب: اجتماعی اجتہاد (مرتب: محمد طاہر منصوری) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۷م، ص ۲۲۱۔۴۷۵ آٹھویں ادارے کا ذکر اسی کتاب کے صفحہ ۶۵۷، نویں ادارے کا صفحہ ۶۵۲، دسویں ادارے کا تذکرہ ابتدائیہ کے ضمن میں صفحہ "ع" اور گیاریں ادارے کا ذکر صفحہ ۵۳۶ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ بحث

احکام شرعیہ کے ادراک کے لیے بغیر کسی سستی و کاہلی اور مداہنت کے اپنی مکمل کوشش صرف کرنے کا نام ''اجتہاد'' ہے اسی طرح کلمہ ''اجتہاد'' کا استعمال عموماً غیر منصوص مسائل کے شرعی حل کے لیے بھی ہوتا ہے۔ مجتہد کے مقام و مرتبہ کو نبی کریم ﷺ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ مجتہد مصیب کے لیے دوگنا اجر ہے اور اگر اس سے خطا سرزد ہو جائے تو بھی اس کے لیے اکہرے اجر کی نوید ہے لیکن اس خوشخبری کے پیشِ نظر ہر شخص اجتہاد کرنے کا مجاز نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ مجتہد تو شارع کی نیابت کرتے ہوئے حکمِ شرعی واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے مجتہد کی اس اہم ذمہ داری کی بنا پر ہی علماء نے اجتہاد کی درج ذیل شرائط طے کی ہیں۔

i۔ اسے قرآن و سنت بالخصوص آیاتِ احکام اور احادیثِ احکام کا تفصیلی علم ہو۔

ii۔ عربی زبان کا وہ ماہر ہو۔

iii۔ قدیم و جدید فقہی ذخیرہ سے آگہی رکھتا ہو۔

iv۔ مقاصدِ شریعت اور احکامِ شریعت کی علل کا علم رکھتا ہو۔

v۔ اصول فقہ اور فقہی کلیات پر اس کی دسترس ہو۔

vi۔ جدید علوم اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھتا ہو، اسی میں اپنے زمانے کے عرف سے واقف ہونا بھی شامل ہے۔

vii۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر معمولی ذہنی و عقلی صلاحیت کا مالک ہو۔

viii۔ فتویٰ و اجتہاد کی قبولیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مسلم، عاقل و بالغ اور صالح و متقی ہو۔

ix۔ مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے اجتہاد کے دائرہ کار کا علم ہو کہ عقائد سے متعلقہ اسلامی تعلیمات اور منصوص عبادات و معاملات میں اجتہاد نہیں کیا جا سکتا بلکہ نئے پیش آمدہ

مسائل اور وہ احکام جن کے بارے میں نص ظنی الثبوت اور ظنی الدلالۃ ہے تو ان میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔

اجتہاد کی ضرورت کا احساس ہر دور میں محسوس کیا جائے گا کیونکہ ہر دور اور زمانہ میں اور ہر علاقہ میں بوجوہ نت نئے مسائل پیش آتے رہتے ہیں جب کہ قرآن وسنت کی نصوص جامع مگر محدود ہیں لہٰذا اجتہاد کے ذریعے مسلم عوام کو نئے مسائل بارے رہنمائی فراہم کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یقیناً اجتہاد کی فقہاء امت کو اجازت ہونا امت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی نعمت ہے جس پر امت کو اللہ کے حضور سجدہ شکر بجالانا چاہیے۔ مجتہدینِ امت کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے امت کی صحیح رہنمائی کرنا ہے لیکن اگر انہوں نے خدانخواستہ لاپرواہی اور سستی کا مظاہرہ کیا تو مسلم عوام کو اباحیت پسندی سے کوئی نہ روک سکے گا۔ (الا من رحم ربی سوائے اس شخص کے جس پر میرا رب رحم فرمائے۔)

اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کوئی چارہ نہیں ہے کہ اجتہاد کی ضرورت تو نزولِ وحی کے زمانہ میں ہی محسوس کی گئی یہی باعث ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کرنے کے ساتھ ساتھ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد کرنا بھی کئی مواقع پر ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ودنیوی نیز جنگی وحربی امور میں عملاً اجتہاد فرما کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مجتہدینِ امت کی رہنمائی فرمادی ہے اور اجتہادی منہج سے بھی روشناس کرایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں قرآن وحدیث (دونوں ہی وحی ہیں) سے استدلال واستنباط کیا وہاں کئی مواقع پر قیاس واستحسان، مصلحت، سد ذریعہ، عرف اور استصحاب کا بھی اپنے اجتہادات میں لحاظ رکھا ہے، انہی اصول وضوابط کے اختیار کرنے کی فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات میں بھی مثالیں ملتی ہیں مگر یاد رہے کہ اجتہاد کے یہ مناہج اور اسالیب اپنی موجودہ فنی شکل میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے بھی بہت بعد باقاعدہ مدون کیے گئے البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات میں ان امور کو ملحوظ رکھے جانے کے واضح اشارے ضرور ملتے ہیں۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم درجہ اجتہاد کے حامل نہ تھے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے۔ فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک سو تیس صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہادات ہم تک منقول ہوئے ہیں، ان میں خلفاء راشدین بھی ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شخصی، علمی اور فقہی واجتہادی اعتبار سے ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

خلفاء راشدین نے براہِ راست چشمہ نبوت سے فیض پایا تھا اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں انہیں صحبتِ نبوی کی برکات سے مستفید ہونے کا کچھ زیادہ ہی موقع ملا تھا لہٰذا ان کے اجتہادی منہج اور نبوی اجتہادی منہج میں بڑی حد تک یکسانیت نظر آتی ہے۔ خلفاء راشدین کا مجموعی اجتہادی منہج حسبِ ذیل تھا۔

i۔ خلفاء راشدین قرآن وحدیث سے براہِ راست استفادہ ترجیحی طور پر کرتے تھے۔

ii۔ قرآن وحدیث سے رہنمائی حاصل نہ کر سکنے کی صورت میں وہ شورائی اور اجتماعی طرز کا اجتہاد کرتے تھے اور ان کے اجتماعی اجتہادات کبھی ''اجماع سکوتی'' کا درجہ بھی اختیار کرتے رہے۔

iii۔ قرآن وحدیث سے پیش آمدہ مسائل کے نظائر وامثال تلاش کر کے قیاس بھی کرتے تھے۔

iv۔ انہوں نے کئی دفعہ اجتہادی فیصلے استحساناً بھی کیے۔

v۔ روحِ شریعت بالفاظِ دیگر مصالح مرسلہ کا لحاظ رکھتے ہوئے دسیوں بیسیوں اجتہادات کیے۔

vi۔ سدّ ذریعہ اصول کو بھی اختیار کیا۔

vii۔ عرف جو روحِ شریعت سے متصادم نہ ہو، اس کا بھی لحاظ کیا۔

viii۔ استصحاب اصول سے بھی امت کو فائدہ پہنچایا۔

ix۔ سابقہ شرائع سے استفادہ تو کبھی کیا مگر شریعتِ محمدی کے کامل واکمل ہونے کی وجہ سے اس کی کچھ زیادہ نوبت نہیں آئی۔

x۔ اجتہاد کرتے ہوئے انہوں نے بدلتے ہوئے حالات وظروف کا بھی لحاظ رکھا۔

xi۔ آیات واحادیث کے احکام کا موقع ومحل متعین کر کے ہر دور کے فقہاء کی پہلی مرتبہ اس سلسلہ میں رہنمائی کی۔

xii۔ مباح امور پر بوقتِ ضرورت سیاستِ شریعہ کے طور پر کبھی پابندی لگائی جس میں دراصل مصلحتِ عامہ کا ہی لحاظ تھا۔

xiii۔ محض واقعاتی مسائل بارے اجتہاد کیا، فرضی مسائل کو تو کبھی زیر بحث ہی نہ لائے بلکہ سخت نفرت اور غصہ کا اظہار کیا۔

xiv۔ بوقتِ ضرورت ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' اصول کا لحاظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں

سے استفادہ کو بھی عار نہ سمجھا۔

xv۔ ہر خلیفہ اپنے سے پیش رو اور سابقہ خلفاء کے اجتہادات سے بھی علمی استفادہ کرتا رہا۔

xvi۔ خلفاء راشدین نے متعدد مواقع پر سابقہ رائے سے رجوع بھی کیا۔

xvii۔ انہوں نے اپنے اجتہادات سے اختلافِ رائے کی گنجائش کو عملاً تسلیم کیا۔

خلفاء راشدین کا یہی وہ اجتہادی منہج ہے جس کو اختیار کرنے کی نبی کریم ﷺ نے فقہاء و مجتہدینِ امت کو بایں الفاظ تلقین کی تھی ''علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین''۔ ''سنة الخلفاء'' سے مراد خلفاء کرام کا اجتہادی منہج ہے نہ کہ ان کے جمیع اجتہادات۔ اگر سنتِ خلفاء سے مراد ان کے اجتہادات لیے جائیں تو کئی طرح کے سوالات و اعتراضات پیدا ہوتے ہیں جن کا تشفی بخش جواب نہیں لہٰذا راجح بات یہی ہے کہ سنتِ خلفاء سے مراد ان کا اجتہادی منہج ہے اور اس معنی و مراد کو لینے سے کوئی ایسا اعتراض اور اشکال پیدا نہیں ہوتا کہ جس کا تسلی بخش جواب نہ دیا جا سکے۔

البتہ یہ بحث بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یا خلفاء کرام میں ہی باہم اختلاف ہو جائے تو کس کی رائے کو ترجیح دی جائے گی؟ اس بارے بالکل سادہ اور عام فہم اصول یہ ہوگا کہ اجتہادی آراء کے مختلف ہونے کے نتیجہ میں ہمیں قرآن مجید سے اصول ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ''(سورۃ النساء۴:۵۹)(اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول ﷺ (کے حکم) کی طرف رجوع کرو۔) دیا گیا ہے لہٰذا جس کا بھی موقف کتاب و سنت کی تعلیمات کے زیادہ قریب ہوگا اسی کے موقف کو ترجیح دی جائے گی اور اگر دونوں آراء کی گنجائش ہو تو کسی ایک رائے پر جمود اختیار نہ کیا جائے گا۔ دو مختلف آراء میں ترجیح دیتے ہوئے یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان میں سے کون سی رائے حالات و ظروف کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتی ہے نیز جسے اختیار کرنے سے لوگ بھی کسی عسر و تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔ خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج ان کے اجتہادات سے واضح ہوتا ہے اور انہیں یہ اجتہادات کرنے کی نوبت اس لیے آئی کہ ان کے دور میں تاریخِ اسلام میں پہلی دفعہ کئی طرح کے مسائل منصہ شہود پر آئے۔ ان مسائل کے پیش آنے کے اسباب حسبِ ذیل تھے

i۔ ملک کے اندرون و بیرون شورشیں برپا ہوئیں جن کے نتیجہ میں کئی طرح کے مسائل فقہیہ نے جنم لیا۔

ii۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں فتوحات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا یہ فتوحات بھی اپنی جلو

میں کئی مسائل لے کر آئیں۔

iii۔ اموالِ غنیمت (منقولہ وغیر منقولہ) کی فراوانی سے بھی کئی مسائل وجود میں آئے۔

iv۔ نئی مفتوحہ اقوام کا عرف ورواج بھی کئی جدید فقہی مسائل کا سبب بنا۔

v۔ بین الاقوامی روابط بڑھنے سے بھی کئی مسائل نے سر اٹھایا۔

vi۔ تمدنی ترقی کے نتیجہ میں کئی جدید فقہی سوالات نے خلفاء راشدین کو سوچنے پر مجبور کیا۔

ان مذکورہ بالا اسباب کے نتیجہ میں خلفاء راشدین کو جن نوعیتوں (Categories) سے متعلقہ اجتہادات کرنے پڑے وہ درج ذیل تھے۔

1۔ عبادات سے متعلقہ اجتہادات

2۔ اقتصادی امور میں اجتہادات

3۔ مناکحات سے متعلقہ اجتہادات

3۔ حربی امور میں اجتہادات

4۔ انتظامی نوعیت کے مسائل میں اجتہادات جو خلیفہ وقت کے تشریعی اختیارات کے نتیجہ میں سامنے آتے ہیں، اسے ''سیاستِ شرعیہ'' کا عنوان بھی دیا جاتا ہے۔

خلفاء راشدین نے کئی مواقع پر انفرادی وشخصی طور پر اجتہاد کیا اور یہ اس وقت جب اجتہادی مسئلہ کا تعلق اجتماعی امور سے نہ تھا یا اجتماعی امور سے تھا مگر انہیں اپنی اجتہادی رائے کے درست ہونے پر مکمل اطمینان واعتماد حاصل تھا بصورتِ دیگر خلفاء راشدین نے اکثر وبیشتر شورائی واجتماعی طرز کے اجتہاد کو اختیار کیا اور ان کے اس شورائی طرز کے اجتہاد کے دیگر کئی فوائد کے علاوہ امت کو ممکنہ حد تک ''اجماع'' کی طرف عملی رہنمائی ملی۔

خلفاء راشدین کا یہ شورائی اجتہاد درج ذیل اہم خصوصیات کا حامل تھا۔

i۔ ہر عمر کے افراد حتیٰ کہ بچے، نوجوان، بوڑھے اور کبھی عورتوں سے بھی مشورہ کیا جاتا تھا جب خصوصاً زیرِ بحث مسئلہ عورتوں سے متعلقہ ہوتا۔

ii۔ ہر کسی کو اپنی رائے کے اظہار میں مکمل آزادی تھی اور ایک دوسرے کی رائے کا احترام بھی کیا جاتا تھا۔

iii۔ خلیفہ اپنی رائے کو بہ حیثیت رکنِ شوریٰ پیش کرتا تھا نہ کہ خلیفہ کی حیثیت سے۔

iv۔ واقعاتی مسائل ہی زیرِ بحث آتے تھے، فرضی مسائل پر بحث نہ کی جاتی تھی۔

۷۔ ارکانِ شوریٰ پر خوفِ خدا کا عنصر غالب رہتا تھا۔

خلفاء راشدین کے جو اجتہادات ہم تک نقل ہو کر آئے ہیں ان کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہادات، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کے مقابلہ میں نسبتاً کم ہیں اور اس کم ہونے کی وجہ قطعاً یہ نہیں ہے کہ ان میں اجتہادی صلاحیت کم تھی بلکہ دراصل وجہ یہ تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو زیادہ عرصہ خلافت کا موقع ہی نہ مل سکا اور جو مسائل پیدا ہوئے وہ زیادہ تر اندرونِ ملک کی حد تک شورشیں تھیں۔ رہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو آپ رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو اس وقت نظامِ حکومت انتہائی مستحکم تھا۔ دسیوں بیسیوں مسائل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں پیش آ چکے تھے جن کا آپ رضی اللہ عنہ نے شورائی اجتہاد کے ساتھ حل پیش کیا تھا اور امت کی رہنمائی فرمائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں کوئی زیادہ مسائل نے جنم نہ لیا لہٰذا انہیں کثرتِ اجتہاد کی نوبت نہ آئی اور جہاں نوبتِ اجتہاد آئی تو وہاں آپ رضی اللہ عنہ نے کوئی کوتاہی بھی نہیں کی۔

خلفاء راشدین کا چونکہ امت میں شخصی و علمی دونوں اعتبار سے سب سے نمایاں اور ارفع مقام ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں رہ کر شریعت سے استفادہ کا طریقہ بھی سیکھا تھا جس کے نتیجہ میں ان کے اجتہادی منہج اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادی منہج میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی پھر ان کے اجتہادی منہج کو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید بھی حاصل تھی۔ یہ وہ اسباب تھے جن کی بنا پر خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج اور ان کے اجتہادات کو امت میں بڑی پذیرائی ملی۔ ماضی میں علماء، فقہاء قاضی، حکمران طبقہ اور مجتہدین ان کے اجتہادی منہج اور اجتہادات سے استفادہ کرتے رہے۔ خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج اور اجتہادات کے نہ صرف فقہ اسلامی پر اثرات مرتب ہوئے بلکہ ''اصولِ فقہ'' کا فن بھی کافی حد تک انہی کا مرہونِ منت ہے۔

جس طرح خلفاء راشدین کے مبارک دور میں کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا، اسی طرح آج کے پرفتن دور میں بھی کئی ایک قابلِ اجتہاد مسائل سامنے آئے ہیں۔ عصرِ حاضر میں ان مسائل کے پیش آنے کے درج ذیل اسباب ہیں:

i۔ جدید آلات و ذرائع اور ترقیات جو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیداوار ہیں۔

ii۔ مغرب کے نئے تنظیمی اور مفید اداروں کے وجود میں آنے سے کئی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

iii۔ بعض جدید مسائل کا تعلق انتظامی امور سے ہے۔

iv۔ تمدنی ترقی کے نتیجہ میں کئی جدید طرقِ تجارت سامنے آئے ہیں جن کے بارے شرعی نکتہ نظر کی وضاحت ضروری ہے تاکہ مسلم عوام کا تعلق شریعت سے کمزور نہ ہونے پائے۔

v۔ بعض جدید مسائل کا تعلق علاقائی اور عالمی عرف کے بدلنے سے ہے۔

vi۔ بعض مسائل کا تعلق ضرورت و مجبوری سے ہے۔

vii۔ مختلف قوموں خصوصاً مسلم تہذیب اور غیر مسلم یورپی و مغربی تہذیب کے تصادم سے متعلقہ مسائل میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

viii۔ بین الاقوامی قسم کے معاہدات بھی عصرِ حاضر کے جدید فقہی مسائل کا ایک اہم سبب ہیں۔

ان مذکورہ بالا اسباب کے نتیجہ میں درج ذیل نوعیّتوں سے متعلقہ مسائل میں اجتہاد کی ضرورت عصرِ حاضر میں پیش آئی ہے۔

i۔ عبادات سے متعلقہ کئی جدید مسائل سامنے آئے ہیں جن کے بارے اجتہاد کی ضرورت ہے۔

ii۔ اقتصادیات سے متعلقہ معاشی امور میں اجتہادات

iii۔ جدید مسائل مناکحات

iv۔ عصری حربی و عسکری مسائل

v۔ جدید طبی مسائل

vi۔ انتظامی امور یعنی ''سیاست شرعیہ'' سے متعلقہ مسائل

گزشتہ چند صفحات میں ذکر کردہ عہد خلافتِ راشدہ کے فقہی مسائل کا اگر عصرِ حاضر کے مذکورہ بالا جدید فقہی مسائل سے موازنہ کیا جائے تو بڑی حد تک یکسانیت نظر آتی ہے البتہ بعض مسائل (جیسے طبی مسائل) ہیں جو بالکل نئے ہیں اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کے دور میں غیر مسلموں اور ذمیوں سے متعلقہ مسائلِ فقہیہ سامنے آئے تھے مگر آج مسلمانوں کے مغلوب ہونے کی صورت میں اس کے عکس صورت حال درپیش ہے لہٰذا غیر مسلم ممالک میں موجود مسلمانوں کو کئی جدید طرز کے مسائل کا سامنا ہے جس سے اسلامی فقہ میں ''فقہ الاقلیات'' کے عنوان سے ایک نیا اضافہ ہوا ہے۔

خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج ہر دور کے فقہاء و مجتہدین کیلئے اسوہ و نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا مذکورہ بالا جدید فقہی مسائل کے حل کے لیے بھی معاصر فقہاء کو خلفاء کرام کے اجتہادی منہج سے استفادہ کرنا ہوگا۔ ماضی قریب میں بعض اہلِ علم نے خلفاء کے اجتہادی منہج سے استفادہ کرتے ہوئے

یہ کہا کہ کبھی منصوص مسائل کو بھی بدلا جا سکتا ہے اور بعض نے کہا کہ سنت رسول اللہ ﷺ ایک متبدل چیز ہے جسے ہر دور میں حاکمِ وقت بدل سکتا ہے حالانکہ یہ نکتہ ہائے نظر درحقیقت خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کے نتیجہ میں سامنے آئے۔ فی الحقیقت خلفاء راشدین نے نہ تو کسی نص کے حکم کو بدلا اور نہ ہی سنتِ نبوی ﷺ کو ایک متبدّل چیز قرار دیا۔

خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے عصرِ حاضر میں استفادہ کی صحیح صورت حسبِ ذیل ہو سکتی ہے۔

i۔ قرآن وحدیث سے براہِ راست استنباط واستدلال کیا جائے۔

ii۔ جدید مسائل کی نظائر وامثال قرآن وحدیث سے تلاش کر کے قیاس کیا جائے۔

iii۔ استحسان کا بقدرِ ضرورت استعمال ہو نہ کہ ہر چیز کو جائز اور حلال کر دینے کی ہی روش ہو۔

iv۔ استصحاب اصول کی روشنی میں نئی اشیاء، نئے افکار اور نئے تنظیمی اداروں بارے اجتہاد کیا جائے مگر شریعت کے منافی اگر کوئی عنصر ہو تو اسے پہلے دور کیا جائے۔

v۔ عصرِ حاضر کے بیشتر جدید فقہی مسائل میں ''مصالح مرسلہ'' کے تحت ''اجتہاد استصلاحی'' کیا جائے۔

vi۔ قدیم وجدید فقہی ذخیرہ سے بھی استفادہ کیا جائے۔

vii۔ مسلمانوں کے ایمان اور اخلاق وغیرہ کو بچانے کے لیے نئی ایجادات واختراعات کے جواز و عدمِ جواز بارے اجتہادی رائے قائم کرتے ہوئے سدّ ذریعہ اصول کا ستعمال بھی نہایت ضروری ہے مگر ایسا بھی نہ ہو کہ ہر نئی چیز کو محض نیا ہونے کی وجہ سے ہی حرام ہی قرار دے دیا جائے۔

viii۔ جدید فقہی مسائل کے حل کے لیے خلفاء راشدین کی طرح عرف کا اعتبار کرنا بھی ضروری ہے بشرطیکہ روحِ شریعت کے منافی نہ ہو۔

ix۔ حالات وظروف کا اعتبار بھی از بس ضروری ہے۔

x۔ اخلاصِ نیت اور خوفِ خدا ایسے اوصاف جلیلہ سے مجتہدین متصف ہوں۔

xi۔ مآخذ شریعت سے استفادہ خلفاء راشدین کی طرح بالترتیب کیا جائے۔

xii۔ اجتہاد سے رجوع کو باعثِ عار نہ سمجھا جائے۔

xiii۔ اجتہاد چونکہ محض مجتہد کی ایک ذاتی رائے ہے جس میں خطا کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے لہٰذا

اختلافِ رائے کی گنجائش کو تسلیم کیا جائے۔

xiv۔ آیات واحکام کے موقع ومحل کی تعیین سے گریز نہ کیا جائے۔

xv۔ واقعاتی مسائل میں ہی غور وفکر کیا جائے۔

xvi۔ ایک مسئلہ سے متعلقہ کسی ایک نص پر اکتفانہ کیا جائے بلکہ متعلقہ دیگر نصوص بھی سامنے رہیں۔

xvii۔ مباح امور بارے بوقتِ ضرورت پابندی کا فتویٰ دیا جائے۔

xviii۔ غیر مسلموں سے استفادہ کرتے ہوئے خلفاء راشدین کے اصول ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کوملحوظ رکھا جائے نیز مسلمان قوم خود بھی ترقی کی طرف بڑھنے کی کوشش کرے۔

xix۔ عصرِ حاضر میں انفرادی طرز کے اجتہاد کے مقابلہ میں شورائی واجتماعی اجتہاد کی ضرورت عہدِ خلافتِ راشدہ سے کہیں زیادہ ہے لہٰذا اس کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے استفادہ کی ضرورت کو آج کی طرح ہر دور میں محسوس کیا گیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ عصرِ حاضر کے فقہاء کرام اور مجتہدینِ عظام اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج سے مستفید ومستنیر ہوتے ہوئے جدید فقہی مسائل کا حل پیش کریں تاکہ امت کا دین سے رشتہ مضبوط ومحفوظ رہے وگرنہ ارتداد کی راہ کھلنے کے خدشہ سے انکارنہیں کیا جاسکتا۔

وصلی اللّٰہ علی نبیہ محمد و علی الہ وصحبہ اجمعین ۔(آمین برحمتک یا ارحم الرحمین)

بحث وتحقیق کے نتائج:

گزشتہ صفحات میں مذکور پانچ ابواب پر مشتمل بحث وتحقیق بعنوان'' خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج اور عصر حاضر میں اس سے استفادہ'' کے اہم ترین نتائج حسب ذیل ہیں۔

1۔ اجتہاد کی ضرورت واہمیت سے کسی بھی دور میں انکار نہیں کیا جاسکتا۔

2۔ خود رسول اللہ ﷺ نے کئی ایک مواقع پر اجتہاد کیا ہے۔

3۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عہدِ نبوی میں رسول اللہ ﷺ کی موجودگی اور عدم موجودگی میں اجتہاد کرنا تاریخی طور پر ثابت ہے۔

4۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کی اجازت اس وقت دے دی گئی تھی جب رسول اللہ ﷺ

نے غزوہ بنوقریظہ کے موقع پر "لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظہ" فرمایا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس موقع پر دو قسم کے طرزِ عمل سامنے آئے تھے جن پر آپ ﷺ نے خاموشی کا اظہار فرمایا تھا۔

5۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم درجہ اجتہاد پر فائز نہ تھے البتہ جو اس اہم مقام پر فائز تھے ان میں سے تقریباً ایک سو تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فقہی و اجتہادی اقوال منضبط ہو سکے ہیں۔

6۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں بالعموم اور فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بالخصوص خلفاء راشدین ایک امتیازی شان و مقام رکھتے ہیں ان خلفاء اربعہ میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی اجتہادی آراء جو ہم تک منقول ہو کر آئی ہیں وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی نسبت زیادہ ہیں اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ میں اجتہادی صلاحیت میں کمی تھی بلکہ دراصل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زیادہ عرصہ خلافت کا موقع نہیں مل سکا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو زیادہ تر نئے مسائل پیش نہ آئے بلکہ اکثر مسائل عہدِ فاروقی میں پیش آئے جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجتہاد فرمایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فاروقی اجتہادات کو ہی برقرار رکھنے میں مصلحت سمجھی۔

7۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اگرچہ تمام علومِ شرعیہ کے عالم تھے مگر مسائلِ حج بارے آپ رضی اللہ عنہ کو گویا تخصص کا درجہ حاصل تھا۔

8۔ خلفاء راشدین کا مجموعی اجتہادی منہج حسب ذیل تھا:

i۔ قرآن و حدیث سے براہ راست رہنمائی

ii۔ سابقہ خلفاء کے اجتہادات سے استفادہ

iii۔ شورائی طرز کا اجتہاد جس کا نتیجہ کبھی "اجماع سکوتی" کی صورت میں نکلتا رہا۔

iv۔ قیاس کے لیے قرآن و سنت سے نظائر و امثال کی تلاش

v۔ حسبِ ضرورت استحسان کا استعمال

vi۔ مصالح مرسلہ (روح شریعت) کا لحاظ

vii۔ استصحاب اصول کا لحاظ

viii۔ سدِ ذریعہ کی بنیاد پر اجتہادی فیصلے

ix۔ عرف کا لحاظ

x۔ سابقہ شرائع سے استفادہ (بوقتِ ضرورت)

xi۔ بدلتے ہوئے حالات وظروف کا لحاظ

xii۔ آیات واحادیث کے احکام کا موقع ومحل متعین کرنا

xiii۔ مباح امور پر بوقتِ ضرورت پابندی

xiv۔ محض واقعاتی مسائل بارے اجتہاد

ان چودہ امور میں سے پہلے دس کو مختلف اصولیوں نے مآخذ ومصادرِ شریعت کی حیثیت دی ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں اصولیوں کے تشکیل کردہ تمام مصادر کی امثلہ خلفاء راشدین کے اجتہادات سے بھی دی جا سکتی ہیں گویا ان مآخذ کے استعمال کرنے میں خلفاء راشدین کو اسبقیت وتقدم حاصل ہے۔

9۔ خلفاء راشدین کے اپنی اجتہادی آراء سے رجوع کی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

10۔ حدیث ''علیکم بسنتی و سنة الخفاء الراشدین المهدیین'' میں خلفاء کی سنت سے مراد ان کا اجتہادی منہج ہے نہ کہ ان کے اجتہادات، لہٰذا ان کے اجتہادی منہج کو یقیناً شرعی حیثیت حاصل ہے۔

11۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات کو اگرچہ قرآن وحدیث کے نصوص ایسی شرعی حیثیت حاصل نہیں مگر ان سے فقہی استفادہ کی ضرورت واہمیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔

12۔ کسی مسئلے میں اگر خلفاء راشدین کی آراء مختلف ہوں تو ان میں سے جس کی رائے قرآن وسنت کے زیادہ قریب ہوگی اسے ترجیح دی جائے گی اور اگر اس طرح ترجیح دینا مشکل ہو تو جس کی رائے حالات وظروف اور یسر وسہولت کے تقاضوں کے مطابق ہوگی اسے ترجیح دی جائے گی۔

13۔ خلفاء راشدین کے دور میں عبادات، اقتصادیات، مناکحات، فنونِ حرب اور انتظامی معاملات سے متعلقہ نئے مسائل نے سر اٹھایا جن کا حل خلفاء راشدین نے اجتہاد کے ساتھ پیش کیا۔

14۔ انفرادی قسم کے مسائل میں خلفاء راشدین نے انفرادی اجتہاد بھی کیا ہے مگر بالکل نئے قسم کے اور اجتماعی نوعیت کے اہم مسائل میں شورائی اور اجتماعی طرز کا اجتہاد کرتے رہے۔

15۔ شورائی طرز کے اجتہاد کے نتیجہ میں امت ایک عرصہ تک اتفاق واجتہاد کی لڑی میں پروئی رہی اور جب سے انفرادی اجتہاد کا رجحان بڑھا امت گروہ بندیوں کا شکار ہو کر رہ گئی۔

16۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات اور اجتہادی منہج سے ماضی میں خلفاء وحکمران، جج حضرات اور مجتہدینِ امت استفادہ کرتے رہے۔

17۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات اور اجتہادی منہج کے فقہ اسلامی کے تمام مکاتب فقہ پر گہرے انمٹ اثرات ہیں۔

18۔ عصرِ حاضر میں بھی عبادات، اقتصادیات، مناکحات، فنونِ حرب اور طبی نوعیت کے جدید فقہی مسائل معاصر فقہاء امت اور مجتہدین کے اجتہادی فیصلوں کے منتظر ہیں اور ان مسائل میں مبتلا امت بھی حیران وششدر کھڑی ان مجتہدین کا منہ تک رہی ہے۔

19۔ غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو انتہائی سنگین قسم کے بعض مسائل درپیش ہیں ان مسائل بارے معاصر فقہی آراء کو ''فقہ الاقلیات'' کا نام دیا گیا ہے۔

20۔ خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج ہر دور کے فقہاء و مجتہدین کے لیے مفید و نافع ہے لہٰذا اس کی روشنی میں جدید فقہی مسائل کا حل کرنا ازبس ضروری ہے۔

سفارشات وتجاویز

بحث وتحقیق کے گزشتہ نتائج کی روشنی میں درج ذیل سفارشات وتجاویز دی جاتی ہیں جن پر امید ہے کہ بنظرِ استحسان غور وفکر کیا جائے گا۔

1۔ عصرِ حاضر کے با صلاحیت اور اہل مجتہدین فقہاء کرام کو عصری مسائل بارے ہمہ قسم کی معلومات حاصل کرنے کے بعد اجتہاد کرنا چاہیے۔

2۔ علوم کی گونا گونی کی بنا پر ایک شخص تمام علوم وفنون میں مہارتِ تامہ حاصل نہیں کر سکتا لہٰذا بالخصوص عصرِ حاضر کے پیش آمدہ فقہی مسائل کے حل کے لیے شورائی اور اجتماعی طرز کا اجتہاد کیا جانا چاہیے۔

3۔ اجتماعی اجتہاد کے لیے صرف ایک مسلک کے علماء وفقہاء کو جمع نہ کیا جانے بلکہ ”وسیع المسلکی اجتہاد“ کیا جائے جس میں تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ علماء وفقہاء شرکت کریں۔

4۔ ممکن حد تک کسی اتفاقی رائے تک پہنچا جائے بصورتِ دیگر اکثریتی رائے کو ترجیح دے کر اسے عوام کے سامنے پیش کیا جائے البتہ اقلیتی رائے کو بھی ساتھ شائع کر دیا جائے۔

5۔ جدید فقہی مسائل کے حل کے لیے خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کو اختیار کیا جائے لہٰذا سب سے پہلے قرآن وسنت سے براہِ راست استفادہ کی کوشش کی جائے اور نئے مسائل کی نظائر وامثال کتاب وسنت سے تلاش کی جائیں تا کہ قیاس کی راہ ہموار ہو سکے۔ بقدرِ ضرورت استحساناً اجتہادی فیصلے کیے جائیں اسی طرح سدّ ذریعہ، مصالح مرسلہ، استصحاب اصول نیز عرف کا بھی لحاظ کیا جائے۔

6۔ جدید کے لیے قدیم کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لہٰذا جدید مسائلِ فقہیہ کے لیے جدید وقدیم فقہی ورثہ سے بھی استفادہ کیا جائے۔

7۔ جدید مسائل میں سے کئی ایک بالکل نئی نوعیت کے ہیں جن کے نظائر وامثال قرآن وسنت

سے بھی نہیں ملتے نیز قدیم کتبِ فقہ میں بھی ان بارے کوئی رہنمائی نہیں ملتی لہٰذا ایسے مسائل کے لیے استصلاحی طرز کے اجتہاد کی شدید ضرورت ہے، بالفاظ دیگر روحِ شریعت اور مقاصدِ شریعت کے تقاضوں کی روشنی میں اجتہاد کیا جائے۔

8۔ حالات وظروف کی تبدیلی وتغیر کے اجتہادی فیصلے پر اثر انداز ہونے سے بھی انکار نہ کیا جانا چاہیے۔

9۔ اجتہاد کرتے ہوئے جب مصلحت کا لحاظ رکھا جائے تو اس سلسلہ میں "مصلحتِ عامہ" کو "مصلحت خاصہ" پر ترجیح دینی چاہیے۔

10۔ اجتہادات کا تعلق "فقہ الواقع" (واقعاتی مسائل) سے ہو نہ کہ فرضی وخود ساختہ مگر ناممکن الوقوع مسائل کے بارے میں اجتہادی سرگرمیاں دکھائی جائیں۔

11۔ غیر مسلموں کے انتظامی اداروں، ان کی ایجادات وانکشافات اور مصنوعات وغیرہ سے "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے اصول کے مطابق استفادہ کرنا چاہیے۔

12۔ عصرِ حاضر میں جن آیات واحادیث کے احکام کے موقع ومحل کو متعین کرنے کی ضرورت ہے اسے بھی متعین کیا جائے۔

13۔ مباح امور کی اجازت سے اگر معاشرہ میں مفاسد سامنے آرہے ہوں تو جلب منفعت اور دفع مضرت کے طور پر ان پر پابندی لگادی جائے۔

14۔ خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کو شائع کیا جائے تاکہ معاصر فقہاء کرام اور مجتہدین سنتِ خلفاء کو صحیح معنوں میں اختیار کرسکیں۔

15۔ خلفاء راشدین کے اجتہادی منہج کو سرکاری مدارس میں ایم اے کی سطح پر اور مدارس دینیہ میں فقہ واصول الفقہ کے سلیبس میں شامل کرنے کی بھرپور سفارش کی جاتی ہے یا کم از کم اصولِ فقہ کے طلبہ کو اس سے متعارف ضرور کرایا جائے تاکہ بوقتِ ضرورت وہ اس سے استفادہ کرسکیں کیونکہ اجتہاد کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین ہی فقہاء امت کے لیے اسوہ ونمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عنوانِ مقالہ کی مناسبت سے مقدور بھر تحقیق کی گئی ہے تاہم درج ذیل تشنہ تحقیق پہلوؤں پر بھی اگر تحقیقی کام کروایا جائے تو اس مقالہ کی اہمیت مزید دوچند ہوجائے گی:

أ۔ خلفاء کرام کے اجتہادات کی فقہی انداز میں تشریح کی کاوش ہونی چاہیے تاکہ ان کی افادیت مزید واضح ہوسکے۔

ii۔ خلفاء کرام کے بعض اجتہادات سے متعلق کچھ سوالات و اعتراضات یا اشکالات پیدا ہوتے ہیں لہٰذا اس سلسلہ میں تحقیقی کام بھی یقیناً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

iii۔ مقالہ میں خلفاء راشدین کے پیش کردہ اجتہادات ''روایات'' کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ان کی اصولِ حدیث کی روشنی میں تخریج و تحقیق کی جانی چاہیے تاکہ ان روایات کی صحت و ضعف واضح ہو سکے۔

آخر میں راقم الحروف ربِ کریم کے حضور انتہائی شکرگزار ہے کہ جس کی توفیق سے ہی اس مقالہ کی تکمیل ہو سکی۔ اس موقع پر میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ایک قول کو قدرے تغیر کے ساتھ ذکر کرنا چاہوں گا:

''اگر اس مقالہ میں کوئی خوبی ہے تو میرے رب العلمین کی طرف سے ہے جس کا میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا امیدوار ہوں اور اگر کوئی خامی و نقص ہے تو وہ میری طرف سے ہے اور شیطان کی طرف سے ہے جس پر میں اللہ عزوجل سے عفو و درگزر کا خواستگار ہوں''۔

وصلی اللہ علی نبیہ محمد و علی اٰلہ و اصحابہ اجمعین

(آمین یارب العلمین)

فہرست آیات

نمبر شمار	آیات	سورۃ نمبر	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
-1	اثمهما اكبر من نفعهما	۲	البقرة	۲۱۹	۳۶۴,۴۱۲
-2	اقرا باسم ربك الذى خلق ٥ خلق الانسان من علق	۹۶	العلق	۳،۲	۳۷۳
-3	الذى يو تى ماله يتزكىٰ ٥ ومالاحد عنده	۹۲	الليل	۱۹،۱۸	۱۰۶
-4	الزانية والزانى فا جلدوا كل واحد منهما	۳۴	النور	۲	۵۵,۵۶
-5	اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى	۵	المائده	۳	۴۱۴
-6	ان اشكرلى ولوالديك	۳۱	لقمان	۱۴	۲۷
-7	ان تقولو ا على الله ما لا تعلمون	۷	الاعراف	۳۳	۴۱۸
-8	ان الحكم الاالله	۱۲	يوسف	۴۰	۱۸۱
-9	ان السمع و البصر و الفواد كل اولئك كان عنه مسئول	۱۷	الاسراء	۳۶	۳۸۵
-10	ان الظن لا يغنى من الحق شيئا	۱۰	يونس	۳۶	۵۴
-11	ان هذا القرآن يهدى للتى هى اقوم	۱۷	الاسراء	۹	۴۰۴
-12	انا انزلنا اليك الكتاب با لحق	۴	النساء	۱۰۵	۷۱
-13	انفقو ا من طيبت ما كسبتم	۲	البقرة	۲۶۷	۱۶۳,۳۹۷
-14	انما حرم عليكم الميتة و الدم	۲	البقرة	۱۷۳	۱۶۶,۳۸۲

15-	انما الصدقات للفقراء والمسکین و العملین علیها	۹	التوبة	۶۰	۳۵۶
16-	انما الخمر و المیسر والانصاب والازلام رجس	۵	المائدة	۹۰	۱۸۱
17-	تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض	۲	البقرة	۵۳	۸۳
18-	تر هبون به عدو الله و عدوکم	۸	الانفال	۶۰	۳۷۵
19-	تا لله لقد اثرک الله علیناوان کنا لخطئین	۱۲	یوسف	۹۱	۱۲۵
20-	جعل لکم سرابیل تقیکم الحرو سرابیل تقیکم با سکم	۱۶	النحل	۸۱	۲۷۷
21-	حمله و فصٰله ثلثون شهرا	۴۶	الاحقاف	۱۵	۱۸۲
22-	خذوا حذرکم	۴	النساء	۱۰۲	۳۷۳
23-	ذلک فضل الله یو تیه من یشاء	۵	المائدة	۵۴	۱۳۳
24-	رب زدنی علما	۲۰	طه	۱۱۴	۴۹
25-	سنریهم ایتنا فی الافاق و فی انفسهم	۴۱	حمٓ السجدة	۵۳	۳۴۶
26-	صحفا مطهرة	۹۸	البیّنة	۲	۱۴۷
27-	فاجعل افئدة من الناس تهوی الیهم	۱۴	ابراهیم	۳۷	۳۵۷
28-	فاذا عزمت فتوکل علی الله	۳	ال عمران	۱۵۹	۶۶
29-	فاعتبروا یا اولی الابصار	۵۹	الحشر	۲	۶۵
30-	فان تنازعتم فی شئی فردوه الی الله والر سول	۴	النساء	۵۹	۴۴۶
31-	ففهمنهاسلیمن	۲۱	الانبیاء	۷۹	۷۱
32-	فکفارته اطعام عشرة مسٰکین من اوسط۔	۵	المائدة	۸۹	۵۵
33-	فمن اضطر غیر با غ ولاعاد	۲	البقرة	۱۷۳	۳۸۳,۳۸۴
34-	فوق کل ذی علم علیم	۱۲	یوسف	۷۶	۳۰۹
35-	فی الرقاب	۹	التوبة	۶۰	۳۴۹,۴۱۹

36-	کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم	۲	البقرۃ	۱۸۳	۳۵۴
37-	کلوا من ثمرہ اذا اثمر واتوا حقہ یوم حصادہ	۶	الانعام	۱۴۱	۳۹۷
38-	کنتم خیر امۃ اخرجت	۳	ال عمران	۱۱۰	۲۰۰
39-	لا تا کلو ا اموالکم بینکم بالباطل	۲	البقرۃ	۱۸۸	۵۸
40-	لا تثریب علیکم الیوم یغفر للہ لکم	۱۲	یوسف	۹۲	۱۲۵
41-	لا ھن حل لھم ولا ھم یحلون لھنّ	۶۰	الممتحنۃ	۱۰	۳۷۱,۳۷۲
42-	لایکلف اللہ نفسا الاوسعھا	۲	البقرۃ	۲۸۶	۲۹۴
43-	للہ ملک السموت و الارض یخلق ما یشاء	۴۲	الشوری	۴۹	۳۸۰
44-	لیس علی الذین امنوا و عملوا الصلحت جناح فیما	۵	المائدۃ	۹۳	۳۰۱
45-	مااقاء اللہ علی رسولہ	۵۹	الحشر	۷	۱۵۰
46-	ما فرّ طنافی الکتب من شیء	۶	الانعام	۳۸	۱۷
47-	ما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علی اصولھا	۵۹	الحشر	۵	۳۷۴
48-	مایرید اللہ لیجعل علیکم من حرج	۵	المائدۃ	۶	۴۱۴
49-	محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخذان	۵	المائدۃ	۵	۱۶۵
50-	من احیاھا فکانمااحیاالناس جمیعاً	۵	المائدۃ	۳۲	۳۸۳
51-	من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا	۶	الانعام	۱۶۰	۳۶
52-	من کفر باللہ من بعد ایمانہالا من اکرہ ۔	۱۶	النحل	۱۰۶	۱۶۶
53-	من یعمل سو ء یجز بہ	۴	النساء	۱۲۳	۱۳۳
54-	من یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا	۲	البقرۃ	۲۶۹	۸۲
55-	نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیاۃ الدنیا	۴۳	الزخرف	۳۲	۸۴
56-	واتقوااللہ ویعلمکم اللہ	۲	البقرۃ	۲۸۲	۴۸,۸۲

-57	واتموا الحج و العمرة لله	۲	البقرة	۱۹۶	۲۶۲
-58	واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا	۴	النساء	۱۰۱	۱۱۷
-59	واعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخیل	۸	الانفال	۶۰	۳۷۳
-60	واعلموا انما غنمتم من شئی فان لله خمسه وللرسول	۸	الانفال	۴۱	۱۸۳
-61	واقسموا بالله جهد ایمانهم	۶	الانعام	۱۰۹	۲۹
-62	والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما ۔	۵	المائدة	۳۸	۱۶۶
-63	والذین جاء وامن بعدهم یقولون۔	۵۹	الحشر	۱۰	۱۴۹,۱۵۰ ۲۶۷
-64	والذین هم لفروجهم حفظون الا علی ازواجهم	۲۳	المومنون	۵	۱۷۱
-65	والذین لا یجدون الا جُهدهم	۹	التوبة	۷۹	۳۰
-66	والوالدات یرضعن اولادهن حولین کاملین	۲	البقرة	۲۳۳	۱۸۲
-67	و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض	۱۳	الرعد	۱۷	۳۵
-68	وامر هم شوریٰ بینهم	۴۲	الشوری	۳۸	۴۲۵
-69	وان تجمعوا بین الاختین	۴	النساء	۲۳	۱۷۱
-70	وان خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکما ۔	۴	النساء	۳۵	۱۸۲
-71	وان طلقتموهن من قبل ان تمسوهن وقد فرضتم	۲	البقرة	۲۳۷	۱۷۲
-72	وانزل الله علیک الکتاب والحکمة	۴	النساء	۱۱۳	۷۲
-73	وجعلنا منهم ائمة یهدون بامرنا لما صبروا	۳۲	الم السجدة	۲۴	۲۰۱
-74	ورفعنا بعضهم فوق بعض درجت	۴۳	الزخرف	۳۲	۳۱۳

-75	وشاور هم فی الامر	۳	ال عمران	۱۵۹	۶۵،۴۲۵
-76	وعلی المولودله رزقهن وکسوتهن بالمعروف	۲	البقرة	۲۳۳	۱۲۵
-77	وکذالک جعلناکم امة و سطا	۲	البقرة	۱۴۳	۲۰۰
-78	وکلا اتینا حکما و علما	۲۱	الانبیاء	۷۹	۷۱
-79	ولا تقتلوا انفسکم	۴	النساء	۲۹	۳۸۵
-80	ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة	۲	البقرة	۱۹۶	۳۸۵
-81	ولا تعاونوا علی الاثم و العدوان	۵	المائدة	۲	۳۷۶
-82	ولقد اتینا ابراهیم رشده	۲۱	الانبیاء	۵۱	۷۱
-83	ولقد کرمنا بنی ادم	۱۷	الاسراء	۳۰	۳۸۴
-84	ولیشهد عذابهما طائفة من المؤمنین	۲۴	النور	۲	۴۱۳
-85	وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسول	۳	ال عمران	۱۴۴	۱۴۲
-86	ومن یعتصم بالله فقد هدی الیٰ صراط مستقیم	۳	ال عمران	۱۰۱	۲۰۰
-87	ونزلنا علیک الکتب	۱۶	النحل	۸۹	۱۷
-88	ونفضل بعضها علی بعض فی الاکل	۱۳	الرعد	۴	۸۴
-89	واولات الاحمال اجلهن ان یضعن حملهن	۶۵	الطلاق	۴	۱۹۵
-90	و یخلق ما لا تعلمون	۱۶	النحل	۸	۳۴۶
-91	هوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا	۲	البقرة	۲۹	۳۸۴
-92	هدی للناس	۳	ال عمران	۴	۳۹۵
-93	یاتوک رجالا و علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق	۲۲	الحج	۲۷	۳۵۷

-94	یا یها الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصدقین	۹	التوبۃ	۱۱۹	۲۰۰
-95	یا یها الذین امنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا	۸	الانفال	۲۹	۳۸،۸۲
-96	یضل بہ کثیراویهدی بہ کثیرا	۲	البقرۃ	۲۶	۳۹۵

فہرست احادیث

18-	الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله ﷺ	سنن دارمی	۱۸,۴۶
19-	الخلافة فی امتی ثلاثون سنة......	مسند احمد	۱۰۳
20-	السمع والطاعة فی حق مالم یؤمر بمعصیة......	صحیح بخاری	۳۹۹
21-	الشیطان مع الواحد وھو عن الاثنین ابعد	جامع تر مذی	۴۲۶
22-	الصلاۃ جا معة	اتحاف الکرام	۱۲۶
23-	الصلوۃ وما ملکت ایمانکم	سنن ابن ماجه	۳۴۸
24-	العلماء ورثة الانبیاء	سنن دارمی	۶۴
25-	الکلمة الحکمة ضالة المومن	سنن ابن ماجه	۳۴۴
26-	اللھم اعز الاسلام باحب ھذین......	جامع ترمذی	۱۱۴
27-	اللھم انی ابرأ الیک مما صنع خالد	صحیح بخاری	۳۸
28-	اللھم اھد قلبه و ثبت لسانه	الاستیعاب	۱۲۵
29-	النکاح من سنتی......	سنن ابن ماجه	۳۶۶
30-	امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو	صحیح بخاری	۱۵۲,۳۰۴
31-	انزل القرآن علی سبعة احرف	مسند احمد	۱۴۴
32-	ان الحلال بین و ان الحرام بین	صحیح مسلم	۱۴۱
33-	ان الشیطان لیخاف منک یا عمر	جامع ترمذی	۱۳۰
34-	ان الله اختار اصحابی	الموافقات	۲۰۲
35-	ان الله جعل الحق علی لسان عمر	جامع ترمذی	۲۰,۱۱۴,۲۰۵
36-	ان الله سیھدی لسانک و یثبت قلبک	مسند احمد	۱۲۵
37-	ان الله یرفع بھذا الکتاب اقواما......	سنن ابن ماجه	۳۹۵
38-	ان عثمان اول من ھاجر با ھله من ھذه الامة	الاصابة	۱۱۹
39-	ان لک اجر رجل ممن شھد بدراً وسھمه	صحیح بخاری	۱۲۰
40-	ان مثل اصحابی فی امتی کمثل الملح	اعلام الموقعین	۲۰۱
41-	انت احق به مالم تنکحی	سنن ابی داود	۲۴۱

-42	انتم اعلم بامر دنیاکم......	اصول سرخسی	۷۲
-43	انکم تختصمون الیّ فلعل بعضکم	صحیح مسلم	٦۷
-44	انما الطاعة فی المعروف	سنن ابی داود	۳۹۹
-45	انما انا قاسم و الله یعطی	صحیح بخاری	۱۳۲
-46	انه لم یدفن نبی قط الاحیث یقبض	البدایة و النهایة	۱۴۴
-47	انه لیس من الناس احدٌ ا منّ علیّ	کنز العمال	۱۰٦
-48	اوتیت القرآن ومثله معه	سنن ابی داود	۴۰۴
-49	بالغ فی الاستنشاق الا ان تکون صائما	جامع ترمذی	۳۵۵
-50	بل هو الرأی والحرب والمکیدة	سیرت ابن ہشام	٦۷
-51	جعلت لی الارض مسجدا و طهورا	صحیح بخاری	۳۵۳
-52	خیر الناس من ینفع الناس	کنزالعمال	۳۵
-53	رفع القلم عن ثلاثة	سنن ابی داود	۵۰
-54	شاوروا الفقهاء العابدین	مجمع الزوائد	۲۹۸,۴۲٦
-55	ضلوا و اضلوا	صحیح بخاری	۲۱،۳٦
-56	عضوا علیها بالنواجذ	سنن ابی داود	۲۰۳
-57	علیکم بتقوی الله......	سنن ابی داود	۲۰۲
-58	علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین	سنن ابی داود	۱۹,۲۲,۲۰۹,۴۴٦
-59	فدین الله احق ان یقضٰی	مسند احمد	۲٦۰
-60	فکره رسول الله ﷺ المسائل و عابها	صحیح بخاری	۴۲۱
-61	کانت بنواسرائیل تسوسهم الانبیاء......	صحیح مسند احمد	۲۸۴
-62	کلا والله مایحزنک الله ابداً	صحیح بخاری	۱۰۸
-63	کنت وابو بکرو عمر	صحیح بخاری	۱۱٦
-64	کیف تقضی اذا عرض لک قضاء	سنن ابی داود	۷۵
-65	لا ضرر ولاضرار	سنن ابن ماجة	۳۷٦

-89 نعم ان اصبت فلک اجر ان......	مستدرک حاکم	۷۵
-90 و اما السجود فاجتهدوا فی الدعا	سنن ابی داود	۳۱
-91 و اتخذ لک مؤذنا لا یأخذ علی اذانه اجرا	سنن نسائی	۱۷۹
-92 و الذی نفسی بیده ما لقیک الشیطان......	صحیح بخاری	۲۰,۱۱۷
-93 وفی الرکاز الخمس	سنن ابی داود	۲۶۵
-94 یا ابن اخی لا تبعینّ شیئا حتی تقبضه	سنن بیهقی	۳۶۴

فہرست اعلام

فہرست اماکن

المراجع والمصادر

الف

1۔ القرآن الکریم

2۔ آر۔ کے۔ نور محمد، ڈاکٹر: اقضیۃ الخلفاء الراشدین، دار السلام، ریاض، ۲۰۰۳م

3۔ آمدی، علی بن محمد، سیف الدین، امام: الاحکام فی اصول الاحکام، دار الکتاب العربی، بیروت ۱۹۹۸م

4۔ ابن ابی شیبہ، عبداللہ بن محمد، امام: المصنف، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴م

5۔ ابن اثیر، علی بن ابی الکرم، امام: الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۵م

6۔ ابن الاثیر، عز الدین، امام: اسد الغابۃ، دار الشعب، شہر ندارد، ۱۹۷۰م

7۔ ابن باز، عبدالعزیز بن عبداللہ، شیخ: تحفۃ الاخوان، وزارۃ الشوون الاسلامیہ والاوقاف، الریاض، ۱۴۳۳ھ

8۔ ابن تیمیہ، امام: السیاسۃ الشرعیہ، وزارۃ الشوون الاسلامیہ، الریاض، ۱۴۱۸ھ

9۔ ابن تیمیہ وغیرہ، امام: المسودۃ فی اصول الفقہ، مطبعۃ المدنی، قاھرۃ، س۔ن

10۔ ابن الجوزی، عبدالرحمٰن بن علی، امام: تاریخ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، دار احیاء العلوم الدین، دمشق، س۔ن

11۔ ابن حجر، حافظ: تہذیب التھذیب، دار صادر، بیروت، ۱۳۲۵ھ

12۔ ایضاً: الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر، ۱۹۳۹م

13۔ ایضاً: فتح الباری، المطبعۃ السلفیۃ، القاھرۃ س۔ن

14۔ ایضاً: تلخیص الحبیر، المکتبۃ الاثریہ، سانگہ ہل، ۱۹۶۴م

15۔ ابن حزم، علی بن احمد، ابو محمد، امام: المحلی، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر، ۱۳۴۹ھ

16۔ ایضاً: الاحکام فی اصول الاحکام، ضیاء السنۃ، ادارۃ الترجمہ والتالیف فیصل آباد، ۱۴۰۴ھ

17۔ ابن حنبل، احمد، امام: المسند، المکتب الاسلامی بیروت، ۱۹۶۹م

18۔ ابن رجب حنبلی: الاستخراج لاحکام الخراج، دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن

19۔ ابن رشد، محمد بن احمد، امام: بدایۃ المجتہد، فاران اکیڈمی، لاہور، س۔ن

20۔ ابن السبکی، عبدالوہاب، امام: جمع الجوامع مع حاشیہ البنانی، اصح المطابع بمبئی، س۔ن

21۔ ابن سعد، محمد، امام: الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، ۱۹۵۷م

22۔ ابن عبدالبر، یوسف بن عبداللہ، امام: الاستذکار، دار قتیبہ، دمشق، ۱۹۹۳م

23۔ ایضاً: الاستیعاب، مکتبہ التجاریہ الکبریٰ، مصر، ۱۹۳۹م

24۔ ابن عدی، عبداللہ، امام: الکامل فی ضعفاء الرجال، دار الفکر، بیروت، س۔ن

25۔ ابن فرحون، ابراہیم بن محمد، امام: تبصرۃ الحکام، دار الکتب العلمیہ، بیروت، س۔ن

26۔ ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد، موفق الدین، مقدسی، امام: روضۃ الناظر وجنۃ المناظر، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۱م

27۔ ایضاً: المغنی، مکتبہ الریاض الحدیثہ، الریاض ۱۹۸۱م

28۔ ابن قیم، محمد بن ابی بکر، ابوعبداللہ، شمس الدین، امام: اعلام الموقعین، دار الجیل، بیروت، ۱۹۷۳م

29۔ ایضاً: اغاثۃ اللہفان، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۹۸م

30۔ ایضاً: الطرق الحکمیۃ، دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور، س۔ن

31۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، حافظ: تفسیر القرآن العظیم، دار السلام، ریاض، ۱۹۹۴م

32۔ ایضاً: البدایہ والنھایہ، دار ابی حیان، قاہرہ، ۱۹۹۶م

33۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابوعبداللہ، القزوینی، امام: سنن ابن ماجہ، دار السلام، ریاض، ۱۹۹۹م

34۔ ابن النجار، محمد بن احمد، الفتوحی، الحنبلی، امام: شرح الکوکب المنیر، دار الفکر، دمشق، ۱۹۸۰م

35۔ ابن نجیم امام: البحر الرائق شرح کنز الدقائق، المکتبہ الماجدیہ، کوئٹہ، س۔ن

36۔ ابن ہشام، عبدالملک، ابومحمد، امام: السیرۃ النبویۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۵م

37۔ ابن ہمام، محمد بن عبدالواحد، کمال الدین: التحریر فی اصول الفقہ، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۱ھ

38۔ ایضاً: شرح فتح القدیر، مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، مصر، س۔ن

39۔ اسعدی، عبیداللہ، مولانا: اصول الفقہ، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن

40۔ الاسنوی، جمال الدین، عبدالرحیم: شرح الاسنوی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۴م

41۔ البانی، ناصر الدین، شیخ: سلسلہ الاحادیث الضعیفہ والموضوعۃ، مکتبہ المعارف، ریاض، ۲۰۰۰م

42۔ امرتسری، ثناء اللہ، مولانا: رسالہ اجتہاد و تقلید، اہلحدیث اکادمی، لاہور، ۱۹۶۸م

43۔ ابوداود، سلیمان بن اشعث، السجستانی، امام: سنن ابی داود، کتاب القضاء، باب اجتہاد الرای فی القضا

44۔ ابویوسف، قاضی، امام: کتاب الخراج، طبع بولاق، ۱۳۰۲ھ

45۔ ایضاً: کتاب الآثار، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، س۔ن

46۔ ابویعلی محمد بن حسین، قاضی، امام: الاحکام السلطانیہ، ناشر ندارد

ب

47۔ بخاری، محمد بن اسمٰعیل، ابوعبداللہ، امام: صحیح البخاری، دارالسلام، ریاض، ۱۹۹۹ء

48۔ بلاذری، احمد بن یحیٰ، امام: فتوح البلدان، المطبعہ المصریہ، الازھر، ۱۹۳۲ء

49۔ بیضاوی، عبداللہ بن عمر، ناصر الدین، القاضی، امام: نھایۃ السول فی شرح منہاج الاصول، المطبعۃ السّلفیہ، قاھرہ، ۱۳۴۵ھ

50۔ ایضاً: تفسیر البیضاوی، دارفراس للنشر والتوزیع، س۔ن

51۔ بیہقی، احمد بن حسین، ابوبکر، امام: السنن الکبریٰ، دارالفکر، بیروت، س۔ن

پ

52۔ پرویز، غلام احمد: شہکار رسالت، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۸۱ء

ت

53۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، امام: جامع ترمذی، دارالسلام، ریاض، ۱۹۹۹ء

ج

54۔ جصاص، احمد بن علی، الرازی، امام: احکام القرآن، دارالکتاب العربی، بیروت، س۔ن

55۔ جعفر شاہ، پھلواری، مولانا: اجتہادی مسائل، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء

56۔ ایضاً: رفقائے نبی، عظمت صحابہ اکیڈمی، لاہور، س۔ن۔

57۔ جلال الدین محلی، محمد بن احمد، شمس الدین: شرح الجلال المحلی، مطبع اصح المطابع، بمبئی، س۔ن

58۔ جھنڈانگری، عبدالرؤف، مولانا: ایمان وعمل، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۲۰۰۴ء

ح

59۔ حاکم، محمد بن عبداللہ، امام: المستدرک، دارالباز، مکۃ المکرمۃ، س۔ن

60۔ حسام الدین، محمد بن محمد، امام: الحسامی، کتاب السنۃ، باب متابعۃ اصحاب رسول اللہ ﷺ، نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی، س۔ن

خ

61۔ خطیب بغدادی، احمد بن علی، امام: الفقیہ والمتفقہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۰ء

62۔ خطیب تبریزی، محمد بن عبداللہ، امام: مشکوٰۃ المصابیح (حاشیہ نگار: مولانا احمد علی سہارنپوری) قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن

د

63۔ دارقطنی، علی بن عمر، امام: سنن دارقطنی، کتاب فی الاقضیۃ والاحکام، نشر السنۃ، ملتان س۔ن

64۔ دارمی، عبداللہ بن عبدالرحمان، حافظ، امام: سنن دارمی، قدیمی کتب خانہ کراچی، س۔ن

65۔ الدینوری، احمد بن داود: الاخبار الطوال، داراحیاء الکتب العربیہ، ۱۹۶۰م

ذ

66۔ ذہبی، شمس الدین، ابوعبداللہ، امام: تذکرۃ الحفاظ، داراحیاء التراث العربی، من مطبوعات دائرۃ المعارف العثمانیہ، س۔ن

ر

67۔ رویعی بن راجح الرحیلی، ڈاکٹر: فقہ عمر بن الخطاب، دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ

68۔ رؤفہ اقبال، ڈاکٹر: عہد نبوی کے غزوات و سرایا، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱م

69۔ رئیس احمد جعفری: سیرت ائمہ اربعہ، شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور۔ ۱۹۵۵م

ز

70۔ زرقانی، محمد عبدالعظیم، شیخ: مناھل العرفان فی علوم القران، داراحیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن

71۔ الزرقانی، محمد، امام: شرح الزرقانی علی موطا امام مالک دار الفکر، بیروت، س۔ن

72۔ زرقاء مصطفٰی، احمد: المدخل الفقہی العام، دار الفکر، دمشق، ۱۹۶۸م

73۔ زرکشی، محمد بن بہادر، بدرالدین، امام: البحر المحیط فی اصول الفقہ، دار الصفوۃ، القاھرۃ ۱۹۹۲م

74۔ زکریا البری، ڈاکٹر: الاجتہاد فی الشریعۃ الاسلامیۃ، ادارۃ الثقافۃ والنشر، جامعہ الامام محمد بن سعود، ریاض، ۱۳۹۶ھ

75۔ زمخشری، جاراللہ، علامہ: الکشاف، مکتبہ و مطبعۃ مصطفٰی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۴۸م

س

76۔ ساجدالرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر: اسلامی معاشرہ کی تاسیس و تشکیل، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۷م

77۔ سرخسی، محمد بن احمد، امام: اصول السرخسی، دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن

78۔ ایضاً: المبسوط، دار المعرفہ، بیروت، س۔ن

79۔ ایضاً: شرح السیر الکبیر، حرکۃ الانقلاب الاسلامیہ الافغانیہ، شہرندارد، ۱۴۰۵ھ

80۔ سعید بن منصور، امام: سنن سعید بن منصور، دار الکتب العلمیہ، بیروت، س۔ن

81۔ سلیمان بن عبداللہ، ڈاکٹر: مقدمہ فی اصول الفقہ، دار العاصمہ الریاض، ۱۹۹۷م

82۔ سید سابق: فقہ السنۃ، فاران اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء

83۔ سیوطی، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، جلال الدین: الرد علی من اخلد الی الارض وجہل ان الاجتہاد فی کل عصر فرض، دار الکتب العلمیۃ، بیروت

84۔ ایضاً: تاریخ الخلفاء، دار الفکر، بیروت، ۱۹۷۴ء

85۔ ایضاً: الدر المنثور، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۳ء

ش

86۔ شاطبی، ابراہیم بن موسیٰ، ابو اسحٰق، المالکی، الغرناطی: الموافقات فی اصول الشریعۃ، دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن

87۔ ایضاً: الاعتصام، دار المعرفۃ، بیروت، س۔ن

88۔ شافعی، محمد بن ادریس، امام: الرسالۃ، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۹۴۰ء

89۔ ایضاً: مسند شافعی، دار الکتب الملکیۃ مصریۃ، مصر، ۱۹۵۱ء

90۔ ایضاً: الام، مکتبۃ الکلیات الازہریۃ، الازہریہ، ۱۹۶۱ء

91۔ شاہ محمد اسماعیل، شہید: ایضاح الحق الصریح (ترجمہ: معراج محمد بارق) قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن

92۔ شاہ ولی اللہ، امام: عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (مترجم: مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی) قرآن محل، کراچی، س۔ن

93۔ ایضاً: ازالۃ الخفاء (مترجم: مولانا اشتیاق احمد دیوبندی)، قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن

94۔ ایضاً، امام: حجۃ اللہ البالغہ، المکتبۃ السلفیہ، لاہور، س۔ن

95۔ شبلی نعمانی، علامہ: الفاروق، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن

96۔ شریف رضی، علامہ (مرتب): نہج البلاغہ (مترجم: مفتی جعفر حسین) امامیہ پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن

97۔ شوکانی، محمد بن علی، قاضی، امام: ارشاد الفحول، محل محمد امین الخانجی، مصر، ۱۳۲۷ھ

98۔ شہرستانی، محمد بن عبدالکریم، امام: الملل والنحل، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۷۵ء

99۔ شہزاد اقبال شام: اسلامی قانون کے مآخذ، ماخذ سوم: الاجماع، شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

100۔ ایضاً: مآخذ القیاس، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

101۔ شیرازی، ابراہیم بن علی، ابو اسحاق، الشافعی، الفیروزابادی، امام: کتاب اللمع فی اصول الفقہ، مطبعۃ السعادۃ مصر، س۔ن

102۔ ایضاً: المھذب، مطبع عیسی البابی، مصر، س۔ن

ص

103۔ صبحی محمصانی، ڈاکٹر: فلسفہ شریعت اسلام (مترجم: مولوی محمد احمد رضوی) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۵ء

104۔ صفی الرحمٰن، مبارکپوری، مولانا: اتحاف الکرام شرح بلوغ المرام، دارالکتب، پشاور، س۔ن

105۔ صلاح الدین یوسف، حافظ: زکوٰۃ، عشر اور صدقۃ الفطر، دارالسلام، لاہور، ۲۰۰۲ء

106۔ ایضاً: تفسیر احسن البیان، مکتبہ دارالسلام، الریاض، س۔ن

107۔ صنعانی، عبدالرزاق بن ہمام، امام: المصنف، کتاب المغازی، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۷۲ء

108۔ صنعانی، محمد بن اسماعیل: سبل السلام شرح بلوغ المرام، جمعیت احیاء التراث الاسلامی، کویت ۱۹۹۷ء

ط

109۔ طالب الہاشمی: سیرۃ خلیفۃ الرسول، حسنات اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء

110۔ طبرانی، سلیمان بن احمد، ابوالقاسم، امام: المعجم الاوسط، مکتبۃ المعارف، ریاض، ۱۹۸۶ء

111۔ طبری، محمد بن جریر، امام: تاریخ الامم والملوک، دار سویدان، بیروت، ۱۹۶۷ء

112۔ ایضاً: جامع البیان عن تاویل آی القرآن، مکتبہ ومطبعہ مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۹۵۴ء

113۔ طوفی، سلیمان بن عبداللہ، نجم الدین، امام: شرح مختصر الروضۃ، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۰ء

114۔ طٰہٰ جابر، العلوانی، ڈاکٹر: اصول الفقہ الاسلامی، المعہد العالمی، امریکہ، ۱۹۹۵ء

ع

115۔ عبدالرحمٰن بن عبدالخالق، مولانا: البیان المامول فی علم الاصول، ناشر ندارد

116۔ عبدالسلام بن تیمیہ، امام: المنتقی من اخبار المصطفیٰ ﷺ، الریاسۃ العامہ لادارات البحوث العلمیہ، ریاض، ۱۹۸۳ء

117۔ عبدالسلام، ندوی، مولانا: سیر الصحابۃ، ادارہ اسلامیات، لاہور، س۔ن

118۔ عبدالعظیم شرف الدین، ڈاکٹر: تاریخ التشریع الاسلامی، جامع قاریونس، بنغازی، ۱۹۹۳ء

119۔ عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر: الوجیز فی اصول الفقہ، فاران اکیڈمی، لاہور، س۔ن

120۔ ایضاً: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیہ، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۰ء

121۔ ایضاً: مجموعہ بحوث فقہیہ، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۲ء

122۔ عبدالکریم مراد و عبدالمحسن العباد: من اطیب المنح فی علم المصطلح، قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن

123۔ عبداللہ محفوظ محمد الحداد: السنۃ والبدع، دارالقلم، دمشق، ۱۹۹۹ء

124۔ عبدالوہاب خلاف: علم اصول الفقہ، دارالقلم، کویت، ۱۹۷۸ء

125۔ عبدالوہاب النجار: الخلفاء الراشدون، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، س۔ن
126۔ عبیداللہ، مبارکپوری، مولانا: مرعاۃ المفاتیح، مکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل، شیخوپورہ، س۔ن
127۔ عرفان خالد، ڈھلوں، ڈاکٹر (مرتب): علم اصولِ فقہ ایک تعارف، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۶م
128۔ عزت علی عطیہ، ڈاکٹر: البدعۃ تحدیدھا وموقف الاسلام منھا، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۰م
129۔ عطیہ محمد سالم وغیرہ: تسہیل الوصول الی فہم علم الاصول، فاروقی کتب خانہ، لاہور، س۔ن
130۔ علاء الدین علی، امام: الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۱م
131۔ علی قاری، ملاں: الموضوعات الکبری، المکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل، شیخوپورہ، س۔ن
132۔ علی بن برھان الدین، حلبی، امام: السیرۃ الحلبیہ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن
133۔ علی متقی، امام: کنز العمال، موسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۹م
134۔ عینی، بدرالدین، علامہ: عمدۃ القاری، ناشر وتاریخ ندارد

غ

135۔ غالب عبدالکافی، القرشی: اولیات الفاروق السیاسیۃ، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۸۳م
136۔ غزالی، محمد بن محمد، امام: المستصفی، مطبع الامیریہ، بولاق، مصر، ۱۴۲۳ھ
137۔ ایضاً: المنخول من تعلیقات الاصول، دار الفکر، س۔ن

ف

138۔ فضل الرحمن، ڈاکٹر: اسلام اور جدیدیت (مترجم: محمد کاظم)، مشعل عوامی کمپلیکس، لاہور، ۱۹۹۸م
139۔ فواد عبدالباقی: المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۹۴م

ق

140۔ قاسم بن سلام، امام: کتاب الاموال (تصحیح وتعلیق: محمد حامد الفقی) ناشر ندارد
141۔ قرافی احمد بن ادریس، امام: الاحکام (مترجم: ڈاکٹر حافظ غلام یوسف) شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴م
142۔ قرطبی، محمد بن احمد، امام: الجامع الاحکام القرآن، دار الکاتب العربی، قاھرۃ، ۱۹۶۷م
143۔ قرطبی، یوسف بن عبداللہ، امام: کتاب الکافی فی فقہ اہل المدینۃ، الریاض الحدیثیہ، الریاض، ۱۹۷۸م

ک

144۔ کاسانی، ابوبکر بن مسعود، امام: بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۶م

145۔ کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا: سیرت المصطفیٰ، مکتبہ عثمانیہ، لاہور، ۱۹۹۲م

146۔ کیلانی، عبدالرحمٰن، مولانا: احکام تجارت اور لین دین کے مسائل (تحقیق وتخریج: مبشر احمد ربانی) مکتبہ السلام، لاہور، س۔ن

گ

147۔ گوہر رحمٰن، مولانا: اسلامی سیاست، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۲۰۰۲م

148۔ ایضاً: اجتہاد اور اوصاف مجتہد، حرا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰م

م

149۔ مالک بن انس، امام: الموطا، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵م

150۔ مبشر حسین، حافظ: جدید فقہی مسائل، مبشر اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۸م

151۔ مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا (مرتب): جدید فقہی مباحث، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، س۔ن

152۔ مجیب اللہ ندوی، مولانا: اجتہاد اور تبدیلی احکام، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، س۔ن

153۔ محب الطبری، ابوجعفر، احمد: الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، س۔ن

154۔ محب اللہ بن عبدالشکور، علامہ: مسلم الثبوت مع شرحہ فواتح الرحموت، دارصادر، بیروت، ۱۳۲۴ھ

155۔ محسن ابراہیم، ابوالحسن: جدید حیاتیاتی علوم اور اسلام (مترجم: خان) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۱م

156۔ محمد ابراہیم شقرہ: الرأی السدید فی الاجتہاد والتقلید، ناشر ندارد، ۱۹۸۱م

157۔ محمد اقبال، علامہ: اسلامی فکر کی نئی تشکیل (مترجم: شہزاد احمد)، مکتبہ خلیل، لاہور، ۲۰۰۵م

158۔ محمد امین احسن اصلاحی، مولانا: اسلامی قانون کی تدوین، ناشر و تاریخ ندارد

159۔ محمد امین، امیر بادشاہ، علامہ: تیسیر التحریر، مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۱ھ

160۔ محمد بن احمد، ابوبکر، سمرقندی، امام: میزان الاصول فی نتائج العقول، ادارۃ الشؤون الاسلامیۃ، قطر، ۱۹۸۴م

161۔ محمد بن حسن، شیبانی، امام: کتاب الآثار، باب فضائل الصحابۃ، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۴۰۷ھ

162۔ محمد بن عبدالعزیز، شیخ (مرتب): فتاویٰ اسلامیہ، (ترجمہ: مولانا محمد خالد سیف) مکتبہ دارالسلام، لاہور، س۔ن

163۔ محمد بن نظام الدین، عبدالعلی، الانصاری، امام: فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، مطبع الامیریۃ، بولاق مصر، ۱۳۲۳ھ

164۔ محمد تقی عثمانی، مفتی: اسلام اور جدید معیشت و تجارت، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۰۷م

165۔ محمد تقی امینی، مولانا: اجتہاد، قدیمی کتب خانہ کراچی، س۔ن

166۔ ایضاً: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، س۔ن

167۔ ایضاً: فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۹۱م

168۔ محمد حسین، ھیکل: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (مترجم: محمد اسحاق بھٹی) الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۸

169۔ ایضاً: الفاروق عمر، مکتبہ النھضۃ المصریہ، قاھرہ، س۔ن

170۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر: خطباتِ بہاولپور، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۵م

171۔ محمد الخضری بک: اصول الفقہ، المکتبۃ التجاریۃ، مصر، ۱۹۶۹

172۔ ایضاً: تاریخ التشریع الاسلامی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۷۰م

173۔ ایضاً: تاریخ الامم الاسلامیہ، مکتبہ التجاریہ الکبری، مصر، س۔ن

174۔ محمد خیر ھیکل، ڈاکٹر: الجہاد والقتال فی السیاسۃ الشرعیۃ، دار البیارق، بیروت ۱۹۹۶م

175۔ محمد رشید رضا: تفسیر المنار، دار الفکر، بیروت، س۔ن

176۔ محمد رواس قلعہ جی، ڈاکٹر: فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (مترجم: ساجد الرحمٰن صدیقی)، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۲۰۰۲م

177۔ ایضاً: فقہ حضرت ابوبکر (مترجم: مولانا عبد القیوم)، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۸۹م

178۔ ایضاً: موسوعہ فقہ عثمان بن عفان، دار النفائس، بیروت، ۱۹۹۱م

179۔ ایضاً: فقہ حضرت علی (مترجم: مولانا عبد القیوم) ادارہ معارف اسلامی لاہور، ۲۰۰۲م

180۔ محمد زاہد الکوثری، علامہ: فقہ اہل العراق وحدیثھم، مکتب المطبوعات الاسلامی، بیروت، ۱۹۷۰م

181۔ محمد شفیع، مفتی: معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۸۵م

182۔ محمد صدقی، ڈاکٹر: الوجیز فی ایضاح قواعد الفقہ الکلیہ، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۳م

183۔ محمد طاہر بن علی، امام: تذکرۃ الموضوعات، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۳ھ

184۔ محمد عاصم الحداد: اصول فقہ پر ایک نظر، اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۱م

185۔ محمد علی صابونی: صفوۃ التفاسیر، دار القرآن الکریم، بیروت، ۱۹۸۵م

186۔ ایضاً: التبیان فی علوم القرآن، مکتبہ الغزالی، دمشق، ۱۹۸۱م

187۔ محمد عمیم الاحسان، مفتی: قواعد الفقہ، الصدف پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۲م

188۔ محمد عیسیٰ، منصور پوری، مولانا: اجتہاد وقت کی اہم ضرورت، دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۵م

189۔ محمد قطب الدین خان، نواب، دہلوی: مظاہر حق جدید شرح مشکوۃ المصابیح، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۹۴م

190۔ محمد کرم شاہ، ازہری، پیر وغیرہ: دعوت فکر ونظر، مجموعہ مقالات علمیہ (مرتب و ناشر: جمعیت اہلحدیث لاہور) ۱۹۷۹م

191۔ محمد گوندلوی، حافظ: النبراس فی الفرق بین البدعۃ والقیاس، مکتبہ اعظم منہاس، گوجرانوالہ، س۔ن

192۔ محمد نواز، ڈاکٹر: اسلامی بحریہ، دارالاندلس، لاہور، س۔ن

193۔ محمد یوسف، بنوری، مولانا: معارف السنن شرح سنن الترمذی، المکتبۃ البنوریۃ، کراچی، ۱۳۸۳ھ

194۔ محمود احمد ظفر، حکیم: امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کتب خانہ مجیدیہ، ملتان، س۔ن

195۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر: محاضراتِ حدیث، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۵م

196۔ ایضاً: محاضرات فقہ، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۵م

197۔ محمد طاہر منصوری (مرتب): اجتماعی اجتہاد، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۲۰۰۷م

198۔ محمود طحان، ڈاکٹر: تیسیر مصطلح الحدیث، مکتبۃ المعارف، ریاض، ۱۹۸۷م

199۔ مرغینانی، برھان الدین، امام: الھدایہ، بک لینڈ، لاہور، س۔ن

200۔ مسلم بن حجاج، امام: صحیح مسلم، دارالسلام، ریاض، ۱۹۹۸م

201۔ مسلم بن عید الھلالی: البدعۃ واثرھا السیٔ فی الامۃ، ناشر ندارد، ۱۴۲۰ھ

202۔ مصطفیٰ جمال الدین: القیاس حقیقتہ وحجیتہ، مطبعہ النعمان، النجف، ۱۹۷۰م

203۔ مصطفیٰ زید، ڈاکٹر: المصلحۃ فی التشریع الاسلامی ونجم الدین الطوفی، دارالفکر العربی، قاہرہ، ۱۹۶۴م

204۔ مقبول احمد، قاضی، پروفیسر: اسلام اور اجتہاد، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۲۰۰۱م،

205۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید: تفہیمات، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱م

206۔ ایضاً: الجہاد فی الاسلام، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۳م

207۔ ایضاً: رسائل ومسائل، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱م

208۔ ایضاً تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۴م

ن

209۔ نادیہ شریف، العمری، ڈاکٹر: الاجتہاد فی الاسلام، موسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۹۸۵م

210۔ ایضاً: اجتہاد الرسول ﷺ، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۷م

211۔ ندوی، علی، ابوالحسن، سید: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۶م

212۔ ایضاً: المرتضی کرم اللہ وجھہ، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۹۱م

213۔ ندوی، محمد حنیف، مولانا: مسئلہ اجتہاد، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶م

214۔ ندوی، معین الدین، احمد، شاہ: خلفاء راشدین، نعمانی کتب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳م

215۔ ایضاً: تاریخ اسلام، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن

216۔ نسائی، احمد بن شعیب، امام: سنن نسائی، دار السلام، ریاض، ۱۹۹۹م

217۔ نعیم سرفراز: انسانی حقوق برائے اساتذہ و منتظمین، فضل داد ہیومن رائٹس انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد، س۔ن

218۔ نووی، محی الدین، امام: شرح النووی لصحیح مسلم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۵۶م

219۔ ایضاً: المجموع شرح المھذب، دار الفکر، بیروت، س۔ن

و

220۔ وھبہ الزحیلی، ڈاکٹر: اصول الفقہ الاسلامی، دار الفکر، دمشق، ۱۹۸۶م

ھ

221۔ ھیثمی، علی بن ابی بکر، امام: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، مکتبہ القدسی، قاھرۃ، ۱۳۵۲ھ

ی

222۔ یحیی بن ادم القرشی، امام: کتاب الخراج، دار المعرفہ، بیروت، س۔ن

لغات

223۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، الجزری، امام: النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر، داراحیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن

224۔ ابن منظور، محمد بن مکرم، افریقی، امام: لسان العرب، دار صادر، بیروت، ۱۹۵۵م

225۔ ابرھیم انیس، ڈاکٹر وغیرہ: المعجم الوسیط، المکتبۃ الاسلامیۃ، استنبول، س۔ن

226۔ الرازی، محمد بن ابی بکر، امام: مختار الصحاح، دار الفکر، بیروت، س۔ن

227۔ راغب اصفہانی، حسین بن محمد بن مفضل، امام: المفردات فی غریب القرآن (مترجم: مولانا محمد عبدہ)، اسلامی اکادمی، لاہور، ۱۹۸۷م

228۔ زبیدی، محمد مرتضیٰ، امام: تاج العروس، المطبعۃ الخیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ

رسائل و جرائد

229۔ الاعتصام، ہفت روزہ، دار الدعوہ السلفیہ، لاہور

230۔ الاحیاء ماہنامہ، الاحیاء ریسرچ فاؤنڈیشن، لاہور

231۔ ترجمان القرآن، ماہنامہ، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور

232۔ دعوۃ، ماہنامہ، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

233۔ ساحل، ماہنامہ، کراچی

234۔ فقہ اسلامی، ماہنامہ، گلشن اقبال کراچی

235۔ فکر و نظر، سہ ماہی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

236۔ القلم، سالنامہ، ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

237۔ محدث، ماہنامہ، مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور

238۔ منہاج، سہ ماہی، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور

239۔ میثاق، ماہنامہ، انجمن خدام القرآن، لاہور

240۔ نداء الجامعہ، سہ ماہی، جامعہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، لاہور

خلفاء راشدین کا اجتہادی منہج و نوعیت

اور

عصر حاضر میں اس سے استفادہ

حافظ شعیب احمد